حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کا مجموعہ

مواعظ اشرفیہ

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ تھانوی دفتر رسالہ الابقاء
مولوی مسافر خانہ ایم اے جناح روڈ کراچی ۱
فون ۷۷۷۷۶۲۰، ۷۷۷۰۰۹۴

قال اللہ تعالیٰ

فَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِينَ

وعظ ملقب بہ

مِفتاح الخیر

منجملہ ارشادات

حکیم الامّۃ مجدّد الملّۃ حضرت مولانا محمّد اشرف علی صاحب تھانوی

(رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ)

ناشر:- محمّد عبد المنّان غفرلہ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافرخانہ بندر روڈ (ایم۔ اے۔ جناح روڈ) کراچی ۱

ضروری اطلاع :- خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرمایا کریں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وعظ ملقب بہ مفتاح الخیر

این	متیٰ	کم	کیف	ماذا	من ای شان	لم	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہوکر	کیا مضمون تھا	کس طبقے کیلئے زیادہ مفید تھا	کیوں ہوا	کس نے لکھا	تعداد سامعین	متفرقات
قصبہ جلال آباد ضلع مظفر نگر	۳ر محرم سنہ ۱۳۳۶ھ	ایک گھنٹہ ۱۵ منٹ	کھڑے ہوکر	خدمت علمیہ کی فضیلت	عوام کے لئے زیادہ مفید تھا۔	بتقریب افتتاح عمارت مدرسہ اسلامیہ	احمد حسن عفی عنہ	پچاس	عوام اور رؤسا کا مجمع تھا

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہٗ ورسولہٗ صلے اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہ وبارک وسلم۔

امابعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً۔ **یہ جملہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے اس میں حق** تعالیٰ کی حکمت کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور اس بیان کا موقع ظاہر ہے کہ تقریب افتتاح مدرسہ اسلامیہ کی ہے اور میرا مقصود اس بیان سے استمداد مالی نہیں ہے کہ آپ لوگ مدرسہ کی مدد کریں بلکہ مقصود یہ ہے کہ اس فعل کی حقیقت معلوم ہوکر آپ کو مسرت ہو۔ کہ الحمد للہ ہم کو ایسے بڑے کار خیر میں شرکت کی توفیق ہوئی باقی اس کام کی حق تعالے کے اختیار میں ہے خواہ وہ آپ حضرات کے ذریعہ سے تکمیل فرمادیں یا دوسرے لوگوں کے ہاتھ سے میری غرض تقریر سے صرف اسی قدر ہے کہ اس فعل کی حقیقت سے آپ حضرات آگاہ ہوجاویں اور مسرور ہوکر شکر خداوندی بجالاویں کہ ایسے عظیم الشان دین کے کام کی توفیق ہوئی۔

حق تعالیٰ نے ان مختصر الفاظ میں علم دین کی فضیلت عنوان حکمت سے جس کے معنی حقیقت شناسی کے ہیں بیان فرمائی ہے اور اس پر اجماع ہے علماء حکماء عقلاء کا کہ مراد حکمت سے حقیقت شناسی ہے یہ دوسری بات ہے کہ حقیقت کی تعیین میں اختلاف واقع ہو جاوے چنانچہ فلاسفہ یونانیین نے جن امور کو حقائق سمجھا ہے وہ اور ہیں اور حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ نے جو حقائق ارشاد فرمائے ہیں وہ اور ہیں اور اس کا فیصلہ کہ کون سے حقائق صحیح اور حق ہیں۔ آسانی سے اس طرح ہو سکتا ہے کہ جانبین کے دلائل میں غور کیا جاوے اس سے معلوم ہو جاوے گا کہ کونسے دلائل صحیح ہیں اور کون سے فاسد ہیں اس سے صاف معلوم ہو جاویگا کہ کس کا دعویٰ صحیح اور کس کا غلط ہے کیونکہ صحت و فساد دعوے کا دلیل ہی کے صحت فساد سے معلوم ہوتا ہے سو دلائل میں غور کرنے سے کالشمس فی نصف النہار صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حکماء کے دلائل و مقدمات نہایت ضعیف اور لچر ہیں اور اس بات کو جو پابند مذہب نہیں وہ بھی جانتے ہیں بلکہ خود مستدلین بھی اپنے دل میں سمجھتے ہیں کہ ہم کیسی پوچ باتیں کہہ رہے ہیں اور حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ کے دلائل و مقدمات نہایت قوی ہیں اور یقینی ہیں اور صرف نقلی ہی نہیں ہیں بلکہ عقلی بھی ہیں کیونکہ نقلیات کا مرجع عقلیات ہوا کرتے ہیں مثال اس کی یہ ہے کہ مثلاً قیامت کا وقوع دلیل سے ثابت ہے اور صرف عقل سے اس کا ادراک نہیں ہو سکتا لہذا یہ مسئلہ نقلیہ ہے مگر اس طرح یہ مسئلہ عقلیہ ہے کہ اس کی دلیل مرکب ہے دو مقدموں سے پہلا مقدمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے وقوع کی قرآن مجید میں خبر دی ہے اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جو کلام اللہ میں بتلایا جاوے وہ صحیح ہے اور اس سے پہلے مقدمے کو اس حیثیت سے بیان نہیں کیا گیا کہ یہ کلام اللہ ہے اور اس کا صحیح ہونا لازم ہے بلکہ یہ ایک دوسرا مستقل مقدمہ ہے جس کی دلیل عقلی خود قرآن مجید میں موجود ہے وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ جس کا محصل یہ ہے کہ اگر تم کو اس قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں شبہ ہے اور کلام بشر ہونے کا احتمال ہے تو اس کی مثل ایک ہی سورۃ تصنیف کر لاؤ اور (آخر تم فصحاء، بلغاء، و اہل زبان ہو سو تم کو تو اس میں کچھ بھی تامل نہ ہونا چاہیے قالہ الجامع عفی عنہ) اور چونکہ وہ لوگ باوجود مخالفت شدیدہ و سعی بلیغ کے قرآن کے مقابل ایک سورۃ تو کیا ایک

آیت بھی نہ لا سکے تو ثابت ہو گیا کہ یہ کلام بشر نہیں ہے اور کلام عزوجل ہے پس معلوم ہو گیا کہ مسئلہ وقوع قیامت کا تقریر مذکور کے اعتبار سے عقلی ہے اور تمام دعاوی نقلیہ مقدمات عقلیہ سے ثابت ہونے کی وجہ سے عقلیہ ہوتے ہیں لہذا عقلی ہونے کی وجہ سے حکماء پر بھی حجت ہیں اور حکماء میں خود باہم جوتی پیزار ہونا اور ایک دوسرے کی دلیلوں کا توڑنا یہ بھی ان کے مقاصد ومقدمات کے ضعف کی دلیل ہے بخلاف ان مقاصد ومقدمات کے جن کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام لائے ہیں کہ ان سب کا مقصود واحد اور اصول متفق ہیں گو بعض فروع ہیں باختلاف ازمنہ اختلاف واقع ہوا ہے لیکن اس اختلاف میں اور حکماء کے اختلاف میں زمین وآسمان کا فرق ہے اس اختلاف میں تناقض نہیں اور اگر مجتہدین کے اختلاف میں کہیں تناقض بھی ہے۔ تب بھی ایک کو دوسرے کے رد کا خیال بھی نہیں ہوتا۔ اور حکما کے اختلاف میں علاوہ تناقض کے ان کو بجز رد وقدح کے اور مقصود ہی نہیں ہوتا۔ اور اگر بعض مدعیان عقل نے انبیاء علیہم السلام کے دعووں کو جو رد کرنا چاہا مگر مبطل کو ہمیشہ محرومی ہی ہوئی ہے اور کبھی کامیابی نہیں ہوئی۔ غرض دلائل سے معلوم ہو رہا ہے کہ حقائق کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ ہی نے سمجھا ہے پس اس آیت میں حکمت سے مراد یہی حقائق ہیں جو انبیاء کے بتلائے ہوئے ہیں جس کا حاصل دین ہے اور بجائے لفظ علم کے حکمت کا لفظ اس لئے اختیار کیا گیا کہ حکمت کی خیریت متفق علیہ ہے گو اس کی حقیقت کی تعیین مختلف فیہ ہو تو اس صورت میں صرف تعیین حقیقت ہی میں کلام رہے گا۔ باقی حکمت کا خیر کثیر ہونا مسلم رہے گا بخلاف عنوان دین کے کہ اس میں خود اس حکم ہی میں اختلاف ہو جاتا غرض حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص حکمت یعنی علم دین عطا کیا جاوے تو اس کو بیشک خیر کثیر مل گئی۔ اب یہ سمجھئے کہ آیت میں یوت الحکمۃ فرمایا یہ نہیں ارشاد فرمایا من تعلم الحکمۃ یا من حصل الحکمۃ یعنی حق تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ جو شخص حکمت دیا جاوے اس کو خیر کثیر مل گئی یہ نہیں فرمایا جو حکمت سیکھے یا جو حکمت حاصل کرے اس کو خیر کثیر مل گئی اس میں یہ رمز ہے کہ کہیں طالب علم ومحصل کو زعم اور عجب اور ناز نہ پیدا ہو جاوے کہ میں نے اپنی فطانت وذہانت ومحنت سے علم حاصل کیا ہے پس من یوت میں یہ بتلا دیا کہ یہ محض موہبت خداوندی ہے جس کو چاہیں عطا فرماویں گو اس کے اسباب مکتسبہ ضرور ہیں اور اسی بنا پر انسان اس کی تحصیل کا مکلف قرار دیا گیا ہے چنانچہ حدیث میں ہے طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم (قال الجامع

رواہ ابن عبد اللہ باسناد صحیح کما فی الجامع الصغیر (والمتن) قال ابن القطان صاحب ابن ماجہ فی کتاب العلل عقب ایرادہ من جہۃ سلام الطویل عن انس ومرفوعا انہ غریب حسن الاسناد وقال العراقی قد صحیح بعض الائمۃ بعض طرقہ وقال المزی ان طرقہ تبلغ بہ رتبتہ الحسن ورد بناہ فی ثانی السمعونیات من حدیث موسی بن داود ثنا حماد بن سلمۃ عن قتادۃ عن انس بہ ورجالہ ثقات ھذا کلہ فی المقاصد الحسنۃ قال الجامع وبسط فیہ الکلام لان المشھور انہ لیس لہ اسناد ثابت) مگر سچ یہ ہے کہ بعد سعی کے علم دین کا حاصل ہوجانا یہ محض موہوب من اللہ ہے مکسوب نہیں ہے جیسے نکاح فعل اختیاری ہے اور اسی طرح مجامعت بھی فعل اختیاری ہے۔ مگر اولاد کا ہونا بالکل غیر اختیاری ہے اگر حق تعالیٰ چاہیں عطا فرمادیں اور چاہیں محروم فرمائیں سو اسی طرح کتاب پڑھنا محنت کرنا سامان تحصیل مہیا کرنا افعال اختیاریہ ہیں لیکن حصول علم دین غیر اختیاری ہے کیونکہ درحقیقت علم دین حقائق دینیہ کا قلب پر وارد ہوتا ہے۔ اور وہ محض موہوب ہے اور میں اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر دعویٰ سے کہتا ہوں کہ آپ دو طالب علم لیجئے جو ہر طرح ظاہری اسباب تحصیل میں مساوی درجہ کے ہوں یعنی اوستاد دونوں کا ایک ہو توجہ بھی استاد کی دونوں پر مساوات کے ساتھ ہو تدریس وتحشیہ وتصنیف وغیرہ کا کام بھی دونوں سے برابر درجہ میں لیا گیا ہو مدت تکمیل بھی دونوں کی ایک ہو عمر بھی ایک ہو فطانت وذہانت میں بھی برابر ہوں مگر ایک میں تقویٰ زیادہ ہو تو ضرور ہے کہ متقی کا علم لطیف اور بڑھا ہوا ہوگا اور یہ امر مشاہدہ ہے۔ لاریب فیہ بلکہ بعض اوقات متقی اس درجہ کا ذہین نہیں ہوتا جس درجہ کا وہ دوسرا شخص ذہین ہوتا ہے جو اس سے تقویٰ میں کم درجہ کا ہے مگر باوجود اس کے متقی کا علم[؎] زیادہ اور لطیف ہوتا ہے۔ پھر اسباب ظاہریہ کی مساوات

[؎] اگر شبہ ہو کہ تقویٰ بھی تحصیل علم کا سبب ہے، اور وہ ایک شخص میں کم ہے اسی لئے اس کے علم میں بھی کمی ہے پھر موہوب علم کہاں رہا اور مساوات کہاں متحقق ہوئی تو جواب یہ ہے کہ اول تو ہم تو یہی مسلم نہیں کہ تقویٰ بھی تحصیل علم کا ایک سبب ہے، چنانچہ کوئی شخص خاص اس نیت سے تقویٰ کرکے دیکھے کہ ہمارے علم میں ترقی ہوگی سو دیکھ لیگا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اس کے علم میں خاک بھی ترقی نہ ہوگی ترقی تو عادۃً ہوجاتی ہے جبکہ مقصود تقویٰ سے خالص رضائے الٰہی ہو اور بر تقدیر تسلیم یہ اسباب ظاہریہ میں سے نہیں ہے۔ اور یہاں ذکر اسباب ظاہری کا ہے اور جو اسباب کو عام لیا جاوے تو اسباب غیر ظاہری تو رحمت خداوندی بھی ہے جو سبب ہے موہبت کا تو پھر یہ بھی کہا جاویگا کہ ایک کے شامل رحمت الٰہیہ ہے اور وہ سبب ہے زیادت کا اور دوسرے کو یہ میسر نہیں خلاصہ مساوات حالانکہ یہ اعتراض کوئی فہیم نہیں کرسکتا ۱۲ جامع عفی عنہ۔

کے ہوتے ہوئے تقویٰ سے علم کا زیادہ لطیف ہو جانا یہ موہوب ہونے کے سبب سے نہیں تو اور کیا ہے پس معلوم ہوا کہ حصول علم دین محض وہبی ہے وللہ در العارف الرومی حیث یقول ؎

بینی اندر خود علوم انبیا　　بے کتاب و بے معید و اوستا

(اپنے اندر علوم انبیا مشاہدہ کرو گے بدون کتاب اور تکرار کرانے والے کے اور استاد کے)

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب علیہ الرضوان کے دیکھنے والے اس جماعت میں موجود ہیں مولانا کی تقریر آپ حضرات نے سنی ہوگی کہ کس درجہ کی ہوتی تھی اور مولانا کا کیسا علم تھا اور مولانا کی طالب علمی کی شان دیکھنے والوں سے سننے والے بھی موجود ہیں کہ کس بے پروائی سے مولانا نے پڑھا تھا۔ ابتداء ہی سے ویرانوں جنگلوں سے الفت اور تجرد پسند تھے کہیں جمنا میں تیر رہے ہیں کہیں سیر و سیاحت کر رہے ہیں ایک آزاد طبیعت تھی بخلاف ان کے اقران و ہمعصر حضرات کے کہ انھوں نے توجہ سے پڑھا محنت کی اساتذہ کاملین سے تحصیل کی مگر مولانا کے علوم کی شان ان میں نہ پیدا ہوئی یہ صرف تقویٰ کی برکت تھی حدیث میں ہے من عمل بما علم ورثہ اللہ علم ما لم یعلم او کما قال (اخرجہ فی حلیۃ الاولیاء کما اوردہ فی بہشتی جوہر حصہ اول قال الجامع) یعنی جو عالم اپنے علم پر عمل کرے وارث کرے گا اس کو اللہ تعالیٰ ایسے علم کا جس کو وہ نہیں جانتا ہے حضرت استاذی و مولائی مولوی شاہ محمد یعقوب صاحب قدس سرہ سے میرے سامنے پوچھا گیا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو اس درجہ کا علم کس طرح حاصل ہو گیا۔ آپ نے چند اسباب ذکر فرمائے کہ اساتذہ کامل تھے پیر کامل تھے تقویٰ تھا اساتذہ کا ادب زیادہ فرماتے تھے اور یہ امور آپ کے اقران میں بھی تھے مگر باطنی تقویٰ کی ایک خاص شان آپ کے اندر تھی جو آپ کے معاصرین کو کم میسر تھی سب سے بڑی وجہ علم کی ترقی کی یہی ہوئی غرض اس لئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں من یؤت الحکمۃ الخ یعنی جس کو حکمت عنایت فرمائی گئی اس کو خیر کثیر مل گئی اشارہ اس طرف ہے کہ اگر تم حکمت کا لینا چاہتے ہو تو براہ راست اس کا حاصل ہو جانا تمھارے اختیار میں نہیں ہے اس کے حاصل ہونے کی صرف یہی صورت ہے کہ اپنے اندر قابلیت ایسی پیدا کر لو کہ جس سے ہمارا عطیہ اور موہوبہ لینے کے قابل ہو جاؤ اور وہ قابلیت تقویٰ کا اختیار کرنا ہے مگر یاد رہے کہ اس قصد سے تقویٰ اختیار کرنا کہ علوم القا ہوں ہرگز زیبا نہیں اور نہ اس طریق سے کامیابی کی امید بلکہ تقویٰ محض مخلصاً للہ تعالیٰ اور رضائے الٰہی کیلئے ہو عادت خداوندی کے موافق اس کی قابلیت کے اندازہ سے جو علوم حق تعالےٰ کو عطا فرمانے ہوں گے وہ عطا فرما دیں گے اور جس کو سچا تعلق خداوند تعالےٰ سے

ہوگا وہ تو عبادت بغیر اللہ تعالیٰ کیوں کرنے لگا۔ اور ایسا ہی شخص محل نزول برکات بھی ہے اور حکمت کا لفظ بجائے علم کے ارشاد فرمانے کی اس کی وجہ جو میں پیشتر بیان کر چکا ہوں اس کے نظائر قرآن مجید میں اور بھی ہیں چنانچہ فرماتے ہیں تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم یعنی اے اہل کتاب تم ایسی بات کی طرف چلے آؤ اور وہ امر قبول کر لو جو ہمارے اور تمھارے درمیان میں اتفاقی ہے اور وہ توحید ہے چنانچہ فرماتے ہیں ان لا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ یعنی وہ کلمہ یہ ہے جس کی طرف ہم داعی ہیں کہ ہم اور تم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی شے کو اس کا شریک نہ ٹھہراویں اور بعض ہم میں سے بعض کو اپنا رب نہ بنائیں خدا کو چھوڑ کر جیسا وہ لوگ علماء کے ساتھ برتاؤ کیا کرتے تھے۔ اب اس عنوان سے ایک درجہ میں اُن سے موافقت کر لی کہ تم بھی توحید کو مانتے ہو اور ہم بھی پھر موافقت کے بعد ان سے یہ کہنا کہ تمھاری توحید واقع میں توحید نہیں ہے کہ ممزوج بشرک ہے اور ہماری توحید خالص اور واقعی توحید ہے۔ اتفاق کے بعد اختلاف بھی ان پر زیادہ گراں نہ ہوگا اور اگر پہلے ہی سے ان کو مشرک کہا جاتا تو وہ اول ہی سے سخت برانگیختہ ہو جاتے اور توحید کے مضمون کو سننا بھی گوارا نہ کرتے اور ایک بات سمجھنے کی ہے کہ آیت میں حکمت یعنی علم دین کو خیر کثیر کہا گیا حالانکہ صرف خیر کا لفظ بھی کافی تھا کیونکہ یہ لفظ ہم تفصیل ہے اس کے معنی ہیں بہت اچھا اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ جیسی عظیم الشان ذات جس چیز کو بہت اچھا فرمائے اس کی خوبی کس درجہ کی ہوگی مگر صرف اسی لفظ پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ مزید مبالغہ کے لئے کثیرا کا لفظ بھی اضافہ فرمایا یعنی علم دین بہت ہی بڑی نعمت ہے، اور بہت اچھا ہونے کے دو درجے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی چیز بہت سی چیزوں سے یا کسی خاص چیز سے بہت اچھی ہو اور دوسرے یہ کہ تمام چیزوں سے زیادہ عمدہ ہو اور یہاں ظاہراً دوسری صورت مراد ہے کیونکہ یہاں مفضل علیہ مذکور نہیں ہے پس مراد یہ ہے کہ علم دین تمام اچھی چیزوں سے زیادہ بڑھ کر ہے واضح ہو کہ اس خیر کے مفضل علیہ میں تمام واقعی عمدہ چیزیں داخل ہیں اور مال و دولت تو واقع میں کمال ہی نہیں اور نہ وہ کچھ زیادہ اچھا ہے بلکہ بقدر حاجت روائی محمود ہے اور وسیلہ ہے مقصود کا خود بذاتہ کچھ محمود مقصود نہیں اس لئے اس خیر کے مفضل علیہ میں اس کے داخل ماننے کی ضرورت ہی نہیں اب رہا ایمان سو وہ خود ایمان اس علم ہی میں داخل ہے کیونکہ ایمان تصدیق بالقلب کا نام ہے اور ظاہر ہے کہ یہ علم ہے۔ اب رہی جنت سو وہ اس خیر کے مفضل علیہ میں داخل ہے کیونکہ ایمان کہ علم دین کی ایک فرد ہے۔ جنت سے افضل ہے۔ گو بعض لوگوں نے جنت کو ایمان سے افضل کہا ہے اور یہ دلیل بیان کی ہے

کہ من جاء بالحسنۃ فلہ خیر منہا یعنی جو شخص نیکی کرے تو اس کو اس نیکی سے بڑھ کر جزا دی جاوے گی اس سے معلوم ہوا کہ عمل سے جزا افضل ہے اور اعمال میں ایمان بھی ہے۔ لہذا ایمان کی جزا یعنی جنت ایمان سے افضل ہوئی لیکن یہ استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ یہاں خیر سے مراد جنت نہیں بلکہ نفس حسنہ ہے تو مطلب یہ ہوا کہ آدمی جو نیکی کرتا ہے خواہ وہ ایمان ہو یا دیگر اعمال اللہ تعالیٰ اس عمل کو بڑھا دیتے ہیں۔ مثلاً ایک نیکی کو بڑھا کر دس نیکی کر دیں پھر ان دس نیکی پر جزا مرتب ہوتی ہے اور دوسری آیت میں تصریح ہے کہ وہ بڑھائی ہوئی چیز حسنہ ہی ہے چنانچہ فرمایا ہے من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالہا اور ظاہر ہے کہ امثالہا میں ضمیر مضاف الیہ کا مرجع حسنہ ہے تو حسنہ کے امثال حسنات ہی ہیں۔ مثلاً کسی نے دو رکعت نماز پڑھی تو اس کو اول بیس رکعت یعنی دس گنا فرمایا پھر اس بیس رکعت کا ثواب مرحمت فرمایا کام کمزور تھا۔ لکھا گیا قوی تھوڑا کیا تھا تحریر میں لایا گیا زیادہ۔ پس حسنات مضاعفہ کا حسنہ معمول بہا سے افضل ہونا لازم آیا نہ کہ جزا کا عمل سے اور اسی کی تائید کے درجہ میں نہ کہ احتجاج کے مرتبے میں عرض کرتا ہوں کہ بعض حضرات نے اولئک یبدل اللہ سیئاتہم حسنات کی تفسیر کی ہے کہ سیئات سے مراد وہ طاعات ہیں جو موافق امر کے بجا نہیں لائی گئیں پس اللہ تعالیٰ بجائے ان کے خالص طاعات مرحمت فرما دیں گے مثلاً نماز پڑھی اس میں مکروہات و محرمات کا ارتکاب ہو گیا تو وہ نماز تھی سیئہ[1] عطا ہوئی نماز خالص اور تفسیر کچھ بعید نہیں کیونکہ بعض احادیث میں وارد ہوا ہے کہ گناہ گن گن کر بعضے لوگوں کو حق تعالیٰ ان گناہوں کے عوض نیکیاں مرحمت فرما دیں گے سو جب مستقل معاصی کی عوض حسنات دی جاوینگی تو عائش معاصی کے عوض حسنات عطا فرمایا جانا کیا بعید ہے سو یہاں پر ان اعمال ناقصہ کے عوض اعمال کاملہ عطا ہونا مذکور ہے اسی طرح فلہ خیر منہا میں بھی حسنہ ناقصہ قلیلہ کے عوض میں ایسے اعمال جو اس سے خیر ہوں عطا ہونا مراد ہو سکتا ہے پس اس سے بھی تائید دعوے مذکورہ کی ہو گئی پس اجزا کا عمل سے اعلیٰ و افضل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اور حق تعالیٰ نے حکمت کو جو خیر کثیر ارشاد فرمایا ہے اور کثیر کی کوئی حد نہیں فرمائی سو اول تو حق تعالیٰ جس چیز کو کثیر فرماویں اس کی کثرت ظاہر ہے کہ کس درجہ کی ہوگی پھر اس کثیر کو بھی جب کسی حد سے مقید و محدود نہیں فرمایا بلکہ مطلق رکھا پس یہ کثرت

---

[1] وہو ظاہر الآیۃ وتقبیح المعاصی بالمکروہات التنزیہیۃ بعید فی الجملۃ وتحول عن الظاہر نعم لک ان تقول ان التبدیل یعم سائر المعاصی سواء کانت محرمۃ او مکروہۃ وتحمل الحدیث والآیۃ علیہ فافہم ۱۲ جامع

نہایت ہی عظیم الشان کثرت ہوگی۔ حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس آیت پر حکمت یعنی علم دین کو ان مبالغات کے ساتھ خیر کثیر کے لقب سے ملقب فرمایا ہے یہ مضمون ایک مقدمہ ہے جو قرآن مجید سے ماخوذ ہے اور دوسرا مقدمہ حدیث شریف سے اخذ کر کے بیان کرتا ہوں اور چونکہ قرآن مجید و حدیث شریف دونوں ادلہ شرعیہ میں سے ہیں اس لئے ہم کو اختیار ہے کہ خواہ دونوں مقدموں کی حدیث و قرآن پر توزیع کر دیں یا دونوں کو صرف قرآن مجید یا فقط حدیث شریف سے اخذ کر لیں وہ حدیث یہ ہے فطوبی لعبد جعله الله مفتاحا للخير مغلاق للشر وويل لعبد جعله الله مفتاحا للشر مغلاق اللخير (اخرجه ابن ماجه وفي سنده عبد الرحمن بن زيد هو ضعيف وليحقق بقية سنده قاله الجامع) یعنی خوش حالی اور خوبی ہے اس شخص کے لئے اللہ نے بھلائی اور نیکی کی کنجی بنایا اور برائی اور شر کا قفل بنایا اور خرابی ہے اس کے لئے جس کو حق تعالیٰ نے شر کی کنجی اور خیر کا قفل بنایا۔ اور کنجی کی خاصیت ہے کھولنا اور تالے کی خاصیت ہے بند کرنا۔ اب یہ شبہ رہا کہ کنجی تو تالا کھولتے اور بند کرتے وقت دونوں جگہ استعمال کی جاتی ہے۔ کیونکہ اصل حاجت کنجی کی ہے اور خاصیت اس کی یہی ہے کہ تالا کھولنے وقت استعمال کی جاوے گو بند کرتے وقت عارضی طور پر کبھی اس کی حاجت ہو جاتی ہے جبکہ وہ تالا ایسا ہو جو بغیر کنجی کے بند نہ ہو سکے بعض قفل بغیر کنجی کے بند ہو جاتے ہیں لیکن بغیر کنجی کے کھلتا کوئی نہیں حاصل یہ ہے کہ جس شخص سے امر خیر کا افتتاح ہو اور شر کا انسداد ہو اس کے لئے خوش حالی ہے کہ دارین میں رحمت خداوندی سے مشرف رہیگا قالہ الجامع) اور جس کے ذریعہ سے خیر کا انسداد اور شر کا افتتاح ہو اس کے لئے بدحالی ہے کہ دونوں جہان میں رحمت الٰہیہ سے بعید اور مردود رہیگا قالہ الجامع) گو کارخانہ تکوین کے اعتبار سے بدحالی والے کا بھی وجود مصلحت ہے کہ عمارت عالم بغیر اس کے درست نہیں ہوتی فان الاشیاء تعرف باضدادہا جیسے کہ باغ انبہ وغیرہ طرح طرح کے عمدہ درخت ہوتے ہیں مگر باڑھ کیکر کے درختوں کی لگائی جاتی ہے ولقد اجاز العارف الشیرازی فیما قال ؎

در کارخانہ عشق از کفر ناگزیر است ، آتش کرا بسوزد گر بولہب نباشد

کارخانہ عشق میں کفر کا وجود بھی ضروری تھا ورنہ آگ کس کو جلاتی اگر بولہب نہ ہوتا یعنی کفر کی نسبت حق تعالیٰ کی ایجاد کے ساتھ حکمت پر مبنی ہے حق تعالیٰ کا شکر ہے کہ جس نے اپنی رحمت سے ہم سب کو ایمان کی دولت سے نوازا۔

دیکھو مکان تیار کیا جاتا ہے اس میں شہ نشین بھی ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ کس قدر نفیس اور باوقعت شے ہے اور پاخانہ بھی ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ نفرت کی چیز ہے مگر چونکہ ایک درجہ میں اس کی بھی ضرورت ہے اس لئے بغیر اس نفرت کی چیز کے مکان کی عمارت کامل نہیں ہوتی اور ناقص رہتا ہے اسی طرح تعمیر عالم اور اس کی تکمیل کے لئے بری چیزوں کا وجود بھی ضرور ہے لیکن یہ خیال رہے کہ یہ حکمت برائی کے ارتکاب کے لئے عذر نہیں ہو سکتی کیونکہ برائی کرنے والے اپنے اختیار سے عصیان خداوندی کا مرتکب ہوتا ہے اور وہ اس کارخانہ کا داروغہ نہیں ہے جو وہ اپنے کو اس کام کے لئے منتخب کرے لہذا وہ معذور نہیں۔ ہے یہ حکمت تو خلق خداوندی کے اعتبار سے ہے نہ کہ کسب عباد کے اعتبار سے اب یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ حدیث میں لوگوں کی دو قسمیں ذکر کی گئی ہیں اور ظاہر عنوان سے ان میں انحصار معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تیسری قسم نہیں ہے لیکن بظاہر شبہ ہوتا ہے کہ اور قسمیں بھی نکلتی ہیں اور استیعاب اقسام کا یہ ہے۔ اول خیر کا مفتاح ہونا۔ شر کا مغلاق ہونا۔ ثانی خیر کا مغلاق ہونا شر کا مفتاح ہونا۔ اور یہ دو قسمیں تو حدیث میں مذکور ہیں۔ ثالث خیر کا مفتاح ہونا۔ شر کا مغلاق ہونا۔ رابع شر کا مفتاح ہونا خیر کا مغلاق ہونا۔ خامس خیر کا مفتاح نہ ہونا شر کا مغلاق ہونا۔ سادس شر کا مفتاح نہ ہونا خیر کا مغلاق ہونا۔ سابع خیر و شر دونوں کا مفتاح ہونا۔ خیر و شر دونوں کا مغلاق ہونا۔ ثامن دونوں کا مفتاح و مغلاق نہ ہونا۔ پس یہ اقسام ہیں لیکن یہ تمام اقسام جو حدیث میں ظاہراً مذکور نہیں ہے حقیقۃً حدیث ہی کے تحت میں داخل ہیں اس لئے انحصار منقوض نہیں ہوتا اور دخول کی یہ صورت ہے کہ خیر و شر باہم ایسے متقابل ہیں کہ ایک کا فتح دوسرے کے غلق کو اور ہر ایک کا غلق دوسرے کے فتح کو مستلزم ہے۔ جب یہ سمجھ میں آ گیا تو حدیث میں غور فرمائیے جب کوئی شخص مفتاح خیر ہوگا تو اس کے لئے مغلاق شر ہونا لازم ہے کیونکہ اس خیر کی فتح نہ ہوتی تو ایک شر جو اس کا مقابل ہے باقی رہتا اب فتح خیر سے اس شر کا انسداد ہو گیا پس قسم ثالث متحقق نہیں اسی طرح جو شر کا مفتاح ہوگا اس کے لئے اس کا مغلاق ہونا جو اس شر کے مقابل ہے لازم ہے پس قسم رابع کوئی قسم نہ ہوئی اسی طرح جو مغلاق شر ہوگا اس کے لئے مفتاح خیر ہونا لازم ہے کیونکہ شر کا بند کرنا یہ بھی ایک خیر ہے پس قسم خامس مقدم ہو گئی۔ اسی طرح جو خیر کا مغلاق ہوگا وہ مفتاح شر ضرور ہوگا۔ پس قسم سادس نہ رہی اور جو دونوں کا مغلاق ہے وہ مختلف خیر و شر کے اعتبار سے مفتاح

خیر بھی ہے اور مغلاق شر بھی ہے اسی طرح وہ مغلاق خیر بھی ہے اور مفتاح شر بھی پس قسم سابع بھی ان ہی دو قسموں میں داخل ہے اور خیر و شر دونوں کا مفتاح و مغلاق نہ ہونا اس کے لئے بھی فتح خیر اور سد شر اور فتح شر اور سد خیر لازم ہے پس قسم ثامن بھی ان ہی دو قسموں میں داخل ہوتی۔ غرض حدیث میں انحصار ہے اب ہر شخص دیکھ لیوے کہ میں مفتاح خیر اور مغلاق شر ہوں یا اس کا عکس اور بعضے لوگ صرف اسباب پر خوش نہ ہوں کہ اگر ہم مفتاح خیر نہیں ہیں تو مفتاح شر بھی نہیں ہیں نہ اچھے کی مدد کرتے ہیں نہ برے کی مدد کرتے ہیں کیونکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے مفتاح خیر نہ ہونے کے لئے مفتاح شر ہونا لازم ہے۔ اس لئے کہ جب تم خیر کو نہ کھولو گے تو ظاہر ہے کہ خیر بند نہ ہوگا اور خیر کا بند رکھنا شر کا کھولنا ہے خیر کا نہ کھولنے والا اضطراراً شر کا کھولنے والا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ذیل کی وعید میں ایسا شخص بھی داخل ہوگا سو ہر شخص کو مفتاح خیر ہونے کی سعی کرنا چاہیئے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ حدیث میں حکم مذکور ہر خیر شر کے لئے عام ہے۔ اور یہ بھی تقریر سے معلوم ہو چکا ہے کہ علم دین بہت بڑی خیر ہے تو خواہ اس خیر کو عموم حدیث میں داخل ہونے کے بعد حدیث کا احق مصداق کہا جاوے یا خیر سے خیر کامل مراد لے کر حدیث کو علم دین ہی پر محمول کیا جاوے غرض دونوں صورتوں میں علم دین کی خدمت کرنے والے کے لئے حدیث میں خوش حالی کی بشارت ہے اور اس میں حصہ نہ لینے والے کے لئے وعید ہے۔ اور حدیث شریف گو بظاہر کلام ہے۔ جناب سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لیکن حقیقت میں وہ کلام ہے حق تعالیٰ کا کیونکہ آپ اپنی طرف سے تھوڑا ہی احکام بیان فرماتے تھے جو کچھ فرماتے تھے رب حق تعالیٰ کا ارشاد ہوتا تھا قال تعالیٰ ما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ و صدق من قال ؎

گفتہ او گفتہ اللہ بود   گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(ان کا کہا ہوا ارشادات حق ہوتے ہیں گرچہ وحی الٰہی زبان رسالت ہی سے ادا ہوئی ہے)

دونوں مقدموں کا نتیجہ یہ ہے کہ فاتح علم خیر کے لئے خوش حالی کی بشارت ہے اور اس کی فتح میں سعی نہ کرنے والے کے لئے وعید ہے اور اسی نتیجہ کے لئے میں نے تقریر کی تھی گو درمیان میں مضامین علیہ بھی آ گئے کیونکہ جو مضمون جس نوع کا ہوتا ہے وہ تو اسی شرح سے ادا ہو سکتا ہے مگر مضائقہ نہیں اس لئے کہ اصل مضمون جتنا ہے اس کو سب ہی سمجھ گئے ہیں اب آپ خدا تعالیٰ کا شکر کیجیے کہ الحمدللہ تعالیٰ حق تعالیٰ نے آپ کو یہ موقع عطا فرمایا کہ ایسے کار خیر میں شرکت اور اس کا افتتاح آپ کے ہاتھ سے ہوا اور آپ اس کام کو چھوٹا سا کام سمجھ کر اس کو بے وقعتی کی نظر سے نہ دیکھیں کیونکہ خلوص کے ساتھ چھوٹا سا کام

بھی بہت بڑا ہو جاتا ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اے عائشہؓ کسی نیکی کو حقیر نہ سمجھو وجہ یہ کہ کیا خبر ہے اللہ تعالیٰ کے یہاں معمولی نیکی کا وہ درجہ خلوص کے سبب عطا ہو جائے جو بڑی نیکی سے بھی بوجہ کسی عارض عدم خلوص وغیرہ کے نہ عطا ہوتا اور سمجھ لیجئے کہ دینی کاموں میں خلوص کی حاجت تو خلوص سے بہت زیادہ ہے اکثر لوگوں کو مدارس کے مقاصد میں فلوس کی طرف زیادہ نظر ہو جاتی ہے اور خلوص کا اس قدر اہتمام نہیں ہوتا حالانکہ فلوس تو خود آجاتے ہیں۔ کیونکہ اس کام کا رحمت اور خیر ہونا تو معلوم ہو چکا اور جو خیر منجانب اللہ مفتوح ہوتی ہے جس میں بڑا دخل خلوص کو ہے اس کا کوئی روکنے والا نہیں چنانچہ حق فرماتے ہیں۔ ما یفتح اللہ للناس من رحمۃ فلا ممسک لہا وما یمسک فلا مرسل لہ من بعدہ۔ یعنی جو رحمت اللہ تعالیٰ عطا فرماویں اس کا کوئی بند کرنے والا نہیں اور جس رحمت کو وہ روک لیں اس کو کوئی دینے والا نہیں لہذا بھروسہ حق تعالیٰ کی ذات پر ہونا چاہئے۔ جتنے کارخانے خلوص پر مبنی ہوئے ہیں ان سب میں ترقی ہوئی ہے خود اصل دین کی حالت کو ملاحظہ فرمایئے کہ ابتداء اس کی کیا تھی تمام عالم مخالف تھا اور بات بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی ہی ارشاد فرمائی تھی جو سارے جہان کے خلاف تھی اور یہی وجہ مخالفت کی تھی ورنہ قبل دعوائے نبوت تو لوگ آپ کو بہت چاہتے تھے۔ مگر باوجود اس مخالفت کے دیکھئے اسلام کہاں سے کہاں پہنچا یہ سب برکت محض اخلاص کی تھی ورنہ ظاہر ہے کہ اسلام کے پاس اس وقت کہاں کا لشکر تھا اس وقت یہ چند حضرات مسلمان تھے۔ عورتوں میں حضرت سیدتنا خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ سب سے پہلے ایمان لائیں لڑکوں میں سب سے پہلے حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ۔ غلاموں میں حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ تعالیٰ عنہ۔ بوڑھوں میں حضرت امام الامۃ مقدام الملۃ افضل اولیا، الامم اعظم الاتقیاء الملل سیدنا ومولانا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ ایمان لائے یہ اسلامی کمیٹی تھی اور ایمانی لشکر تھا جس نے ساری دنیا کو زیر و زبر کر دیا سلطنت کا انتظام بہت بڑی قوت پر مبنی ہوتا ہے یہاں کونسی قوت تھی۔ صرف اخلاص کی برکت تھی کون خیال کر سکتا تھا کہ یہ سلطنت عالمگیر ہو جاوے گی۔

اور بعضے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے چلا ہے سو اول تو یہ مسلم نہیں ہے اور علی تقدیر التسلیم صرف تلوار سے تو کام بھی نہیں چلتا تلوار کے لئے کوئی اس کا چلانے والا بھی تو ہونا ضروری ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ یہی فرمایا کرتے تھے کہ میاں تلوار کے لئے

کوئی تلوار چلانے والا بھی تو ہونا ضرور ہے اور وہ چلانے والے کہاں سے آئے وہ مجمع کس نے پیدا کر دیا یہ سب خلوص کی برکت سے حق تعالیٰ نے پیدا فرما دیا اور یہ بات کہ تلوار سے اسلام کی اشاعت ہوئی ہے وہ شخص کہہ سکتا ہے جو تاریخ سے بالکل ناواقف ہو دیکھو ابتداءً کبھی تلوار نہیں چلائی گئی بلکہ پہلے یہ کہا گیا کہ اسلام لاؤ یا اہلِ اسلام کی اطاعت قبول کرو اور جو دونوں امر منظور نہ ہوں تو پھر تلوار ہے۔ پھر قبول اطاعت کا قانون ایسا وسیع ہے کہ ظاہراً اسلام کے لئے نہایت خطرناک تھا۔ کیونکہ کبھی اطاعت تلبیس سے بھی ہوتی ہے ظاہر میں اقرار کر لیا کہ ہم اطاعت قبول کرتے ہیں پھر دھوکا دیدیا جب موقع پایا۔ لیکن اس خطرہ کی پرواہ نہیں کی گئی، کیونکہ کام کرنے والا حقیقت میں خدائے تعالیٰ ہے کما قال یریدون ان یطفؤا نور اللہ بافواھھم ویابی اللہ الا ان یتم نورہ ولو کرہ الکافرون ؎

چراغے را ایزد فروزد ہر آنکس تف زند ریشش بسوزد

(جس چراغ کو حق تعالیٰ روشن کرنا چاہتے ہیں اوس کو جو بھی بجھانا چاہتا ہے اسکی ہی داڑھی کو جلا دیتے ہیں)

اور ایسے خطرات بیشک کبھی آتے مگر پھر بھی جو قانون مقرر کر دیا گیا وہ برابر جاری رہا قیامت تک وہی رہے گا اہل سلطنت کے قوانین میں تھوڑی تھوڑی مصلحت کے لئے تغیر کیا جاتا ہے اور یہاں ایسے ایسے خطرناک قوانین کو بھی استقامت دی گئی سبحانہ ما اعظم شانہ ولہ الکبریاء فی السموات والارض۔ صاحبو تلوار اخیر درجہ میں اٹھائی گئی ہے۔ جب دونوں شقیں منظور نہ کیں نہ اسلام لائے نہ اطاعت قبول کی۔ اور یہ تلوار اٹھانا بھی اس اضطرار کی وجہ سے تھا کہ بغیر اس کے مخالفین کے شر سے محفوظ رہنا ممکن نہ تھا۔ اور بدون اطاعت کے محض صلح کی حالت کا اقرار امن و امان کا کہ وہ اہل اسلام کو ضرر نہ پہونچاویں گے موجب اطمینان نہ تھا۔ لہذا ضرور تھا کہ انسداد شر باضابطہ ہو تاکہ اس سے محفوظ رہ کر حق تعالیٰ کی اطاعت اطمینان کے ساتھ ہو سکے اور اس ضابطہ کی صرف یہی صورتیں ہیں کہ یا تو مخالفین اسلام لاویں یا باضابطہ اطاعت اسلام قبول کریں اور جو یہ دونوں صورتیں نہ ہوں تو مجبوری کو مقاتلہ سے کام لیا جاوے خود قرآن مجید بتلا رہا ہے کہ صرف فتنہ فرو کرنے کے لئے تلوار کی اجازت دی گئی ہے

چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں حتیٰ لاتکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ **اور پھر عین اس مقاتلہ** میں بھی ایسا قانون مقرر کیا جس میں مخالفین کو خداع کا بہت بڑا موقع تھا مگر مسلمانوں کو اس شبہ کی گنجائش نہیں دی گئی کہ شاید مخالفین نے دھوکا دیا ہو اگر کسی اور ملت و دین میں یہ قانون ہوتا تو وہ ملت ہرگز ترقی نہ کر سکتی اور جس کا جی چاہے اب بھی کوئی ملت یہ قانون مقرر کر کے دیکھ لے ہرگز ہرگز ترقی نہ کر سکے گی یہ صدق اسلامی ہی کی برکت ہے کہ باوجود ایسے وسیع قانون کے پھر بھی اسلام نے ترقی کی۔ وہ قانون یہ ہے کہ اگر کسی کافر پر تلوار اٹھائی ہو اور کافر بھی وہ جس کے ہاتھ سے اس تلوار اٹھانے والے کے تمام خاندان والے مسلمان قتل ہو چکے تھے اور اس نے عین اس حالت میں کلمہ پڑھ لیا تو حکم ہے کہ فوراً ہاتھ روک لو اور اگر اس نے اس طور پر اپنی جان کی حفاظت کر لی اور اگلے دن اس نے دھوکا دیا اور پھر ایسا ہی کیا پھر بھی اسلامی قانون یہی رہا کہ جب کوئی کلمہ پڑھ لے اس سے درگزر کرو اور مسلمانوں جیسا برتاؤ اس کے ساتھ کرو گو وہ پھر دھوکا ہی کیوں نہ دیدے۔ تم کو شبہ کرنے کا حق نہیں ہے کہ خلوص سے ایمان لایا عدم خلوص سے یہ تو ایسی وسعت ہے کہ لوگ جب چاہیں مسلمانوں کا قلع قمع کر دیں لیکن اسلام کے صدق کی قوت ہے کہ باوجود ایسا موقع ملنے کے بھی مخالف لوگ اسلام کی قوت کو نہ توڑ سکے اور صحابہ میں بھی خلوص تھا اور صدق تھا جس کی وجہ سے اسلام کو ترقی ہوئی۔ غرض یہ ہے کہ خلوص سے کام کرنا چاہیے فلوس کی زیادہ فکر نہ کرو مشہور مثل ہے سر سلامت چاہیے ٹوپیاں بہت خلوص و فلوس کی ایک لطیف مثال ذہن میں آئی جو حضرت حاجی صاحب قدس سرہ نے ارشاد فرمائی تھی کہ ایک جانور اڑا جا رہا ہے اور اس کے سایہ کا شکاری شکار کرنا چاہتا ہے تو خود سایہ کو کوئی پکڑنا چاہے ہاتھ نہ آوے گا۔ اس کے شکار کرنے کی صرف یہی تدبیر ہے کہ خود اس جانور کے تیر لگاؤ اور سایہ اس کی ہمراہ خود آ جاوے گا اور اس طرح آوے گا کہ تم علیحدہ کرنا چاہو گے اور وہ جدا نہ ہو گا حدیث میں ہے اتتہ الدنیا وھی راغمۃ یعنی ایسے لوگوں کے پاس دنیا ذلیل ہو کر آتی ہے اور اس کی مثال ایسی سمجھو کہ جیسے فواحش عورتیں مستغنی کے پیچھے پڑتی ہیں اور چاہنے والے سے ناز و نخرہ کرتی ہیں۔ حضرت حاجی صاحب یہ بھی فرماتے تھے کہ جو طالب دنیا ہونا چاہے وہ تارک دنیا ہو جاوے اھ مگر یہ یاد رہے کہ جو اخلاص سے حق تعالیٰ کی رضا کے لئے ترک دنیا کرتا ہے اس کے پیچھے

دنیا پڑتی ہے اور جو محض نقل ہی کرے اور تحصیل دنیا کی ایک تدبیر ترک دنیا کو سمجھے اور اس کو عمل میں لاوے تو چونکہ وہ سچا تارک نہیں اس لئے ثمرہ بھی اس کی اس تدبیر پر مترتب نہوگا اور اگر تارک حقیقی ہو تو اس کے لئے حق تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اتقیا کو راحت وبین مرحمت فرماتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے من یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب۔ مشاہدہ کرلیجئے ہر زمانہ میں ایسے لوگ رہتے ہیں۔ کانہ جلسے میں جب میں نے اسی تقریر کے جو یہاں ہے بیان کیا تھا تو اس میں یہ بھی کہا تھا کہ صاحبو کام شروع کرو روپیہ خود آرہیگا۔ کام کے اندر مقناطیس جیسی خاصیت ہے جیسے وہ لوہے کو کھینچتا ہے اسی طرح کار خیر زر کو کھینچتا ہے ہاں اخلاص اور استعانت من اللہ کی حاجت ہے مقناطیس کامل ہو اور اس کے پاس لوہا خود آجاویگا اس کو لوہے کے پاس جانے کی کیا حاجت ہے اہل اللہ سلطنت پر لات ماردیتے ہیں مگر پھر بھی دنیا ان کی گرتی ہے اور استغنا حقیقی تو بڑی چیز ہے اس کی نقل میں بھی کشش ہوتی ہے۔

ایک شخص میری یہ تقریر سن کر میرے ایک عزیز سے میرے متعلق بطور اعتراض کہنے لگے کہ ان کا تو استغنا بھی ایک تدبیر ہے تحصیل دنیا کی اور یہ ان کی واقع میں غلطی تھی جو مجھے مستغنی سمجھتے تھے میں تو دنیا داروں سے بھی بدتر ہوں خیر میں نے جب یہ حکایت سنی تو ضابطہ کا جواب دیدیا کہ بھائی میں نے کب دعویٰ کیا تھا کہ میں مستغنی ہوں اور میرے اندر جو یہ عیب ہے تو دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس سے مجھے پاک فرما دیں میں نے تو صرف یہی ضابطہ کا جواب دیا لیکن ان عزیز نے یہ جواب دیا کہ صاحبو اگر یہ طرز بطور تدبیر کے ہوتا تو ظاہر ہے۔ ایسی تدبیر کو تو لوگ چھپایا کرتے ہیں تاکہ دوسرے اس سے مال نہ حاصل کرلیں اور یہ شخص تو برسر منبر اس کو بیان کرتا ہے کہ اہل علم کو استغنا اختیار کرنا چاہیئے دنیا خود ان کے پیچھے دوڑے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ بہ نیت تدبیر یہ طرز اختیار نہیں کیا مگر سچا جواب تو وہی ہے جو میں نے دیا۔ غرض کار خیر کے اندر خاص کشش ہے گو کار خیر کی نقل ہی ہو پھر اگر اصل ہوجاوے تو کیا ٹھیک ہے۔

قال العارف الرومی ؎

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند　　صاف گر باشد ندانم چوں کند

(جرعہ خاک آمیز جب مجنوں کرتا ہے تو اگر صاف ہو تو نہ جانے کیا اثر دکھائیگا)

یعنی ایسی شراب جس میں مٹی ملی ہو اس درجہ کا نشہ لاتی ہے کہ آدمی مجنون ہوجاتا ہے اگر وہ صاف ہو تو خدا جانے کیا غضب برپا کرے۔ غرض خلوص کو اختیار کرنا چاہیئے عمل بڑھیگا جیسے کہ رائی کا ایک دانہ بویا جاتا ہے

پھر اس سے کس قدر ترقی ہوتی ہے مثل ضرب حسابی کے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جیسے اگر برگد کے درخت کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جاوے اور اس کی داڑھی نہ کاٹی جاوے تو اس قدر پھیلے کہ ساری کمشنری میں بھی نہ سماوے۔ دیکھو اس ننھے سے رائی کے دانہ کی بدولت کس قدر ترقی ہوئی اسی طرح اگر لوگ خلوص سے جو نیک کام بھی شروع کریں وہ ترقی پذیر ہوگا اور برابر ترقی جاری رہے گی۔ ہاں اگر درمیان میں خلوص کا سلسلہ ٹوٹ جاوے اور اس کی وجہ سے سلسلہ ترقی کا مسدود ہو جاوے یہ دوسری بات ہے اور اپنی کوتاہی ہے آج حق تعالیٰ نے بنا مدرسہ کی آپ کو توفیق عطا فرمائی خلوص کے ساتھ شکریہ کیجئے قولاً بھی اور عملاً بھی کہ اس کی خدمت میں سعی کیجئے اس شکر سے نعمت بڑھے گی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں لئن شکرتم لازیدنکم یعنی اگر تم شکر کرو گے تو ہم زیادہ عطا فرما دیں گے۔ اس قصبے میں مدرسہ کی ضرورت بھی تھی گو آس پاس مدارس دینیہ موجود ہیں لیکن علم دین کے انتظام کی تو ہر جگہ ہی حاجت ہے اور اگر قرب و جوار کے مدارس اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کافی ہیں تو جلال آباد میں کنووں کی بھی حاجت نہ ہونا چاہیے قرب و جوار میں کنویں بہت ہیں تھانہ بھون کے کنووں سے پانی منگا لیا کرو۔ مگر یہ کسی کو گوارا نہیں اور نہ اس طرح کام چل سکتا ہے بلکہ لوگ تو کنووں کو اس کثرت سے بنانا چاہتے ہیں کہ ہر ہر گھر میں کنواں ہو جاوے تو اچھا ہے۔ صاحبو جیسے جسم کی زندگی پانی سے ہے اسی طرح دل کی حیات علم دین سے ہے اگر تنافس نہ ہوتا تو میں تو یہ رائے دیتا کہ ہر ہر محلہ میں مدرسہ ہونا چاہیے مگر آجکل تعداد مدارس کا نتیجہ تجربہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ باہم منافست اور مخالفت پیدا ہو جاتی ہے مدرسہ کے نام میں ہی آجکل یہ اثر ہو گیا ہے کہ متعدد مدارس ہوئے مخالفت رونما ہوئی ہاں جو مکتب یہاں پہلے سے ہیں ان میں یہ احتمال نہیں اور وجہ اس مخالفت کی صرف چندہ ہے مکاتیب میں چونکہ چندہ نہیں ہے اس لئے مخالفت بھی نہیں ہوتی اور مدارس میں چونکہ ہر مدرسہ کے مہتمین اور کارپرداز یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے مدرسہ کی طرف لوگوں کا زیادہ رجحان ہو اور اسی مدرسہ میں چندہ زیادہ آوے یہ تو خیال ہوتا نہیں کہ ہر مدرسہ خدائے تعالیٰ کا ہے جہاں جس کا جی چاہے دیوے ہم کو تزاحم کا کیا حق ہے۔ سو اس وجہ سے مخالفت ہوتی ہے میں جب تھانہ بھون آ کر بطریق استقلال رہا تو میری فرمائش تو تھی نہیں میرا تو صرف یہ قصد تھا کہ مجھ سے خود جس قدر علم دین کی خدمت ہو سکے گی کروں گا۔ مگر لوگوں نے چندہ سے مدرسہ کی شکل بنائی چندہ ہوتے ہی تزاحم اور حکومت شروع ہوئی کوئی مدرس پر اعتراض کرتا ہے۔ کوئی طلبہ پر حکومت کرتا ہے۔ میں نے جو اس کے اسباب پر غور کیا تو ان تمام امور کی جڑ چندہ سمجھ میں آئی میں نے

چندہ حذف کرنا چاہیئے کہ ایک مجذوب برہنہ پھرتے تھے مریدوں نے کپڑے بنا دیئے۔ کپڑوں کو چوہوں نے کتر لیا۔ اس کلفت کے ازالہ کے لئے بلی پالی تو کھانے خراب کرنے لگی تو کتا پالا وہ کھانوں کو ناپاک کرنے لگا تو آدمی مقرر کیا۔ وہ آدمی مرغن کھانے کھا کر مستانے لگا اُدھر پھرنے لگا اس لئے اس کی شادی کر دی بیوی آئی بال بچے ہوئے شاہ صاحب آزاد منش تھے ان سب جھگڑوں کو دیکھ کر گھبرائے اور فرمانے لگے کہ ان سب کی جڑ لنگوٹا ہے اس کو اتار کر پھینکا۔ بالغرض میں نے چندہ موقوف کرا دیا لیکن یہ نہیں کیا کہ کوئی مدرسہ کی اعانت خلوص سے کرے اس کو بھی اعانت کی اجازت نہ ہو بلکہ یہ اطلاع کرا دی کہ اب یہ توکل کا مدرسہ ہے نہ روئداد ہوگی نہ حساب کتاب ہوگا نہ رسید ہوگی نہ باضابطہ قواعد مقرر ہوں گے جس کا جی چاہے اس میں اعانت کرے اور جس کا جی نہ چاہے نہ کرے اور جو کرے وہ اس شرط سے کہ اس کو اس قدر تحمل ہو کہ اگر میں ساری رقم اس کی خود بھی کھا جاؤں تو گوارا کر لے سو الحمدللہ کہ پہلے سے زیادہ آمدنی اور اطمینان ہے بعضے لوگوں نے کہا کہ اس طرح تم نے تو چلا لیا۔ مگر اور کسی سے نہ چل سکے گا۔ میں کہتا ہوں کہ ہر وہ شخص چلائے گا جو خلوص سے اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر کام کرے گا اور اگر نہ بھی چلے تو چھوڑ دے میں نے بھی یہی قصد کر لیا تھا کہ جتنا کام اپنی ذات سے ہو سکیگا وہ کر لوں گا اور اس سے زیادہ اگر حق تعالیٰ چاہیں گے کسی ذریعہ سے کرا دیں گے ورنہ اس کے عدم ہی میں مصلحت سمجھوں گا۔ حدیث قدسی میں ہے انا عند ظن عبدی بی (اخرجہ الشیخان والحاکم بسند صحیح) یعنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں میں بندہ کے گمان کے پاس ہوں مطلب یہ ہے کہ اگر مجھ سے اچھا گمان رکھیگا تو میں بھی اچھا برتاؤ کروں گا اور جو بدگمانی کرے گا تو اس کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کیا جاوے گا سو جن لوگوں کا گمان یہ ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کام چلائیں گے ان کے ساتھ ان کے گمان کے موافق برتاؤ کیا جاتا ہے اور جن کا یہ گمان ہوتا ہے کہ بغیر ظاہری سبب کے کام نہیں چل سکتا تو حق تعالیٰ ان کو اس گمان کا ثمرہ مرحمت فرماتے ہیں یعنی وہ کام بغیر ظاہری سبب کے نہیں چل سکتا چور کا گمان ہے کہ بغیر چوری کے رزق نہیں ملتا تو اس کو بغیر اس فعل شنیع کے روزی نہیں ملتی اس کی پھٹی ہوئی جھولی ہے اس میں برکت نہیں ہوتی آتا تو ہے مگر نکل جاتا ہے دیکھئے اسٹیشن کی مسجد کی تعمیر میں کونسی لوٹ کھسوٹ ہوئی تھی کام دیکھ کر خود لوگوں کو رغبت ہوئی۔ بھوپال معمولی طور پر ایک غریب آدمی کی طرف سے اطلاع دی گئی کہ نہ خط کی رجسٹری کرائی گئی نہ کوئی خاص اہتمام سفارش کا

ہوا خصوصاً ایسے وقت میں کہ ولیعہد بہادر تھے اور امور دربار سے بیگم صاحبہ کاروبار کی طرف پورے طور پر متوجہ بھی نہ ہوتی تھیں مگر پھر خدا تعالیٰ نے ان کو متوجہ کر دیا اور خط کے جواب میں انھوں نے تخمینہ دریافت کیا۔ تخمینہ بھی پورا پورا لکھ دیا گیا بڑھا کر نہیں لکھا اسی وجہ سے چندہ میں کمی پڑی لوگوں نے کہا کہ تعمیر کے کام میں اندازہ سے زیادہ صرف ہوتا ہے۔ اس لئے تخمینہ زیادہ لکھنا چاہئے میں نے کہا کہ کیا واہیات بات ہے ہرگز ایسا نہ کرنا چاہئے غرض وہاں سے اعانت ہوئی پھر کمی پڑی پھر اطلاع دی گئی اس طریق سے کہ آپ سے یہ درخواست نہیں ہے کہ آپ اس کام کی تکمیل کرا دیں بلکہ غرض سے اطلاع دی جاتی ہے کہ کام ناتمام ہے شاید آپ مطلع ہو کر شکایت فرماویں کہ ہم کو کیوں نہیں خبر دی ہم اس کو پورا کرا دیتے۔ انھوں نے اس درخواست پر بھی بقدر تکمیل مدد فرمائی اور کچھ متفرق لوگوں نے اعانت کی۔ غرض سب کام اسی طرح ہو گیا۔ غرض چندہ پر زور دینا سبب ہوتا ہے تحاسد و تنافس مدارس کا اور مدارس میں اکثر ایسا ہوتا ہے اس لئے میں ایک بستی میں تعدد کی رائے نہیں دیتا۔ ہاں تعدد مدارس وہاں مضر نہیں ہوتا جہاں حکومت کا اثر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہاں داعی ہی نہیں یعنی چندہ اور مانع موجود ہے یعنی حکومت۔ ایک طالب علم بخاری کہتے تھے کہ بخارا میں ۳۶۰ مدرسے ہیں ہر مدرسہ میں پائیں باغ اور بڑے بڑے مکانات اور طلبہ کو باغوں کے میوے وغیرہ تصرف میں لانے کی بے تکلف اجازت۔ اور ان کا جیب خرچ مقرر ہے تو چونکہ وہاں حکومت اسلامیہ کے ماتحت مدارس ہیں اس لئے تنافس اور تخالف کا اثر نہیں اور میں نے چندہ پر زور ڈالنے سے منع کیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اس مدرسہ کی اعانت کو منع کرتا ہوں۔ میں مناع للخیر نہیں ہوں لیکن متعارف درخواست نہیں کرتا ہوں ہاں عام ترغیب دلاتا ہوں لایسئلون الناس الحافا کے موافق درخواست ہے خوش قسمتی ہے۔ آپ حضرات کو کہ ایسا موقع میسر ہو گیا ہے اگر اور بھی کچھ نہ ہو سکے تو دعا ہی کر دیا کرو ؎

لا خیل عندک تہدیہا ولا مال فلیسعد النطق ان لم یسعد الحال

(نہیں ہے گھوڑا تمہارے پاس کہ تم ہدیہ کرو اور نہ مال ہے کہ اسے دو تو صرف زبان ہی سے موافقت کرو اگر تمہارا حال موافقت نہیں کرتا)

دعا بہت بڑی چیز ہے گو لوگ اس کو معمولی اور حقیر سمجھتے ہیں لیکن صرف اسی پر قناعت بھی نہ کیجئے بلکہ ہر طرح سے جو کچھ مدد ہو سکے فرمائیے اور اس مثل کے مصداق نہ ہو جئے (محبت رکھوں پاک، لینے دینے کے منہ میں خاک)

گو بخیل کی (تبسم کے لہجہ میں ۱۲ جامع) دعائیں اس حیثیت سے زیادہ اثر کی امید ہے کہ وہاں خلوص زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ وہاں تو صرف دعا ہی دعا ہے اور کچھ ہے ہی نہیں مگر ایک دوسری حیثیت سے اور وہ حیثیت نحوستِ بخل ہے۔ قبولیت دعا میں کمی ہو جاوے مگر خلوص تو بہت ہی ہوتا ہے اور عجب نہیں کہ خلوص برکت بخل کی نحوست پر غالب آجائے اور ضرورت اس کام کی آپ کو معلوم ہی ہو چکی جب تک حضرت قاری محمد علی خاں صاحب قدس سرہٗ یہاں تشریف فرما تھے تو اس قدر یہاں مدرسہ کی حاجت نہ تھی گو کسی درجہ میں جب بھی تھی اب کون ہے جس سے ضرورت کے وقت مسئلہ دریافت کیا جاوے۔ صرف کتابوں سے کام نہیں چل سکتا کیونکہ کتابوں کا پورے طور پر سمجھنا عالم کے سوا دوسرے کا کام نہیں ہے کبھی کسی کی ہمت پڑی ہے کہ کتابوں سے مسہل دیکھ کر استعمال کیا ہو ہمیشہ طبیب ہی کی حاجت ہوتی ہے۔ پھر جب طب جسمانی کے لئے صرف کتابیں کافی نہیں سمجھی جاتیں تو تعجب ہے کہ طب روحانی کیلئے کیونکر کتابوں پر قناعت ہو جاتی ہے حالانکہ قلب کی اصلاح جسم کی اصلاح سے اہم اور اس سے زیادہ نازک ہے لہذا یہاں مدرسہ میں ایک عالم کی حاجت ہے اور وہ عالم ایسے ہوں جن کی درسیات پوری ہو چکی ہوں اور ان کے متعلق تین کام ہونا چاہئے ایک تو بچوں کا گھیرنا اور محبوس رکھنا تاکہ وہ آوارگی سے بچیں اور گو گھیر گھار سرکاری مدارس میں بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن وہاں صرف علم معاش کی تعلیم ہوتی ہے علم معاد سے کوئی تعلق نہیں اس سے نفس کی اصلاح نہیں ہوتی اور میں علم معاش کا مخالف نہیں ہوں مگر مسلمان اسکو کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ علم معاش کے اہتمام میں اپنی عمر تمام کر دے اور معاد سے بے بہرہ رہے کم سے کم علم معاد میں قرآن مجید اور اردو کے رسائل جن سے ضروری مسائل پر عبور ہو جاوے اتنا ہی پڑھوا دو دوسرا کام ان عالم کا یہ ہو کہ بوقت ضرورت مسائل بتلا دیں اور اس عالم کا متدین ہونا بھی ضرور ہے تاکہ جن مسائل کو کتاب کی مدد سے بھی نہ بتلا سکے ان کے پوچھنے کے لئے اپنے سے بڑے عالم کا پتہ بتلا دے اور نیم تر عالم اگر متدین ہوگا تب تو کام نہ کر سکیگا اور جو متدین نہ ہوگا تو جو چاہے گا بتلائیگا صحیح و غلط کی پرواہ نہ کرے گا تیسرا کام گاہے گاہے وعظ کہنا ہے۔ کیونکہ تدریس سے تعلیم خاص حاصل ہوتی ہے اور وعظ تعلیم عام ہے اگر اسی طرح تھوڑے عرصہ تک کام چلتا رہا تو بہت سے فاسق متقی ہو جاویں گے بہت سے جاہل عالم ہو جاوینگے بہت سے ناواقف واقف ہو جاویں گے۔ بہت سے طلبا بڑے مدارس عربیہ میں داخل ہونے کے لائق ہو جاوینگے اور تجربہ سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جب تک مدرسہ کا مکان خاص نہ ہو اس وقت تک اطمینان سے تعلیم نہیں ہو سکتی۔

مسجد میں اول تو تنخواہ دار کا پڑھانا فقہاء نے مکروہ لکھا ہے دوسرے مسجد کا ادب ملحوظ رکھنا تدریس کی صورت میں دشوار ہے اور اگر مدرسہ کسی کی بیٹھک میں قائم کیا جاوے تو اس کا استقرار دشوار ہے ممکن ہے کسی وقت میں صاحب بیٹھک اہل مدرسہ کو وہاں سے اٹھا دے نیز مسجد کی آبادی نمازیوں سے کافی ہو جاتی ہے طلبہ پر موقوف نہیں اس لئے مسجد میں مدرسہ ہونے سے لوگوں کا خاص طور پر مدرسہ کی آبادی کا اہتمام نہیں ہو سکتا۔ اور جب مدرسہ مستقل ہوگا تو اس وقت اس کی آبادی کا خیال ہوگا درجہ اس مدرسہ کا یہ ہوگا کہ عربی کی ابتدائی کتابوں تک تعلیم رہے گی جب طلبہ یہاں کی تعلیم سے فارغ ہو چکیں کسی بڑے مدرسہ میں داخل ہو جاویں یہاں تو مختصر ہی مدرسہ مناسب ہے خصوصاً ابتدائی حالت میں۔ ایک اللہ کے بندے نے کچھ چندہ بھی جمع کر لیا ہے اور ایک عالم بھی ذہن میں قرار دے لئے ہیں۔ ایک عالم کا بستی میں رہنا ضرور ہے اب وقت اس کا ہے کہ آپ لوگ عمارت کی بنیاد رکھیں اور یہ دعا کریں ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم یہ دعا ہے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جو بوقت بنا رکعبہ کے آپنے جناب باری میں عرض کی تھی اور واقع میں حق تعالیٰ کی اعانت کی نہایت ضرورت ہے کیونکہ خلوص بھی جب ہی مؤثر ہے جبکہ حق تعالیٰ قبول فرمالیں اس لئے کہ سوائے اللہ جل جلالہ کے تمام اشیا حادث ہیں اور خلوص بھی انہی میں سے ہے اور کوئی حادث فاعل بالذات نہیں ہوتا پس خلوص بغیر اعانت خداوندی کے مؤثر نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک ہو سکے جلدی سے جلد اس کام کو شروع کر دیجئے اور چونکہ یہ افتتاح عمارت مدرسہ کا وقت ہے اور مجھے معلوم نہیں کہ کبھی یہاں مدرسہ اس سے پہلے ہوا ہو اس مناسبت سے بھی اور نیز اس مناسبت سے کہ افتتاحی کتابیں یہاں پڑھائی جاویں گی اور نیز اس مناسبت سے بھی فتح باب خیر ہے اور اس مناسبت سے بھی کہ حدیث میں جو یہاں بیان کی گئی ہے لفظ مفتاح واقع ہوا ہے۔ اس مدرسہ کا نام مفتاح العلوم رکھتا ہوں اور اس وعظ کا نام مفتاح الخیر چونکہ یہ اسماء مقتبس من الحدیث ہیں اس لئے مدرسہ میں نیز اس وعظ میں برکت کی زیادہ امید ہے۔ اب دعا فرمایئے۔ (دعا پر جلسہ ختم ہوا اور سنگ بنیاد مدرسہ کا رکھا گیا)

تمت

قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

(رواہ البخاری)

السوق لاہل الشوق

:- منجملہ ارشادات :-

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

(رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ)

ناشر:- محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی —— دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ (ایم۔ اے جناح روڈ) کراچی

السوق لاہل الشوق

این	متیٰ	کم	کیف	ماذا	من ضبط	المستمعون	الاشتات
مدرسہ قاسم العلوم مسجد شاہی بازار چوک مراد آباد	۲۲ شعبان ۱۳۳۶ھ یوم الاحد ۲ جون ۱۹۱۸ء	از ۷ بجے ۴۳ منٹ صبح تا ۱۰ بجے ۵۵ منٹ کل وقت ۳ گھنٹے ۱۲ منٹ	کرسی پر لب حوض بیٹھ کر	ترغیب علم و احوال دوزخ و جنت	احقر محمد مصطفیٰ بجنوری مقیم میرٹھ محلہ کرم علی	۱۵۰۰ یا ۲۰۰۰	

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دعا، خطبہ۔ امابعد: اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط وما قدروا اللہ حق قدرہ والارض جمیعا قبضتہ یوم القیٰمۃ والسمٰوات مطویٰت بیمینہ سبحانہ وتعالیٰ عما یشرکون ونفخ فی الصور فصعق من فی السمٰوات ومن فی الارض الا من شاء اللہ ثم نفخ فیہ اخریٰ فاذا ھم قیام ینظرون واشرقت الارض بنور ربھا ووضع الکتاب وجائی بالنبیین والشھداء وقضی بینھم بالحق وھم لا یظلمون۔ ووفیت کل نفس ما عملت وھو اعلم بما یفعلون وسیق الذین کفروا الیٰ جھنم زمرا حتیٰ اذا جاءوھا فتحت ابوابھا وقال لھم خزنتھا الم یاتکم رسل منکم یتلون علیکم اٰیات ربکم وینذرونکم لقاء یومکم ھذا قالوا بلیٰ ولکن حقت کلمۃ العذاب علی الکافرین قیل ادخلوا ابواب جھنم خٰلدین فیھا فبئس مثوی المتکبرین وسیق الذین اتقوا ربھم الی الجنۃ زمرا حتیٰ اذا جاءوھا و

فتحت ابوابها وقال لهم خزنتها سلام علیکم طبتم فادخلوها خلدین وقال الحمد لله الذی صدقنا وعده واورثنا الارض نتبوا من الجنة حیث نشاء فنعم اجر العملین وتری الملئكة حافین من حول العرش یسبحون بحمد ربهم وقضی بینهم بالحق وقیل الحمد لله رب العلمین ط یہ چند آئتیں ہیں جن میں حق جل شانہ وعم نوالہ نے اکثر حصہ میں معاد کا ایک مضمون بیان فرمایا ہے اور اس سے مقصود اس مقام پر توحید کی ترغیب اور تاکید ہے اور ترکِ توحید پر ترہیب ہے تو یہ دو مضمون ہوئے اور ان دونوں میں سے بھی زیادہ مقصود اثبات توحید ہے گو عبارت میں معاد کے بیان کو زیادہ طول ہے اور اس میرے دعوے پر کہ مقصود اثبات توحید ہے آیت میں صریح قرینہ وما قدروا الله حق قدره ہے جس کا میں ترجمہ کروں گا تو بہت وضاحت کے ساتھ یہ بات سمجھ میں آجاوے گی۔ غرض اس آیت میں کھلے کھلے الفاظ ایسے موجود ہیں جن سے میرا مدعا ثابت ہوتا ہے۔ ترجمہ کے عنوان میں غور کرنے سے معلوم ہوجاوے گا کہ مقصود زیادہ تر اثبات توحید ہے اور اس مضمون کی تاکید کے لئے معاد کا بیان کیا گیا ہے اور اس آیت میں اوپر تو بہت ہی صریح الفاظ اس مضمون کے موجود ہیں۔ دیکھئے فرماتے ہیں قل افغیر الله تأمرونی اعبد ایها الجاهلون۔ یعنی اے جاہلو کیا تم مجھے خدا تعالےٰ کے سوا کسی اور کی عبادت کے لئے کہتے ہو۔ اس میں غیر اللہ کی عبادت پر انکار کیا گیا یعنی شرک کی نفی کی گئی اور یہ عین اثبات توحید ہے اور اس سے بھی صریح عنوان اس کے آگے یہ موجود ہے۔ ولقد اوحی الیك والی الذین من قبلك لئن اشرکت لیحبطن عملك ولتکونن من الخاسرین اس میں لفظ لئن اشرکت موجود ہے نفی شرک کے لئے اس سے زیادہ کونسا لفظ صریح ہوسکتا ہے۔ اور ہرچند کہ لئن اشرکت واحد حاضر کا صیغہ ہے جس میں بظاہر خطاب صرف حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر مقصود یہ نہیں ہے کہ یہ حکم یعنی شرک کی ممانعت اور توحید کی تاکید صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کی ذات مبارک کے ساتھ خاص ہے کیونکہ اس پر سینکڑوں نصوص اور دلائل موجود ہیں کہ توحید کا قائل ہونا ہر شخص کے لئے ضروری ہے اور شرک سب کے لئے ممنوع ہے۔ بلکہ اس آیت میں اصل مقصود ملازمت ثابت کرنا ہے درمیان شرک اور حبط عمل کے یعنی جہاں شرک کا وجود ہوگا اس کے ساتھ حبط کا عمل بھی ضرور ہوگا اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اس کا مخاطب اس لئے کیا گیا کہ وحی کے مخاطب اول حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں غرض خطاب خاص کے صورت میں ایک قاعدہ کلیہ بیان کیا گیا ہے وہ یہ کہ شرک کو حبط عمل لازم ہے یہ تو مشہور جواب ہے اس بات کا کہ اس موقع پر یا اسی جیسے دوسرے موقعوں پر قرآن شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیوں بنایا گیا ہے اور اس کا ایک نہایت لطیف جواب اور ہے وہ یہ کہ لئن اشرکت میں خطاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے ہی نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان غایت نزاہت رکھتی ہے شرکت جیسی گندی چیز کا وہاں کیا ذکر اور کیا احتمال شرک تو وہ اکبر الکبائر اور اقبح القبائح ہے جس کو کسی صاحب عقل نے بھی جائز نہیں رکھا شانِ نبوت تو بہت اعلیٰ ارفع ہے بلکہ اس کا خطاب دوسرے مخاطبین کو ہے اور اس پر کوئی لفظ اوحی الیک سے اشکال نہ کرے جو اسی جملہ میں موجود ہے کہ اوحی الیک میں تو یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے اس کا مخاطب تو ہر شخص نہیں ہو سکتا جب ایک جملہ میں آپ کو خطاب ہے تو جملہ ثانیہ لئن اشرکت الخ کے مخاطب بھی آپ ہی ہوں گے۔

کیونکہ یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ آیت میں کئی مضمون تو سب کے مخاطب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ ایک کے مخاطب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہوں اور باقی مضامین تبلیغ کے لئے ہوں اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کی طرف اور تمام انبیاء کی طرف وحی بھیجی گئی ہے اس مضمون کی کہ لئن اشرکت ایہا المخاطب لیحبطن عملک تاکہ یہ حکم خدا کے بندوں کو پہنچا دو کہ جو کوئی شرک کریگا اس کے اعمال حبط ہو جائیں گے۔ تو لئن اشرکت میں تو خطاب افراد امت کو ہوا

اور لقد اوحی الیک الخ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور دیگر انبیاء علیہم السلام کو خطاب ہوا بہرحال خطاب خواہ عام ہو یا خاص آحادِ امت کو ہو۔ مقصود آیت میں نفی اور ابطال شرک ہے اور پوری آیت سیاق و سباق میں نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک کو باطل کرنا اور توحید کو ثابت کرنا منظور ہے چنانچہ فرماتے ہیں ما قدروا اللہ حق قدرہ یعنی ان لوگوں نے خدا کی اتنی عظمت نہیں جانی جتنی کہ واقع میں ہے اس میں شکایت ہے شرک کی کیونکہ شرک کے معنی یہی ہیں کہ خدا میں کسی بات کی کمی ہے اس واسطے دوسرے کو ماننے کی ضرورت ہے کوئی دوسرے کو کسی کام میں جب ہی شریک کرتا ہے کہ وہ کام خود اس سے پورا نہ ہو سکے مثلاً تجارت میں کوئی دوسرے کو اسی وجہ سے شریک کرتا ہے کہ اس کے پاس روپیہ کم ہے یا یہ اس میں کما حقہ محنت نہیں کر سکتا غرض اس میں مالی یا جانی کمی ہے اُس کے پورا کرنے کیلئے دوسرے کو شریک کرتا ہے تو خدا کے ساتھ جب کسی کو شریک کیا جاوے گا تو اس کے معنی یہی ہوں گے کہ نعوذ باللہ خدا میں کسی بات کی کمی ہے اس کے پورا کرنے کے لئے دوسرے کی ضرورت ہے اس صورت میں خدا تعالیٰ کو کمال و آثار کمال میں تفرد نہ ہوگا تو مشرک نے خدا کو کامل نہیں مانا بلکہ ناقص مانا تو اس نے خدا کی پوری تعظیم نہیں کی کیونکہ پوری تعظیم بدون اس کے نہیں ہو سکتی کہ کمال یا اس کے آثار میں کمی نہ مانی جاوے میں نے یہ دو لفظ یعنی کمال و آثار کمال اس واسطے کہے کہ بعض دفعہ اعتقاد درجہ کمال میں شرک نہیں ہوتا مثلاً خالقیت، وغیرہ میں خدائے تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ مانا جاوے مگر آثار میں شریک مانا جاوے جیسے مشرکین عرب کرتے تھے کہ مقصودیت و خالقیت میں کسی کو حق تعالیٰ کی برابر نہیں مانتے تھے ہاں اس کے آثار میں غلطی کرتے تھے اس کی شہادت قرآن میں موجود ہے حق تعالیٰ نے ان کا قول نقل فرمایا ہے ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ یعنی مشرکین کہتے تھے کہ ہم ان بتوں کی پرستش صرف اس واسطے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا کے یہاں پہنچاویں اور مقرب بناویں اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ خدا کے برابر تو کسی کو نہیں جانتے تھے ہاں

خدا کے تصرفات میں بعضوں کو دخیل مانتے تھے بلفظ دیگر یہ کہ کمال میں تو شریک نہیں کرتے تھے لیکن آثار کمال میں شریک کرتے تھے اور حدیث میں روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مشرک سے پوچھا تیرے کتنے معبود ہیں کہا سات ہیں ان میں سے سب سے بڑا تو آسمان میں ہے۔ بڑے بڑے کاموں کے لئے اس کو پکارا جاتا ہے اور معمولی کاموں کیلئے دوسرے معبود ہیں دیکھئے یہ لوگ کمال مطلق تو حق تعالیٰ ہی کے لئے ثابت کرتے تھے کیونکہ اس سے بڑا کسی کو نہیں جانتے تھے ہاں کمال کے آثار میں دوسروں کو بھی شریک کرتے وہ یہ کہ خدا تعالیٰ کے یہاں پہنچانے اور قریب کرنے کیلئے ان کو معبود مانتے تھے مگر اس پر بھی حق تعالیٰ نے انکار فرمایا چنانچہ آیت مذکورہ میں ان کا وہی قول نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں والذین اتخذوا من دونه اولیاء ما نعبدهم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ ان اللہ یحکم بینهم فی ما هم فیه یختلفون ان اللہ لا یهدی من هو کاذب کفار۔ ایسے لوگوں کو کافر فرمایا ہے۔ غرض یہ دونوں مشرک ہیں اسی واسطے میں نے دو لفظ عظمت کے ساتھ کہے کہ کمال میں اور اس کے آثار ومقتضیات میں جب تک کمی کی بالکلیہ نفی نہ کی جاوے اس وقت تک پوری تعظیم نہیں ہوسکتی اگر ایک میں بھی کمی مانی جاوے گی تو پوری تعظیم نہ ہوگی خواہ کمال میں کمی ہو یا اس کے آثار ومقتضیات میں یہ دونوں منافی ہیں حق تعالیٰ کی عظمت کے اور ان سے کسی ایک کا بھی قائل ہونا شرک ہے پوری بڑائی یہی ہے کہ نہ کمال میں کسی کو شریک مانا جاوے اور نہ مقتضیات کمال میں غرض شکایت کرتے ہیں کہ ما قدروا اللہ حق قدرہ ان لوگوں نے خدائے تعالیٰ کی پوری عظمت نہیں کی حالانکہ پوری پوری عظمت کرنی چاہئے کیونکہ خدائے تعالیٰ کی ایسی شان ہے کہ زمین اس کی ایک مٹھی ہے اور آسمان ایک ہاتھ میں لپیٹ لئے جاویں گے اور صور پھونکا جاوے اور قیامت قائم ہوگی اور کفار جہنم میں جاویں گے اور مومنین کو جنت ملے گی غرض حق و باطل پر اس اہتمام کے ساتھ جزا و سزا ہونے والی ہے پھر یہ لوگ کس خیال میں ہیں اور کیوں خدائے تعالیٰ کی عظمت کما حقہ نہیں کرتے اور شرک کئے جاتے ہیں اول تو کمال ذاتی ہی

قرآن شریف میں اس عنوان کو اختیار کیا گیا ہے کہ توحید کے بیان کے ساتھ معاد کا بیان کیا گیا کہ اب ایسا ہونے والا ہے یوم الفصل آنے والا ہے اور وہاں یہ یہ ہوگا باوجود اس کے تعجب ہے کہ مشرکین پوری تعظیم نہیں کرتے اور شرک سے باز نہیں آتے جیسے بچہ سے کہیں کہ کل کو امتحان ہونے والا ہے اور ایسی ایسی قمچیاں منگائی گئی ہیں اور ایسے ایسے جلاد بلائے گئے ہیں جو بالکل بے رحم ہیں اگر اس پر بھی وہ یاد نہ کرے تو تعجب کیا جاوے گا کہ کس قدر دلیر اور بدطینت ہے کہ علم اول تو ویسے ہی قدر کی چیز ہے بے علم آدمی جانوروں سے بھی بدتر ہے قطع نظر اس سے اس بے حیا کو ایسی مار کا بھی خوف نہ ہوا ظاہر ہے کہ بچہ کے سامنے یہ ہولناک چیزیں سنانے سے غرض اس کو علم سکھانا ہے اسی طرح آیت میں مقصود توحید کا اثبات اور شرک کی نفی کرنا ہے اسی کے لئے معاد کا ذکر فرمایا ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں متن قرآن یعنی اس کے اصول مسائل تین چیز ہیں توحید اور رسالت اور معاد یہ تینوں اصول اور متن ہیں باقی سب ان کی شرح ہیں ان میں سے دو مسئلے اس آیت میں مذکور ہیں یعنی توحید اور معاد اور غور کیا جاوے تو تیسرا مسئلہ یعنی مسئلہ رسالت بھی اس آیت میں مذکور ہے کیونکہ ان ہی آیات میں صاف موجود ہے اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یعنی فرشتے کفار سے بطور سرزنش کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس پیغمبر نہیں آئے تھے اور وہ حسرت سے جواب دیں گے کہ بَلٰی وَلٰکِنْ حَقَّتْ کَلِمَۃُ الْعَذَابِ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ یعنی پیغمبر آئے تو بیشک تھے مگر قسمت ہماری کہ یہ عذاب چکھنا تھا ان کی بات کو نہ مانا معلوم ہوا کہ مسئلہ رسالت بھی ضروری اور ماننے کی چیز ہے تو تینوں اصول دین اس آیت میں مذکور ہیں اور مسئلہ رسالت کے ضروری ہونے کا راز یہ ہے کہ مسئلہ توحید موقوف ہے رسالت پر اور مسئلہ توحید ضروری ہی ہے تو مسئلہ رسالت بھی ضروری ہوا۔ اور مسئلہ توحید کے مسئلہ رسالت پر موقوف ہونے کا بیان یہ ہے کہ توحید خدا تعالیٰ کی معرفت پر موقوف ہے اور معرفت ایک تعلق ہوتا ہے درمیان دو شخصوں کے

اور تعلق کے لئے مناسبت شرط ہے اور بندوں میں اور خدا میں کچھ مناسبت نہیں اس واسطے ضرورت ہوئی واسطہ کی اس واسطہ ہی کو رسول کہتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ کی شان یہ ہے انت کما اثنیت علیٰ نفسک یہ سید العارفین جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقولہ ہے فرماتے ہیں کہ اے اللہ آپ خود ہی اپنی ذات وصفات کو خوب جانتے ہیں، ہم نہیں جان سکتے اور یہ بطور مبالغہ نہیں ہے بالکل سچی اور واقعی بات ہے ذات وصفات واجب تعالیٰ کا علم ممکن کو ہو ہی نہیں سکتا اپنا علم انھیں کو ہے اگر کوئی عقل سے کچھ دریافت کرنا چاہے گا تو قیاس الغائب علی الشاہد ہوگا کیونکہ ان کی کوئی نظیر نہیں تو بہت سے بہت یہ ہوگا کہ شاہان دنیا پر قیاس کریں گے کہ ان کی بھی قدرت اور علم اور دیگر صفات ایسی ہی ہوں گی اور یہ بات کہ ان کی قدرت عام اور علم محیط ہے کوئی چیز خارج نہیں یہ بلا وحی کے ثابت نہیں ہو سکتی۔ تو خدا کی معرفت عقل سے جو کچھ ہوتی بھی وہ بالکل ناقص ہوتی چنانچہ جن لوگوں نے وحی سے استفادہ نہیں کیا اور اپنی عقل کے زعم میں رہے انھوں نے الہیات میں ایسی غلطیاں کی ہیں جن پر آج اہل حق کے بچے بھی ہنستے ہیں۔ جب تک وحی نہیں تھی وہ لوگ بڑے عقلمند اور حکیم مانے جاتے تھے لیکن وحی کے آنے پر ان کی قلعی کھل گئی کہ کیسی فاش غلطیوں میں مبتلا تھے غرض خدائے تعالےٰ کی معرفت بلا اسی طرف کی خبر کے اور بلا توسط واسطہ کے جس کو رسول کہتے ہیں نہیں ہو سکتی اگرچہ خبر کے بعد بھی کنہ اس کی مدرک نہیں مگر خبر سے اتنا تو ہوا کہ وجہ تو اس کی مدرک ہوئی (یعنی علم بالوجہ تو ہو گیا) اجمالاً اتنا تو معلوم ہو گیا کہ خدائے تعالیٰ وہ ہے جس کی قدرت اور علم سے کوئی چیز خارج نہیں بلا وحی اور بلا رسول کے اتنا بھی معلوم نہیں ہو سکتا یہ راز ہے مسئلہ رسالت کی ضرورت کا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسئلہ توحید بلا مسئلہ رسالت کے پورا نہیں ہو سکتا۔

غرض تینوں اصول مسائل اس آیت میں مذکور ہیں توحید بھی اور رسالت

بھی اور معاد بھی، ہاں بیان مبسوط معاد کا ہے گو مقصود توحید ہے۔ اور اس سے
تعجب نہ کیا جاوے اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ اگر مقصود مسئلہ توحید ہوتا تو
اس کے بیان میں بسط ہوتا نہ کہ اس مسئلہ کے بیان میں جو مقصود نہیں اور
تبعاً اور ضرورتاً لایا گیا ہے گویا طریق کو مقصود سے بڑھا دیا گیا صا جو
کبھی تو طیہ و تمہید میں زیادہ کام ہوتا ہے بہ نسبت اصل مقصود کے جیسے
کھانا ایک مقصود ہے کہ یہ ذرا دیر کا کام ہے مگر اس کے تمہید اور مقدمات
کو دیکھئے کہ اللہ تو بہ کس قدر طول طویل اور دشوار ہیں اس کا شروع مثلاً کھیتی
سے ہوتا ہے۔ اس کے لئے برسات کے موسم کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ بہت انتظار
کے بعد موسم آیا تو بیلوں کی ضرورت ہے اور آدمیوں کی ضرورت ہے سب مل کر
کام کرتے ہیں حتیٰ کہ مالک کو بھی ان کے ساتھ لگنا پڑتا ہے۔ برسات کی دھوپ
ہے اور سر سے پیر تک پسینہ بہ رہا ہے ہزار کوششوں اور دردسریوں کے بعد
کھیت پیدا ہوا اور عرصہ تک نگاہداشت اور غور و پرداخت کے بعد اس میں
دانہ پیدا ہوا پھر وہ کاٹا گیا اور پیروں میں لاکر گاہا گیا دانہ الگ کیا گیا اور بھوسہ
الگ، پھر اس دانہ کو پیسا گیا، پھر پکایا گیا اور پکانے کے لئے ماما کی تلاش کرنی پڑی
غرض بہزار دقت یہ نوبت آئی کہ کھانا تیار ہوا اس میں کتنا عرصہ لگا اور کتنے بکھیڑے
ہوئے کہ خدا کی پناہ اور یہ سب ذریعہ اور تمہید کا مرتبہ تھا اور جو اصل مقصود ہے یعنی
کھانا وہ پانچ منٹ میں ختم۔ دیکھئے اس مثال میں مقصود سے ذریعہ اور تمہید کو اتنا
طول ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بہ نسبت مقصود کے ذریعہ میں طول ہے
بلکہ طریق کا بہ نسبت مقصود کے طویل ہونا تو موافق عادت کے ہے اور امر اکثری ہے
دیکھئے آپ کہیں سیر کرنے یا اور کسی کام کے لئے جاتے ہیں تو اصل مقصود طول
عرض میں کتنا ہوتا ہے اور اس کا طریق کتنا ہوتا ہے۔ مثلاً کلکتہ سیر کے لئے جاتے
ہیں تو سیرگاہ یعنی شہر کلکتہ تو دو چار میل ہی کا طول عرض رکھتا ہے مگر طریق اس کا
ایک ہزار میل کا ہے تو یہ کچھ تعجب کی بات نہ رہی کہ طریق مقصود سے بڑا ہے بلکہ امر

معتاد یہی ہے کہ طریق مقصود سے طول ہو ہاں جلالت قدر میں مقصود کا ذریعہ سے بڑا ہونا ضروری ہے اگر اس کا خیال نہ رکھا جاوے تو غلطی ہوگی مثلاً کلکتہ جانا سیر کے لئے اور عجائبات دیکھنے کے لئے تو مضائقہ نہیں کیونکہ یہ چیزیں کسی درجہ میں مہتم بالشان ہیں اور اگر مثلاً کوئی اس واسطے جاوے کہ ایک مٹھی گھاس کی ضرورت ہے اور اس کے لئے اتنا سفر کرے تو ہر شخص بے وقوف بناوے گا کہ اتنی ذرا سی بات کے واسطے اتنا بڑا راستہ کیوں طے کیا اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ مقصود جلالت قدر میں طریق کی برابر نہیں آیت میں مقصود مسئلہ توحید ہے اور یہ جس قدر جلیل القدر مسئلہ ہے سب جانتے ہیں اس کے لئے طریق کو جتنا بھی طول ہو تعجب کی بات نہیں بلکہ عین عادت اور عقل کے موافق ہے غرض اتنی تقریر سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ آیت میں بالقصد مسئلہ توحید کا اثبات اور شرک کی نفی کرنا ہے اور اس کی تاکید کے لئے مسئلہ معاد نہایت شد و مد کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور مسئلہ رسالت بھی آیت میں مذکور ہے غرض تینوں اصول دین آیت میں مذکور ہیں لیکن مجھ کو اس وقت صرف مسئلہ معاد کو بیان کرنا مقصود ہے اور نتیجہ یہ نکالوں گا کہ جب معاد میں ایسے واقعات ہونے والے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس کی درستی کی سخت ضرورت ہوئی تو اس کا جاننا بھی سخت ضروری ٹھہرا کہ معاد کی درستی کیسے ہوتی ہے اور چونکہ یہ احتمال تھا کہ پھر یاد رہے نہ رہے اس لئے اس کو میں ذرا تفصیل کے ساتھ یہیں بتائے دیتا ہوں کہ معاد کی درستی کے طریقے میں اخیر میں کیا بتاؤں گا سو اس طریق کا حاصل وہ یہ ہے کہ عقائد و اعمال کی اصلاح کی جاوے اور یہ موقوف ہے علم پر تو علم کی ضرورت ثابت ہو جاوے گی اور یہ مضمون اس علمی جلسہ کے مناسب ہو جاوے گا صاحبو یوں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ہی سے ضرورت علم کی معلوم ہے بہت سی حدیثیں علم کی فضیلت اور اس کے طلب وجوب کے متعلق موجود ہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہم کو مل گیا تو ضرورت معلوم ہوگئی کہ اس کام کو کرنا چاہیئے اب اور کسی ضرورت کے تلاش کی حاجت نہیں رہی لیکن اگر عقل سے بھی ثابت ہو جاوے اس طرح سے کہ تحرز عن المضرت

اور جلب منفعت ضروری چیز ہے اور منجملہ مضرتوں کے مضار آخرت بھی ہیں بلکہ مضرت کے افراد میں اکمل وہی ہیں تو آخرت کے مضار سے بچنا بھی ضرور ہوا اور وہ موقوف ہے مضار آخرت کے علم پر جس کا ذریعہ محض علم دین ہے تو اس سے یہ مضمون اور زیادہ اقرب الی الفہم اور موجب طمانیت قلب ہوگا اس واسطے میں بیان معاد کے بعد اصلاح عقائد و اعمال کی ضرورت بیان کروں گا اس کے لئے علم کی ضرورت ثابت کروں گا تاکہ اچھی طرح ذہن نشین ہوجاوے اس وقت اس اصلاح مذکور کے طریق کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں آجکل اس کو سب مانتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے تمام حالات میں اصلاح کی حاجت ہے اور اس کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ سب مسلمان مل کر کوشش کریں یہ کام ایک دو افراد کا نہیں ہے اور اصلاح کے لئے علم کی ضرورت ہے تو اس بات کی ضرورت ہوئی کہ علم کے لئے سب مسلمان مل کر کوشش کریں گھر گھر علم کا چرچا ہو جگہ جگہ مجمعے اہل علم کے موجود ہوں چنانچہ بحمد اللہ بہ نسبت پہلے زمانہ کے اس میں ترقی بھی ہے ہر جگہ مدرسہ موجود ہے کچھ نہ کچھ مجمع اہل علم کا موجود رہتا ہے اور مدرسہ جگہ جگہ ہونے سے بہت فائدہ پہنچا ہے کیونکہ جب علم کی مسلمانوں کو ضرورت ہے اور علم کی ترقی علمی مجالس سے ہوتی ہے تو علمی مجالس جس قدر زیادہ ہوں اسی قدر علم کو ترقی ہونے کی اور اسی قدر مسلمانوں کو نفع پہونچنے اور قوت علمی بڑھنے کی امید ہوگی علم کی مثال ریل کے انجن کی سی ہے کہ اسی کی طاقت سے ریل چلتی ہے۔ انجن جتنا زوردار ہو اتنی ہی رفتار ریل کی زیادہ ہوتی ہے اور اگر ایک انجن کی جگہ دو انجن جوڑ دیئے جاویں تو ظاہر ہے کہ قوت اور بڑھ جاوے گی۔ بنا بریں جتنی مجالس علمی یعنی مدارس تعداد میں زیادہ ہوں گے علمی قوت بڑھے گی اور مسلمانوں کو نفع ہی پہونچے گا۔ یہاں سے ان لوگوں کی غلطی ظاہر ہوتی ہے جو کہا کرتے ہیں کہ مدرسے کھولنے کی کیا ضرورت ہے شہر میں ایک ہی مدرسہ کافی ہے۔ بازار میں اگر دس دکانوں کی جگہ گیارہ ہو جاویں تو اس کو بازار کی ترقی کہا جاتا ہے اور جتنی بڑھتی جاویں اس کو اچھی نظر سے دیکھا جاتا ہے پھر نہ معلوم مدرسوں کی تعداد بڑھنے پر اعتراض کیوں کیا جاتا ہے

غور سے دیکھیئے تو اس پر اعتراض کا منشاء صرف یہ ہے کہ دین کی کچھ وقعت ان کے ذہن میں نہیں ہے اس واسطے اس کے ذرائع کی بھی حاجت نہیں سمجھتے دراصل ایک مدرسہ بھی ان کے دل میں کھٹکتا ہے مگر چونکہ نام اسلامی مدرسہ کا لگا ہوا ہے اس واسطے اس سے کچھ تعرض نہیں کر سکتے کیونکہ لوگ مطعون کریں گے پس یہ خوف ان کو اس مدرسہ کی مخالفت سے روکے ہوئے ہے ورنہ ان کے دل کی پوچھو تو اس ایک مدرسہ کو بھی نہ رہنے دیتے تعدد تو کہاں گوارا ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ذرا سی کوتاہی مدرسہ میں ہو جاتی ہے تو یہ لوگ مخالفوں کی طرح طعن کرنے کو کھڑے ہو جاتے ہیں کیونکہ خاموشی کی جو اصل وجہ تھی یعنی اعتراض کرنے سے لوگوں کا مطعون کرنا وہ اب نہیں رہی کیونکہ اس کوتاہی کی وجہ سے سب لوگ مدرسہ کے موافق نہیں رہے کچھ ان کے بھی ہم خیال پیدا ہو گئے ہیں اب ان کا اصلی خیال ظاہر ہونے کا موقعہ ملا چنانچہ وہ ظاہر ہوتا ہے اور مدرسہ والوں کے گلے پر چھری پھیرنے کو تیار ہوتے ہیں اور اگر مدرسہ بیخ و بنیاد سے بھی جاتا رہے تو ان کے کان پر جوں نہ رینگے اگر یہ صرف تعدد کے مخالف ہوتے تو اس ایک مدرسہ سے تو ہمدردی رکھتے اور ایسے وقت میں اس کی اصلاح کی کوشش کرتے نہ کہ اس کے بھی اٹھا دینے کی غرض تعدد کی مخالفت جس طرح آجکل ہو رہی ہے وہ تو بیجا ہے اور اس کا منشاء دین سے لاپروائی ہے جو مسلمان کے لئے کسی طرح زیبا نہیں حیرت کی بات ہے کہ ہر مذہب والے کو یہ خیال ہے کہ مذہبی ترقی ہو اور اس کے ذرائع سوچتے ہیں اور اس کو منجملہ ضروریات کے سمجھتے ہیں لیکن مسلمانوں کا خیال یہ ہوتا جاتا ہے کہ مذہب کی کوئی ضرورت نہیں اور اسی وجہ سے اس کے ذرائع کو بیکار سمجھتے ہیں اور وہ ذرائع جتنے زیادہ ہوں ان کے طبیعت کے زیادہ خلاف ہوتے ہیں یہ تو غلطی ہے اور اس بنا پر تعدد مدارس کی مخالفت درحقیقت دین کی مخالفت ہے لیکن اس تعدد مدارس کے متعلق ایک شکایت واقعی بھی ہے وہ یہ کہ تکثیر مدارس فی نفسہ تو واقعی مفید اور باعث ترقی دین ہے لیکن آج کل یہ تکثیر ظاہراً تو تکسیر ہے اور درحقیقت تکثیر بالثاء بمعنی تعدد نہیں بلکہ تکسیر بالسین بمعنی شکستن ہے۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ)

(پرنٹنگ محل کراچی)

ایک کی جگہ دو مدرسے اس واسطے نہیں ہوتے کہ مسلمانوں کی علمی قوت دوچند ہوجاوے اس مدرسہ کو اس سے قوت پہنچے اور اس کو اس سے بلکہ اس واسطے ہوتے ہیں کہ ایک قوت دو جگہ بٹ جاوے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو قوت دیتی ہے نہ اس کو اس کی مثال یہ ہوئی کہ ایک روٹی ایک آدمی کے پاس ہے بجائے اس کے کہ وہ اس کو اکیلا کھا وے دوسرا اور شریک ہوگیا تو ظاہر ہے کہ نہ اس کا پیٹ بھرے گا نہ اُس کا تو یہ تعدد اشخاص روٹی کے لئے تکسیر ہوئی یعنی دو حصے کر دینا تکثیر بمعنی کثیر کردن جب ہوئی کہ وہ دوسرا آدمی اس روٹی میں حصہ دار نہ بنتا بلکہ اور روٹی لاکر شامل کرتا تو ایک سے دو زیادہ روٹیاں ہوجائیں یہی حالت آجکل کے تعدد مدارس کی ہے کہ اس واسطے تعدد نہیں ہوتا کہ دوسرے کو علمی اور دینی قوت پہنچاویں بلکہ اس واسطے ہوتا ہے کہ اس کی علمی اور دینی قوت آدھی بانٹ لیں بلکہ یہ بھی نہیں ہر ایک کی یہ نیت ہوتی ہے کہ اس کی سب قوت چھین لے تو اب مثال یہ ہوئی کہ ایک روٹی والے کے پاس دوسرا آدمی آیا اور اس کا ارادہ یہ ہے کہ وہ کل روٹی اس سے چھین لے اور خود کھالے اور اس کو نہ دے بلکہ اس سے بھی ترقی کر کے کہا جاتا ہے کہ یہ مثال بھی صحیح نہیں ٹھیک مثال یہ ہے کہ وہ دوسرا صرف یہ چاہتا ہے کہ اس سے وہ روٹی چھن جاوے چاہے اس کو بھی نہ ملے جس کو حسد کہتے ہیں اسی طرح ہر مدرسہ والا یہ چاہتا ہے کہ دوسرا مدرسہ نہ رہے چاہے یہ مدرسہ بھی رہے یا نہ رہے اور افسوس اس میں کون مبتلا ہیں وہ لوگ جو مقتدا اور علما کہلاتے ہیں اور جن کو لوگ دین کا حامل سمجھتے ہیں اور ان کے وجود سے دین کا وجود سمجھا جاتا ہے جبہ قبہ سے تو ان کو جیسا چاہئے سمجھ لیجئے ورنہ درحقیقت ان کی حالت دنیا داروں سے بھی بد تر ہے اور یہ ان لوگوں سے بھی زیادہ خطرناک امراض میں مبتلا ہیں جن کا ذکر اوپر آیا ہے کہ وہ ظاہراً صرف تعدد مدارس کے خلاف ہیں اور درحقیقت ایک مدرسہ کی بھی ان کے نزدیک

ضروری اطلاع :۔ خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرمائیں۔

ضرورت نہیں کیوں کہ ان کے نزدیک دین ہی کی ضرورت نہیں ان علماء کی حالت ان سے بدتر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں اس بات میں تو برابر ہیں کہ نہ وہ مدرسہ کے وجود کو ضروری سمجھتے ہیں نہ تعدد کو (اور اس کی وجہ سوائے قلت مبالات کے کچھ نہیں) گو دونوں زبان سے مدرسہ کی حمایت ہی کا دم بھرتے ہیں لیکن حقیقت وہی ہے جو میں نے عرض کی ایک فریق لوگوں کے مطعون کرنے سے ڈر رہا ہے اس واسطے حمایت کا دم بھرتا ہے اور ایک اپنے پیٹ کی وجہ سے کہ مدرسہ نہ رہے گا تو ہمارا گذارہ کیسے ہوگا غرض اس میں تو دونوں برابر ہیں کہ ضرورت مدرسہ کی جس حیثیت سے ہونی چاہئے ایک کے ذہن میں بھی نہیں اور ان علما صاحبان میں اتنی بات زیادہ ہے کہ قلت مبالات بالدین کے ساتھ یہاں حسد بھی شریک ہے جو بدترین امراض ہے اور اس میں ایک شدت اور یہ بڑھ گئی کہ اہل دنیا کا تو جو فعل بھی ہوتا ہے دنیا کے رنگ میں ہوتا ہے اس سے کوئی دھوکا نہیں کھاتا اور ان حضرات کا ہر فعل دین کے رنگ میں ہوتا ہے گویا معصیت طاعت کی شکل میں ہوتی ہے اس سے بہت دھوکا ہوتا ہے۔ اب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ یہ مقتدا صاحبان اہل دنیا سے بھی خراب حالت میں ہیں اور ان کی کوشش تعدد مدارس کے لئے علم کو بڑھانے اور قوت پہنچانے کے لئے نہیں ہے بلکہ اس موجودہ قوت کو مٹانے کے لئے ہے تو یہ مدارس کی تکثیر بالشار نہ ہوئی بلکہ تکسیر بالسین ہوئی اور ان پر جو تعدد کی مثال یہ دی گئی تھی کہ ریل میں دو انجن لگا دیئے گئے تو قوت اور رفتار بڑھ جاوے گی۔ یہاں یہ مثال جب صحیح ہوتی جبکہ دونوں میں تزاحم نہ ہوتا اور جب تزاحم ہو تو مثال یہ ہوگی کہ انجن جوڑے گئے لیکن رفتار دونوں کی ایک طرف کو نہیں رکھی گئی۔ ایک کو مغرب کی طرف چلایا گیا اور ایک کو مشرق کی طرف۔ تو ظاہر ہے کہ ریل کو اس سے کوئی فائدہ بھی نہ پہونچے گا کیونکہ ان دونوں انجنوں میں سے ایک بھی نہ چل سکے گا جب تک ایک کو اس میں سے

الگ نہ کر لیا جاوے ورنہ یا تو ٹرین ایک ہی جگہ کھڑی رہے گی یا دونوں کے زور سے بیچ سے ٹوٹ جاوے گی کچھ اس کے ساتھ ہو جاوے گی اور کچھ اس کے ساتھ یہی حالت مدرسوں کے اس تعدد کے وقت ہوتی ہے کہ دونوں میں تزاحم ہوتا ہے جس دین کی قوت کے لئے مدارس کی ضرورت تھی اس کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں بلکہ اس کا تزاحم ایسا ہوتا ہے جیسے دو انجنوں کا آمنے سامنے سے مقابلہ ہو۔ جس کو ریل لڑنا کہتے ہیں جس کے تصور سے بھی وحشت ہوتی ہے خدا نہ دکھاوے۔ وہی حالت ان حضرات کے تزاحم سے دین کی ہو رہی ہے کہ اس کے واسطے یہی کہنا پڑتا ہے کہ خدا نہ دکھاوے مگر افسوس ہر جگہ یہ تزاحم واقع ہو رہا ہے اور دیکھتے دیکھتے عادت ہوگئی اس واسطے اس سے کچھ زیادہ انقباض بھی نہیں ہوتا غرض آجکل تعدد مدارس کی حقیقت اور اس کا کچا چٹھا یہ ہے تو یہ بات موجب شکایت ہے یا نہیں اور اس حالت میں تو تعدد مدارس سے جو طبیعتوں کو انقباض ہوتا ہے وہ مطلقاً بے اصل نہیں ہے بلکہ اس کے لئے کچھ واقعیت ضرور ہے گو نئے تعلیم یافتوں کو جو انقباض ہوتا ہے وہ تو بے اصل ہی ہے کیونکہ اس کا منشا دین سے علیحدگی ہے اور کاش تزاحم کے وقت دونوں میں سے ایک فریق تواضع اختیار کر لیتا اور کہتا کہ لے بھائی تو مجھے ہی پیچھے ہٹا لے اور ہم ہی دب گئے تو بات ختم ہو جاتی اور تزاحم جاتا رہتا دب جانے پر ایک حکایت یاد آئی۔

ایک شیخ صاحب ڈاڑھی چڑھائے ہوئے چلے جا رہے تھے راستہ میں ایک خاں صاحب ملے ان کو شیخ صاحب کا ڈاڑھی چڑھانا سخت ناگوار ہوا اور کہا کیوں بے تو ہماری برابری کرنے لگا شیخ جی بڑے چالاک تھے کہا برابری کیوں نہ کریں ہم تجھ سے کس بات میں کم ہیں خانصاحب کو اور غصہ آگیا اور کہا اچھا آ لڑ لے شیخ جی نے کہا یوں نہیں لڑتے لڑائی لڑنی ہے تو اچھی طرح لڑیں گے پھر اپنے پیچھے جورو بچوں کو بیوہ اور یتیم چھوڑ گئے تو کس کام کی بات ہوگی لڑنا

ہے تو پہلے اپنے کنبہ کو ختم کرلو پھر دل کھول کر لڑو خاں صاحب کو غصہ بے حد چڑھا ہوا تھا زور میں آ کر اس کے لئے بھی تیار ہو گئے اور گھر جا کر تمام کنبہ کو صاف کردیا اور لوٹ کر آئے کہ اب لڑ لے۔ شیخ جی نے کیا کیا کہ اپنی ڈاڑھی اتار لی اور کہا کہ لو بھائی تم ہی جیتے میں ہارا، میں تمہاری برابری نہیں کرتا، تم بڑے اور میں چھوٹا تواضع ایسی چیز ہے جس کی بدولت شیخ جی اور شیخ جی کا کنبہ صحیح و سالم رہا اور تکبر ایسی چیز ہے جس کی بدولت خانصاحب کا سارا کنبہ غارت ہوگیا اور اگر شیخ جی بھی اکڑنے ہی جاتے اس کا مصداق ہوتا ؎

دگر از ہر دو جانب جاہلانند
اگر زنجیر باشد بگسلانند

(اگر ہر دو جانب جاہل لوگ ہوتے ہیں تو اگر لوہے کی زنجیر بھی ہو تو توڑ دیں گے یعنی محبت اور تعلق مضبوط سے مضبوط ختم کر دیتے ہیں۔)

اور نتیجہ وہی ہوتا کہ شیخ جی کا سارا کنبہ بھی صاف ہوجاتا بلکہ شیخ جی بھی نہ رہتے اور خانصاحب بھی نہ رہتے اگر مرتے بھی نہیں تو زخمی تو ہو ہی جاتے۔ ایک تواضع نے ایک کا کنبہ بچایا اور دونوں کی جان بچائی۔ دو ریلیں جب لڑتی ہیں تو اس کی وجہ بھی یہی ہوتی ہے کہ دونوں انجنوں میں سے کوئی پیچھے ہٹنا نہیں چاہتا اگر ایک انجن خود یا بواسطہ ڈرائیور کے یہ کہتا کہ میں مزاحمت نہیں کرتا اور آگے کو نہیں چلتا بلکہ واپس ہوتا ہوں میری چال پیچھے ہی کو سہی تو وہ تمام آفتیں نہ آتیں جو تزاحم سے آتی ہیں اور مالی اور جانی نقصان سب سے حفاظت رہتی۔ ہاں ایک بات یہ ہوتی کہ ذرا دیر کو ہیٹی ہوتی اور تابعیت کا اطلاق آتا سو یہ کوئی بات نہیں تابعیت تو کوئی عیب نہیں کیونکہ متبوعیت کو کوئی کہاں تک نباہے گا کسی نہ کسی بات میں تو ہر شخص کو کسی نہ کسی کا تابع بننا ہی پڑتا ہے پھر اس موقع پر بھی تابعیت اختیار کرلی جاوے تو کیا عیب لگ جاوے گا تابعیت اور چھوٹا پن تو بڑی اچھی چیز ہے اس سے اپنا بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے تم متبوع بن کر بھی دیکھو اور تابع بن کر

بھی دیکھو اندازہ ہو جاوے گا کہ کس میں راحت ہے دیکھو ایک عالم سے کوئی مسئلہ پوچھا جاوے اور وہ اس میں غور وخوض کرے مگر اطمینان نہ ہو تو اگر وہ یہ کہدے کہ مجھے شرح صدر نہیں ہوا دوسرے سے پوچھ لو تو کتنا بوجھ ہلکا ہو جاوے گا مگر آجکل اس کو کسر شان سمجھا جاتا ہے اور علم کی شان یہی سمجھی جاتی ہے کہ مسئلہ کا جواب ضرور دیا جاوے خواہ وہ غلط ہی ہو۔ بس اس شان نے تباہ کیا اسی سے علماء میں اتفاق نہیں ہوتا، کوئی عالم دوسرے کا تابع بننا نہیں چاہتا حالانکہ اتفاق اور تابعیت سے مؤنت کم ہو جاتی اور بوجھ بٹ جاتا ہے مگر ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ بے علمی کا اقرار کرنے سے کرکری ہو گی اور اس کو گوارا نہیں کرتا مگر اس سے کرکری میں پڑ جاتے ہیں۔ بعض دفعہ تو وہ کرکری یہیں دنیا ہی میں ظاہر ہو جاتی ہے مثلاً دوسرے سے رائے نہ لینے کی وجہ سے جواب میں غلطی رہ گئی اور وہ غلطی پکڑ لی گئی بعض دفعہ وہ غلطی ایسی فاش ہوتی ہے کہ آدمی کو بہت خفیف ہونا پڑتا ہے اور اگر یہاں ظاہر نہ بھی ہوئی تو ایک وقت وہ آنے والا ہے جس میں وہ بہت رنگ لا دے گی وہ وقت آنکھ بند ہونے کے بعد کا ہے وہ کرکری ایسی سخت ہو گی کہ اس کا کچھ علاج نہ ہو سکے گا مگر ہم لوگ ایسے بے حس ہو گئے ہیں کہ کرکری سے بھاگتے ہیں اور کُرکری میں مزا آتا ہے اور بے دھڑک مسئلہ کا جواب دیدیتے ہیں اور اس سے جو کسی قدر شان بڑھتی ہے اُس میں لطف آتا ہے یہ ایسا ہے جیسے تمباکو کھانے والے کہتے ہیں کہ تمباکو میں مزا آتا ہے ذرا ان سے پوچھو تو کہ سُسرا تمباکو بھی کوئی مزے کی چیز ہے مگر چونکہ تم عادی ہو گئے ہو اس واسطے حس خراب ہو گیا ہے۔ ذرا ایک نئے آدمی کو کھلا کر دیکھو کیسا چکر آتا ہے اور کیسی ہچکیاں آنے لگتی ہیں ہلکے سے ہلکا تمباکو بھی کھلا دو تو وہ برداشت نہیں کر سکتا اور کھانے والوں کی یہ حالت ہے کہ جتنا کڑوا اور تیز ہوا اتنا ہی ان کو مزا آتا ہے اور اس کو اچھا سمجھتے ہیں۔

اس پر ایک قصہ یاد آیا کہ ایک شخص نے دوکان سے تمباکو خریدا اور اس کو پیا تو

ہلکا ثابت ہوا پھر آیا کہ اس سے کڑوا دو دوکان دار نے اور تیز قسم کا تمباکو دے دیا مگر خریدار کو وہ بھی ہلکا معلوم ہوا کہا اس سے بھی کڑوا دو تو دوکان دار کہتا ہے بس اس سے کڑوا اللہ کا نام۔ لفظ تو بیہودہ ہے مگر معنے صحیح ہیں وہ یہ کہ کڑوا ہونا تمباکو کے لئے کمال سمجھا جاتا ہے تو اس لفظ کے معنے یہ ہوئے کہ تمباکو کو تو اتنا ہی کمال حاصل ہے اس سے زیادہ کمال اللہ کے نام کو ہے اس معنے کے اعتبار سے یہ شخص کافر نہیں ہوا کبھی فتویٰ لگا دیا جاوے یہ ایسا تلخ ہوا جیسے عارف شیرازی کہتے ہیں ؎

آں تلخ وش کہ صوفی ام الخبائثش خواند
اشہیٰ لنا واحلے من قبلۃ العذارے

غرض اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ کا نام کڑوا ہے بلکہ یہ مطلب ہے کہ اس سے زیادہ لذیذ اللہ کا نام ہے اور کڑوے سے اس واسطے تعبیر کیا کہ تمباکو میں کڑوا ہونا ہی لذت ہے یہ سیدھی سی توجیہ ہے۔ آدمی کو چاہیئے کہ حقیقت پر نظر کرے نہ کہ عنوان و صورت پر اس مثال سے غرض یہ ہے کہ عادت ہو جانے سے حس ایسا بدل جاتا ہے کہ کڑوا پن بھی کمال سمجھا جاتا ہے حالانکہ کڑوا ہونا بھی کوئی کمال ہے بس عادت نے حس میں تبدیلی کردی ہے کہ کڑوے ہی میں لذت آتی ہے جیسے ہماری طرف ایک شخص مقدمہ باز تھے وہ مقدمہ بازی کے اس قدر عادی ہوگئے تھے کہ بلا کچہری جائے ان کو چین ہی نہ آتا تھا اور گھر کی روٹی اچھی نہیں معلوم ہوتی تھی خوا مخواہ سرائے میں جا کر پڑتے اور ان کی روکھی پھیکی روٹی کھاتے اور اس میں خوش رہتے گھر پر دودھ گھی سے بھی منہ سیدھا نہ ہوتا تو ان کو اگر مقدمہ بازی میں لطف آتا تھا تو کیا اس سے کوئی عقلمند یہ ثابت کر سکتا ہے کہ مقدمہ بازی لذت اور مزے کی چیز ہے نہیں بلکہ یہی کہا جاوے گا کہ ان کا حس خراب ہو گیا ہے اور عادت نے حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے جیسے تمباکو حقیقت میں تکلیف کی چیز تھی مگر عادت سے اس میں مزہ آنے لگا اسی عادت سے مقدمہ بازی جیسی

بری چیز میں لطف آنے لگا حالانکہ کس قدر بکھیڑے کی چیز ہے توڑ پھوڑ پارٹیاں بنانا جھوٹے گواہ بہم پہونچانا وکلاء کی خوشامد کرنا اور دن میں مارے مارے پھرنا ایک مجمع کو جمع کرنا اور ان کو ساتھ لئے پھرنا عملہ والوں کو رشوتیں دینا اور ہاتھ جوڑنا اللہ توبہ لوگوں کا اس سے جی نہیں گھبراتا مگر کیا کیجئے عادت سے حقیقت پر پردہ پڑ گیا ہے اور ایسی بدمزہ چیز لذیذ بن گئی ہے ۔ ان بکھیڑوں کے تو تصور سے بھی وحشت ہوتی ہے ۔ بس اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ عادت سے سہار ہوگئی ہے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ بعض تکلف کی چیزیں بھی عادت ہو جانے سے لذیذ معلوم ہونے لگتی ہیں اسی قبیل سے وہ تکلیفیں بھی ہیں جو مدارس کے تزاحم سے پیش آتی ہیں ۔ بعض دفعہ اس کی نوبت کہاں تک پہنچتی ہے کہ دونوں مدرسوں کے مہتمموں کے خاندانوں میں عداوت ہو جاتی ہے ۔ اور اس پر بھی بس نہیں ہوتا کیونکہ مدرسہ دینی کام ہے اس سے تمام مسلمانوں کو تعلق ہوتا ہے اس لئے ان کے تزاحم کا اثر صرف دو خاندانوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ عام مسلمانوں پر پڑتا ہے اور مدرسوں کے تزاحم کے وقت عام مسلمانوں میں فرقہ بندی ہو جاتی ہے اور بہت سے فریق بن جاتے ہیں جن میں عداوتیں پیدا ہو جاتی ہیں پھر یہ عداوتیں بچے دیتی ہیں اور جس بات پر ان کی بنا ہوئی اس پر بھی محدود نہیں رہتیں بلکہ ذاتی عداوتیں طرح طرح کی پیدا ہو جاتی ہیں آپ جانتے ہیں کہ عداوت اتفاق کی ضد ہے اور سب جانتے ہیں کہ اتفاق تمام راحتوں کی جڑ ہے تو اس کی ضد تمام تکالیف کی جڑ ہو گی تو یہ تزاحم ایسی بری چیز ہوئی کہ تمام تکالیف کی جڑ ہے مگر آجکل ایسی بے حسی چھائی ہوئی ہے کہ ہر جگہ مدارس میں یہ تزاحم موجود ہے اور لوگوں کو اس سے ذرا بھی گرانی نہیں ہوتی یہ بے حسی داخل عادت ہو گئی ہے گویا مدرسہ کے لئے یہ بات مان لی گئی کہ تزاحم بھی لازمی چیز ہے جب مدرسہ کا کام شروع کیا تو اس کو بھی شروع کر دیا اور سمجھتے ہیں کہ جہاں مدرسہ کے اور کاموں میں محنت و مشقت ہے اسی جنس سے یہ بھی ہے ۔

اور نیز یہ بھی سمجھتے ہیں کہ جیسے مدرسہ کے اور کاموں

میں اجر ہے ایسے ہی اس توڑ پھوڑ میں بھی اجر ہے بلکہ اور کاموں سے زیادہ اجر ہے کیونکہ اس میں مجاہدہ زیادہ ہے اس غلطی میں اچھے اچھے پڑھے لکھے مبتلا ہیں اور مقدمہ بازیوں اور پالیسیوں کو مدرسہ کا کام سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب بنار فاسد علی الفاسد ہے یہ مستحسن جب ہوتا جب شریعت نے اس کا حکم کیا ہوتا یا شریعت کے کسی حکم پر اس کی بنار ہوتی اس کی بنار تو بہت گندی اور شریعت کے خلاف امر پر ہے اور راز وہی ہے جس کو میں نے اوپر عرض کیا کہ تعدد مدارس دوسرے مدرسہ کو توڑنے اور دین کی موجودہ قوت مٹانے کے لئے ہوتا ہے خلاصہ یہ کہ اس کی بنار اکثر حسد پر ہوتی ہے۔ پھر جس چیز کی بنا حسد پر ہو اس سے شریعت کو کیا واسطہ شریعت میں تو حسد منجملہ بدترین اعمال کے ہے تو جس کام کی بنار اس پر ہو اس پر اجر کی توقع رکھنا نہ معلوم کہاں تک صحیح ہے تعدد فی نفسہ تو برا نہ تھا کیونکہ مدرسہ دارالعلم ہے اور دین کے لئے علم کی ضرورت ہے تو جتنے دارالعلم زیادہ ہوں گے اتنے ہی دین کو قوت ہوگی اور اس کی نظیر بھی موجود ہے۔ دیکھئے ایک شہر میں بلکہ ایک قصبہ میں مسجدیں متعدد ہوتی ہیں اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا بلکہ کسی کا دل نہیں کھٹکتا پھر مدارس نے کیا قصور کیا ہے مسجد دارالعمل ہے اور مدارس دارالعلم تو جیسے دارالعمل کا تعدد دین کے لئے مضر نہیں بلکہ مسلمانوں کے لئے آرام دہ ہے اور ترقی دین کی علامت ہے ایسے ہی دالعلم کا تعدد بھی دین کے لئے مفید اور علامت ترقی ہونا چاہئے لیکن عجیب بات ہے کہ مساجد کے تعدد سے کوئی نہیں کھٹکتا اور مدارس کے تعدد سے کھٹکتے ہیں۔ یہ بات دراصل بے بنیاد بھی نہیں ہے۔ اس میں ایک راز ہے وہ یہ کہ عادۃً تعدد مساجد کی بنا ان باتوں پر نہیں ہوتی جن پر تعدد مدارس کی بنا ہوتی ہے یعنی باہمی مخالفت اور جاہ اور بڑائی اس واسطے مساجد سے کوئی نہیں کھٹکتا اور مدارس سے کھٹکتے ہیں اور جہاں کہیں مساجد میں بھی یہ خرافات شامل ہو جاتی ہیں اور تعدد کی بنا جاہ اور بڑائی پر ہو جاتی ہے وہاں مساجد کی بھی یہی گت ہو جاتی ہے کہ ہر شخص ان کو بری نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ چنانچہ کانپور میں دو مسجدیں برابر ایسی ہی

موجود ہیں پہلے ایک مسجد تھی پھر ایک شخص نے صرف اپنی بڑائی دکھانے کے لئے دوسری بنائی اب دونوں میں مخالفت کی یہ نوبت آئی کہ ہر ایک میں کوشش کی جاتی ہے کہ یہاں نمازی زیادہ ہوں اس کے لئے تعارف سے بھی کام لیا جاتا ہے اور اپنے جان پہچان لوگوں کو ہر مسجد والا اپنی مسجد میں کھینچ کر لے جاتا ہے جب اس سے بھی کام نہیں چلتا تو مٹھائی بانٹی جاتی ہے اور عمدہ عمدہ مٹھائیاں بنوائی جاتی ہیں یہ مسجد گو احکام مسجد میں ہو مگر باعتبار ثواب کے مسجد نہیں۔ ہے کیونکہ ثواب مسجد خدا کے لئے بنانے سے ہوتا ہے اور جب اس میں دوسری حیثیت لگ گئی وہ یہ کہ خدا کے حکم کے خلاف بنائی گئی تو اب اس میں ثواب کیا دیکھو مسجد ضرار کی نسبت قرآن شریف میں موجود ہے کہ وہ مسجد مع اہل مسجد کے دوزخ میں گرے گی دیکھئے جہاں تعدد کی بنا فاسد ہو وہاں مسجد جیسی متبرک چیز میں سے بھی برکت جاتی رہتی۔ ہے اور اس کا تعدد بھی برا ہو جاتا ہے وہ بنا فاسد کیا ہے مسجد ضرار میں تو کفر کی تائید اور اسلام کا ضرر تھا اور یہ بنا متیقن تھی اس لئے وہ احکام میں بھی مسجد نہ ہوئی اور یہاں یہ تو نہیں بلکہ اس سے ہلکی چیز ہے یعنی اپنا نام مقصود ہونا اس کا منشا حب جاہ اور کبر ہے اس لئے وہ احکام میں مسجد ضرار نہیں لیکن ثواب نہ ہونے میں اسی کے مشابہ ہے لیکن چونکہ عام طور سے مساجد میں یہ بنا نہیں ہوتی اس لئے اس سے کوئی نہیں کھٹکتا اور تعدد مدارس کی بنا اسی پر ہوتی ہے اس وجہ سے اس سے سب کھٹکتے ہیں پس راز اس کا یہ ہوا کہ کہیں تعدد سے مقصود ثواب ہوتا ہے تو وہاں تزاحم نہیں ہوتا اور نتیجہ اس کا اچھا نکلتا ہے اور کہیں مقصود ثواب نہیں ہوتا بلکہ سباب ہوتا ہے پھر وہاں ثواب کہاں سباب کے معنے گالیاں بکنا ہے گالیاں بکنے میں ثواب کا کیا کام اس صورت میں نتیجہ کبھی اچھا نکل نہیں سکتا اور تزاحم ضرور ہوتا ہے اور یہ اثر ہر جگہ لازم ہے خواہ دار العمل یعنی مسجد میں ہو تو اور دار العلم یعنی مدرسہ میں ہو تو جہاں تعدد ہو مسجد کا ہو یا مدرسہ کا اگر ثواب کے لئے ہو یعنی اس میں خلوص ہو اور محض دین مقصود ہو تو وہاں تزاحم نہ ہوگا اور وہی تعدد مسجد کا ہو یا مدرسہ کا اگر ثواب کے لئے

نہیں ہے یعنی اس میں خلوص نہیں ہے تو تزاحم ضرور ہوگا اس وقت تعدد سے زیادہ تر مقصود بجائے ثواب دین کی تائید کے اپنا بڑا بننا ہوتا ہے اسی کی شکایت ہے کہ تعدد مدارس فی نفسہٖ تو برا نہ تھا مگر آجکل اکثر جگہ اس کی بنا حب مال یا جاہ پر ہوتی ہے اس واسطے قابل اعتراض ہے دیکھ لیجئے اس سے بہت کم مدرسہ خالی ہوں گے جہاں دو مدرسہ ہوئے بس وہاں ثواب اور خلوص سے تو بحث نہیں رہتی بس یہ نیت ہوتی ہے کہ کام کی نسبت ہماری طرف ہو کیوں صاحب اگر دین مقصود ہے تو اس خصوصیت کو کیا دخل ہے یہ تو کھلا ہوا حب جاہ ہے کیونکہ دین مقصود ہوتا تو نظر اس پر رہتی کہ دین کا کام ہو جاوے خواہ ہمارے ہاتھ سے ہو یا دوسرے کے ہاتھ سے اور جب اپنی خصوصیت مدنظر ہوئی تو مقصود یہ ہوا کہ ہمارا نام ہو اسی کا نام حُب جاہ ہے۔

کانپور کا قصہ ہے کہ ایک طالب علم ایک مدرسہ میں پڑھتا تھا جب وہ قریب فراغ پہنچا تو دوسرے مدرسہ میں جا نام لکھایا دستاربندی کا جلسہ ہونے والا تھا۔ اب صبح کو جلسہ ہے شام کو پہلے مدرسہ والوں نے اس کو بلایا اور کہا محنت تو کی ہم نے اس کے کیا معنی کہ دستاربندی دوسرے مدرسہ میں ہو لہٰذا تم یہیں آجاؤ اس پر ایک قصہ اور یاد آیا۔ دو بھائی تھے ان کے یہاں کچھ مہمان آئے تو ایک بھائی بولا کہ آج دوپہر کی دعوت میرے یہاں ہے اور دوسرے سے کہا شام کی دعوت تم کر دینا چنانچہ اس پر طرفین کی تراضی ہو گئی جس کے یہاں صبح کی دعوت تھی اس نے کیا کیا کہ اُن سے کہا کہ چلو جنگل ہو آویں ذرا ہوا خوری اور تفریح ہو گی جنگل میں ایک گولر کے درخت کے نیچے جا کھڑا کیا اور کہا گولر خوب پک رہے ہیں دل چاہتا ہے کہ گولر کھاویں چنانچہ کسی کو درخت پر چڑھا کر خوب گولر جھڑوائے اور خود بھی کھائے ان کو بھی کھلائے مقصود ان کو ہی کھلانا تھا تاکہ روٹی کم کھاویں جب دوسرے بھائی کو خبر ہوئی تو اُس نے کہا اس وقت کی دعوت تو میرے یہاں ہے تو شام کو کھلا دینا۔ اس نے کہا واہ یہ خوب رہی گولر لایا تو ہم نے اور کھانا تو کھلائے گا ایسا نہیں ہو سکتا سو حضرت یہی قصہ یہاں ہوا کہ ایک مدرسہ والوں نے اس طالب علم سے کہا کہ تجھے گولر لایا تو ہم نے یعنی محنت کی اور تیار کیا اور

وقت پر دوسرے آکودے اس مدرسہ والوں نے اس طالب علم کو کچھ روپے دینے کو بھی کہے اور اس پر پکا کر لیا کہ دستار بندی دوسرے مدرسہ میں نہ ہو بلکہ یہیں ہو اس کی خبر دوسرے مدرسہ والوں کو بھی لگ گئی انھوں نے کمیٹی کی کہ کیا کرنا چاہیئے بعض چالاکوں نے ایک ترکیب نکالی اور اس طالب علم کو کسی حیلہ سے بلا کر ایک کوٹھری میں بند کر دیا نہ کہتا نہ سنتا کسی کو کانوں کان خبر نہیں۔ بس کوٹھری میں بند کر تالا ڈالدیا اس سے مقصود اُن کو دق کرنا نہیں تھا بلکہ صرف محبوس کر لینا اور اپنے قبضہ میں رکھنا منظور تھا اسی واسطے کوٹھری میں اس کے کھانے پینے وغیرہ کا کل سامان فراغت کے ساتھ جمع کر دیا چند قسم کے پھل رکھدیئے پانی پینے کے لئے گھڑا لوٹا گلاس سب کچھ سامان کر دیا معلوم نہیں نماز کیسے پڑھی ہوگی اور پیخانہ کیسے پھرا ہوگا۔ اسی طرح ان کو قید رکھا پہلے مدرسہ والے ان کو تلاش کر کے مایوس ہو کر بیٹھ رہے، یہ سمجھے ہوں گے کہ طالب علم لااُبالی ہوتے ہی ہیں کہیں کو چلدیئے ہوں گے جب عین جلسہ کا وقت ہوا تو دوسرے مدرسہ والوں نے ان کو کوٹھری میں سے نکال کر بہت حفاظت کے ساتھ جلسہ میں پہنچایا اور دستار بندی کر دی جب کام نکل گیا تو چھوڑ دیا کہ اب جہاں چاہے تشریف لیجایئے وہاں تو روپے بھی ملتے تھے یہاں کچھ بھی نہ ملا مفت ہی میں کام نکالا۔ یہ نوبت ہے تزاحم کی کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس کی بنا ثواب پر ہے اس کی بنا صرف جاہ پر ہے کہ یوں نام ہوگا کہ ہمارے مدرسہ میں اتنے طلبہ کی دستار بندی ہوئی اگر دین کی ترقی منظور ہوتی تو اس بکھیڑے کی کیا ضرورت تھی بس ایک عالم تیار ہوا تھا جس سے دین کی امداد ہونے کی توقع ہے اس مدرسہ سے ہوا تو کیا اور اُس مدرسہ سے ہوا تو کیا مگر یہ تو منظور ہی نہیں منظور تو یہ ہے کہ ہمارا نام ہو اور اس کی وجہ وہی بڑائی ہے جس کو جاہ کہتے ہیں کہ یہ کہا جاوے کہ ہمارے مدرسہ سے اتنے آدمی پڑھ کر نکلے جس طرح ہو تعداد بڑھائی جاوے اس موقع پر مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی ایک بات یاد آئی وہ فرمایا کرتے تھے ر یہ حضرات مخلص تھے اور ہم مفلس ہیں یعنی خلوص سے خالی ہاتھ ہیں مفلس کے لفظ پر ایک لطیفہ یاد آیا ایک شخص سے میں نے کہا آپ بڑے مخلص ہیں انھوں نے

شاید کبھی مخلص کا لفظ سنا نہ تھا وہ مفلس سمجھے تو کہنے لگے جی اللہ کا فضل ہے کھانے کو سب کچھ ہے) مولانا فرمایا کرتے تھے کہ جو کوئی راہ نجات بھی پڑھاتا ہے وہ بھی ہمارا معین ہے، ہمارا کام بٹاتا ہے ہم کو بھی اس کی اعانت کرنی چاہیئے اور ملا جُلا رہنا چاہیئے یہ ہے خلوص اور یہ ہے ثواب کے واسطے دین کی تعلیم دینا یہ انبیاء علیہم السلام کا سا باہمی علاقہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں انبیاء سب بھائی بھائی ہیں یہ ہے طریقہ سنت اور طریقہ حق اور یہی مشائخ اور علما اور فقراء کو چاہیئے کہ باہم ایسا علاقہ رکھیں مگر آجکل اگر کسی دوسرے کو بھائی کہتے بھی ہیں تو اس کے معنے وہ ہوتے ہیں جو ہندو بھائی اور عیسائی بھائی کے معنے ہیں کہا جاتا ہے ہمارے ہندو بھائی یوں کہتے ہیں اور عیسائی بھائی یوں کہتے ہیں یہ لفظ تہذیب کا ہے ورنہ مراد دشمن ہے تو مشائخ یا علماء اگر کسی اپنے ہمعصر کی نسبت بھائی یا برادر کا لفظ بولتے ہیں تو برادرانِ وطن مراد ہوتے ہیں جس کا اطلاق ہندوؤں پر آتا ہے نہ برادرانِ طریق پر۔ علماء کو بھی چاہیئے کہ اتحاد سے رہیں اور دین کا کام دین کی طرح کریں نہ آجکل کے مدرسوں کی طرح کہ دوسرے مدرسہ میں چاہے کیسی ہی اچھی تعلیم ہوتی ہو اور کیسے ہی قابل لوگ وہاں موجود ہوں مگر جب اسے یاد کریں گے تو برائی ہی سے یاد کریں گے کیا اس حالت پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ خلوص سے کام کیا جاتا ہے۔ خلوص تو کوسوں دور ہے بس مقصود دوسرا ہی ہے کہیں مقصود جاہ ہے یعنی انتساب کہ ہم اتنا کام کرتے ہیں اور کہیں مال یعنی چندہ رسی کی ضرورت سے مجمع بڑھایا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ طالب علم زیادہ ہوں کیونکہ جب طالب علم زیادہ ہوں گے تو لوگ سمجھیں گے کہ کام خوب ہو رہا ہے لہذا چندہ بھی زیادہ دیں گے یہ چندہ ایسا مطمح نظر ہوا ہے کہ اس پر بھی نظر نہیں رہی کہ چندہ مقصود بالذات ہے یا کسی چیز کا ذریعہ ہے اور اس کی وہ حالت ہوگئی جیسے بعض لوگ کھانے کے حریص ہوتے ہیں اور کھائے چلے جاتے ہیں خواہ اس پر وہ غرض جس کے لئے کھانا موضوع ہے مرتب نہ بھی ہو یعنی تغذیہ بدن ہو یا نہ ہو

جا ہے دست ہی آتے رہیں مگر کھائے ضرور جاتے ہیں اور جب کوئی ٹوکے تو کہتے ہیں سب کام تو قوت پر موقوف ہیں اور قوت موقوف ہے کھانے پر تو سب کام موقوف ہیں کھانے پر تو کھانا ایسی ضروری چیز ہے اور تم اس سے منع کرتے ہو اس بیوقوف نے یہ نہیں سمجھا کہ اس دلیل میں ایک مقدمہ میں تفصیل کی کسر ہے وہ یہ کہ یہ تو صحیح ہے کہ سب کام موقوف ہیں قوت پر اور یہ بھی صحیح ہے کہ قوت موقوف ہے کھانے پر مگر یہ کہ کونسا کھانا مورث قوت ہے اس میں کلام ہے اگر یہ کہا جاوے کہ مطلق کھانا مورث قوت ہے تو اس پر ہم لانسلم کہیں گے کیونکہ کھانا وہ مورث قوت ہوتا ہے جو ہضم ہو اور ہضم جب ہی ہوگا جب پیٹ کے موافق کھایا جاوے اور جب پیٹ سے زیادہ کھایا جاوے گا تو وہ ہضم نہیں ہو سکتا اور جب ہضم نہ ہوگا تو اس سے طبیعت غذا نہیں حاصل کر سکتی بلکہ مجبور ہوگی اس کی دفع پر اور اس میں کوئی فعل نہ کرے گی بجز اس کے کہ دستوں کے راہ نکال دے تو اس کھانے کا نتیجہ تو محض یہ ہوا کہ ایک راہ سے پیٹ میں داخل کیا گیا اور دوسرے راہ سے نکال دیا گیا تو اس دلیل میں غلطی یہ تھی کہ ایک مقدمہ کا خیال نہیں رہا جس پر نتیجہ کی صحت موقوف تھی۔ خلاصہ غلطی کا یہ ہوا کہ ذریعہ کو اختیار کیا گیا مگر نہ بہ حیثیت منتج مقصود ہونے کے بلکہ ذریعہ کو مقصود بنا لیا گیا۔ یہی حالت آجکل کے چندہ کی ہے کہ لوگ ایسے اس کے پیچھے پڑے ہیں کہ فنا فی الچندہ ہو گئے۔ نہ جائز کو دیکھتے ہیں نہ ناجائز کو بس چندہ ہونا چاہیئے اور جب کوئی ان سے کہے کہ چندہ میں یہ خرابیاں ہیں تو وہی جواب یہاں بھی ملتا ہے جو اس کھانے والے نے دیا تھا کہ سارے کام تو آجکل مالی قوت پر موقوف ہیں اور مالی قوت کا مدار چندہ پر ہے تو سارے کام موقوف ہوئے چندہ پر اور تم اس سے منع کرتے ہو۔

صاحبو! یہ دونوں مقدمے ٹھیک ہیں مگر ایک مقدمہ یہاں بھی قابل تفصیل ہے کہ یہ چندہ جس میں حدود کا خیال نہ رکھا جاوے یہ بھی مفضی الی القوت ہے یا نہیں۔ سو دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہرگز نہیں ہے کیونکہ قوت سے مراد دینی قوت ہے

(اس کو خوب ذہن نشین کر لیجئے) اور جب چندہ اس طریق سے لیا گیا جو شرعاً ممنوع ہے تو دین تو پہلے ہی غارت ہو گیا پھر اس سے دینی قوت کی توقع رکھنا کیا معنے یہ تو ایسا ہوا جیسے کھانے کے شوق میں آ کر ڈھیلے و پتھر کھالئے اور خوش ہیں کہ اس سے قوت آوے گی بلکہ ڈھیلے پتھر بھی نہیں سنکھیا کھا لیا اور دل خوش کر لیا کہ اس سے قوت آوے گی۔ اس سے جیسی قوت آوے گی ابھی ذرا دیر میں معلوم ہو جائے گی۔ غلطی یہی ہے کہ چندہ کو مقصود بالذات سمجھا ذریعہ نہیں سمجھا اگر ذریعہ سمجھتے تو ظاہر ہے کہ چندہ ذریعہ کاہے کا ہے دین کا تو دین اس کے واسطے غارت نہ کرتے اور دین کو غارت کر کے چندہ لیا تو یہ تو ایسا ہوا جیسے چھت کی مرمت کے لئے سیڑھی کی ضرورت تھی اور کوئی یوں کرے کہ چھت ہی میں سے دو کڑیاں نکال کر ان کی سیڑھی بنا لے تو کیا آپ اس کو عقلمند کہیں گے ہرگز نہیں اس میں بھی تو غلطی یہ ہے کہ اس نے مقصود اور ذریعہ میں فرق نہیں کیا اور ذریعہ کے لئے یعنی سیڑھی کے لئے مقصود کو یعنی چھت ہی کو بگاڑ ڈالا اسی طرح یہ چندہ والے کرتے ہیں کہ چندہ جو کہ ذریعہ ہے دین کی درستی کا اس کے لئے دین ہی کو خراب کر لیتے ہیں اور سنئے آپ کو معلوم ہوگا کہ اصلاح ذات البین اور اتفاق بھی ایک فرد ہے دین کا اور اس کا مقابل تخریب دین ہے تو چندہ اگر موجب ہوا فساد اور نفاق اور عداوت کا تو وہ قوت دین کا ذریعہ کہاں بنا بلکہ تخریب دین کا ذریعہ بن گیا بس اس وقت تو یہی کہا جاوے گا کہ مقصود سے کچھ غرض نہیں ذریعہ ہی کو مقصود بنا لیا ہے جہاں دو مدرسے ہو جاتے ہیں وہاں کیا کیا بُرے اور شرمناک واقعات ہوتے ہیں اور سب کی اصل نکالی جاوے گی تو وہی چندہ اصل نکلے گی کہ ہر مدرسہ والا اس کی کمی سے ڈر رہا ہے اس واسطے دوسرے مدرسہ کی مخالفت کرتا ہے اور دونوں آپس میں لڑتے ہیں حتیٰ کہ ہاتھا پائی اور فوجداری کی نوبت آ جاتی ہے پھر کیسا فضیحت ہونا پڑتا ہے عدالت تک نوبت آتی ہے اور موافق اور مخالف سب کے سامنے ہنسائی ہوتی ہے حالانکہ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اگر دو مدرسے ہو گئے تو حرج کیا ہو گیا کام ہلکا ہو گیا پہلے

سب کام ایک کو کرنا پڑتا تھا اب دو ہو گئے تو کام بٹ گیا۔ اس کو تو غنیمت سمجھنا چاہئے۔ ہمارے یہاں تھانہ بھون میں مدرسہ ہے جس کو لوگ جانتے ہیں ایک دفعہ ایک نیا مدرسہ ہونے کو تھا میں نے کہلا بھیجا کہ چشم ما روشن دل ما شاد اچھا ہے ہمارا کام آپ اپنے سر لے لیں اگر آپ مدرسہ کرتے ہیں تو ہم مخالفت نہیں کریں گے جس سے آپ کے چندہ میں کچھ کمی ہو بلکہ ہم اپنا مدرسہ اٹھا دیں گے یہ چندہ بھی جو کچھ ہو آپ ہی لے لیجئے اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ نیا مدرسہ موقوف رہا (اگر دوسرے مدرسہ کو روکنا بھی ہو تو یہ ترکیب ہے نہ یہ کہ اس سے لڑا جاوے اور فوجداری کی جاوے) میں نے در اصل یہ ترکیب نہیں چلی تھی اور صرف کہلا بھیجنا نہ تھا بلکہ دل سے یہی ارادہ تھا حتیٰ کہ یہ کیا کہ اپنے یہاں کے مدرسین کو تین چار مہینہ کی تنخواہیں پیشگی دے کر میں باہر چلا گیا اور ان سے کہہ گیا کہ اگر وہ مدرسہ واقعی شروع ہو جاوے تو مزاحمت نہ کرنا بلکہ اس میں چلے جانا اور تنخواہیں اس واسطے دیدیں کہ شاید اس میں بالفعل چندہ کی کمی ہو اور اس لئے وہاں مدرسین کو تنخواہیں نہ مل سکیں اور وہ اس وجہ سے وہاں جانے سے نہ رک جاویں اور باہر اس وجہ سے چلا گیا کہ شاید میری موجودگی میں نئے مدرسہ والوں کو کچھ رکاوٹ ہو۔ میں تو اس کے لئے بالکل تیار تھا مگر اثر یہ ہوا کہ وہ مدرسہ شروع ہی ہو کر رہ گیا ایک نرم ہو جاوے تو اس کا دوسرے پر بھی اثر ہوتا ہے اور وہ بھی نرم ہو جاتا ہے اس کا مطلب یہ نہ سمجھئے کہ اس ترکیب سے اس غرض کے لئے کام لینا چاہیئے دوسرے پر یہ اثر ہو کہ وہ نرم پڑ جاوے اور اس سے دب جاوے اور دوسرا مدرسہ جاتا رہے یہ تو خود طلبی اور دھوکا دینا ہے اور اس کو پالیسی کہتے ہیں اور اس سے اثر بھی نہیں ہوتا بلکہ جب یہ بات کھل جاتی ہے کہ اس میں پالیسی تھی تو اثر برعکس ہوتا ہے اور ہر شخص پہلے مدرسہ والوں کا مخالف بن جاتا ہے اور لوگ کہنے لگتے ہیں کہ مولویوں کو بھی مکاری آتی ہے بلکہ نرم برتاؤ فی نفسہ مامور بہ اور محمود ہے اور دونوں اس کے مخاطب ہیں یہ سمجھ کر دونوں کو چاہیئے کہ نرمی کا برتاؤ کریں اور خلوص سے کام کریں جس سے بھی جو کام دین کا ہو جاوے اس کو غنیمت سمجھے تزاحم کیوں کیا جاتا ہے

یہ صورت ہے اتفاق کی۔

حضرت حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ لوگ اتفاق اتفاق پکارتے پھرتے ہیں مگر جو اصل ہے اتفاق کی اس سے بہت دور ہیں تو اتفاق کی اصل تواضع ہے جن دو شخصوں میں تواضع ہوگی ان میں نا اتفاقی نہیں ہوسکتی اور تواضع کی ضد تکبر ہے جہاں تکبر ہوگا وہاں اتفاق نہیں ہوسکتا اب لوگ ہر بات میں تکبر کو اختیار کرتے ہیں اور زبان سے اتفاق اتفاق پکارتے ہیں تو اس سے کیا ہوتا ہے اگر دونوں تواضع سے کام لیں تو اتفاق قائم رہے اور تواضع جب ہوتی ہے جبکہ حُبِّ مال وجاہ نہ ہو اور جہاں مال وجاہ کا دخل ہوگا وہاں تزاحم ضرور ہوگا یہ حب مال وجاہ فساد کی جڑ ہیں اگر یہ نہ ہوں تو خدا کی قسم ہے کہ تزاحم کبھی نہ ہو جیسے اسی کی ایک نظیر موجود ہے کہ مساجد میں تزاحم نہیں ہوتا کیونکہ عادۃً اکثر مساجد کے بنانے میں مال وجاہ مقصود نہیں ہوتا اور جہاں مساجد میں بھی یہ بلا شامل ہے وہاں تزاحم بھی موجود ہے مساجد کو بھی چھوڑیئے مدرسوں ہی میں جہاں یہ بلا نہیں ہے وہاں تزاحم بھی نہیں دیکھ لیجئے گورنمنٹ کے ہزاروں مدرسے ہیں اور آپس میں تزاحم نہیں کیونکہ ان میں مال وجاہ کی غرض شامل نہیں کیونکہ ہر شخص کو اپنی تنخواہ سے مطلب ہے۔ یہ خیال کسی کو نہیں کہ ایک مدرسہ میں طالب علم زیادہ ہوں گے تو دوسرے سے بڑھ جاوے گا۔ اور چندہ زیادہ آوے گا اور نام ہوگا کہ فلانے کا مدرسہ خوب چلتا ہے۔ وہ مدرسے تو سب ایک ہی کے ہیں چندہ کا وہاں کام نہیں اور طالب علم زیادہ ہونے سے کسی ایک شخص کا نام نہیں ہوتا۔ غرض مال وجاہ کی شرکت نہیں اس واسطے تزاحم بھی نہیں اگر ہمارے مدرسوں میں بھی یہ بلا نہ رہے تو متزاحم نہ رہے اور اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ دونوں میں سے ایک ماتحت بن جاوے دوسرے کا تو حقیقت میں دونوں ایک ہوں گے۔ ایک اصل اور ایک فرع تو تزاحم نہ ہوگا کیونکہ ایک کی ترقی دوسرے کی ترقی کو مانع نہ سمجھی جاوے گی بلکہ ہر ایک کی ترقی دوسرے کی بھی ترقی سمجھی جاوے گی اور دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے تابع نہ

سہی مگر آپس میں محبت رکھیں اور غور کرنے سے یہ صورت ثانی زیادہ مشکل معلوم ہوتی ہے کیونکہ ہم لوگ ایسے فاسد المذاق ہو گئے ہیں کہ بلا حکومت اور دباؤ کے مل کر کوئی کام نہیں کر سکتے۔ بہر حال جتنی کوشش ہو سکے اچھا ہے آپس میں میل اور اتحاد پیدا ہونے کی کچھ تدبیریں ہیں مثلاً ایک یہ کہ علماء ایک دوسرے سے ملتے رہیں، دوسرے یہ کہ دوسرے مدرسہ کے طالب علم کو اپنے مدرسہ میں داخل نہ کریں تاوقتیکہ وہاں کی اجازت نہ ہو اور مہتمم کے دستخط نہ لے آویں ایک طرف سے یہ ہو اور دوسری طرف سے یہ ہو کہ اس طالب علم کو اس مدرسہ میں داخل ہونے سے منع نہ کریں اور دستخط اور اجازت دیدیا کریں کیونکہ مقصود تعلیم دین ہے ممکن ہے کہ ایک کتاب ایک مدرسہ میں ہوتی ہو جس شرکت کی طالب علم کو ضرورت ہے اور دوسرے مدرسے میں وہ نہیں ہوتی تو اس صورت میں اس طالب علم کو ایک مدرسہ کا مقید کرنا اس کا وقت ضائع کرنا ہے اور مقید کرنے کی کوئی وجہ بھی تو ہو۔ غرض آپس میں اتحاد رکھنا ہو تو اس کی یہ تدابیر ہیں ان تدابیر کو اگر بتکلف بھی اختیار کیا جاوے تو اثر ہوتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اخلاق باطنی کو دخل ہے ظاہری برتاؤ میں کہ جیسے اخلاق ہوتے ہیں ویسے ہی برتاؤ اس سے ظاہر ہوتا ہے ایسے ہی اس کا عکس بھی ہے کہ ظاہری برتاؤ کو بھی دخل ہے باطنی اخلاق کے پیدا ہونے میں کہ جیسا برتاؤ بتکلف اختیار کیا جاوے ویسے ہی اخلاق پیدا ہو جاتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک و بینه عداوة کانه ولی حمیم۔ یعنی اگر کسی سے تکلیف پہونچے تو اس کی مکافات اچھے برتاؤ کے ساتھ کیجئے اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ جس کو آپ سے عداوت تھی وہ پکا دوست بن جاوے گا صدیق صداقت سے ہے جس کے معنی ہیں محبت اور خلت یعنی وہ دوستی جو قلب میں گھس گئی ہو۔ معلوم ہوا کہ نیک برتاؤ کا گو وہ تکلف ہی سے ہو یہ اثر ہے کہ دوسرے شخص کے قلب میں سچی اور واقعی محبت پیدا ہو جاتی ہے آیت سے یہ مسئلہ بدلالة النص ثابت ہو گیا کہ اگر یہ تدابیر اتحاد دل سے بھی نہیں اختیار کر سکتے تو بتکلف ہی اختیار

کریں غرض اتحاد اچھی چیز ہے اس کے حاصل کرنے کی تدابیر کرنی چاہئیں پھر اتحاد کی صورت میں تعدد مدارس بھی کچھ برا نہیں مگر یہ تبھی ہو سکتا ہے کہ مقصود علم دین کی خدمت ہو نہ کہ جاہ اور مال اگر مقصود تعدد سے علم دین کی خدمت ہو تو جتنا تعدد ہوگا علم دین کی خدمت زیادہ ہوگی یہ ایسا ہوگا جیسے ایک آدمی کے ساتھ دس آدمی ہو جاویں تو دس گنا کام ہوگا اور اس کو ہر شخص چاہتا ہے کہ علم دین کی جس قدر زیادہ خدمت ہو سکے ضروری ہے خصوصاً اس زمانہ میں کہ ضلالت سے نجات بلا اس کے ناممکن ہے یعنی خصوصاً اس واسطے کہا کہ پہلے زمانہ میں تو اہل تزاحم کم تھے اس لئے تھوڑے۔ جماعت کی دین سے واقفیت کافی تھی اور ناواقفوں کے لئے صرف اتنا کافی تھا کہ جو ضرورت پیش آئے اس کا حکم کسی سے پوچھ لیا اب اہل باطل کی مزاحمت بھی موجود ہے زمانہ آزادی اور خود داری کا ہے ہر شخص جدا جدا اسلام پر حملہ کرنے کو تیار ہے۔ غیر اسلام والے بھی اسلام پر حملہ کرتے ہیں اور خود اہل اسلام میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اسلام پر حملہ کرتے ہیں۔ اور یہ حملہ زیادہ مضر ہے کیونکہ غیر اہل اسلام تو مخالف ہیں صورۃً وحقیقۃً دونوں طرح ان کو دشمن سمجھا جاتا ہے اور دشمن کی بات کا زیادہ اثر نہیں ہوتا اور یہ لوگ دشمن بصورت دوست ہیں ان کے جال سے بچنا مشکل ہے اب تو دین کی حفاظت کی اس کے سوا کوئی صورت ہی نہیں کہ علم کافی والوں کی بہت بڑی جماعت ہو اور اتنا بڑا مجمع اہل علم کا بلا کافی قوت اور کوشش کے نہیں ہو سکتا اس واسطے ضرورت ہے کہ سب مسلمان متفق ہو کر کوشش کریں اب وقت اختلاف کا نہیں رہا اس تقریر سے علم اور کافی علم کی ضرورت ثابت ہو گئی اور یہی علم ذریعہ ہے دین کی حفاظت کا اسی سے عقائد درست ہو سکتے ہیں اور اسی سے اعمال درست ہو سکتے ہیں اور اس مجموعہ اصلاح کا خلاصہ درستی معاد ہے تو حاصل یہ ہوا کہ درستی معاد ہوتی ہے علم سے اس واسطے علم کی سخت ضرورت ہے اور اس وقت جو آیت تلاوت کی گئی اس کے ضمن میں مسئلہ معاد ہی کا بیان مجھے مقصود ہے۔ اب میں آیت کا ترجمہ ہی کئے دیتا ہوں متعلقات کو طول نہیں دوں گا۔ اب تک

میرا یہ طریقہ تھا کہ ایک آیت پڑھی اور اس کے متعلق تمام مالہ وما علیہ سے بحث کی اور اس ضمن میں اصل مضمون کے متعلقات اور متعلقات کے متعلقات اور ان کے متعلقات سب ہی آجاتے تھے اور بات کہیں سے کہیں پہونچ جاتی تھی گو اس سلسلہ کے بڑھ جانے سے بھی کلام میں تشتت نہ ہوتا تھا اور اصل مضمون محفوظ رہتا تھا کیونکہ نظر اصل مضمون ہی کی طرف رہتی تھی تاہم اصل مضامین کے ساتھ متعلقات بہت زیادہ ہوتے تھے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آیت تھوڑی ہوتی تھی اور بیان زیادہ ہوتا تھا۔ اور آج اس طرز کو چھوڑ کر دوسرے طرز سے بیان کروں گا۔ وہ یہ ہے کہ متعلقات کو طول نہیں دوں گا صرف آیتوں کا ترجمہ کروں گا اور مختصر طور پر توضیح مطلب کر دوں گا۔ اس طرز کا نتیجہ یہ ہے کہ آیتیں زیادہ ہوں گی اور متعلقات کا بیان کم ہوگا اور میرا قدیم طریقہ یہی تھا گو اس دوسرے طریقے کی ایک مدت سے عادت ہو جانے کے سبب یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ قدیم طریقہ تھا اور آج جدید طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ لیکن واقعی بات یہ ہے کہ قدیم طریقہ عرصہ سے بدلا ہوا تھا اور بجائے اس کے دوسرا طریقہ اختیار کیا ہوا تھا آج پھر اسی قدیم طریقہ کا اعادہ کیا جاتا ہے۔ اور بات بھی یہی ہے کہ بیان ذریعہ ہے اور اصل مقصود مضمون آیت ہے تو نظر مقصود پر رہنی چاہیئے ذریعہ وہی اختیار کرنا چاہیئے جو موصول الی المقصود ہو اور بس اگر ایک کام کے چند ذرائع ہوں تو ظاہر ہے کہ جو ذریعہ احقر ہو یعنی چھوٹے سے چھوٹا ہو اسی کو اختیار کرنا چاہیئے قدیم طریقہ مختصر اور بہت سہل تھا اس واسطے اس کو درمیانی طریقہ پر ترجیح ہو سکتی ہے جیسا کہ ظاہر ہے کہ ترجمہ اور مضامین اصلیہ کے بیان کرنے میں کچھ بھی دقت نہیں اور اس دوسرے طریقہ میں چند چیزوں کی ضرورت ہے (جیسا کہ آگے معلوم ہوگا) تو چند چیزوں کے جمع کرنے میں اتنی سہولت نہیں ہو سکتی جتنی ایک چیز میں ہوگی۔ یہاں میں پھر وہ بات یاد دلاتا ہوں کہ طریق مقصود نہیں بلکہ مقصود ہی مقصود ہے۔ مقصود کیا ہے وہ یہ ہے جس کا بیان خود قرآن میں موجود ہے وذکر فان الذکریٰ تنفع المومنین جس کا خلاصہ نصیحت ہے مسلمانوں کو جب مقصود نصیحت ہے اور بیان اس کا ذریعہ اور طریق ہوا تو کیا

ضرور ہے کہ ایک ہی طریقہ کا التزام کر لیا جاوے بلکہ جب کوئی دوسرا طریقہ انفع معلوم ہو تو چاہیئے کہ پہلے کو بدل دیا جاوے اور یہ مؤید بالسنت بھی ہے حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں ہے ما خیر بین امرین الا اختار ایسرھما یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کسی دو بات میں اختیار دیا جاتا اُن سے اُسی کو اختیار فرماتے تھے جو آسان ہو۔ یہ ایسا ہے جیسے حج کو جانے کے دو رستے ہوں ایک قریب اور ایک بعید تو عقل کی بات یہی ہے کہ قریب کا راستہ اختیار کیا جاوے اس میں بعض غلطی کرتے ہیں اور طریق طویل کے اختیار کرنے کو باعث ازدیاد ثواب اور مجاہدہ سمجھتے ہیں۔ وطن میں ایک صاحب سے میری گفتگو ہوئی وہ اسی خیال کے تھے اور کہتے تھے کہ دین میں سہولت پسندی اچھی نہیں کیونکہ جتنی مشقت زیادہ ہوگی اتنا ہی ثواب زیادہ ہوگا حدیث موجود ہے اجرک علیٰ قدر نصبک یعنی اجر بقدر محنت کے ہے اور میں کہتا تھا کہ اس حدیث سے طریق طویل کو اختیار کرنے کی فضیلت بتلانا مقصود نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ بڑے مقصود کو حاصل کرو اور اس کی تحصیل میں جو مشقتیں پیش آئیں ان کی وجہ سے ہمت نہ ہارو کیونکہ اجر علیٰ قدر نصبک ان مشقتوں پر اجر بھی زیادہ ملے گا یہ مقصود نہیں کہ مقصود کے دو طریقوں میں سے اعسر اور اطول کو اختیار کرو اس امید پر کہ اس سے ثواب بڑھ جاوے گا یہ تو درحقیقت مقصود سے محرومی ہے اور ذریعہ کو مقصود بنانا ہے وہ کسی طرح مانتے نہ تھے میں نے کہا اچھا اگر یہی بات ہے کہ جتنا ذریعہ کو طول دیا جاوے اتنا ہی باعث فضیلت ہے تو آپ یوں کیا کریں کہ اگرچہ پانی تھانہ بھون میں بھی موجود ہے مگر فضیلت بڑھانے کے لئے وضو کے واسطے پانی جلال آباد سے لایا کیجئے اور اس سے وضو کر کے نماز پڑھا کیجئے اس طرح ہر نماز کا ثواب بہت بڑھ جاویگا کیا آپ کے دل کو یہ بات لگتی ہے تب ان کی سمجھ میں آیا۔ تو اصل بات یہی ہے کہ ذریعہ اور طریق کو طول دینا کچھ فضیلت کی بات نہیں ہاں اگر مقصود کے لئے کوئی طریق ہی نہ ہو سوائے طریق طویل کے تو ہمت نہ ہارے غرض وعظ ایک طریق ہے

جس سے مقصود مسلمانوں کا نفع ہے تو جس طریق میں بلامشقت و مضرت ہو وہی طریق اچھا ہوگا اور جو طرز آجکل اختیار کیا گیا ہے اس کی یہی شان ہے اس دوسری طریق میں ایک مضرت یہ ثابت ہوئی کہ بعض سامعین کو غلط فہمی ہوتی تھی کیونکہ بعض مضامین نئے ہوتے تھے جو کتابوں میں نظر سے نہیں گذرتے اکثر طبائع نئی بات سے چونکتی ہیں اس واسطے لوگ ان سے متوحش ہوتے تھے اور غور کرنے کا مادہ طبیعتوں میں رہا ہی نہیں ہے بس نئی بات سنکر خواہ مخواہ اعتراض کر دیتے تھے اور نئے مضامین ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس طریق میں صرف منقولات پر اکتفا نہ ہوتا تھا کہ فلاں کتاب میں یوں لکھا ہے اور فلاں کتاب میں یوں لکھا ہے بلکہ معقولات بھی شامل ہوتے تھے یعنی سیاق و سباق اور قواعد سے استنباط کر کے ایسے مضامین بھی بیان ہوتے تھے جو کسی نے نہیں لکھے کیونکہ ہر مضمون کا کتاب میں لکھا ہوا ہونا ضروری نہیں اور کتابوں میں قواعد کے درج کرنے کا یہی تو حاصل ہے کہ جزئیات کے لکھنے کی ضرورت نہ رہے بس چند اصول کلی لکھدیئے ہیں جن سے سیکڑوں جزئیات نکالے جا سکتے ہیں تو وعظ کے وقت ان جزئیات کو مستنبط کر کے بیان کر دینے میں کیسا حرج ہے اول تو ہمیں اس کی لیاقت کہاں اور قواعد ہم کو ایسے مستحضر کہاں ہیں جن سے ہم زیادہ استنباط کر سکیں مگر خیر ہم بہت تواضع بھی کیوں کریں آخر کچھ تو علم خدا تعالیٰ نے دیا ہے کہیں کہیں استنباط سے بھی کام لیا جاتا تھا اور کچھ نہ کچھ ایسے مضامین بھی جو کسی سے بالتصریح منقول نہ ہوں بیان میں آجاتے تھے ان سے بعض لوگ چونکتے تھے اور خواہ مخواہ اعتراض کرتے تھے یا بعض مضامین ایسے ہوتے تھے کہ ان کے سمجھنے کی لیاقت سامعین میں نہیں ہوتی تھی نہ اُس کے سمجھنے کی کوشش کرتے تھے بس جو مدلول سرسری طور پر اپنی سمجھ میں آگیا اسی کو واقعی مطلب سمجھ کر اعتراض کر دیتے تھے ان مفسدوں کو دیکھ کر خیال ہوا کہ اس بکھیڑے کو کیوں مول لیا۔ اس طریقہ کو چھوڑ ہی کیوں نہ دیا جاوے جس سے یہ سب خرابیاں پیدا ہوئیں گو اس سے یہ فائدہ بھی ہوتا تھا کہ وہ نئے مضامین اگر کسی کو پسند آگئے تو وہ بہت محظوظ ہوتے تھے لیکن پھر یہ مفسدہ ہوتا تھا

کہ کبھی مضامین منقولہ وغیر منقولہ میں تعارض کے توہم سے فرقہ بندی شروع ہوگئی اور ایک اس کے طرفدار ہو گئے اور ایک اس کے۔ گو اس فرقہ بندی سے بیان کنندہ کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ اس نے کوئی غلطی نہیں کی ایسی فرقہ بندی سلف کے وقت میں بھی ہوئی ہے مگر مجھے اس سے بھی غیرت آتی ہے کوئی قاسمی بنے اور کوئی رشیدی کوئی اشرفی اور کوئی روپیہ صاحبو! انسان بنئے اشرفی روپیہ بننے سے کیا فائدہ پھر غور سے سمجھ میں آیا کہ یہ ساری خرابی استنباط کی ہے نہ یہ ہو نہ اختلافات ہوں جب نقل محض ہوگی اور صرف ترجمہ ہوگا تو بات بڑھے ہی گی نہیں پھر استنباط کی نوبت ہی نہیں آوے گی تو اس طریق میں خطرہ نہیں جب کوئی اشکال کرے کہدیا دیکھ لو یہ ترجمہ اور یہ مضمون فلاں صاحب نے لکھا ہے اپنے اوپر کچھ بھی بار نہ رہا اس طریق میں دماغ پر بھی تعجب بہت ہوتا تھا کیونکہ آیت میں سے ایک مضمون نکالا اور اس مضمون میں سے اور مضمون نکالا اور اس میں سے اور نکالا ان سب کا سلسلہ یاد رکھنا اور ہر مضمون کے لئے اصل کو تلاش کرنا اور ہر پہلو پر نظر رکھنا ظاہر ہے کہ کس قدر دماغ کا کام ہے اور اس صورت میں آیت کے الفاظ کا اتباع ہے جو مضامین سیدھے سیدھے اُن الفاظ سے سمجھ میں آویں بیان کر دے تو بہت سا کام کم ہوگیا۔ غرض اُس طریق میں بہت بکھیڑے تھے نیز ضرر بھی دیکھا تو اس سنت پر عمل کرنے کو جی چاہا ما خیر بین امرین الا اختار اھونھما اور اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ طریقہ بدل دیا جاوے اس واسطے اب میں سیدھے سیدھے ترجمہ پر اکتفا کروں گا بعضوں کا خیال یہ ہے کہ اس طریق کے بیان میں مزا نہیں ہے اس کا جواب یہ ہے کہ مزا مقصود نہیں شفا مقصود ہے۔

دیکھئے حکیم محمود خاں مریض کے لئے نسخہ لکھتے تھے۔ اس میں مزہ کہاں ہوتا تھا بلکہ بعضے نسخے تو نہایت بدمزہ ہوتے ہوں گے پھر یہ تھوڑا ہی ممکن تھا کہ کوئی بدمزہ ہونے کی وجہ سے اس نسخہ کو چھوڑ کر مومن خاں کے مزہ دار اشعار پڑھ لیا کرے مزہ شعر میں ہے مگر شفا نسخہ میں ہے حتیٰ کہ بمقتضائے انا عند ظن عبدی بی بعض دفعہ صرف کاغذ گھول کر پلا دینے سے شفا ہوگئی اور مومن خان اور ذوق اور شوق کے تمام دیوان بھی

پی جاوے تو شفا نہیں ہو سکتی تو مقصود نفع ہے نہ مزہ جس کی نظر مقصود پر ہے اس کے نزدیک دونوں طریقے یکساں ہیں اصلاح کے مضامین اس میں بھی ہوں گے کیونکہ نرا ترجمہ سہی مگر ہے تو ترجمہ اسی کلام کا جس میں سرتا پا اصلاح بھری ہوئی ہے رنگینی نہ سہی اور اس بے مزہ طریق کو اختیار کرنے میں بھی ایک نفع ہے کہ لوگ مجھے وعظ کے لئے کم بلاویں گے اور گرمی میں دق نہ کریں گے مجھے آرام ملے گا نیز بلانے والوں کی محبت بھی معلوم ہو جاوے گی کہ صرف اپنے کام کے لئے بلاتے ہیں یا محبت ہی اس کی محرک ہوئی ہے چنانچہ یہاں کے بلانے والوں سے میں نے صاف کہدیا تھا کہ اگر وعظ مقصود ہے تو میں وعظ تو اب پھیکا اور بے مزہ کہوں گا اگر اس پر بھی آپ حضرات راضی ہوں تو میں حاضر ہوں چنانچہ اس وعدہ کا اس وقت ایفا کروں گا حضرات داعین کی محبت ہے کہ انھوں نے اس کو منظور کیا گویا اصل محبت تو یہی ہے کہ روٹیاں کھلا دیں اور بوٹیاں نہ نوچیں اور کام لے کر اور پوری محنت کرا کے روٹی دی تو کیا احسان کیا یہ تو مزدوری ہے خیر یہ تو لطیفہ تھا۔ اصل وجہ اس تبدیل طریقہ کی محض مضرات ہیں جن کا اب احساس ہوا بیان تو کیا جاتا ہے نفع کے لئے اور پیدا ہوا نقصان تو کیوں ایسا طریقہ اختیار کیا جاوے میں نے اترے پترے سب کھولدیئے مجھے بناوٹ پسند نہیں جو بات صاف ہے وہ کہدی اب جس کا جی چاہے وعظ سنے اور جس کا جی چاہے نہ سُنے۔ اب میں ترجمہ کرتا ہوں

فرماتے ہیں وما قدروا اللہ حق قدرہٖ لوگوں نے حق تعالیٰ کی ایسی عظمت نہ کی جیسا عظمت کرنا چاہیئے تھا حالانکہ ان کی عظمت وہ ہے کہ والارض جمیعًا قبضتہٗ یوم القیمۃ تمام زمین ان کی ایک مٹھی میں ہوگی قیامت میں۔ والسمٰوات مطویات بیمینہ اور کل آسمان ان کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے یمین کا لفظ اور ایسی ہی قبضہ کا لفظ متشابہات میں سے ہے جن کا بیان کوئی کر نہیں سکتا صرف اتنا معلوم ہے کہ ان الفاظ کے معنی متعارف مراد نہیں حدیث میں ہے فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کلتا یدی ربی یمین یعنی خدائے تعالےٰ کے دونوں ہاتھ یمین ہیں

مراد یہ ہے کہ قوت میں یمین ہی کی طرح ہیں وہاں فرق نہیں ہے کہ ایک ہاتھ قوی اور ایک ضعیف ہو جیسے مخلوقات میں متعارف ہے کہ داہنا ہاتھ قوی اور بایاں ضعیف ہوتا ہے متشابہات کے متعلق تحقیق یہی ہے کہ ان میں گفتگو نہ کرے اور ان پر ایمان رکھے مثلاً خدائے تعالے کے لئے شریعت میں ید کا اطلاق آیا ہے لہذا اس کا تو قائل ہو کہ ید ثابت ہے مگر اس کی کیفیت وغیرہ سے بحث نہ کرے۔ بس سیدھی بات ہے جیسا اللہ ویسا ہی اس کا ید ہم کو اللہ کی حقیقت کہاں معلوم ہے اور اس کا علم بالکنہ کہاں حاصل ہے بس ایسے ہی اُس کے ید کا بھی علم نہیں ہے۔ یہ تو قبضہ اور یمینہ کی بحث ہوئی اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمین پر قدرت بیان کرنے کے لئے تو قبضہ فرمایا اور آسمانوں کے لئے مطویات بیمینہ فرمایا۔ دونوں کے واسطے عنوانوں میں فرق کیوں کیا کہ زمین کی بابت تو فرمایا کہ مٹھی میں ہوگی اور آسمانوں کی نسبت فرمایا کہ لپٹے ہوئے ہاتھ میں ہوں گے گویا ہتھیلی پر رکھے ہیں سیدھی بات یہ تھی کہ یوں فرما دیتے۔ والارض و السموات جمیعًا قبضتہ یعنی زمین و آسمان سب اس کی مٹھی میں ہوں گے اس کا نکتہ ایک ان پڑھ آدمی کی سمجھ میں آیا بلکہ آدمی کے نہیں آدمن کے سمجھ میں آیا جو مجھ سے ترجمہ پڑھا کرتی تھی اور مجھے وہ نکتہ بہت پسند آیا حتیٰ کہ میں نے اس کو اپنی کتاب میں درج بھی کر دیا میں نے اس سے پوچھا کہ یہ فرق عنوانوں میں کیوں کیا گیا ہے کہا کہ زمین بہ نسبت آسمان کے چھوٹی ہے اور چھوٹی چیز کے لئے یہی عادت ہے کہ مٹھی میں بند کی جاتی ہے اور بڑی چیز کے لئے عادت یہ ہے کہ لپیٹ کر کھلے ہاتھ پر رکھ لی جاتی ہے مٹھی کو بند نہیں کیا جاتا اس واسطے زمین کے لئے وہ عنوان اختیار کیا گیا اور آسمان کے لئے یہ دیکھئے یہ علوم قرآنیہ ہیں ان میں خصوصیت پڑھے لکھوں اور علماء فضلاء کی نہیں ہے جس کو حق تعالے چاہیں القاء کر دیں خدا کی دین ہے جس کو چاہے دیدیں بعض وقت ایک عامی آدمی کی سمجھ میں وہ بات آجاتی ہے جو ایک بڑے عالم کی سمجھ میں نہیں آتی اور ایسا بہت ہوتا ہے کہ عامی آدمیوں کی سمجھ میں دین کی بات آجاتی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ دین فطرت کے بہت قریب ہے جس کی فطرت میں سلامت ہو

اس کا ذہن اس تک پہونچ جاتا ہے گو عامی آدمی اس مضمون کو اصطلاحی الفاظ میں ادا نہ کر سکے مگر اعتبار تو معانی کا ہے الفاظ کوتاہ ہوں تو کیا حرج ہے یہ نور ایمان کی برکت ہے اور نور ایمان کم و بیش ہر مسلمان کو حاصل ہے خواص کی کچھ خصوصیت نہیں مگر اس کو سنکر ان پڑھ لوگ فخر نہ کرنے لگیں کہ ہم بھی نکات جانتے ہیں کیونکہ ان کے نکات صحیح و غلط ہونے کا معیار یہی ہے کہ اہل علم ان کے جس نکتہ کو صحیح کہیں وہ صحیح ہے ورنہ غلط ہے ان کے واردات اہل علم کی رجسٹری کے محتاج ہیں علم اور بے علمی برابر نہیں ہے بلکہ عوام تو کیا غیر متبحرین کی واردات بھی جبھی معتبر ہیں جب کہ متبحرین کے نزدیک صحیح ہوں۔ اصل میں تو ان کے صحیح ہونے کا معیار یہ ہے کہ شریعت کے موافق ہوں اور شریعت کے موافق ہونے کو پہچاننا یہ متبحرین کا کام ہے اس واسطے یہ کہدیا گیا کہ وہ متبحرین کے نزدیک صحیح ہوں آج اس غلطی میں اچھے اچھے پڑھے لکھے مبتلا ہیں ذرا سی کسی کو کوئی کیفیت حاصل ہوئی یا کوئی وارد قلب پر آیا اور اس کو وحی سمجھنے لگے اور کہتے ہیں ہم کو یہ القاء ہوا ہے گویا یہ مقدمہ ان کے نزدیک مسلم ہے کہ القاء شدہ بات کبھی غلط نہیں ہوتی صاحبو یہ بڑی غلطی ہے۔ القاء کا منجانب اللہ ہونا ضروری نہیں القاء منجانب شیطان بھی ہوتا ہے اور بہت ہوتا ہے خود نص موجود ہے وان الشیاطین لیوحون الی اولیاءھم یعنی شیاطین اپنے ہم جنسوں پر القاء کرتے ہیں آجکل اس غلطی میں بڑے بڑے لوگ مبتلا ہیں اسی غلطی میں پڑ کر کوئی مدعی ولایت بن گیا اور کوئی مدعی نبوت صاحبو جب نص موجود ہے کہ القاء شیطانی بھی ہوتا ہے تو پھر ہر القاء کو صحیح اور قطعی سمجھ لینا کیسے ٹھیک ہے اس کے لئے ایک یہی معیار ہے کہ اگر وہ شریعت کے موافق ہے تو صحیح ہے ورنہ غلط ہے۔ اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے کبھی اپنے حالات اور واردات پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے تاوقتیکہ کوئی متبحر اور تجربہ کار اس کو شریعت کے موافق نہ کہے اہل فن نے بالتصریح لکھ دیا ہے کہ کل حقیقۃ ردتہا الشریعۃ فہی زندقۃ۔

ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ کو اس بارہ میں اس قدر احتیاط تھی کہ علماء کے

سامنے کوئی نکتہ بیان فرماتے تو یہ بھی فرمادیتے کہ بھائی میرے نکات اور اقوال ہیں تم غور کرلینا اگر کچھ غلطی ہو تو بتلادینا اور اس بارے میں ادب سے کام نہ لینا میں کہہ چکا اب تم ذمہ دار ہو۔

جب ایسے کاملین اور عارفین کو اس قدر احتیاط تھی تو ہما و شما چہ رسد۔ اس باب میں ہرگز جرأت نہیں کرنا چاہیئے کسی حال اور کسی وارد کو صحیح مت سمجھو جب تک کہ وہ شریعت کے موافق نہ ہو اور شریعت کے موافق ہونے کے لئے بھی اپنی تحقیق پہ بس نہ کرو بلکہ اس کو اس وقت تک شریعت کے موافق نہ سمجھو جب تک کوئی متبحر عالم اس کو شریعت کے موافق نہ کہدے۔ غرض عام لوگ اپنی یہ ایک تعریف سن کر کہ عوام کی عوام کی سمجھ میں بھی نکات صحیح طور پر آجاتے ہیں کیونکہ دین فطرت کے بہت قریب ہے اور ان لوگوں کی فطرت میں تصنع وغیرہ نہ ہونے کی وجہ سے بہت سلامتی ہوتی ہے شریعت میں نکات نکالنے کی جرأت نہ کریں ورنہ وہ قصہ ہوگا کہ ایک ہمارے ابتدائی کتابوں کے استاد تھے ان کے پاس ایک درزی بیٹھا تھا اس نے آمنت باللہ بھی اور والبعث بعد الموت پر ایک آہ کی اور کہا کہ بادل کی بھی موت ہے ع بعد کا ظاہر نہ ہوا تھا الف پڑھا تھا اس لئے یہ نکتہ مستنبط کیا یا کسی نے من ذالذی یشفع کا ترجمہ کیا تھا۔ من ذل جو شخص ذلیل کرے ذی یعنی نفس کو (شاید ذی کو جی پڑھا یا اسم اشارہ سمجھا) یشف شفا پاوے گا۔ ع یاد رکھ ایسے ہی ایک صاحب تھے کہ وہ بی بی کو تو خوب کھلاتے پلاتے تھے اور ان کی ماں بھی موجود تھی اس کی خبرگیری نہ کرتے تھے ان سے ایک مولوی صاحب نے کہا کہ تو ماں کو کچھ کھانے کو کیوں نہیں دیتا۔ کہا قرآن میں تو کھلانے کا حکم بی بی کے لئے آیا ہے۔ واطعمھم من جوع یعنی جوئے کو کھانا دو (جوئے بمعنی زوجہ) مولوی صاحب بھی بڑے حاضر جواب تھے۔ کہا بھلے مانس بی بی کے لئے تو کھانا ہی دینے کا حکم آیا ہے اور ماں کے لئے تو یہ حکم ہے کہ مالہٗ وما کسب یعنی ماں کا سب مال ہے جو کچھ تیرے پاس ہے سب ماں کا ہے اس حکم کے رو سے تو جوئے کا کھانا تو الگ رہا تو بھی اپنے مال میں سے بلا اجازت ماں کے کچھ نہیں کھا سکتا۔ اب وہ لاجواب ہوئے

یہاں طالب علمانہ ذرا سا اشکال ہے اس کو اور اس کے حل کو بھی سن لیجئے وہ یہ کہ اس شخص نے جو استدلال قرآن شریف سے کیا یعنی اطعمہم من جوع کے معنی یہ لئے کہ بی بی کو کھانا دے اس کو تو غلط کہا گیا اور جاہلانہ نکات میں شامل کیا گیا لیکن اس کے جواب میں مولوی صاحب نے بھی ایسی گنوارو بات کہی کہ وہ بھی بجنسہ ویسی ہی ہے کیونکہ ماکسب کے معنے عربی زبان میں یہ کہاں ہیں کہ بیٹے کا مال سب ماں ہی کی ملک ہے پھر ایک گنوار ہی پر کیا الزام ہے معلوم ہوا کہ علما بھی ایسے نکلتے نکالتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو ہم یہ نہیں کہتے کہ مولوی صاحب نے ٹھیک جواب دیا ہے اور قرآن کا یہی مدلول ہے اور نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ مولوی صاحب کا یہ نکتہ مقبول ہے اور اس گنوار کا وہ نکتہ مقبول نہیں بلکہ ہم دونوں کو یہی کہتے ہیں کہ یہ جاہلانہ نکات ہیں دونوں یکساں ہیں اور اس قسم کے نکات قرآن میں نکالنا درست نہیں یہ مولوی صاحب والا نکتہ بھی غلط ہے اور بجنسہ ویسا ہی ہے جیسا وہ گنوار والا نکتہ ہے۔ لیکن چونکہ یہ واقعہ ایک بڑے عالم کا ہے اس واسطے یہ نہیں کہا جاتا کہ قرآن میں تحریف کی گئی ہے یا وہ ماکسب کے معنی یہی سمجھتے تھے بلکہ اس میں تاویل کی جائے گی کہ مولوی صاحب نے جواب الزامی دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر ایسے نکات سے حکم ثابت ہو سکتا ہے جیسا اس نے لایلاف سے جوئے کا حق ثابت کیا تو تبّت سے مال کا سب حق ثابت ہو جاوے گا یہ جواب اس کے ساتھ استدلال کے رد کرنے کے لئے بہت کافی ہے یہ تقریر ہے اس طالبعلمانہ شبہ کی اور اس کے جواب کی غرض یہ ہے کہ عوام کے نکات اکثر ایسے لغو ہوتے ہیں جیسے مثالوں میں بیان ہوئے لہذا عوام کو قرآن میں نکات نکالنے کی اجازت نہیں اور اس سے عوام خوش نہ ہوں کہ ایک شخص کے ایک نکتہ کی میں نے تعریف کر دی آیت والارض جمیعاً قبضتہ اور والسموٰت مطویات بیمینہ کے متعلق اس کی سمجھ میں آگیا تھا اور میں نے تعریف میں یہ لفظ کہدیا کہ عوام کا مذاق چونکہ فطرت کے بہت قریب ہوتا ہے اور دین بھی فطرت کے موافق ہے اس واسطے دین کی بات ان کی سمجھ میں آجاتی ہے مطلب یہ ہے

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عوام کے ذہن میں کوئی صحیح نکتہ آجاتا ہے اور علما کو بھی یہ نہ چاہیئے کہ ہر بات کو صرف یہ دیکھ کر کہ عوام کے منہ سے نکلی ہوئی ہے غلط سمجھنے لگیں بلکہ اس بات میں غور کریں اور دیکھیں کہ قواعد شرعی کے مخالف ہے یا نہیں اگر مخالف نہ ہو تو اس کو مان لیں اور اس کو اپنے لئے کسر شان نہ سمجھیں دین کچھ ان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے دین تو سب کی مشترک جائداد ہے نور ایمان سب میں موجود ہے اس کی برکت سے اگر کسی وقت ایک عامی آدمی کی سمجھ میں ایسی بات آجاوے جو کسی عالم کی سمجھ میں نہ آئی ہو تو کیا استعجاب ہے۔ خدا کی دین ہے جس کو چاہیں دیدیں اسی قبیل سے یہ نکتہ ہے جو والارض جمیعًا قبضته یوم القیمة والسموٰت مطویات بیمینه میں ایک عامی آدمی کے منہ سے نکلا مجھے یہ پسند ہوا لہذا میں نے اس کو اپنی کتاب تفسیر بیان القرآن میں بھی درج کر دیا ہے آگے فرماتے ہیں سبحانه وتعالیٰ عما یشرکون۔ ترجمہ یہ ہے کہ پاک ہے حق تعالیٰ اور برتر ہے اس سے جو شرک کرتے ہیں دیکھئے جملہ سابقہ پر اس جملہ کو مترتب کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام آیت سے مقصود نفی شرک ہے جس کا میں نے شروع ہی میں دعویٰ کیا تھا کہ گو بظاہر یہاں معاد کا بیان ہے مگر مقصود اس سے توحید الٰہی کا اثبات ہے جس کو شکایت کے عنوان میں اس طرح ارشاد فرمایا گیا کہ لوگوں نے خدائے تعالیٰ کی عظمت نہیں پہچانی اور اب اس کی شرح کی ہے کہ سبحنه وتعالےٰ عما یشرکون اس میں تصریحًا شرک سے تنزیہ ہے۔ غرض آیت کے الفاظ سے بہت وضوح کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں مضمونوں میں سے یعنی توحید اور معاد میں سے گو مضمون معاد کو طول کے ساتھ بیان کیا گیا ہے مگر مقصود اثبات توحید ہے آگے فرماتے ہیں ونفخ فی الصور فصعق من فی السموٰات ومن فی الارض الا من شاء اللہ معنی یہ ہیں کہ نفخ صور سے گر پڑیں گے تمام وہ لوگ جو آسمان اور زمین میں ہیں۔ صعق کے معنی بے ہوش ہو کر گر پڑنا ہیں۔ تو یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ مرجاویں گے کیونکہ مرنے میں بے ہوشی اور گر پڑنا ہوتا ہی ہے اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ غشی طاری

ہو جاوے گی کیونکہ صور کی آواز ایسی ہولناک ہوگی کہ سب کے حواس جاتے رہیں گے الا من شاء اللہ من فی السموٰات ومن فی الارض سے مستثنیٰ کیا من شاء اللہ کو معنی یہ ہوئے کہ تمام آسمان اور زمین کے لوگ بے ہوش ہو جاویں گے سوائے اُس کے جس کا بے ہوش ہونا حق تعالےٰ کو منظور نہ ہوا اس سے بظاہر معلوم ہوا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو بے ہوش نہ ہوں گے۔ باقی یہ اللہ کو معلوم ہے کہ وہ کون کون ہیں اور ایک توجیہہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ الا من شاء اللہ گو بظاہر استثنار ہے مگر بمعنی شرط کے ہے جس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ کسی کا بے ہوش نہ ہونا مشیت ایزدی پر ہے اگر چاہیں تو کسی کو صعق کے حکم کلی سے مستثنیٰ بھی کرسکتے ہیں تو اس کا تحقق جب بھی صحیح ہے کہ کسی کو بھی صعق سے نہ بچایا جائے کیونکہ ماحصل اس کا یہ ہوا کہ مستثنیٰ کرنا مشیت پر موقوف ہے مشیت اس کے وقوع کے متعلق ہوئی تو وقوع ہوگا اور عدم وقوع کے متعلق ہوئی تو عدم وقوع ہوگا تو یہ مضمون ہر حال میں صادق رہا کہ بعض افراد بشرط مشیت مستثنیٰ ہوسکتے ہیں اس کے لئے استثنار کا وقوع ضروری نہیں ثم نفخ فیہ اخریٰ فاذا ھم قیام ینظرون۔ ترجمہ پھر نفخ صور دوبارہ ہوگا تو ایک دم سب کھڑے ہو جاویں گے اور محشر کا تماشا پیش نظر ہوگا۔ اگر صعق کے معنے مرجانے کے ہیں تو یہ معنے ہوئے کہ مردے زندہ ہو جاویں گے اور اگر صعق کے معنے بے ہوش ہو جانے کے ہوں تو یہ معنی ہوئے کہ بے ہوشی سے ہوش میں آجاویں گے اس میں اختلاف ہے کہ نفخ صور کے دفعہ ہوگا۔ اس آیت سے بتفسیر مشہور اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ایک نفخہ سے تمام عالم مرجاوے گا مگر میں نے کہا تھا کہ صعق کے معنے بے ہوش ہوجانے کے بھی ہیں اس لحاظ سے اس کے معنے یہ بیان کئے ہیں کہ جو لوگ اس وقت زندہ ہوں گے وہ مرجاویں گے اور جو لوگ اس سے پہلے مرچکے ہیں ان کی روحیں بے ہوش ہوجاویں گی اور نفخہ ثانیہ سے مردے زندہ ہوجاویں گے اور بے ہوش روحیں ہوش میں آجاویں گی اسی کا نام حشر ہے سب اگلے پچھلے مردے انسان اور حیوان اور حشرات ایک ایک زندہ ہوجاویں گے

یہاں یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ زمین ان سب کے لئے کافی کیسے ہوگی کیونکہ اگر مردم شماری سے دیکھا جاوے تو اولین وآخرین تمام انسانوں ہی کی تعداد اس قدر ہوسکتی ہے کہ زمین ان کے جمع ہونے کے لئے کافی نہ ہو چہ جائیکہ تمام وحوش وطیور وغیرہ سب کے سب جمع ہوں۔ جواب یہ ہے کہ واقعی زمین موجودہ حالت میں تو اس کے لئے کافی نہیں ہوسکتی لیکن اس وقت زمین کو وسعت دیدی جاوے گی جیسے ربڑ کو پھیلا دیں تو وہ بڑھ جاتا ہے کہ ربڑ پہلے چھوٹا ہوتا ہے مگر کھینچنے سے بڑھ جاتا ہے یہی خاصیت زمین میں ہے کہ اس وقت چھوٹی ہے اور اس وقت اس کو کھینچ کر بڑھا دیا جاوے گا۔ اور یہ بات عام طبائع میں بھی محال نہیں بلکہ ممکن ہے چنانچہ محاورات میں بولتے ہیں کہ زمین کی تنابیں کھینچ گئیں معلوم ہوا کہ عوام بھی زمین کو بڑھنے اور کھینچنے کے قابل سمجھتے ہیں بلفظ دیگر یوں کہئے کہ زمین میں تخلخل ہو جاوے گا تخلخل کو حکماء نے بھی ممکن مانا ہے تخلخل کے لفظ سے یہ مضمون سہولت سے ذہن نشین ہو جاتا ہے اور استبعاد رفع ہو جاتا ہے کیونکہ تخلخل کا امکان ذہنوں میں موجود ہے۔

یہاں سے ایک بات طالب علموں کے کام کی بھی نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ حدیث میں ایک قصہ آتا ہے کہ ایک شخص نے نناوے قتل کئے تھے اس کے بعد اس کو کچھ تنبہ ہوا اور خیال ہوا کہ میری مغفرت کیسے ہوگی۔ اس کے دریافت کرنے کے لئے ایک عالم کے پاس پہونچے اور سب واقعہ بیان کیا کہ میں نے ننانوے قتل کئے ہیں میری مغفرت کی بھی کوئی صورت ہے وہ خفا ہوئے اور کہا کہ ایک ہی قتل دوزخ میں جانے کیلئے کافی ہے چہ جائیکہ ننانوے قتل جاؤ اب کوئی صورت بخشش کی نہیں ہوسکتی اُسے بہت رنج ہوا اور غصہ بھی آیا اور کہا جب یہی بات ہے کہ دوزخ میں جانا ضرور ہے تو آپ کو بھی کیوں چھوڑوں جس نے میرے دل پر نشتر لگایا ہے جہاں ننانوے قتل ہوئے ہیں ایک اور بھی سہی پورے سو بھی کیوں نہ ہو جائیں۔ چنانچہ ان کو بھی قتل کر دیا مگر پھر دل نے نہ مانا اور دوسرے عالم کے پاس پہنچا اور سارا واقعہ بیان کیا کہ ننانوے قتل کئے تھے اور ایک قتل ابھی کر کے آیا ہوں میری مغفرت کی بھی کوئی صورت ہے۔

میں توبہ کرلوں تو میری بخشش ہو سکتی ہے یا نہیں وہ حکیم بھی تھے اور شاید کچھ اس شخص سے کچھ خوف بھی ہوا ہو اس لئے خیال ہوا کہ اس وقت ترہیب کا موقعہ نہیں ہے ترغیب کی ضرورت ہے ترغیب ہی سے اثر ہوگا کہا توبہ سب کی قبول ہے سو قتل کیا اگر ہزار بھی کئے ہوں تب بھی توبہ قبول ہو سکتی ہے تم توبہ کرو مگر تکمیل توبہ کی شرط یہ ہے کہ اس سرزمین سے چلے جاؤ اور کسی نیک بستی میں جاکر رہو اس نے ایسا ہی کیا ان کے ہاتھ پر توبہ کی اور ایک دوسری بستی کو چلا راستہ میں موت کا وقت آگیا اور ملک الموت علیہ السلام نے اس کی جان قبض کرلی اس وقت اس کو نہایت یاس ہوئی اور کچھ تو نہ ہوسکا اتنا کیا کہ اپنا سینہ اسی بستی کی طرف بڑھا دیا جہاں جانا تھا۔ اب اس کے پاس ملائکہ دونوں قسم کے آئے عذاب کے بھی اور رحمت کے بھی۔ وہ کہتے تھے کہ اس کی روح کو ہم لے جائیں گے، اور وہ کہتے تھے ہم لے جائیں گے۔ اخر اس جھگڑے کے فیصلے کے لئے حق تعالےٰ نے ایک فرشتہ بھیجا اور اس نے کہا اس راستہ کی پیمائش کرو جس بستی کے یہ شخص قریب ہو اسی کا حکم ہوگا واقع میں وہ شخص اپنی بستی کے قریب تھا تو فیصلہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ عذاب ہی کے فرشتے غالب آتے مگر حق تعالےٰ نے خود ہی یہ فیصلہ کیا اور خود ہی اس کی تکمیل بھی فرمادی یہ اس کی نیت کی برکت تھی کہ اس سے جو کچھ ہوسکتا تھا کرچکا اور وہ ارادہ ہے یہ اس کے اختیار سے باہر تھا کہ دوسری بستی میں۔ پہنچ جاوے آدمی کا اختیاری فعل نیت کرتا ہے اور بقدر وسعت کوشش کرتا رہے اس کی تکمیل اور نتیجہ کا متفرع ہوجانا یہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں وہ شخص نیت کرچکا اور جہاں تک اس کے امکان میں تھا چل چکا۔ حق تعالیٰ نے اس پر نتیجہ اپنی رحمت سے متفرع فرمایا اس طرح باوجودیکہ وہ اپنی بستی سے قریب تھا لیکن زمین کے اس حصے کو حکم دیا کہ دور ہوجا اور دوسرے حصے کو حکم دیا کہ قریب ہوجا بس فرشتوں نے پیمائش کی تو وہ اس دوسری بستی سے قریب ثابت ہوا جہاں کو جارہا تھا اور قریب بھی صرف اس قدر کہ اس کا سینہ اس طرف بڑھا ہوا تھا لہٰذا رحمت کے فرشتے غالب آئے۔ اس قصہ میں بیان کرنا اس بات کا مقصود ہے کہ کوئی طالب علم پوچھ سکتا ہے کہ

وہ دونوں بستیاں کس طرح قریب اور بعید ہوگئیں۔ جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی قدرت سے کچھ بعید نہیں اور اس میں اشکال کرنے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ جس بات کے استحالہ پر کوئی دلیل عقلی قائم نہیں ہے وہ ممکن ہے پھر ممکن کے وقوع میں کیا استبعاب ہے مگر طبیعت چاہتی ہے کہ اس قریب اور بعید ہونے کی کوئی صورت بھی بیان کی جائے جس سے قریب الی الفہم ہوجاوے اور استبعاب بالکل باقی نہ رہے وہ یہ ہے کہ اس وقت تخلخل اور تکاثف کا حکم ہوا ایک حصہ میں تخلخل ہوا اور اس کی مسافت بڑھ گئی اور دوسرے حصہ میں تکاثف ہوا اس کے اجزا سمٹ گئے اور مسافت گھٹ گئی پھر بعد میں خواہ ہر حصہ اپنی حالت سابقہ پر لوٹ آیا ہو یا اسی حالت میں رہ گیا ہو اس تقریر سے واقعہ قریب الی الفہم ہوجاتا ہے اور استبعاب رفع ہوجاتا ہے مگر دعویٰ نہیں کیا جاتا کہ یہی صورت ہوئی تھی صرف احتمال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ اس قرب اور بعد کے ہونے کی یہ بھی صورت ممکن ہے سو دفع اشکال کے واسطے یہ احتمال بھی کافی ہے اب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ حدیث میں جو آیا ہے کہ قیامت میں تمام عالم کے حشر کے لئے زمین کافی ہوگی اس کی توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس زمین کے اجزا میں تخلخل ہوجائے گا جس سے اتنی وسعت ہوجائے گی کہ حشر کے لئے کافی ہو اب آگے محشر کے واقعات گنوائے ہیں۔ ایک واقعہ یہ ہے واشرقت الارض بنور ربہا یعنی زمین چمک اٹھے گی خدائے تعالےٰ کے نور سے خود آیت میں ہے کہ یہ نور حق تعالیٰ کی تجلی کا ہوگا۔ دوسری آیت میں حق تعالیٰ کی آمد صاف الفاظ میں ہے ۔ وجاء ربک والملک صفا صفا یہ آئتیں متشابہات میں سے ہیں ان کی حقیقت سے کاوش کرنا ٹھیک نہیں بس سیدھے سیدھے یہ معنی کہے جاویں کہ حق تعالےٰ زمین کی طرف متوجہ ہوں گے اور تشریف لاویں گے یہ تو ترجمہ ہوگیا آیت کا باقی اس کے حقیقی معنی کی نسبت یہی کہیں گے کہ اللہ اعلم بمرادہ بذالک حق تعالےٰ ہی کا کلام ہے اور انھیں کو اس کے معنے خوب معلوم ہیں یہ آیت ایسی ہے جیسے آیت الرحمٰن علے العرش استوٰی ہے کہ اس کے معنی میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ استواء یلیق یہ اس وقت استواء عرش پر ہے

بلا کیفیت

اور اس وقت یعنی قیامت میں زمین کی طرف مجیئ ہو یہ معنی ہیں جاء ربك کے اور اگر مجیئ سے کیف سمجھ میں نہ آوے تو تقریب الی الفہم کے لئے یوں سمجھ لیجئے کہ جب بادشاہ کے خدم وحشم آتے ہیں تو کہتے ہیں بادشاہ آرہا ہے حالانکہ ابھی بادشاہ نہیں آیا تو ایسی ہی جاء ربك سے معنے مجازی مراد لے لیجئے کہ حق تعالیٰ کے خدم وحشم آویں گے یعنی فرشتے مع جنت اور نار وغیرہ آئیں گے اور عدالت قائم ہوگی اور حساب وکتاب ہوگا مگر اس سے جزماً یہ نہ سمجھا جاوے کہ یہی معنی مراد ہیں کیونکہ متشابہات کے بارہ میں سلف کا مسلک یہی ہے کہ معنی نہ بیان کئے جاویں اور ان کے علم کو حق تعالےٰ کی سپرد کیا جاوے نہ حقیقی معنوں سے بحث کی جاوے نہ مجازی سے بس یہ کہہ کر چھوڑ دیا جاوے کہ اللہ اعلم بمراده بذلك مگر متاخرین نے عوام کی وحشت رفع کرنے کے لئے معنی مجازی بیان کرنے کی اجازت دی ہے مگر ان کا مطلب یہ نہیں کہ جو معنی مجازی بیان کئے جائیں ان پر یقین کر لیا جاوے کہ یہی معنی مراد ہیں اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ جو واقعات محشر کی آیت میں مذکور ہیں وہ فرضی نہیں ہیں بلکہ واقعی ہیں آج کل اس مذاق کے لوگ بھی بہت ہیں جن کو ان واقعات سے اس قدر استعجاب ہوتا ہے کہ ان کو ناممکن کہدیا ہے اور آیات اور نصوص میں یہ تاویل کرتے ہیں کہ ترغیب وترہیب کے لئے یہ فرضی باتیں فرمادی ہیں تاکہ جنت کے شوق میں اعمالِ صالحہ کریں اور دوزخ سے ڈر کر معاصی سے باز رہیں اور جو واقعہ قیامت کا بیان کیا جاتا ہے اس کی نظیر مانگتے ہیں۔

صاحبو! بہت سے واقعات وہاں کے ایسے ہیں جن کی نظیر یہاں موجود نہیں ہے کیونکہ دنیا عالم طبائع ہے اور وہاں طبائع کو دخل نہ ہوگا. لیکن چونکہ ان کے استحالہ پر کوئی دلیل عقلی نہیں ہے اس واسطے ان کو ممکن کہا جاوے گا اور ممکن کے وقوع کا اگر صحیح دلیل سے دعوے کیا جاوے

تو کسی کو اس کی تکذیب کا یا اس میں کوئی اشکال نکالنے کا حق نہیں ہو سکتا لہذا ان لوگوں کا خیال بالکل غلط ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ حق تعالے محض ترغیب و ترہیب کے لیئے فرضی واقعات بیان فرمائیں جب کلام میں فرضیت پر کوئی لفظ دال نہیں تو ان کو فرضی مثال لکھنے کے لیئے کوئی دلیل ہونی چاہیئے اور اگر بلا دلیل کسی بات کو فرضی کہا جا سکتا ہے تو اس طرح تو اور اوامر و نواہی اور احکام سے بھی اطمینان اٹھ جائے گا کیونکہ ممکن ہے کہ یہ بھی سب فرضی باتیں ہوں حالانکہ کوئی مسلمان اس کا قائل نہیں ہو سکتا ووضع الکتاب۔ ترجمہ اور نامۂ اعمال لائے جاویں گے یعنی سب کے ہاتھوں میں دیئے جاویں گے کیفیت اُن کے دیئے جانے کی دوسری آیتوں میں مذکور ہے وہ یہ ہے کہ نیکوں کے نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں دیئے جاویں گے اور بدوں کے بائیں ہاتھ میں یہ نامۂ اعمال کا لایا جانا ایسا ہے جیسے عدالت میں مسل پیش کی جاتی ہے کہ اب اس کے موافق مقدمہ ہوگا اور جرح قدح ہوگی وجیئی بالنبیین۔ ترجمہ۔ انبیاء علیہم السلام کو بھی بلایا جاوے گا یہ ایسا ہے جیسے عدالت میں گواہ بلائے جاتے ہیں۔ و قضی بینھم بالحق وھم لا یظلمون (ترجمہ) اور تمام فیصلے ٹھیک ٹھیک کئے جاویں گے اور کسی کا حق نہیں مارا جاوے گا یعنی یہ نہیں ہوگا کہ کسی نے کوئی نیکی ذرا سی بھی کی ہو اور وہ نامۂ اعمال میں نہ ہو یا کوئی برائی کسی نے نہ کی ہو اور وہ نامۂ اعمال میں درج کر دی گئی ہو بلکہ بمقتضائے سبقت رحمتی علی غضبی ایسا ہوگا کہ ایک نیکی انسان نے نہ کی ہو اور نامۂ اعمال میں درج[1] ہو وہاں داد و دہش اور انعامات بہت ہوں گے بات بات پر رحمت ہوگی، بعضوں کی بخشش صرف اتنی سی بات پر ہو جاوے گی کہ راستہ سے انھوں نے ایک کانٹا ہٹا دیا تھا۔ ایک عورت کی بخشش اس بات پر ہو جاوے گی کہ اس نے ایک کتے کو

---

[1] مثلاً جن نیکیوں کا ارادہ کیا اور کرنے نہیں پایا یا جو اعمال بیماری یا سفر میں ناغہ ہو گئے یا اس کے مرنے کے بعد کسی کے بخشنے سے نامۂ اعمال میں درج کر دیئے گئے ۱۲ محمد مصطفےٰ

دیکھا کہ کنوے کے کنارہ پر پیاس کے مارے گیلی مٹی چاٹ رہا ہے اس کو رحم آیا اور اپنے چرمی موزہ کو اس نے اپنی اوڑھنی میں باندھ کر کنوے میں لٹکا کر پانی نکالا اور اس کو پلایا۔ وہ عورت بدکار تھی لیکن حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اس نے ہماری مخلوق پر رحم کیا ہے لہٰذا ہم اس پر رحم کرتے ہیں۔ یہ دونوں قصے حدیث میں آئے ہیں اور مکشوفات تو ایسے بہت ہیں مثلاً ایک شخص کا قصہ ہے کہ وہ نیکوکار اور پرہیزگار تھا اس کا انتقال ہوگیا کسی نے خواب میں اس کو دیکھا پوچھا کہئے کیا معاملہ ہوا کہا یہاں مجاہدے اور ریاضتیں تو کچھ کام نہیں آئیں (مطلب یہ ہے کہ ان میں کسر تھی اور وہ اس قابل نہ تھے کہ ان پر بخشش کا استحقاق سمجھا جاوے اس واسطے کہا گیا کہ کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ مجاہدہ وریاضت اور اعمال بیکار چیز ہیں ہرگز نہیں۔ یہ ضرور کام کی چیزیں ہیں مگر ایسے اعمال کر کون سکتا ہے۔ جو دربارِ خداوندی میں پیش کئے جاسکیں اس واسطے کہا ہے ؎

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیر خویش عذر بدرگاہِ خدا آورد

(بندہ اچھا وہی ہے جو حق تعالیٰ کی بارگاہ میں استغفار کرتا رہے اور اعتراف قصور کرتا رہے)

ورنہ سزاوار خداوندیش کس نتواند کہ بجا آورد

(ورنہ حق تعالیٰ کی عظمت کے لائق کوئی شخص بھی عبادت نہیں کرسکتا ہے)

غرض اس نے کہا کہ مجاہدے ریاضت تو کچھ کام نہیں آئے مگر حکم ہوا جاؤ کہ تم نے ایک دن ایک بلی کے بچے پر رحم کیا تھا کہ وہ سردی سے کانپ رہا تھا تم نے اس کو لحاف میں لے لیا۔ جاؤ تم کو ہم نے اس کی عوض میں بخشا آدمی کبھی کسی ادنیٰ سے عمل کو بھی حقیر نہ سمجھے کیا خبر کس عمل کو حق تعالےٰ قبول فرمالیں اور بخش دیں۔ حدیث میں ہے یا عائشۃ لا تحقری طاعۃً ونحوہ یعنی اے عائشہ کسی نیک عمل کو حقیر نہ سمجھو الحاصل وہاں بات بات رحمت کا بہانہ ہوگی ہاں یہ نہ ہوگا

کہ بلا کچھ کئے کسی کو پکڑ لیا جاوے یہ معنی ہیں۔ وھم لا یظلمون کے یعنی کسی کا حق مارا نہیں جاوے گا۔ یہاں ایک طالبعلمانہ شبہ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ حبط اعمال بالکفر ثابت ہے جا بجا نصوص میں وارد ہے اولئك حبطت اعمالهم وفی النار هم خالدون ۔ ان هٰؤُلَآءِ متبر ما هم فيه وباطل ما كانوا يعملون ۔ وقدمنا الی ما عملوا من عمل فجعلناه هباء منثورا ۔ وغیرہا من الآیات۔ تو یہ کہاں صادق ہوا کہ کسی کی نیکی غارت نہ کی جاوے گی۔ میں کہتا ہوں کہ اس نے دنیا ہی میں خود اپنی نیکی کو غارت کر دیا تھا قیامت کے دن اس کی نیکی غارت نہیں کی گئی اس نے خود دنیا میں اپنے اختیار سے وہ فعل کیا ہے جس کی خاصیت سے دوسرے اعمال غارت ہو جاتے ہیں تو قیامت کے دن وہ خود ہی اپنے اعمال کو غارت کر کے لایا ہے نہ یہ کہ یہاں تو اس کا عمل درست تھا اور وہاں پہنچکر غارت کیا گیا اسکی مثال ایسی ہے کہ ایک کمہار نے برتن بنائے مگر بناتا گیا اور توڑتا گیا اور فرض کیجئے کہ اس کے واسطے ایک وقت مقرر تھا کہ اس وقت اس کا کام ختم کر دیا جاوے گا۔ تو اس صورت میں جس وقت اس کا کام ختم کیا جاوے گا ظاہر ہے کہ ایک برتن بھی اس کے پاس نہ ہوگا گو اس نے برتن بنائے ضرور ہیں تو اس حالت میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ کسی نے برتن اس کے توڑ ڈالے یا چھین لئے اس واسطے یہ خالی ہاتھ ہے بلکہ یہ کہا جائیگا کہ اس نے خود ہی کوئی برتن باقی نہیں رکھا یہی حالت کافر کی ہے کہ قیامت میں وہ اس واسطے خالی ہاتھ نہ ہوگا کہ کسی نے اس کی نیکیاں چھین لیں بلکہ وہ دنیا میں ان کو خود ہی تباہ کر کے آیا ہے تو لا یظلمون بالکل صادق ہے ایک شبہ تو یہ رفع ہوا ایک شبہ اور ہے وہ یہ کہ حدیث میں آیا ہے من سن سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها ومن سن سنة سيئة فعليه وزرها من عمل بها اوکما قال اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض گناہ انسان پر بلا کئے ہوئے بھی رکھے جائیں گے۔ مثلاً قابیل نے ہابیل کو مار ڈالا تھا۔ تو حدیث میں آیا ہے کہ قیامت تک جو قتل بھی دنیا میں ہوتا ہے اس کا کچھ حصہ گناہ کا قابیل کو بھی پہنچتا ہے اسی طرح ہر اس

گناہ کا حال ہے جس کی اقتدار دوسروں نے کی ہو تو سوال یہ ہے کہ اس نے کیا کیا تھا۔ دوسروں کے عمل اس پر کیوں ڈالے جاتے ہیں یہ تو وھو لا یظلمون کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ اس نے کیا کیوں نہیں اس کی اقتدار سے جو گناہ بھی ہوتا ہے اس کا سلسلہ اس تک برابر ملا ہوا ہے اور اس کو ضرور اس گناہ میں دخل ہے اس کی مثال یہ ہے جیسے بچے اینٹوں کی ریل بنایا کرتے ہیں کہ پاس پاس دور تک اینٹیں کھڑی کرتے چلے جاتے ہیں پھر ایک کو گراتے ہیں اس سے دوسری اینٹ گرتی ہے اور دوسری سے تیسری اور تیسری سے چوتھی۔ اسی طرح جہانتک اینٹوں کا سلسلہ ہوتا ہے گرتی چلی جاتی ہیں۔ اب فرض کر لیجئے کہ اخیر اینٹ کے سامنے ایک شیشی رکھی ہوئی ہے وہ اس اخیر اینٹ کے گرنے سے ٹوٹ گئی تو آپ کیا کہیں گے کیا اس کا جرم اس شخص پر جس نے پہلی اینٹ گرائی ہے عائد کریں گے یا نہیں ظاہر ہے ہے کہ ضرور عائد کریں گے حالانکہ وہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے تو وہ اینٹ نہیں گرائی جس سے شیشی ٹوٹی ہے۔ میں نے تو ایک وہ اینٹ گرائی تھی جو شیشی سے بہت دور تھی اس لئے شیشی توڑنے کا الزام میرے اوپر لگانا بلاوجہ ہے اور ظلم ہے کیونکہ جو کام میں نے نہیں کیا وہ میرے ذمہ لگایا جاتا ہے۔ اس کا جواب آپ یہی دیں گے کہ جب تجھے معلوم تھا کہ یہ اینٹیں اس طرح کھڑی ہیں کہ ایک کے گرانے سے یکے بعد دیگرے سب گر جائیں گی حتیٰ کہ آخر اینٹ شیشی پر گرے گی پھر جب تو نے ایک اینٹ کو گرایا تو ضرور تو نے ہی شیشی کو قصداً توڑا اسی طرح جب ایک شخص نے گناہ کیا اور وہ جانتا تھا کہ یہ فعل مضر ہے اور دوسرے اس کی اقتدا کریں گے تو وہ قصداً اور اختیاراً ہوا اس گناہ کا جو اس کی اقتدار سے ہوگا سبب بنا تو اب اگر اس کے نامۂ اعمال میں دوسرے اقتدا کرنے والوں کی وجہ سے بھی گناہ لکھا گیا تو بے کئے نہیں لکھا گیا بلکہ اس کا کیا ہوا گناہ لکھا گیا اس سے دوسرا شبہ بھی رفع ہوگیا یہ درمیان میں دو شبہوں کا ازالہ ہوگیا۔

اصل بیان یہ تھا کہ قیامت کے دن یہ تو ہوگا کہ بعض نیکی بدون کئے ہوئے

نامۂ اعمال میں لکھی ہوئی ملیں گی اور یہ نہ ہوگا کہ کوئی نیکی کی ہو اور وہ نامۂ اعمال میں لکھی ہوئی نہ ملے یہ شانِ رحمت ہے کہ عدل کا معاملہ نہیں فرمایا بلکہ فضل کا معاملہ کیا جائے گا ورنہ یہ ہوتا کہ جیسے کی ہوئی نیکی نامۂ اعمال میں درج ہونے سے نہ رہتی ایسے ہی کوئی نیکی بلا کئے ہوئے درج بھی نہ کی جاتی جس سے نہ نیکی بڑھتی نہ گھٹتی اور آیت اس معاملہ رحمت کی نفی نہیں کرتی اسی طرح نیکی کے مضاعف ہونے کی بھی نفی نہیں کرتی کیونکہ آیت میں لا یظلمون کا لفظ ہے اس سے یہ مدلول ہے کہ کسی کی حق تلفی نہیں کی جائے گی اور اس سے یہ نہیں لازم آتا کہ حسنات میں کچھ اضافہ بھی نہیں کیا جائے گا کیونکہ دلائل سے ثابت ہے کہ قیامت میں حسنات میں اضافہ ہوگا۔

بیان اس کا یہ ہے کہ معاملات جزا تین قسم کے ہوسکتے ہیں۔ ظلم اور عدل اور رحمت۔ ظلم یہ ہے کہ کسی کا حق مار لیا جائے اور اس کی کی ہوئی نیکیوں کا اجر نہ دیا جائے اور عدل یہ ہے کہ گناہوں کی سزا دی جائے اور نیکیوں کا اجر برابر سرابر دیا جائے۔ اور رحمت یہ ہے کہ گناہوں کو نظر انداز کیا جائے اور نیکیوں کا اجر بڑھا دیا جائے حق تعالیٰ بندوں پر ظلم تو کیا کرتے عدل کا برتاؤ بھی نہیں کریں گے بلکہ بہت سے گناہوں کو عفو فرمائیں گے اور نیکیوں کا ثواب قانون سے بہت زیادہ دیں گے کہ ایک نیکی دس نیکی کی برابر تو ضرور ہی ہوگی بلکہ حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن مومنین کے ساتھ یہ برتاؤ ہوگا کہ ان کو بعض وہ نیکیاں نامۂ اعمال میں لکھی ہوئی ملیں گی جو انھوں نے کی بھی نہیں تھیں اور گناہوں کی بعض کے ساتھ یہ حالت ہوگی کہ اول بندہ کے سامنے چھوٹے گناہ پیش کئے جائیں گے اور بڑے پیش بھی نہیں کئے جائیں گے پھر ان چھوٹوں کی نسبت بھی یہ حکم ہوگا کہ ان کو معاف کر دو اور ان کو نیکی سے بدل دو اب کیا ہے اس وقت یہ حالت ہوگی کہ یا تو ڈر رہا تھا کہ کہیں بڑے گناہ پیش نہ ہوں اور یا جب گناہوں کے عوض نیکیاں ملتی دیکھیں تو خود کہے گا کہ میں نے

تو اور بھی بڑے بڑے گناہ کئے تھے وہ کہاں ہیں ان کو مجھے کیوں نہیں ظاہر کیا گیا اور اس سے غرض یہ ہوگی کہ جب چھوٹے گناہوں کی جگہ یہ نیکیاں ملی ہیں تو بڑے گناہوں پر ان سے بڑی نیکیاں ملیں گی اس امید میں بے ساختہ کہنے لگے کہ میرے بڑے گناہ کہاں گئے سبحان اللہ کچھ حد ہے رحمت کی اور یہ بھی ہوگا کہ بعضے گناہ وہ ہوں گے جو بندہ نے کئے تھے لیکن وہ نامۂ اعمال میں لکھے ہوئے نہ ہوں گے۔ پہلی قسم تو وہ تھی کہ گناہ نامۂ اعمال میں لکھے ہوئے تھے مگر پیش نہیں کئے گئے اور یہ قسم وہ ہے کہ گناہ نامۂ اعمال میں لکھے ہوئے ہی نہیں ہیں یہ وہ گناہ ہیں جن سے توبہ کر لی گئی ہے اور اہل سنت کی تحقیق تو یہ ہے کہ بلا توبہ بھی عفو ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ کسی گناہ سے توبہ بھی نہ کی ہو اور حق تعالیٰ نے محض اپنی طرف سے اس کو معاف کر دیا ہو غرض کس قدر رحمت ہے کہ بہت سے گناہ جو کئے گئے تھے وہ نامۂ اعمال میں نہ ہوں گے اور بہت سی نیکیاں جن کو بندہ نے کیا بھی نہیں وہ نامۂ اعمال میں موجود ہوں گی یہ شانِ رحمت ہے جو عدل سے بالاتر ہے اور ظلم کا تو ذکر ہی کیا۔ آگے فرماتے ہیں ووفیت کل نفس ما عملت وھو اعلم بما یفعلون قرآن کا کیا نظم ونسق ہے کہ ایک ہی آیت میں ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی ہے اس جملہ کا ترجمہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کی جزا پوری پوری دی جائے گی اور حق تعالیٰ کو ہر ہر فعل کا علم ہے اس میں ذرا ڈرا بھی دیا گو ہم یہ برتاؤ بھی کریں گے کہ کسی کی حق تلفی نہیں کریں گے اور پورا پورا اجر دیں گے لیکن ہم کو علم سب اچھے برے اعمال کا ہے حاکم کا یہ کہنا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو ہم جانتے ہیں اس میں یہ اثر ہے کہ سننے والے اس سے کانپ اٹھتے ہیں۔ اور چونکہ ترغیب انتہا درجہ کی تھی اس وجہ سے ذرا سی ترہیب بھی شامل کر دی تاکہ تعدیل ہو جائے اب سمجھئے کہ یہاں تک جزا و سزا کا بیان اجمالی تھا۔ اب اس تمام قصہ کا نتیجہ بطور تفصیل بیان فرماتے ہیں۔ وسیق الذین کفروا الی جہنم زمرًا۔ اس کا

ترجمہ یہ ہے کہ ہکائے جائیں گے کفار جہنم کی طرف جماعتیں کی جماعتیں سوق کے معنی ہیں زبردستی چلانا اس سے یہ معنی ادا ہوتے ہیں کہ کفار اپنے قصداً و اختیاراً سے جہنم میں نہیں جائیں گے بلکہ جبراً ڈھکیل کے لیجائے جائیں گے جیسے جانوروں کو مار مار کے لے چلتے ہیں اسی طرح فرشتے ان کے پیچھے ہوں گے اور ڈھکیل ڈھکیل کے لے جاتے ہوں گے کہ چلو چلو۔ یہ معنی مفسرین نے لکھے ہیں زمراً کے معنی ہیں جماعت جماعت یعنی کفار کی جماعتیں ہوں گی بڑے کفار آگے ہوں گے اور ان سے چھوٹے ان کے پیچھے اور ان سے چھوٹے ان کے پیچھے دیکھئے شانِ عدل دوزخ میں بھی ظاہر ہوگی کہ کفار میں بھی بقدر مراتب کفر فرق رکھا جائیگا اس کا بیان دوسری آیت میں اس طرح ہے۔ ثم لننزعن من کل شیعۃ ایھم اشد علی الرحمن عتیا فرماتے ہیں کفار کی ہر جماعت سے بھی ہم ان کو الگ چھانٹ لیں گے جو کفر میں اشد تھے اس سے بھی معلوم ہوا کہ کفار کی جماعتیں ہوں گی اور یہ تفصیل بھی معلوم ہوئی کہ بڑے بڑے کفار الگ ہوں گے اور چھوٹے الگ یہی حاصل ہے زمرا کا اور کفار کی سزائیں بھی جو دوزخ کے اندر ہونگی علیٰ قدر مراتب متفاوت ہوں گی گو خلود سب کو ہوگا کیا شان ہے کہ کفر پر بھی سزا دیتے ہیں تو عدل سے دیتے ہیں۔ حتیٰ اذا جاؤھا فتحت ابو بھا۔ ترجمہ یہاں تک کہ کفار جب دوزخ کے پاس پہونچ جاویں گے تو دوزخ کے دروازے کھولے جاویں گے لوگوں نے اس سے استنباط کر کے لکھا ہے کہ دوزخ کے دروازے بند رہتے ہیں اور اس وقت کھولے جاویں گے جب کفار اس کے پاس پہنچ جائیں گے اس میں نکتہ یہ لکھا ہے کہ اس کی گرمی قوی رہے تنور اگر ڈھک دیا جائے تو اس کی گرمی زیادہ ہو جاتی ہے بہ نسبت اس کے کہ کھلا رہے دوزخ مدتوں سے بند ہوگا تاکہ اس وقت دروازے کھلنے سے ایک دم بھپکا نکل کر جھلس دے ایک گرمی آگ کی اور ایک حبس کی اور دونوں سے سزا مقصود ہے حق تعالیٰ یہاں کی چیز۔ بڑی ہے، عذاب بھی ہے تو ایسا ہے کہ اس میں کوئی کسر تعذیب میں نہیں

رہے گی یہ نکتہ تو لوگوں نے بیان کیا ہے اور دوزخ کے دروازے بند ہونے میں ایک نکتہ اور بھی ہو سکتا ہے اور جس سے اس کے متغائر معنے پیدا ہوتے ہیں کیونکہ نکتہ اولیٰ کا حاصل یہ ہے کہ یہ بیان ہے شانِ تعذیب کا اور اس نکتہ ثانیہ کا حاصل یہ ہے کہ یہ بیان ہے شانِ رحمت کا وہ نکتہ ہے کہ دوزخ کے دروازے اس واسطے بند ہوں گے کہ یہ دکھلا دیا جاوے گا کہ دیکھو ہماری طرف سے اتنی گنجائش دی جاتی ہے کہ پاس پہنچنے تک بھی شاید کسی کو کوئی ٹوٹا پھوٹا ذریعہ نجات کا مل جاوے ذرّہ برابر ایمان بھی نکل آوے تو وہ بچ جاوے اور جب دروازہ تک پہونچنے پر بھی کوئی ذریعہ نجات کا بہم نہ پہونچا تو اب مجبوری ہے اتمامِ حجّت ہو چکا اور کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے دوزخ سے دور رکھا جہاں تک ہو سکتا تھا بچایا اور پھاٹک بند رکھا مگر کوئی ذریعہ رحمت کا ان کے پاس تھا ہی نہیں۔ اب پھاٹک کھولا جاتا ہے اور ان کو داخل کر دیا جاتا ہے وقال لھم خزنتھا الم یاتکم رسل منکم یتلون علیکم ایات ربکم و ینذرونکم لقاء یومکم ھذا۔ ترجمہ۔ اور دوزخ میں جانے والوں سے خزنۂ جہنم کہیں گے کیا تمھارے پاس تمھارے ہی جنس کے رسول نہیں آئے تھے جو تمھارے سامنے حق تعالیٰ کی آئیتیں پڑھتے تھے (یعنی احکامِ الٰہی سناتے تھے) اور اس دن کے دیکھنے سے ڈراتے تھے یہ بھی اتمامِ حجت ہے کہ ان سے اقرار بھی لے لیا جاوے تاکہ وہ نہ کہہ سکیں کہ ہم پر ظلم ہوا اور اس میں اول یاد دلایا پیغمبروں کے آنے کو جس کا حاصل یہ ہوا کہ اسباب ہدایت مہیّا تھے مگر افسوس ہے کہ تم نے ان اسباب سے کام نہیں لیا پھر کہتے ہیں منکم یعنی وہ رسول کوئی غیر نہیں تھے تمھارے ہی بھائی بند تھے یعنی فرشتے یا جن نہیں تھے بلکہ از جنس انسان تھے جن سے بوجہ مجانست کے بہت نفع کی امید تھی یہ بھی حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو ہم ہی میں سے بھیجا کیونکہ مناسبت ہوتی ہے مجانست سے اور نفع موقوف ہے مناسبت پر تو اگر انبیاء علیہم السلام ہمارے مجانس نہ ہوتے تو ان سے اتنا نفع نہ ہوتا یہ عین رحمت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو ہمارا ہم جنس پیدا کیا یہی وجہ ہے کہ ان کو ہم پر

غایت درجہ کی شفقت ہوتی ہے اگرچہ اتمامِ حجت کے لئے یہ بھی کافی تھا کہ دنیا میں ایک فرشتے کو بھیج دیتے کہ وہ احکامِ الٰہی سنا دیتا بلکہ اتنا بھی کافی تھا کہ کتاب لکھی ہوئی اتار دیتے کہ لوگ اس میں احکامِ الٰہی دیکھ لیتے بس تبلیغ ہو جاتی اور اس پہ دار و گیر ہو سکتی مگر ایسا نہیں کیا یہ کس قدر رحمت ہے اس کی مثال یہ ہے کہ ایک طبیب تو مریض کو ضابطہ کی حد میں کیف ما تفق دوا بتا دیتا ہے اس کا لحاظ نہیں کرتا کہ کڑوی ہے یا میٹھی اور ایک طبیب ایسا شفیق ہے کہ دواؤں میں سے بھی وہ دوا بتاتا ہے جو بدمزہ نہ ہو بلکہ شربت بنا کر پلاتا ہے تو حق تعالیٰ نے اپنے احکام اس طرح بھیجے ہیں گویا ہم کو شربت بنا کر پلایا ہے چنانچہ انبیاء علیہم السلام کو جنس انسان ہی سے پیدا کیا جس کا اثر یہ ہے کہ انھوں نے صرف ضابطہ کی تبلیغ نہیں کی۔ تبلیغ بھی کی اور ہدایت کے لئے دعا بھی کی اور دل و جان سے توجہ بھی کی۔ انبیاء علیہم السلام محض منادی نہیں تھے بلکہ تربیت کنندہ اور اتالیق بھی تھے کہ احکام الٰہی کو پہونچایا اور ان پر خود عمل کر کے دکھایا اور نمونہ قائم کیا اور بات بات پر نگرانی کر کے درست کر دیا بلکہ اتالیق بھی نہیں۔ یوں کہنا چاہیئے کہ امت کے باپ تھے کہ ہر وقت ان کو امت کی اصلاح ہی کی فکر رہتی تھی جیسے باپ اولاد کے پیچھے کھپ جاتا ہے اور یہی چاہتا ہے کہ ان میں کوئی کسر نہ رہے۔ انبیاء علیہم السلام نے تبلیغ بھی کی، اصلاح کی تدبیریں بھی کیں اور دعائیں بھی کیں۔ یہ بات اُس صورت میں ہرگز نہ پیدا ہوتی کہ انبیاء علیہم السّلام غیر جنس ہوتے۔ غرض منکم کا لفظ اس پر دلالت کرتا ہے کہ ایسے پیغمبر آئے تھے جو تمہارے اوپر نہایت شفیق تھے اور انھوں نے کوئی دقیقہ تمہارے خیر خواہی میں اٹھا نہیں رکھا اب تمہارے پاس کیا عذر ہے۔ اور یتلون مضارع کا صیغہ لایا گیا ماضی کا صیغہ نہیں لایا گیا کیونکہ مضارع کا صیغہ تکرار پر دلالت کرتا ہے کیا معنی کہ انھوں نے صرف ایک دفعہ تبلیغ کر کے نہیں چھوڑ دیا بلکہ باربار تبلیغ کی ینذرونکم یعنی اس دن کی پیشی سے تم کو ڈراتے تھے کہ خدائے احکم الحاکمین کے سامنے جواب دہی کرنا ہوگی اور

اس وقت کوئی عذر وحیلہ نہ ہوگا اور الم یاتکم بعینہ استفہام لایا گیا بجائے اتاکم کے کیونکہ اتاکم میں صرف اخبار ہوتا جو مقتضی جواب کو نہیں ہوتا اور استفہام مقتضی جواب کو ہوتا ہے ظاہر ہے کہ ایک تو یوں کہا جاوے کہ تمہارے پاس ہمارا پروانہ پہونچا تھا اور تم نے اس کی تعمیل نہیں کی اور ایک یوں کہا جاوے کہ کیا تمہارے پاس پروانہ نہیں پہونچا تھا اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اول اس کا جواب دو جب وہ جواب دیگا کہ حضور پہونچا تھا اس کے بعد اس پر یہ الزام متوجہ ہوگا کہ باوجود پروانہ پہنچنے کے تم نے تعمیل حکم کیوں نہیں کی غرض استفہام مقتضی جواب کو ہوتا ہے اس کا فائدہ یہ ہے کہ وہ اعتراف کرلیں اور اقراری مجرم ہوجاویں اور یہ کہنے کی گنجائش نہ رہے کہ ہم کو صرف شہادت سے سزا دی گئی چنانچہ اس استفہام کے جواب میں وہ اقرار کریں گے قالوا بلیٰ کہیں گے ہاں پیغمبر بیشک آئے تھے ولکن حقت کلمۃ العذاب علی الکفرین مگر ہماری قسمت ہی میں عذاب لکھا تھا اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسئلہ جبر سے تمسک کریں گے اور اس طرح اپنی برأت کریں گے کہ ہمارا قصور نہیں کیونکہ ہماری قسمت میں ازل سے یہی لکھا گیا تھا جس کے آگے ہم مجبور محض تھے کیونکہ مسئلہ جبر جو خلاف واقع ہے اور وہ اس لفظ کو قیامت میں کہیں گے جہاں انکشاف حقائق ہوچکا ہوگا اصل یہ ہے کلمہ حسرت کا ہے گو عنوان جبر کا ہے اس کی مثال ہمارے محاورہ میں یہ ہے کہ کسی سے کوئی فاش غلطی ہوجاوے اور اس کی وجہ سے نقصان عظیم اٹھاوے تو وہ اس غلطی سے پچتا ہے۔ اور جب لوگ اس سے کہتے ہیں کہ تجھے کیا سوجھا تھا جو ایسا کام کر بیٹھا تو وہ نہایت درجہ ندامت اور حسرت سے کہتا ہے، ارے میاں قسمت ہی پھوٹ گئی یہاں بھی ظاہر میں اس کے وقوع کو قسمت کی طرف منسوب کیا گیا ہے مگر مطلب یہ نہیں ہے کہ مسئلہ جبر سے تمسک کرتے ہیں ورنہ یوں کہتے ارے میاں مجھ سے کیا قصور ہوا قسمت میں یہی تھا میں کیا کرتا ان الفاظ کی بندش اور لہجہ بتاتا ہے کہ حسرت کا کلمہ ہے اسی طرح ولکن حقت کلمۃ العذاب علی الکفرین ہے کہ اُس سے مقصود اپنے فعل کو تقدیر پر حوالہ کرنا نہیں ہے بلکہ صرف اظہار حسرت ہے

قیل ادخلوا ابواب جہنم خالدین فیہا کہا جائے گا یعنی فرشتے کہیں گے اچھا دوزخ میں چلو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ادخلوا صیغہ امر ہے۔ جو چاہتا ہے استقبال کو جس کے معنے یہ ہوئے کہ اس جواب کے بعد دخول ہوگا اور یہ حکم اس گفتگو کے بعد ہوگا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکالمہ اہلِ دوزخ اور فرشتوں میں جہنم کے دروازہ سے باہر ہوگا، گو آیت میں کوئی لفظ قطعی الدلالت ایسا نہیں ہے جس سے کہا جاوے کہ یقیناً اور قطعاً یہ مکالمہ خارج جہنم ہی ہوگا لیکن الفاظ اور ترتیب سے صراحۃً یہی معلوم ہوتا ہے اور کوئی قرینہ اس کے خلاف پر موجود نہیں لہذا یہی کہا جاوے گا کہ یہ مکالمہ خارج جہنم ہی ہوگا تو کیسا عدل ہے کہ سزا سے پہلے مجرم سے اقرار لے لیا اور کوئی حجت اس کی باقی نہیں رکھی ابواب جہنم کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ جہنم کا دخول جہنم میں دروازوں سے ہوگا۔ یہاں حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے استدلال کیا ہے اور یہ مضمون اسی آیت کے تحت میں لکھا ہے یا سورۃ حدید میں لکھا ہے کہ پل صراط پر کفار سے عبور نہیں کرایا جاوے گا بلکہ پل صراط پر صرف مومنین اور منافقین اتارے جاویں گے کیونکہ پل صراط کے بارہ میں وارد ہے کہ وہ ایک پل ہے جو جہنم کے اوپر بچھایا جاوے گا اور اس پر چلنے والے بعضے پار اتر جاویں گے (وہ مومنین ہوں گے) اور بعضے پار نہ اتر سکیں گے بلکہ کٹ کر دوزخ کے اندر گر پڑیں گے پس اگر کہا جاوے کہ وہ کٹ کر گرنے والے عام کفار ہوں گے تو ان کے متعلق یہ مضمون کہاں صادق ہوگا ادخلوا ابواب جہنم کیونکہ اوپر سے گرنے والے کو داخل من الوسط کہا جا سکتا ہے داخل من الابواب نہیں کہا جا سکتا ہاں ایک گروہ کفار کا بھی ایسا ہوگا جو صراط پر اتارا جاوے گا اور وہ منافقین کا گروہ ہے اور نکتہ اس میں یہ ہے کہ صراط جنت کی سڑک ہے کہ اس سے عبور کر کے جنت میں جا سکیں گے تو اس پر چلنے کے مستحق وہی ہو سکتے ہیں جو جنت میں جانے کا ارادہ رکھیں اور وہ مومنین ہیں یا وہ جن میں شبہ ہے مومنین کا یعنی مشابہت ہے مومنین کے ساتھ اور وہ منافقین ہیں جو زبان سے مدعی ہیں مومن ہونے کے مومنین تو حقیقۃً جنت کے مستحق ہیں اور منافقین

صرف ظاہرًا وادعًا چنانچہ اس کا اثر یہ ہوگا کہ مومنین عبور کر جاویں گے اور منافقین کٹ کر
جہنم میں گر جاویں گے یہ خلاصہ ہے شاہ صاحب کے تحقیق کا کہ کافر محض جس نے زبان سے
بھی ایمان ظاہر نہیں کیا پل صراط پر نہیں چلایا جائے گا بلکہ یہ لوگ الواب جہنم سے داخل کئے
جائیں گے پل صراط پر صرف مومنین چلائے جائیں گے خواہ حقیقی مومن ہوں یا ادعائی

خالدین فیھا حال مقدرہ ہے ادخلو کی ضمیر انتم سے مطلب یہ ہے کہ جہنم میں جاؤ اس
حال میں کہ خلود تمھارے واسطے تجویز شدہ ہے فبئس مثوی المتکبرین۔ ترجمہ۔ پس
وہ بری ہے جگہ متکبرین کی۔ یہاں یہ بات قابلِ غور کرنے کے ہے کہ متکبرین سے مراد
کون لوگ ہیں ظاہر ہے کہ وہی کفار مراد ہیں جن کو دروازہ جہنم سے داخل کیا جائے گا
کیونکہ ان ہی سے خطاب ہو رہا ہے نیز سب جانتے ہیں کہ دوزخ کفار ہی کی مستقل
جگہ ہے گنہگار مسلمانوں کے لئے جہنم مثوی نہیں ہے عارضی جیل خانہ ہے تو ان ہی کو اوپر کفار
کہا گیا ہے۔ وسیق الذین کفروا میں اور ان ہی کو یہاں متکبرین کہا گیا اور ظاہر ہے
کہ اگر چور کو سزا دی جائے اور یوں کہا جائے کہ چور کی یہ سزا ہے تو علت سزا کی چوری
ہی ہوگی اسی طرح جب کہا گیا وسیق الذی کفروا الی جھنم زمرا یعنی کفار جہنم کی
طرف ہنکائے جاویں گے تو جہنم میں جانے کی علت کفر ہی کو کہا جاوے گا اور جب
کہا گیا فبئس مثوی المتکبرین تو اس بُرے ٹھکانے پانے کی علت تکبر ہی کو کہا جاوےگا
اور دونوں جگہ مجرم ایک ہی گروہ ہے تو حاصل یہ نکلا کہ اس گروہ کی اس سزا کی یعنی دخول
جہنم کی علتیں دو بیان ہوئیں کفر اور تکبر اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ دونوں ایک چیز ہیں یعنی
ایک مفہوم کے دو نام ہیں جیسے اسد بھی شیر کو کہتے ہیں اور لیث بھی اُسی کو کہتے ہیں یا
دونوں الگ الگ چیزیں ہیں اور ان میں سے ہر ایک علت ہے دخول جہنم کی غرض ان دونوں
میں کیا علاقہ ہے تو سمجھ لیجئے کہ دونوں مفہوم کے لحاظ سے تو ایک نہیں ہیں کیونکہ کفر اور
تکبر کو کسی نے مرادف نہیں کہا باعتبار مفہوم لغوی کے دونوں علیٰحدہ چیزیں ہیں تو اب
یہ کہا جاوے گا کہ دونوں علیٰحدہ علیٰحدہ علتیں ہیں دخول جہنم کی لیکن ان دونوں میں ہر ایک
مستقل علت نہیں ہے بلکہ ایک علت ہے اور ایک علت العلت بیان اس کا یہ ہے

کہ علت جس سے مراد سبب ہے دو قسم پر ہے ایک سبب اور ایک سبب السبب جیسے امتلاء عروق بھی سبب ہے حمیٰ کا اور عفونت اختلاط بھی سبب ہے حمیٰ کا لیکن عفونت سبب ہے اور امتلا سبب السبب ہے امتلاء سے عفونت پیدا ہوتی ہے اور عفونت سے حمیٰ پیدا ہوتا ہے پس امتلا اور عفونت دونوں کو سبب حمیٰ کہہ سکتے ہیں لیکن واقع میں سبب عفونت ہے اور امتلاء سبب السبب ہے اسی طرح کفر اور تکبر دونوں کو سبب کہہ سکتے ہیں دخول جہنم کا لیکن درحقیقت دخول جہنم کا سببِ قریب کفر ہے اور تکبر سبب السبب ہے یعنی تکبر سبب ہے کفر کا جو سبب ہے دخولِ جہنم کا اس وجہ سے قرآن میں کہیں تکبر کو علت قرار دیا ہے دخولِ جہنم کے لئے اور کہیں کفر کو اور غور سے دیکھا جاوے تو یہ بالکل واقعی بات ہے کہ کفر اور تکبر میں اصل تکبر ہی ہے اور کفر تکبر کا نتیجہ اور فرع ہے اور کفار کو جہنم میں جو لیجاوے گا تو تکبر ہی لیجاوے گا اس لحاظ سے دخولِ جہنم کے محل میں بئس مثوی المتکبرین کہنا بالکل برمحل ہے جو لوگ کفر میں مبتلا ہیں وہ اس وجہ سے مبتلاء کفر نہیں ہیں کہ حق بات ان کو معلوم نہیں ہوتی اور غلطی سے اس بلا میں پڑجاتے ہیں بلکہ وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کو حق بات کے قبول کرنے میں کسی سے چھوٹا بننا پڑتا ہے اس واسطے باوجود حق کو جاننے کے اس کو قبول نہیں کرتے حق بات اول تو عقل ہی سے معلوم ہوجاتی ہے لیکن اس کو اگر کافی نہ کہا جاوے تو حق تعالیٰ کی یہ بھی رحمت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو بھیجکر اس کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے ایسا کہ اس میں کوئی خفا باقی نہیں رہا اور انبیاء علیہم السلام کے بعد علماء کے ذریعہ سے اس کو بالکل آشکارا کر دیا ہے موٹی بات ہے کہ حجت میں کوئی فریق اہل حق سے کبھی نہیں جیت سکا جب اہل حق ہمیشہ غالب رہتے ہیں تو اس کو قبول نہ کرنے کی کونسی وجہ اور اس کے مقابل باطل کو قبول کرلے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے بجز تکبر کے کچھ بھی وجہ نہیں کیونکہ اوپر کی تقریر سے جب صاف ظاہر ہو گیا کہ کفار کا باطل کو اختیار کرنا اس وجہ سے نہیں کہ حق بات میں کچھ خفا ہے تو معلوم ہوا کہ باوجود وضوح کے قبول حق سے کوئی اور ہی مانع

ہے وہ مانع سوائے عار کے کچھ نہیں ہے کسی کو اس سے عار آئی کہ آبا اجداد کے خلاف کیسے نیا دین قبول کریں کسی کو اس سے عار ہوئی کہ ایک معمولی اپنے ہی ہم جنس آدمی کے کہنے سے نئی بات کیسے مان لیں چنانچہ قرآن میں بعض کا قول نقل فرمایا گیا ہے ولئن اطعتم بشرا مثلکم انکم اذا لخاسرون اور بعض کو اس سے عار ہوئی کہ ہم معمولی لوگوں کی برابر کیسے بنیں۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا قول حق تعالےٰ نے نقل کیا ہے قالوا انؤمن لک واتبعک الارذلون یعنی ہم تمہارا کہنا کیسے مان لیں حالانکہ تمہارے متبعین تو معمولی لوگ ہیں کوئی بڑے مالدار اور رؤسا تمہارے پیرو نہیں۔ یہ حماقت دیکھئے کہ تمول اور ریاست کو اتباع حق کا مدار قرار دیا حالانکہ غور کر کے دیکھئے تو جتنے شرور ہیں وہ ان ہی لوگوں سے شروع ہوتے ہیں جو مالدار ہیں اور امور خیر میں ہمیشہ غربا ہی سبقت کرتے ہیں اس قوم کو قبول حق سے یہ عار مانع ہوا کہ ہم معمولی لوگوں کی برابر کیوں بنیں اور اگر کوئی دلیل ان کے پاس ہوتی تو حضرت نوح علیہ السلام کے مقابلہ میں اس کو ضرور پیش کرتے معلوم ہوا کہ دلیل تو کچھ نہ تھی حق واضح ہو چکا تھا لیکن یہی عار مانع تھی اور کہاں تک حق واضح نہ ہوتا حضرت نوح علیہ السلام تقریبًا ایک ہزار برس اپنی قوم میں رہے اس طویل مدت میں انہوں نے کونسا دقیقہ اظہار حق میں چھوڑ دیا ہوگا۔ حق وہ چیز ہے جو کبھی چھپتا ہی نہیں۔

میں نے ایک مکتوب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا دیکھا ہے جو بیاور ضلع اجمیر کسی کو لکھا تھا اس مکتوب میں یہ الفاظ تھے کہ حق وہ ہے جو مدلول ہو نص کا بلا کلفت مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آپس میں کسی بات میں جھگڑتے ہیں ایک فریق کہتا ہے کہ قرآن سے یہ ثابت ہے اور دوسرا فریق کہتا ہے کہ یہ ثابت ہے تو اس میں قول فیصل یہ ہے کہ اپنے اغراض اور خیالات کو الگ کر کے اور ان سے بالکل قطع نظر کر کے دیکھو کہ نص قرآنی کا مدلول بلا کلفت کیا ہے جس میں ایچ پیچ اور تکلف اور تاویل کی بالکل ضرورت نہ ہو بس وہی

حق ہے وہ اپنے خیال کے موافق ہو یا مخالف مطلب یہ ہے کہ حق تو چھپتا ہی نہیں اس کو قصداً اعراض اور تاویلوں سے چھپایا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو کوئی بھی کفر اختیار کرتا ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ حق اس سے پوشیدہ رہا حق تو پوشیدہ رہنے کی چیز ہی نہیں حق ضرور واضح ہوجاتا ہے لیکن عار سبب ہوتی ہے کفر کا اور عار کی حقیقت تکبر ہے تو تکبر سبب ہوا کفر کا اب تکبر اور کفر دونوں میں علاقہ معلوم ہوگیا وہ یہ کہ تکبر سبب ہے کفر کا اور کفر سبب ہے دخول جہنم کا تو تکبر بھی سبب ہوا دخول جہنم کا لیکن بواسطہ یعنی سبب السبب ہوا اور بنا بر تقریر مذکور متکبرین کے لفظ میں اشارہ ہے تمام عقائد و اخلاق کی اصلاح کی ضرورت کی طرف کیونکہ استقرا سے تمام خرابی عقائد کی و اخلاق کی تکبر ہی سے پیدا ہوتی ہے اور یہی تکبر اصل ہے ہر ذمیمہ کی اور تکبر کا نتیجہ بیان کیا گیا دخول جہنم تو اس میں ہر بُرے عقیدے اور ہر ذمیمہ کی برائی آگئی اس کی مثال یہ ہے کہ کہا جاوے کہ میٹھا کھانے سے خون میں گرمی پیدا ہوتی ہے تو اس میں گڑ بھی آگیا جو جڑ ہے مٹھائیوں کی اور جلیبی بھی آگئی اور قلاقند بھی چنانچہ سب جانتے ہیں کہ تکبر ہی سبب ہوا ہے ابلیس کے کفر کا اور اس کے ملعون ہونے کا تو خیال کرنے کی بات ہے کہ لوگ کفر سے تو بچتے ہیں اور اس کے نام سے بھی ڈرتے ہیں جو ایک شاخ ہے کبر کی اور کبر سے نہیں بچتے اور اس سے نہیں ڈرتے حالانکہ وہ اصل ہے کفر کی حیرت ہے کہ شاخ سے تو ڈرا جائے اور جڑ سے نہ ڈرا جائے یہ ایسا ہوا جیسے کوئی جلیبی اور قلاقند سے تو بچے لیکن گڑ خوب کھاوے۔ کبر دلوں کے اندر ایک چنگاری ہے جو راکھ سے دبی ہوئی رکھی ہے اس کا انتظار نہ کیجئے کہ جب وہ ظاہر ہوگی اور آگ بھڑک اٹھے گی اس وقت بجھالیں گے کیونکہ جس وقت آگ بھڑک اٹھتی ہے پھر کسی کے بس میں نہیں آتی مال اور اسباب کو تو جلاتی ہی ہے بجھانے والے کو بھی لپیٹ لیتی ہے۔ آگ سے زیادہ چنگاری سے حفاظت کیجئے کیونکہ آگ کی طرف تو التفات ہوتا بھی ہے اور آدمی اس سے ہوشیار

ہو ہی جاتا ہے مگر چنگاری کی طرف التفات کم ہوتا ہے اور وہ دبے ہی دبے اپنا کام کر جاتی ہے تو اس کا انتظار کیوں کیا جائے کہ جب کفر تک نوبت آ جائے گی اس وقت تکبر کا علاج کر لیں گے پہلے ہی سے اس کی تدبیر کیوں نہ کی جائے تاکہ کفر تک نوبت ہی نہ آئے۔ مولانا کہتے ہیں ؎

علت ابلیس انا خیر بد است ایں مرض در نفس ہر مخلوق ہست

(ابلیس کی بیماری اپنے کو بہتر سمجھنے کی تھی اور یہ مرض ہر مخلوق کے اندر موجود ہے)

اس سے مراد ابلیس کا وہ لفظ ہے جو اس نے اس وقت کہا تھا جب اس کو سجدہ کا حکم ہوا انا خیر منہ یعنی میں آدم سے بہتر ہوں تو اس کو کیوں سجدہ کروں دیکھئے اس کے دل میں ہمیشہ سے کبر تھا اپنے آپ کو بڑا سمجھتا تھا جس سے آخر کار نوبت کفر تک آ ہی گئی چنانچہ خدا تعالیٰ کے حکم کے سامنے انکار سے پیش آیا اور ہمیشہ کے لئے ملعون اور جہنمی ہو گیا مولانا اس واقعہ کو بیان کر کے ہم کو ہوشیار کرتے ہیں۔ ایں مرض در نفس ہر مخلوق ہست۔ مطلب یہ ہے کہ ابلیس کا واقعہ سن کر ہنسو مت اپنی خبر لو۔ کیونکہ وہ مسالہ تمہارے اندر بھی موجود ہے اتنا فرق ہے کہ وہاں اس مسالہ میں رگڑ بھی لگ گئی تھی اور یہاں ابھی تک رگڑ نہیں لگی ہے دیا سلائی تیار موجود ہے رگڑ لگنے کی دیر ہے اور ایک مٹی کے تیل کا پیپہ بھی موجود ہے پھر جہاں دیا سلائی ہو وہاں تو ہر وقت ہی خطرہ ہے کہ خدا جانے کس وقت مسالہ میں رگڑ لگ جائے اور تیل میں آگ لگ کر بھڑک جائے اور سب گھر بار پھونک ڈالے مولانا آگاہ کرتے ہیں کہ تم کو کسی وقت بے فکر نہ ہونا چاہیئے کیونکہ تمہارے یہاں بھی ایک پیپہ مٹی کے تیل کا موجود ہے وہ کیا ہے نفس جس میں ہر وقت استعداد ہے شر کی۔ بس چنگاری پڑنے کی دیر ہے (تم ہو تو مٹی کے مگر تیل کے ساتھ ہو کہ آگ لگی بھڑکی) جب تک تکبر اندر موجود ہے ہرگز کوئی شخص مامون نہیں ہو سکتا۔

مگر عجیب بات ہے کہ یہی سب سے خطرناک چیز ہے اور اسی کا علاج

نہیں کیا جاتا اچھے اچھے نمازی اور پرہیزگار ہیں جن کے لوگ معتقد ہیں مگر ان کے اندر یہ بلا بھری ہوئی ہے اس کو کچھ گناہ اور عیب ہی نہیں سمجھا جاتا معمولی گناہوں سے بچتے ہیں اور کبر جیسے گناہ کی کچھ پرواہ نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ دین نام رکھا گیا ہے صرف اعمال ظاہری کا اور اعمال باطنی کو دین کے اندر داخل ہی نہیں سمجھا جاتا بس نیچا کرتا پہن لیا اور پانچوں وقت کی نماز پڑھ لی اور پاجامہ شرعی پہن لیا اور اپنے آپ کو شبلی وقت سمجھنے لگے خواہ باطنی معاصی میں سر سے پیر تک آلودہ ہوں اور یہ حالت ہو جو ایک بزرگ کہتے ہیں ؎

از بروں چوں گور کافر پر حلل   و اندروں قہر خدائے عز وجل
(باہر سے مثل کافر کے قبر کے خوب زینت ہے اور اندر خدائے تعالےٰ کا قہر ہو رہا ہے)
از بروں طعنہ زنی بر بایزید   وز درونت ننگ میدارد یزید
(باہر سے تو ایسے صوفی کہ بایزید بسطامیؒ کو بھی شرمندہ کر دیں اور باطنی حالت اس قدر
خراب کہ یزید بھی شرمندہ ہو جائے)

یہ مرض ایسا عام ہوا ہے کہ کوئی بھی اس سے خالی نہیں الا ماشاء اللہ خصوصاً اہل علم کسی نے سچ کہا ہے "آفۃ العلم الخیلا" یعنی علم کی آفت تکبر ہے اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ وہ آفت جو علم سے پیدا ہوتی ہے اور ایک یہ کہ وہ آفت جو مانع ہے حصول علم سے کوئی معنی بھی لئے جاویں یہ بات ہر صورت میں صادق ہے کہ تکبر مضر علم ہے چنانچہ جس کے قلب میں تکبر ہے اس کے قلب میں نور علم نہیں ہو سکتا۔ غرض کبر بدترین امراض ہے اور یہ علما کے حصہ میں آیا ہے جاہل بیچاروں میں ایسا بڑا مرض پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اہل علم کا جیسا مرتبہ بڑا ہے ایسے ہی ان کا مرض بھی سب سے بڑا ہے۔ اس لئے ایسے علماء سے جو اس آفت میں مبتلا ہوں جہلا ہی اچھے کیونکہ ان میں اتنا بڑا مرض تو نہیں ہے اور ایسے علم سے جس کے ساتھ تکبر بھی ہو وہ جہل اچھا جس کے ساتھ تکبر نہ ہو اس کو سن کر لوگ کہیں گے کہ علم کی مذمت کر دی حالانکہ علم تو ہر حال میں اچھی

ہی چیز ہے علم ہی ایک روشنی ہے جس سے بھلے بُرے میں امتیاز کیا جا سکتا ہے میں کہتا ہوں کہ عینک اس غرض سے لگائی جاتی ہے کہ آنکھ کی روشنی بڑھے مگر اس سے یہ فائدہ جب ہی تو نکلے گا کہ طریقہ کے موافق استعمال کی جائے ورنہ اگر عینک کو کان پر رکھ لیا جائے تو کیا فائدہ یا اس کے شیشہ پر چونا لپیٹ دیا جائے یا کالک لگادی جائے تو کیا کام دے سکتی ہے ایسی عینک کے ہونے سے تو نہ ہونا اچھا کیونکہ وہ تو رہی سہی بصارت کو بھی کھوتی ہے اور خوامخواہ کا بوجھ بھی بندھتا ہے یہی حالت علم کی ہے کہ اگر اس کو طریقہ سے استعمال کیا جائے یعنی اس سے اپنے نفس کی اصلاح کا کام لیا جائے تو بہت کام کی چیز ہے اور سرتاپا نور ہی نور ہے۔ اور اگر اس سے یہ کام نہ لیا جائے بلکہ دوسروں سے لڑنے جھگڑنے بڑا بننے کے لئے استعمال کیا جائے تو بیکار بلکہ مضر ہے۔ تو یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہوا کہ علم ہر حالت میں اچھی چیز نہیں بلکہ بعض حالتوں میں قابل مذمت بھی ہے۔

میں سچ کہتا ہوں کہ بعض اَن پڑھ لوگ پڑھے ہوؤں سے اچھے ہیں۔ اَن پڑھ لوگوں کے ذہن میں کبھی یہ وسوسہ بھی نہیں آتا کہ ہم دوسروں سے اچھے ہیں اور تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن میں ہر وقت یہی بات بھری رہتی ہے کہ ہم دوسروں سے اچھے ہیں ان پڑھ لوگ اتنی بصیرت تو رکھتے ہیں کہ اپنے عیبوں کو جانتے ہیں گو اجمال ہی کے مرتبہ میں سہی۔ چنانچہ وہ یہ جانتے ہیں کہ ہم جاہل ہیں۔ اور یہ حضرات اتنی بصیرت بھی نہیں رکھتے کہ اپنے عیب کو دیکھ سکیں کہ ہم میں تکبر ہے، حسد ہے، عجب ہے وغیرہ وغیرہ۔

پس وہ اگر چُندھے ہیں تو یہ اندھے ہیں، ہم دوسروں کو کیا کہیں خود اپنے ہی آپ کو کہتے ہیں کہ یہ مرض ہم میں موجود ہے۔ مرض کا وجود علامات سے پہچانا جاتا ہے ہم جب کسی سے ملتے ہیں تو ابتدا بالسلام کیوں نہیں کرتے طبیعت اس سے کیوں رکتی ہے کیا یہ اس کی علامت نہیں ہے کہ ہم کو دل میں اپنے بڑے ہونے کا خیال ہے۔ اگر اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھتے تو ابتدا بالسلام سے کیوں عار آتی ہے

پھر جب علامت سے ثابت ہوگیا کہ مرض موجود ہے اور مرض بھی کون سا بدین امراض تو پھر ہم کس بات پر بھولے بیٹھے ہیں اور وہ کونسی خوبی ہے جس کی بنا پر دوسرے سے اپنے آپ کو اچھا سمجھتے ہیں کیا یہ بات قابل اصلاح نہیں ہے ضرور ہے اور اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ یوں سوچنا چاہیئے کہ تم اگر اس دوسرے شخص سے بڑھے ہوئے ہو جس کو سلام کرنے سے عار آتی ہے تو کس بات میں بڑھے ہوئے ہو. بڑھنے اور گھٹنے کا معیار بھی ہے اگر معیار علم ہے اور وہ تم میں موجود ہے اور اس میں نہیں ہے تو خیال کرو کہ علم فی نفسہ مقصود چیز نہیں بلکہ علم صرف اس وجہ سے مقصود ہے کہ وہ عمل کا ذریعہ ہے تو جب تم دوسرے سے ملے تو اس وقت کا عمل سلام کرنا ہے اور وہ تم نے نہیں کیا تو تمھارا علم بیکار رہا کیونکہ موصل الی المقصود نہ ہوا جب بیکار رہا تو باعث فضیلت بھی نہ ہوا تو تم اس سے بڑھے ہوئے نہ ہوئے بلکہ گھٹے ہوئے ہوئے۔ اور اگر معیارِ فضیلت مال ہے تو اگر اس کے پاس مال تم سے کم ہے اور تمھارے پاس مال اس سے زیادہ ہے تب بھی تعلقات قائم رکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ مال کی ترقی یا بقا تجارت سے ہوتی ہے اور تجارت گو روپیہ سے ہو سکتی ہے مگر اس کے لئے تعلقات بڑھانے کی ضرورت ہے اور سلام ایک عمدہ ذریعہ ہے تعلق بڑھانے کا بس یہ بھی اسی بات کا مقتضی ہے کہ تم ہی اس کو سلام کرو غرض آدمی کو اگر اپنی اصلاح کا خیال ہو تو ہر حال میں کوئی نہ کوئی وجہ اور صورت نفس سے تکبر چھوڑانے کی نکال سکتا ہے یہ سب باتیں سمجھ دار آدمی کے لئے ہیں اور عمل کرنے والے کے لئے ورنہ مناقشہ اور جھگڑا کرنے کو تو بڑی گنجائش ہے۔

ایک طالب علم کا قصہ ہے کہ راستہ میں ان کی ایک جاہل آدمی سے ملاقات ہوئی انھوں نے اُسے سلام نہیں کیا یہ مرض اہل علم میں ہوتا ہی ہے اس وقت اسی کا بیان ہو رہا ہے اس جاہل نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کیا آپ نے کتاب میں ابتدا بالسلام کرنے کی فضیلت نہیں پڑھی انھوں نے جواب دیا کہ ہاں پڑھی ہے مگر قاعدہ یہ ہے کہ چھوٹا آدمی بڑے کو سلام کرے تم جاہل ہو ہم عالم ہیں لہذا

تم چھوٹے اور ہم بڑے تم کو چاہیئے تھا کہ ہمیں سلام کرتے ان دونوں میں گفتگو بہت بڑھ گئی حتیٰ کہ وہ شخص ان کو پکڑ کر ان کے استاد کے پاس لے گیا اور سارا قصہ سنایا استاد نے طالب علم صاحب سے کہا کہ بھائی یہ قضیہ مسلم سہی کہ چھوٹا آدمی بڑے کو سلام کرے مگر تم کو یہ سوچنا چاہیئے تھا کہ بڑا اور چھوٹا ہونا اپنے خیال کا معتبر نہیں ممکن ہے حق تعالےٰ کے نزدیک وہ بڑا ہو استاد نے یہ سچی بات کہی اور صحیح تعلیم دی مگر طالب علموں کی ذہانت دیکھئے آپ فرماتے ہیں کہ یہی بات تو اس جاہل کو بھی سمجھنا چاہیئے تھی کہ ممکن ہے عند اللہ میں بڑا ہوں لہٰذا اس کو ابتداء بالسلام کرنا چاہیئے تھی۔ دیکھئے کیا جواب دیا ہے کہ جاہل تو جاہل استاد کو بھی بند کر دیا حاصل یہ کہ قیل وقال اور بحث مباحثہ کو تو بہت گنجائش ہے اور کوئی بات ایسی نہیں جس کا جواب نہ ہو سکے مگر اس سے کام نہیں چلتا اور یہ طریقہ کچھ مفید نہیں یہ طریقہ دنیا کے تو کسی کام میں اختیار کر کے دیکھئے معلوم ہو جائے گا کہ اس سے کیسا کام چلتا ہے۔ مثلاً کھانا پکانا سیکھتا ہو اور کسی کو اس کام کے لئے استاد بنایا وہ کہتا ہے کہ شوربے میں اتنا مسالہ اور اتنا نمک اور اتنا پانی ڈالو آپ بجائے اس کی اطاعت کرنے کے قیل وقال شروع کر دیں اور ذہانت سے کام لینے لگیں کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ اتنا پانی اتنا ہی مسالہ اتنا ہی نمک چاہیئے ہم یوں کیوں نہ کریں کہ جتنا پانی بتایا ہے اتنا ہی نمک ڈالدیں تو اس قیل وقال سے جیسا کھانا پکے گا معلوم ہے گو استاد آپ کی ذہانت کے سامنے لاجواب ہو جائے لیکن ہے یہی بات کہ یہ طریقہ مفید اور موصل الی المطلوب نہ ہوگا اس قیل وقال سے کچھ کام نہیں چل سکتا مفید طریقہ یہی ہے کہ استاد کے بتانے کو بے چون وچرا تسلیم کر لو اور ذہانت کو چھوڑ دو پھر دیکھو کہ کھانا پکانا کیسے جلدی آتا ہے اور کھانا کیسے مزیدار پکتا ہے۔

جو آدمی کام کرنے والا ہوتا ہے وہ قیل وقال میں کبھی نہیں پڑا کرتا اس کی نظر کام پر ہوا کرتی ہے۔ اسی طرح تہذیب نفس میں مشغول ہونے والے کو دوسرے کو

الزام نہیں دینا چاہیئے کیونکہ یہ طریقہ مفید نہیں اگر دوسرے کو الزام دے بھی دیا تو اسکا کام کیا ہوا یعنی اس کو تہذیب نفس کیا حاصل ہوئی یہ تو ایسی بات ہوئی جیسے ایک شخص بتلائے کہ تمھارے منہ پر کالک لگ گئی ہے اور یہ سننے والا بجائے اپنی کالک چھوڑانے کے اس کو الزام دینے لگے کہ تیری بھی تو ناک ٹیڑھی ہے یہ بات اگرچہ واقع میں سچی بھی ہو اور الزام بیجا نہ ہو تب بھی یہ دیکھو کہ تم کو اس الزام سے کیا نفع ہوا جو شخص نفس کی تربیت کرنا چاہتا ہے اسے دوسرے کو الزام دینے کی طرف متوجہ نہ ہونا چاہیئے۔ اگر دوسرا کسی بات میں گھٹا ہوا بھی ہے تب بھی اس کو اس کے مقابلہ میں اپنے نفس کو بڑھانے سے کیا فائدہ اس صورت میں اس نے نفس کی تربیت نہیں کی بلکہ ایک برائی زیادہ کرلی اور حاصل یہ ہوا کہ پہلے تو شاید اس دوسرے شخص سے کسی بات میں بڑھا ہوا بھی ہو لیکن اب یعنی جبکہ اپنے نفس کو اس سے بڑا سمجھا یقیناً اس سے گھٹ گیا دوسرے کو الزام دینے کا یہ نتیجہ ہوا اب بتلایئے یہ طریقہ مذکورہ صحیح ثابت ہوا یا یہ طریقہ آیندہ کہ ہر شخص ہر بات کو تحقیق کی نظر سے دیکھے اور دوسرے کو الزام دینے سے قطع نظر کرلے اگر کسی بات میں دوسرے کو گھٹا ہوا دیکھا ہے تو اس وقت یہ سوچے کہ ہم بھی کسی بات میں اس سے گھٹے ہوئے ہیں یا نہیں کیونکہ ہر شخص میں کچھ خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور کچھ برائیاں بھی اگر اس شخص میں ایک برائی ہے تو ممکن ہے کہ ہم میں بہت سی برائیاں ہوں یا ایک ہی برائی ہو لیکن اس کی برائی سے بدتر ہو پھر کس طرح اس کو ہم گھٹا ہوا سمجھتے ہیں اور کیوں دوسرے کو اپنے آپ سے کم درجہ سمجھ کر سلام میں ابتدا کرنے سے عار آتی ہے میں نے تدبیر بتادی اس رذیلہ کے نکالنے کی لیکن یہی مقدمات ہیں جن سے آدمی یہ مفید کام بھی لے سکتا ہے اور اچھا اور کارآمد نتیجہ نکال سکتا ہے اور یہی مفید مقدمات ہیں کہ اگر ان کو اس طالب علم کی طرح الٹی ترتیب دے دی جائے تو نتیجہ غیر مفید اور برا نکل سکتا ہے جیسا اس طالب علم نے کہا تھا کہ جیسا مجھے کہا جاتا ہے کہ یوں سمجھو کہ ممکن ہے واقع میں وہ جاہل اچھا ہو ایسے ہی اس جاہل سے بھی تو کہنا چاہیئے کہ یوں سمجھ کہ ممکن ہے واقع میں ہر طرح تجھ سے میں بڑھا

ہوا ہوں لہٰذا وہ مجھے سلام کرے دیکھئے یہ وہی مقدمات ہیں جن کا حاصل یہ تھا کہ ہر شخص میں خوبیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی ان سے ایک طرح تو مفید اور نہایت کار آمد نتیجہ نکلا تھا اور انہی سے اسی ترتیب کے ساتھ ایسا برا اور مضر نتیجہ نکلا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طالب علم نے وہ طریقہ اختیار کیا ہے جو غلط ہے غرض ہم لوگ دوسرے کو اپنے سے کم ثابت کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی برائی اس کی تلاش کر لیتے ہیں اور اس میں جو بھلائی ہوتی ہے اس پر نظر نہیں کرتے۔

بجائے اس کے صحیح طریقہ یہ ہے کہ اپنے عیبوں پر نظر ڈالو اور دوسروں کے ہنروں پر اپنے اندر ہزار ہنر ہوں تو ان کو مت دیکھو اور ایک بھی عیب ہو تو اس کو دیکھو اور دوسرے میں ہزار عیب بھی ہوں تو ان کو مت دیکھو اور ایک بھی ہنر ہو تو اس کو دیکھو نتیجہ یہ ہوگا کہ اپنے آپ کو اس سے ہر حال میں کم سمجھوگے اور اس کو خود سلام کروگے تو کبر تمہارے پاس بھی نہیں آئے گا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر تم میں ہزار ہنر ہیں اور ایک عیب ہے تو اس طریقہ سے اس ایک عیب سے بھی نظر نہ چوکے گی اور کبھی نہ کبھی وہ عیب بھی تم میں سے نکل جائے گا اور تم سراپا ہنر ہو جاؤگے یہ طریقہ اچھا ہے یا وہ طریقہ اچھا ہے کہ دوسروں ہی کے عیبوں کو دیکھتے رہو اور اس میں پڑ کر اپنے عیب سے غافل رہو تاکہ دوسرے اور عیب بھی تم میں پیدا ہوتے جائیں اور رفتہ رفتہ سراپا عیب بن جاؤ سمجھدار اور عمل کرنے والے کے لئے ان ہی مقدمات میں سیدھا راستہ کھلا ہوا ہے اور قیل وقال کرنے والے اور حجتیں چھانٹنے والے کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا کیونکہ یہی مقدمات وہ بھی پیش کرتا ہے بات یہ ہے کہ جس کو خود اصلاح منظور نہ ہو اس کو کیونکر سمجھایا جائے غرض یہ آفت اور کج روی سب میں ہے اہل علم بھی اس سے خالی نہیں بلکہ ان میں یہ مرض عوام سے زیادہ ہے ہم خود اپنے آپ ہی کو کہتے ہیں کہ ہم ابتدا بالسلام نہیں کرتے اس کا منشا وہی اپنے آپ کو بڑا سمجھنا ہے یا راستے میں علو چاہتے ہیں! جدھر کو نکلیں نظریں ہم پر اٹھ جائیں یہ سب بڑا

بننا اور کبر ہی ہے اور بعض وقت راستے میں اس طرح دبے ہوئے اور جھکے ہوئے چلتے ہیں جس سے معلوم ہو کہ بڑے متواضع ہیں حالانکہ دل میں یہ ہوتا ہے کہ اسی متواضعانہ ہیئت کو دیکھ کر لوگوں کی نظریں ہماری طرف اٹھیں یہ ایک کبر دقیق ہے اس کا پتہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مقولے سے چلا فرمایا تھا کہ بعض کبر بصورت تواضع ہوتا ہے۔ جیسا کہ بعض متصنعین میں دیکھا جاتا ہے کہ جب کسی مجمع میں پہنچے تو صف نعال میں بیٹھ گئے اس کے سوا کوئی جگہ ہی نہیں اختیار کرتے لوگ جانتے ہیں کہ یہ فلاں شخص ہیں یا وضع قطع اور صورت و شکل سے بھی سفید پوش اور شریف پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں۔ پڑھے لکھے کی صورت چھپتی نہیں ہے اب لوگ اصرار کرتے ہیں کہ حضرت یہاں تشریف لائیے صدر مقام پر بیٹھیے، آپ کہاں بیٹھ گئے ہم سب کو شرمندہ کردیا یہ جگہ آپ کے بیٹھنے کی نہیں ہے آپ کو خدا تعالیٰ نے بڑا رتبہ دیا ہے مگر یہ ہیں کہ جوں جوں اصرار ہوتا جاتا ہے اور اسی جگہ پر جمے جاتے ہیں اور نہایت عاجزی سے کہتے ہیں کہ بھائی میں تو اس جگہ کے بھی قابل نہیں من آنم کہ من دانم سفید کپڑوں کو یا ظاہری تقدس کو مت دیکھو اندر تو میرے سارے عیب ہی بھرے ہوئے ہیں (سچ کہتا ہے واقعی سارے عیب ہی بھرے ہوئے ہیں کیونکہ ام العیوب یعنی کبر موجود ہے) کتنا ہی کہئے مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹتے بلکہ اور نیچے کو کھسکتے جاتے ہیں یہ وہی کبر ہے جس کو مولانا نے فرمایا کہ بعض کبر بصورت تواضع ہوتا ہے صورت تو ایسی کہ بالکل سراپا تواضع معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ لوگ ہم کو متواضع سمجھیں اور اس طرح ان کے دلوں میں ہماری وقعت اور بڑائی آجائے تو بڑائی مقصود ہوئی نہ تواضع یہ کبر بڑا خطرناک ہے یہ اس کبر سے اشد ہے۔ جو بعض دنیاداروں میں ہوتا ہے کہ کھٹ پٹ کرتے ہوئے آئے اور سب سے اونچی جگہ بیٹھ گئے۔ یہ بھی کبر ہے مگر دونوں میں فرق ہے اس سے نیچے بیٹھنے والے کا کبر اشد ہے کیونکہ وہ چھپا ہے اور یہ ظاہر ہے اور تپ دق اوپر کے بخار سے زیادہ خطرناک ہے دوسرے اس لئے اشد ہے

کہ یہ فعل یعنی صف نعال میں بیٹھ جانا اور تواضع کی صورت اختیار کرنا محمود عند الناس ہے اس سے زیادہ رفعت حاصل ہونے کی امید ہے اور اسی واسطے اس کو اختیار کیا جاتا ہے اور اس شخص کی وضع جو کہ خود آکر اونچی جگہ پر بیٹھ گیا ہے لوگوں کے نزدیک بھی محمود نہیں اس سے اتنی رفعت حاصل ہونے کی امید نہیں جتنی اس میں تھی تو وہ کھڑا ہوا اس کے سے اور ایک وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنی وضع قائم رکھنے کے لئے اپنے بھائی کا کہنا نہ مانا یہ صف نعال میں دوسروں کی دل شکنی کرکے اس لئے بیٹھتا ہے کہ اپنی وضع میں فرق نہ آجائے اور کوئی یوں نہ کہے کہ یہ تو فرش پر بیٹھنے والے تھے کرسی پر کیوں بیٹھ گئے یہ شخص آن پرست بعض لوگوں کو وضعداری میں اس قدر غلو ہوتا ہے کہ اس کے لئے رقمیں خرچ کرتے اور دقتیں اٹھاتے ہیں مگر اپنی وضع میں فرق نہیں آنے دیتے حقیقت اس کی محض کبر ہے کہ ہم اتنے بڑے ہیں کہ کوئی ہم سے ہماری وضعداری نہیں چھوڑا سکتا یہ سب شیطانی دھندے ہیں۔ وضع کیا چیز ہے اور قطع کیا چیز ہے اور آن کیا چیز ہے اپنے آپ کو اتنا بڑا ہی کیوں سمجھے کہ اس کے لئے کوئی خاص وضع مقرر ہو بندہ کا حق تو یہ ہے کہ جس وردی اور جس وضع میں سرکار رکھیں اسی میں رہے اپنی رائے اور ارادے کو بالکل فنا کردے ادنیٰ حالت میں رکھیں تو ادنیٰ حالت میں رہیں اور اعلیٰ حالت میں رکھیں تو اعلیٰ حالت میں رہیں نہ اعلیٰ کو خود اختیار کرے نہ ادنے کو یہ ہے تواضع حقیقی ورنہ پھر یوں کہنا چاہیئے کہ بنی اسرائیل بڑے متواضع تھے کہ انھوں نے ایک اعلیٰ درجہ کے کھانے کو چھوڑ کر ادنیٰ درجہ کے کھانوں کو اختیار کیا تھا ان پر حق تعالیٰ نے اپنے فضل سے من وسلویٰ اتارا تھا اور یہ وہ اعلیٰ درجہ کی غذا ہے کہ بڑے بڑے آدمیوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی ان کو شیرینی ترنجبین کی ملتی تھی اور نمکین غذاؤں کا گوشت ملتا تھا اور لطف یہ کہ یہ چیزیں خود بخود ان کے پاس آجاتی تھیں ان کو کچھ خرچ کرنے اور محنت ومشقت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی ظاہر ہے کہ یہ کیسی اعلیٰ درجہ کی نعمت ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے بطور امتنان کے متعدد جگہ فرمایا ہے وانزلنا علیکم المن والسلوٰی مگر انھوں نے اس حالت کو پسند نہیں کیا اور یہ کہا لن نصبر

علیٰ طعام واحد فادع لنا ربک یخرج لنا مما تنبت الارض من بقلها و قثاء ھا وفومها وعدسها وبصلها ط یعنی ہم ایک کھانے پر صبر نہیں کرسکتے خدا تعالیٰ سے کہیئے کہ ہمارے واسطے کچھ سبزیئں زمین سے پیدا کرے جیسے ترکاریاں اور کھیرے اور گیہوں اور مسور اور پیاز تو ان کے اس فعل کو بھی تواضع کہنا چاہیئے کیونکہ انھوں نے اعلیٰ چیز کو چھوڑ کر ادنیٰ کو اختیار کیا جیسے وہ صف نعال میں نعال میں بیٹھنے والا باوجود لوگوں کے اصرار کے ادنیٰ جگہ کو اختیار کرتا ہے مگر دیکھئے اس کی نسبت ان کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کیا فرماتے ہیں قال اتستبدلون الذی ھو ادنیٰ بالذی ھو خیرط یعنی فرمایا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا بدلتے ہو تم ایک اعلیٰ درجہ کی چیز کو ادنیٰ درجہ کی چیز سے یہ بطور انکار کے فرمایا معلوم ہوا کہ ان کا یہ فعل پسند نہیں ہوا حالانکہ سب جانتے ہیں کہ تواضع یا زہد صفت محمود ہے مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پر انکار فرما رہے ہیں معلوم ہوا کہ ان کا یہ فعل تواضع اور زہد میں داخل نہ تھا ورنہ آپ اس پر کیوں انکار کرتے پیغمبر سے زیادہ تو کوئی صاحب بصیرت نہیں ہوسکتا اس سے صاف معلوم ہوا کہ بعض وہ فعل بھی جو صورتاً تواضع ہوتے ہیں حقیقۃً نہیں ہوتے اس سے مولانا کے اس مقولہ کا ثبوت واضح ہوگیا کہ کبھی کبر بصورت تواضع بھی ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل کے اس سوال کے الفاظ ہی بتلا رہے ہیں کہ یہ زہد اور تواضع نہ تھا بلکہ ایک شرارت اور حق تعالیٰ کی نعمت سے اعراض تھا۔ دیکھئے پیغمبر کے سامنے کہتے ہیں لن نصبر علیٰ طعام واحد یعنی ہم سے یہ ہرگز نہ ہوگا کہ ایک ہی کھانے پر بس کریں اگر یہ تواضعاً کہا جاتا تو اس کے لئے ایسے الفاظ ہوتے کہ حضرت ہم اس قیمتی اور اعلیٰ غذا کے قابل نہیں ہیں۔ ہمارے نفس اس سے پھول جائیں گے اس لئے خدا تعالیٰ سے دعا فرمادیجئے کہ ہمیں کوئی اور چیز دیں جو ہماری حیثیت کے لائق ہو لیکن نہیں انھوں نے بجائے عاجزی کے کلمات کے ایک نہایت سخت لفظ کہا جس میں تمرد پایا جاتا ہے کہ ہم ہرگز ایسا نہیں کریں گے کہ ایک ہی کھانا کھاتے رہیں۔ تواضع تو عبودیت کا شعبہ ہے جس کو عجز و نیاز لازم ہے عاجزانہ الفاظ ایسے نہیں ہوتے غرض یہ فعل تواضع نہ تھا اسی واسطے حضرت موسیٰ علیہ السلام

نے اس فعل پر انکار کیا اور آگے دیکھئے حق تعالیٰ کی طرف سے اس پر کیا انعام ملا فرماتے ہیں وضربت علیہم الذلۃ والمسکنۃ وباءو بغضب من اللہ یعنی ان کے لئے مقرر کر دی گئی خواری اور محتاجی اور انہوں نے خدا تعالیٰ کا غضب اپنے اوپر لیا یہ اس تواضع کا انعام ملا حالانکہ تواضع تو بڑی چیز ہے جس کا صلہ یہ ہے من تواضع للہ رفعہ اللہ یعنی جو کوئی تواضع اختیار کرتا ہے اس کو حق تعالیٰ رفعت اور بلندی دیتے ہیں اور یہاں حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کو ذلت اور پستی دی گئی معلوم ہوا کہ یہ فعل ان کا تواضع تھا ہی نہیں لیجئے خود حق تعالیٰ کے قول سے اس مقولہ کی تصدیق ہو گئی کہ بعض تواضع حقیقت میں تکبر ہوتا ہے تکبر اور عبودیت دو متضاد چیزیں ہیں اگر عبد بننا ہے تو اپنی رائے کو چھوڑ دینا چاہئے یہ بھی اپنی رائے ہے کہ ایک وضع اختیار کر لی ہے جس کو کوئی چھوڑا ہی نہیں سکتا یہ تواضع نہیں ہے علیٰ ہذا بعضوں نے زہد کو اپنی وضع بنایا ہے کہ کھانے کی کوئی چیز چھوڑ دی ہے۔

مثلاً اناج نہیں کھاتے یہ بھی صورتاً زہد ہے اور حقیقت میں وہی تکبر ہے جس سے صرف یہ مقصود ہے کہ شہرت ہو کہ شاہ صاحب ایسے کامل ہیں کہ دنیا سے کچھ تعلق ہی نہیں رکھتے حتیٰ کہ اناج نہیں کھاتے ایسی ضروری اور محبوب چیز کو خدا تعالیٰ کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ صاحبو غور سے دیکھئے تو شاہ صاحب نے اناج کو خدا تعالیٰ کے لئے نہیں چھوڑا بلکہ نفس کے لئے چھوڑا ہے تاکہ یوں کہا جائے کہ شاہ صاحب بڑے کامل زاہد ہیں یہ حب جاہ ہے جو امراض میں سے ہے یہ زہد نہیں ہے جو عملاً کمالات میں سے ہے زہد کے معنے یہ نہیں ہیں کہ خدا نعمت دے اور اس کو استعمال نہ کرے دیکھئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں خلق لکم ما فی الارض جمیعًا یعنی خدا تعالیٰ نے تمہارے واسطے وہ سب چیزیں پیدا کیں جو زمین میں ہیں یہ کیسی عبودیت ہے کہ خدا تعالیٰ تو فرما دیں کہ یہ چیزیں تمہارے واسطے ہیں اور تم ان سے منہ پھیر لو ایسے شخص کو جو اناج نہیں کھاتا یہ چاہئے کہ اس آیت کی تفسیر میں ایک استثنا بڑھا دے الا اناج کہ اور سب چیزیں تو پیدا کی ہیں ہمارے واسطے مگر اناج یہ اچھی عبودیت ہے کہ خدا تعالیٰ کے کلام میں بھی اصلاح کی نوبت آ گئی۔ حضرت عبودیت کا خلاصہ اپنی رائے کو فنا کر دینا ہے اور اپنی رائے کو کچھ سمجھنا یہ عبودیت کی ضد اور تکبر ہے۔

بس بندہ کی شان تو یہ ہے کہ کسی بات میں بڑا بننے ہی نہیں جس چیز میں ذرا سا بھی تکبر پائے اس سے دور بھاگے۔ اگر ململ پہننے سے تکبر ہوتا ہے تو وہ نہ پہنے۔ اور گاڑھا پہننے سے تکبر ہوتا ہو تو وہ نہ پہنے۔ کبھی گاڑھا پہننے سے بھی تکبر ہوتا ہے اور وہ تکبر اس تکبر سے گاڑھا ہوتا ہے جو ململ سے ہوتا ہے جیسا ململ پتلا ہے ایسا ہی اس کا تکبر بھی پتلا ہوتا ہے جہاں گاڑھا پہننے سے مقصود یہ ہے لوگ یوں کہیں کہ شاہ صاحب بڑے متواضع ہیں بڑے زاہد ہیں اور اس سے شاہ صاحب کا نفس پھولنے لگے میں سچ کہتا ہوں کہ اس وقت گاڑھے سے وہ ململ ہی اچھی ہے اس وقت یہ گاڑھا حق تعالیٰ کو پسند نہیں ململ پسند ہے۔

خلاصہ یہ کہ ایک کبر بشکل کبر ہوتا ہے اور ایک کبر بشکل تواضع ہوتا ہے اور یہ اہل علم میں زیادہ ہوتا ہے اور یہ ایسا مخفی کبر ہے کہ اس کا پتہ دوسروں کو تو کیا صاحب مرض کو بھی نہیں چلتا عوام تو علما کے ساتھ ایسا عقیدہ رکھتے ہیں کہ علم کا نام آتے ہی ان کی ہر بات کو اچھا سمجھنے لگتے ہیں اور یہ عالم صاحب حقیقت سے ناآشنا اپنے افعال کی صورت اچھی پاکر مطمئن ہیں کہ ہم عالم باعمل ہیں تواضع ہم میں موجود ہے زہد ہم میں موجود ہے حالانکہ تواضع ہے نہ زہد صرف تکبر ہی تکبر ہے اگر کسی حقیقت شناس کے پاس بیٹھتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ کیا ہے کچھ تو یہ خود اس غلطی میں مبتلا ہیں اور کچھ لوگوں کے منہ سے تعریف سن سن کر ان کا دماغ خراب ہو گیا ہے اور سمجھتے ہیں کہ کوئی بات تو ہے جو ہماری تعریف کی جاتی ہے غرض سرتاپا مریض ہو گئے اور مرض کے ساتھ خدر یعنی سُن کا مرض بھی ہو گیا کہ مرض کا حس باقی نہیں رہا بلکہ حس الٹا ہو گیا کہ مرض کو صحت سمجھنے لگے یہی وجہ ہے کہ آجکل اس بات کو علما کے کمالات میں سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی غلطی ہو جاوے تو اس سے علی الاعلان رجوع نہ کیا جاوے اس کی ہمت نہیں ہوتی بلکہ ایک تاویل سے اخفاء کی ضرورت ذہن میں آتی ہے وہ یہ کہ اگر علی الاعلان رجوع کیا جاوے گا تو عوام کے ذہن سے ہماری وقعت اٹھ جائے گی اور ان کے ذہن میں یہ بات آجائے گی کہ ان کو کچھ علم نہیں ہے اور آئندہ کے لئے ہمارے فتوے کا اعتبار نہ کریں گے پھر شریعت کا حکم ان کو کیسے معلوم ہوگا اور ہدایت کیسے ہو سکے گی گویا مسلمانوں کے بڑے خیر خواہ ہیں کہ ان کو علم سے محروم رکھنا نہیں چاہتے۔ میں اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ

یہ مسلمانوں کی خیر خواہی نہیں ہے بلکہ اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ اپنے نفس کی خیر خواہی ہے فقط یہ منظور ہے کہ ہماری وقعت اور جاہ میں فرق نہ آوے اور ہم بڑے بنے رہیں اور اس میں یہ بات بھی داخل ہے کہ اپنے ایک بزرگ سے غلطی ہو گئی ہو اور ان کو واضح بھی ہو گیا ہو کہ یہ غلطی ہوئی ہے لیکن معتقدین اس کو غلطی نہیں کہتے بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح اس کا ثواب ہونا ثابت کر دیں اور بات بنے یا نہ بنے مگر اس کی پرورش کئے جاویں گے اور اس غلطی کی پرورش کو بزرگوں کی نصرت سمجھتے ہیں حالانکہ یہ نصرت جائز نہیں کیونکہ نصرت حق کی چاہیئے نہ کہ باطل کی یاد رکھو کہ ایک غلطی تو وہ ہوئی جو ان بزرگ سے ہوئی تھی اور دوسری غلطی یہ ہے کہ آپ اس کو نباہ رہے ہیں اور یہ آپ کی غلطی اشد ہے پہلے غلطی سے کیونکہ وہ تو نادانستگی سے ہوئی اور یہ دیدہ و دانستہ ہے یا یہ کہو کہ وہ خطا ہے اور یہ عمداً اور غور کیا جاوے تو در حقیقت یہ ان بزرگ کی نصرت ہے ہی نہیں بلکہ ان پر کبر کی حمایت ہے حقیقت اس کی یہ ہے کہ نفس رائے دیتا ہے کہ اگر اپنے بزرگ کی غلطی تسلیم کرو گے تو اس سے اپنی حماقت ظاہر ہو گی کیونکہ سننے والے کہیں گے کہ یہ بھی اچھے شخص کے معتقد ہیں جس سے ایسی ایسی غلطیاں ہوتی ہیں بس یہ حقیقت ہے اس نصرت کی کہ نفس نسبت الی الحماقت سے بچنا چاہتا ہے مگر اس کے واسطے یہ مقدمات سوجھاتا ہے کہ وہ بزرگ ہیں ان کی نصرت خدام کے ذمہ ہے ایک ادنیٰ مسلمان کی نصرت بھی مسلمان کے ذمہ حق ہے چہ جائیکہ ایک بڑے بزرگ کی یہ دھوکہ ہے نفس کا کہ ایک بری بات کو ایسی اچھی صورت پہنا دی ہے مگر حقیقت اس کی وہی ہے کہ نفس نسبت الی الحماقت سے بچنا چاہتا ہے اور ان کو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے اس واسطے یہ الٹی سیدھی ہانکے جاتے ہیں کیا ٹھکانا ہے اس دھوکہ کا کہ بڑا گہرا دھوکہ ہے اور بہت سی تہوں میں لپٹا ہوا کبر ہے اسی واسطے کسی جاننے والے نے کہا ہے کہ سب سے بڑا مولوی نفس ہے کہ کیسی کیسی دور کی سوچتا ہے اور کتنی دور سے پکڑتا ہے یہ دو واقعے میں نے بطور مثال کے بیان کئے ہیں ورنہ سیکڑوں امور میں یہی بات ہے کہ ظاہر میں صورت اچھی ہے کہیں تواضع ہے کہیں زہد ہے کہیں نصرت ہے کہیں ایثار ہے کہیں نصیحت اور ہدایت ہے لیکن حقیقت ان کی کچھ بھی نہیں ہے سوائے کبر کے مگر افسوس کہ لوگوں میں حتیٰ کہ علماء میں

بھی حس نہیں رہا کیونکہ سر سے پیر تک اسی میں مبتلا ہیں اور کبر طبیعت ثانیہ بن گیا ہے جب اس کا حس ہی نہیں رہا تو علاج کیطرف توجہ کیسے ہو مگر میں پھر بھی بتائے دیتا ہوں کہ اس کا علاج کچھ نہیں ہے سوائے ایک بات کے اور وہ بات یہ ہے ؎

نفس نتواں گشت الاظل پیر   دامن آں نفس کش راسخت گیر

(نفس نہیں فنا ہو سکتا ہے جب تک پیر کا دامن نہ پکڑے اس نفس کو مارنے والے کا
دامن خوب مضبوط پکڑے تاکہ جب اس پر ڈانٹ بھی پڑے تب بھی نہ چھوڑے)

مگر یہ بھی یاد رکھئے کہ سایہ میں آنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دھوپ میں سے ہٹ کر اس کے سایہ میں کھڑے ہو جاؤ بلکہ اس کے معنی ہیں اس سے تعلق پیدا کرنا اور اس کا اتباع کرنا تاکہ اس کے اخلاق کا اثر تم پر پڑے صاحبو صحبت اور تعلق کا اثر ضرور ہوتا ہے سائنس سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ نفس میں مسارقت کا مادہ ہے یعنی دوسرے سے اثر لینے کا (مسارقت سرقہ سے مشتق ہے سرقہ کے معنی ہیں چوری چوری کے نام سے نہ چونکئے گا چوری دو طرح کی ہوتی ہے۔ جائز اور ناجائز۔ جائز چوری میں کچھ حرج نہیں غرض نفس چوری کرتا ہے یعنی جس سے اس کو تعلق وارتباط اور محبت ہو دزدیدہ اس کے اخلاق اپنے اندر لے لیتا ہے اگر اچھے ہیں تو اچھے اور بُرے ہیں تو بُرے اور یہی راز ہے اس حدیث کا المراء علیٰ دین خلیلہ فینظر من یخالله یعنی آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے تو چاہیئے کہ ہر شخص غور کر لیا کرے کہ میں کس سے دوستی کر رہا ہوں اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دوست کا اثر دوست کے دین پر ضرور پڑتا ہے اور یہ بات واقعات سے بھی ثابت ہوتی ہے کفار میں بہت سے آدمی ایسے بھی ہیں جو اسلام کو حق جانتے ہیں لیکن اپنے ملنے والوں اور دوستوں کے شرم ولحاظ سے مسلمان نہیں ہوتے دیکھئے ان کی دوستی نے ان کو دین سے باز رکھا تو یہ سچ ہوا کہ آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے ایسے واقعات بہت ہیں اور بہت جگہ ایسا ہوا ہے کہ ایک مسلمان کسی بددین کے پاس اٹھتا بیٹھتا رہا اور اس پر یہ اثر ہو گیا کہ نعوذ باللہ مرتد ہو گیا غرض یہ بالکل سچا مضمون ہے صحبت کے بارے میں بڑی احتیاط چاہیئے۔ آدمی کبھی یہ نہ سمجھے کہ میرے اوپر کیا اثر ہو سکتا ہے ضرور اثر ہوتا ہے اور اس طرح سے ہوتا ہے کہ خبر بھی نہیں

ہوتی اس پر ایک شخص نے ایک دفعہ اشکال کیا کہ جب صحبت میں یہ اثر ہے کہ ہر شخص میں دوسرے کے اخلاق آجاتے ہیں تو جب ایک نیک اور ایک بد کی باہم صحبت ہوگی تو بد کے اخلاق بھی نیک کی طرف متعدی ہوں گے اس لئے نیک کو بد سے بچنا ضروری ہوا اور بد کو صحبت نیک حاصل کرنے کا حکم ہے تو دونوں کا اجتماع کیونکر ہوگا حاصل یہ ہوا کہ نیک کو تو حکم ہے بد سے الگ رہنے کا اور بد کو حکم ہے صحبت نیک اختیار کرنے کا تو اس صحبت کے حاصل ہونے کی صورت کیا ہے میں نے کہا واقعی بیڈھب شبہ ہے مگر اسی وقت دل میں جواب آگیا جس سے شبہ حل ہو گیا اور یہ بات تجربہ اور واقعات کے دیکھنے سے ماخوذ ہے وہ یہ کہ صحبت کا اثر ہونے کے لئے تابعیت شرط ہے یعنی متبوع کا اثر ہوا کرتا ہے تابع پر نہ کہ تابع کا متبوع پر یہ ہے قاعدہ کلیہ اور یہی مدار ہے صحبت نیک کے حکم کا اور صحبت بد سے ممانعت کا حاصل یہ ہوا کہ بد کے پاس تابع ہو کر نہ جاؤ چنانچہ امراء کی صحبت سے جو اہل اللہ نے بہت اہتمام کے ساتھ منع کیا ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ ان کو مقصود بنا کر ان کے پاس نہ جاؤ اور اگر اس طرح جاتا ہو کہ ان کو مقصود نہ بنایا جاوے اور ان کے تابع نہ بننا پڑے تو کچھ حرج نہیں مثلاً وعظ و نصیحت کے لئے یا کسی معاملہ کے لئے مثلاً اپنی کوئی چیز جیسے مکان یا جائداد وغیرہ بیچنا ہو اس کے لئے جانا ممنوع نہیں کیونکہ یہ ان کو مقصود بنانا نہیں ہے اس میں ضرر نہ ہوگا مگر میں یہ بتائے دیتا ہوں کہ یہ بھی جب ہے کہ وہاں جاکر کسی قسم کی بھی تابعیت پیدا ہو جانے کا خوف نہ ہو کیونکہ امراء کی صحبت میں اکثر ایک زہریلا مادہ ہوتا ہے کہ وہاں جاکر ہر شخص کو تابع بننا پڑتا ہے۔ اور ان کی ہاں میں ہاں ملانا پڑتی ہے اگر ذرا بھی اس بات کا خوف ہو تو اس شخص کو جو اپنے قلب کی محافظت کرنے والا ہے ایسی جگہ نہ جانا ہی بہتر ہے یہ بات اہل علم کو خصوصاً خوب یاد رکھنی چاہیئے بعض وقت امراء اہل علم کو اس طرح بلاتے ہیں کہ علما کو تابع بنانا نہیں چاہتے بلکہ متبوع بنا کر بلاتے ہیں مثلاً وعظ کہنے کے لئے بلاتے ہیں یا دعوت کرتے ہیں اور ادب اور اکرام کے ساتھ بلاتے ہیں ظاہر ہے کہ اس میں آدمی تابع نہیں بنتا اور ظاہراً کچھ حرج نہیں معلوم ہوتا لیکن میں اہل علم کو مشورہ دیتا ہوں کہ اس معیار کو پیش نظر رکھیں اور خوب

غور سے کام لیں کہ وہاں جاکر ہم کو کسی بات میں دبنا تو نہ پڑے گا اور کسی بات میں ہاں میں ہاں تو ملانا نہ پڑے گی اور کسی بات میں مداہنت اور سکوت عن الحق تو کرنا نہ پڑے گا اگر ذرا بھی اس بات کا اندیشہ ہو خواہ اس امیر کے جبروت اور سطوت کی وجہ سے یا اپنے ضعف قلب کی وجہ سے تو ہرگز نہ جائیں اور اگر بالکل اطمینان ہو کہ ان میں سے کوئی بات پیش نہ آئے گی تو مضائقہ نہیں مگر اس کے ساتھ اتنا میں پھر بھی کہے دیتا ہوں کہ گو ہر طرح کا اطمینان ہو لیکن پھر بھی امیر کی صحبت ان مفاسد سے خالی نہیں ہوتی الا ماشاء اللہ غرض میری یہ ہے کہ اہل علم کو اس میں نرمی نہیں برتنا چاہیئے اور ہر قسم کے اطمینان کی صورت میں بھی امرا کی صحبت میں تقلیل ضرور چاہیئے۔ کیونکہ امراء کی صحبت میں خاصیت ہے متبوعیت کی یعنی ہر شخص کو تابع بنا لینے کی اور جب آدمی تابع بن گیا تو حسب قاعدہ مذکورہ نفس مسارقت ضرور کرے گا اور اس کے اخلاق کا تعدیہ ضرور ہوگا بحمد اللہ اب وہ اشکال حل ہو گیا کہ صحبت نیک کیسے حاصل ہو جبکہ نیک کو بھی حکم ہے صحبت بد سے بچنے کا حاصل حل کا یہ ہوا کہ نیک آدمی بد کا تابع ہو کر نہ رہے تو صحبت بد اس کو مضر نہیں نہ اس سے بچنے کا حکم ہے بلکہ طالب اصلاح کو چاہیئے کہ خود تابع بنے اور اس کو متبوع بناوے یہ تو اشکال درمیان میں آگیا تھا اصل بیان یہ تھا کہ صحبت ضرور مؤثر ہے اور یہ بات سائنس سے بھی ثابت ہے تو اگر اپنے اخلاق کی اصلاح کرنا ہے تو کسی ایسے شخص کی صحبت اختیار کیجئے جو اخلاق حمیدہ رکھتا ہو اور اس سے تعلق پیدا کیجئے اور اس کا اتباع کیجئے یہ ہے علاج جس سے برے اخلاق دور ہوتے ہیں اور اچھے اخلاق پیدا ہوتے ہیں اور رٹے پڑھنے پڑھانے سے یہ کام کبھی نہیں ہو سکتا صحبت عجب چیز۔ ہے صحبت جب شرائط کے ساتھ یعنی معہ قصد تابعیت پائی جاوے تو ضرور مؤثر ہوتی ہے تجربہ کر لیجئے کہ ایک غصیارا آدمی جو بات بات پر لوگوں سے لڑتا ہو چند روز ایک حلیم اور بردبار آدمی کے پاس بیٹھے تو اس میں حلم پیدا ہو جاوے گا یا اس کے برعکس ایک حلیم اور سرد مزاج آدمی کسی غصیارے آدمی کے یا کسی حکومت والے کے پاس چند روز بیٹھے تو اس میں ضرور کچھ نہ کچھ تیزی اور گرمی پیدا ہو جائے گی حیادار آدمی کے پاس بیٹھنے سے حیا اور بے حیا آدمی کے پاس بیٹھنے سے بے حیائی اور بک بک کرنے والے کے

(ان شاء اللہ باقی آئندہ)

پاس بیٹھنے سے بک بک کرنا اور فضول گوئی اور خاموشی اور باوقار آدمی کے پاس بیٹھنے سے سکوت اور وقار پیدا ہوتا ہے یہ آثار صحبت سے پیدا ہوتے ہیں اتنے لکھنے پڑھنے اور کتابوں کے دیکھنے سے نہیں ہوتے اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب میں تو ایک مضمون دیکھا جو اس وقت ذہن میں آگیا پھر جاتا رہا اور صحبت میں واقعات پیش آتے ہیں جس سے اس کا استحضار بار بار ہوتا ہے مثلاً حلیم شخص کے پاس بیٹھو گے تو بار بار اس کو صبر وتحمل کرتے دیکھو گے اور اس کے فوائد بھی دیکھو گے اور متعدد مرتبہ اس کا استحضار ہوگا تو تم بھی صبر کرنے لگو گے یہ فرق ہے نرے صحبت اور علم میں یہاں وہ لفظ پھر یاد رکھئے کہ صحبت کا اثر جب ہی ہوتا ہے جبکہ اس شخص کو جس کی صحبت اختیار کی ہے متبوع بناؤ نرا پاس آنا جانا کافی نہیں اسی کو میں نے کہا تھا کہ پیر کے سایہ میں آنے کے معنی یہ نہیں کہ دھوپ سے اٹھ کر اس کی چھاں میں آجائے بلکہ اس سے تعلق پیدا کرنا اور اس کے اتباع کا قصد کرنا مراد ہے یہ مطلب ہے ظل پیر کا اس کا اثر اس طرح ہوتا ہے کہ جب تم نے اس کو بڑا سمجھا اور متبوع بنایا اور اپنے آپ کو تابع بنایا اور وہ علوم میں بھی کامل ہے اور عمل میں بھی تو اس کے پاس رہنے سے علوم کان میں پڑیں گے۔ مثلاً غصہ کا علاج معلوم ہوگا کہ جب غصہ آوے تو آدمی کو چاہیئے کہ وہاں سے ٹل جاوے اس سے جوش فرو ہو جاتا ہے یا یہ کہ غصہ کسی خطا پر آتا ہے اس وقت یہ سمجھے کہ جیسے وہ شخص میرا خطاوار ہے ایسے ہی میں بھی تو کسی کا خطاوار ہوں یہ خیال آتے ہی غصہ فرو ہو جائے گا یہ نکتے کان میں پڑیں گے اور وقت پر رہبری کریں گے جب بار بار یہ باتیں کان میں پڑیں گی تو کہاں تک اثر نہ ہوگا ایک وقت چوکو گے دو وقت چوکو گے تیسری دفعہ تو اصلاح ہو ہی جائے گی اور چند روز میں ان شاء اللہ غصہ کے روکنے کی قدرت حاصل ہو ہی جائے گی یہ سبب تو ظاہری ہے اہل اللہ کے پاس رہکر اصلاح ہونے کا کہ ان کی صحبت میں اچھی اچھی باتیں کان میں پڑتی رہیں گی اور کبھی نہ کبھی اثر کریں گی۔

ایک سبب باطنی بھی ہے وہ یہ ہے کہ جب تم ان کے پاس رہو گے اور تعلق بڑھالو گے

ضروری اطلاع: خط وکتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیں۔

تو ان کو تم سے محبت ہو جائے گی تو اس سے دو طرح اصلاح ہوگی ایک تو یہ کہ وہ دعا کریں گے اور ان کی دعا مقبول ہوتی ہے تو حق تعالیٰ تم پر فضل فرماویں گے اور اکثر یہ ہے کہ ان کی دعا باذن حق ہوتی ہے تو ان کے منہ سے دعا نکلنا اس بات کی علامت سمجھنا چاہیئے کہ حق تعالیٰ کے فضل ہونے کا وقت ہی آگیا دوسری وجہ بڑی خفی ہے وہ یہ کہ تمہارے اعمال میں ان کی محبت سے برکت ہوگی اور جلد جلد ترقی ہوگی جو کام چار دن میں ہوا ایک دن میں ہوگا اور بہت جلد اصلاح ہو جائے گی یہ ایسی بات ہے جس کو سائنس والے نہیں سمجھ سکتے لیکن اگر وہ چاہیں تو بہت آسانی سے سمجھ بھی سکتے ہیں یہ لوگ ہر بات میں نظیر مانگا کرتے ہیں دلیل سے ان کی سمجھ میں بات نہیں آتی۔ اس کی نظیر بھی لیجئے وہ یہ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مقناطیس میں ایک قوت جاذبہ ہے جس سے وہ لوہے کو کھینچ لیتا ہے ہم کو اس کی کنہ بتلانے کی کوئی ضرورت نہیں ہم ایسے نظیر دیتے ہیں جو ان کے ہاتھوں میں موجود ہے اس کی وجہ وہ خود بھی نہیں بیان کر سکتے مگر اس قوت جاذبہ کا انکار نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے سامنے موجود ہے بس یہی قوت جاذبہ اہل اللہ کے قلب میں ہے جو طالب کو ان سے تعلق رکھنے والے کو ایسا ہی کھینچ لیتی ہے جیسے مقناطیس لوہے کو کھینچ لیتا ہے اب باطنی برکت کا بیان اہل سائنس کی سمجھ کی موافق بھی ہوگیا یعنی ان کے قلب میں ایک قوت کشش ہے جو طالب کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور ان کا قلب حق تعالےٰ سے ملا ہوا ہے تو نتیجہ یہ نکلا کہ طالب کے قلب کو ان کی صحبت اور تعلق سے حق تعالیٰ کا قرب ہو جاتا ہے تو ان کی صحبت سے نفع ہونے کے چار سبب ہوئے ان کے پاس جا کر علوم نافعہ کا کان میں پڑنا ان کے افعال کی تقلید کرنا انکی دعا ان کی برکت یہ جس کو میں نے سبب خفی کہا تھا اور جس کا بیان بحمد اللہ بقدر ضرورت ہوگیا اہل اللہ کے پاس رہنے سے ان چار صورتوں سے اثر ہوتا ہے یہ بات کسی اور طرح حاصل نہیں ہو سکتی اسی واسطے کہا تھا ؎

نفس نتواں گشت الاظل پیر

مولانا نے حصر کر دیا ہے اصلاح کو صحبت شیخ میں اور یہ بالکل سچی اور واقعی بات

ہے کہ اصلاح بدون کسی کو بڑا بنائے ہوئے نہیں ہوسکتی۔ بہت سے پڑھے لکھے اور دیندار لوگ بھی اس بات میں غلطی پر ہیں یوں سمجھتے ہیں کہ بس کتابوں کا پڑھ لینا اور مطالعہ میں رکھنا اصلاح کے لئے کافی ہے یاد رکھو کہ اور کتابیں تو کیا وہ کتابیں بھی جو اسی فن اصلاح اخلاق کی ہیں جیسے احیاء العلوم وغیرہ ان سے بھی اصلاح نہیں ہوگی جب تک کسی کے ماتحت نہیں بنو گے اور جبتک کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ ہوگا اور جب تک کوئی یہ کہنے والا نہ ہوگا کہ تم بڑے نالائق ہو یہ حرکت کیوں کی یاد رکھو محض ایک بات کی برائی معلوم ہوجانے سے وہ بات چھوٹ نہیں جاتی۔ دیکھو شرابی شراب پیتا ہے حالانکہ جانتا ہے کہ شراب بری چیز ہے مگر اس جاننے سے شراب چھوٹتی نہیں ہاں اس سے چھوٹتی ہے کہ کوئی اس سے بڑا اس پر مسلط ہو اور جب یہ شراب پیے تو تھوڑی گوشمالی کردیا کرے اس میں اثر ہے اور اس میں نہیں دیکھئے شراب جس کو پینے والا خود بھی برا جانتا ہے بدون کسی بڑے کے دباؤ کے نہیں چھوٹتی تو وہ برائیاں جن کی برائی خود فاعل کو بھی معلوم نہیں وہ بغیر دوسرے کی روک ٹوک کے کیسے چھوٹ سکتی ہیں اور وہ صفات جن کا اختیار کرنا نفس پر بہت شاق ہے نفس ان کا خوگر بدون دباؤ کے کیسے ہوسکتا ہے جیسے تواضع جس کا ذکر ہو رہا تھا کیونکہ تواضع کے معنے چھوٹا بننے کے ہیں۔ آدمی چھوٹا بننا کبھی گوارا نہیں کرتا تو جب تک کوئی بڑا اس پر مسلط نہ ہو اور یہی معنی ہیں ماتحت ہونے کے اس وقت تک تواضع پیدا نہیں ہوسکتی۔ غرض نرے علم سے اصلاح نہیں ہوسکتی بار بار نگرانی کرنے اور عادت ڈالنے سے ہوتی ہے اور عادت بدون دوسرے کو بڑا بنائے ہوئے نہیں ہوسکتی اور اصل [۵]الاصول تمام اخلاق ذمیمہ کی کبر ہے اور اس کے شعبے اس قدر مخفی ہیں کہ بڑے بڑے علم والوں کو بھی پتہ نہیں چلتا جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ بہت سے لوگوں میں کبر بصورت

---

[۵] اس وقت بیان میں بے حد لطف آرہا تھا مگر افسوس کہ دیر ہوجانے کی وجہ سے اہل مدرسہ کی طرف سے عرض کیا گیا کہ مدرسہ کی رپورٹ سنانے کا موقعہ لایا جاوے۔ فرمایا مجکو وقت بتادیجئے کہ اتنی دیر میں بیان کو ختم کردیا جاوے میں اتنی ہی دیر میں ختم کردونگا چنانچہ وقت مقرر کردیا گیا اور اس کی وجہ سے حضرت نے یہاں سے اختصار شروع کردیا ۱۲ من الجامع

تواضع ہوتا ہے اور اس وصف میں اہل علم زیادہ حصہ رکھتے ہیں۔ اور دیا سلائی کے مصالحہ کی طرح یہ مادہ سب میں موجود ہے کسی کو بے فکر نہ ہونا چاہیئے نہ معلوم کس وقت رگڑ لگ جاوے اور جل اٹھے اور سب خانماں کو پھونک دے۔ یہ کبر وہ چیز ہے جو سبب ہوا ہے ابلیس کے کافر ہونے اور رجیم ہونے کا حق تعالیٰ نے اس کے اور اس کے تمام شعبوں کی برائی بیان فرمائی ہے فبئس مثوی المتکبرین میں اور چونکہ تمام اخلاق ذمیمہ کبر ہی سے پیدا ہوتے ہیں جیسا کہ تجربہ سے معلوم ہوتا ہے اور وقت وسیع ہوتا تو بقدر ضرورت بیان بھی کر دیتا تو اس سے اشارہ ہو گیا تمام اخلاق کے اصلاح کی ضرورت کے طرف یہاں تک بیان تھا کفار کی حالت کا قیامت میں اب آگے مومنین کی حالت کا بیان فرماتے ہیں وسیق الذی اتقوا ربھم الی الجنۃ زمرا اس کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے۔ اور ہنکائے جائیں گے وہ لوگ جو حق تعالیٰ سے ڈرتے تھے یعنی مومنین جنت کی طرف گروہ کے گروہ ہنکائے جانے میں ایک معنی زبردستی کے پائے جاتے ہیں جو سوق کی تذلیل کو مستلزم ہے گویا یہ معنی ہوئے کہ زبردستی دھکے دیکر مومنین کو جنت کی طرف لیجایا جائے گا حالانکہ اہل جنت کی تذلیل خلاف واقع ہے عقل کے بھی خلاف ہے کیونکہ جنت محل اکرام[مه] ہے نہ محل تذلیل اور نقل کے بھی خلاف ہے کیونکہ ایک آیت میں صاف آیا ہے اولئک فی جنت مکرمون اس واسطے وسیق الذین اتقوا کے تفسیر میں مفسرین نے یہ لفظ لکھا ہے اے بلطف یعنی اہل جنت کو جنت کی طرف زبردستی لے جایا جائے گا مگر نہ تذلیل کے طور پر بلکہ لطف اور اکرام اور خوشی کے ساتھ جیسے کوئی اپنے بہت عزیز دوست کو بغل میں ہاتھ ڈال کر گھر کی طرف کھینچتا ہے کہ چلو جی جلدی کرو تم کو جانا پڑے گا ہم تم کو ہرگز نہیں چھوڑیں گے اسی طرح اہل جنت کو فرشتے تقاضا کر کے جلدی جلدی بہشت کی طرف لے چلیں گے تو یہ

[مه] سوال۔ اس پر یہ شبہ ہوگا کہ جنت کے محل اکرام ہونے سے خارج جنت کا محل اکرام ہونا لازم نہیں اور سوق خارج جنت ہوگا نہ داخل جنت بقرینۃ الغایۃ فی قولہ تعالیٰ حتی اذا جاءوھا ۱۲ ظ

جواب۔ مقدمات جنت بحکم جنت ہیں تو اہانت کا اجتماع مقدمات کے ساتھ بھی نہیں ہو سکتا ۱۲

سوق عزت کی بات ہے نہ ذلت کی اس کو سوق کیا گیا مشاکلۃ کیونکہ اول گروہ کے لئے سوق کا لفظ آچکا ہے گو دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے اس میں اشارہ ہوگیا اس بات کی طرف کہ صورۃً دو چیزوں کا یکساں ہونا حقیقۃً یکساں ہونے کو مستلزم نہیں سوق اہل جنت کے لئے بھی ہوگیا اور اہل دوزخ کے لئے بھی مگر دونوں میں باہم کچھ نسبت نہیں اور یہ بات اخلاق میں بھی بہت مطرد ہے کہ خلق محمود و مذموم میں بہت تشابہ ہوتا ہے اسی واسطے میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ کسی مبصر کے سپرد کردو اپنے آپ کو اپنی رائے کے بھروسہ پر نہ رکھو بسا اوقات تواضع حقیقت میں تکبر ہوتا ہے غرض سوق دونوں گروہ کے لئے ہوگا مگر وہاں عذاب کے طرف ہوگا اور یہاں ثواب کی طرف زمراً کے معنی وہی ہیں جو پہلے گذرے یعنی جماعتیں کی جماعتیں حتیٰ اذا جاؤھا وفتحت ابوابھا وقال لھم خزنتھا سلام علیکم طبتم فادخلوھا خالدین واوٗ فتحت کا حالیہ ہے یا عاطفہ ہے اور دوسرے معطوفات اسی پر مترتب ہیں اور دونوں تقدیروں پر یہ سب جملے اذا کے تحت میں ہیں اور ترکیب میں شرط ہیں آگے جزاان کی بیان نہیں کی گئی کہ جب یہ سب کچھ ہوگا تو کیا ہوگا یہ سب جنت کے باہر ہوگا جیسا کہ ادخلوا سے معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ادخلوا صیغہ امر ہے جو چاہتا ہے استقبال کو اس کی تقریر پہلے فادخلوا ابواب جھنم میں ہوچکی ہے جزا کے بیان نہ کرنے میں اشارہ اس طرف ہے کہ آگے ایک بات ہو تو بیان کی جاوے جاننے کیا کیا ہے کہاں تک بیان کیا جاوے۔ نیز یہ کہ جو کچھ ہے وہ بات کہنے کی ہے ہی نہیں جب دیکھو گے تب ہی سمجھ میں آوے گی یہ مضمون اس حدیث میں صراحۃً موجود ہے اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علیٰ قلب بشر یعنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ چیزیں تیار کی ہیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں اور نہ کسی کان نے سنیں اور نہ کسی کے دل

---

۵ اور یہ جواب بھی ہوسکتا ہے کہ اہل جنت اور اہل جہنم دونوں اپنے محل کی طرف جلدی جلدی تیزی کے ساتھ چلیں گے لیکن کفار تو ملائکہ کے ہنکانے سے تیزی کریں گے وہاں تو سوق حقیقی ہوگا اور اہل جنت حکم دخول پاتے ہی خود بخود ایسے دوڑیں گے جیسے کسی نے زبردستی دوڑایا ہو تو وہاں حقیقی سوق نہ ہوگا بلکہ حکمی ہوگا۔ واللہ اعلم ۱۲ ظ

میں اس کا خیال آیا۔ پھر اگر وفتحت کا واؤ عاطفہ ہو تو یہ معنی ہوں گے کہ جنت کے دروازے پہلے سے کھلے ہوئے نہ ہوں گے بلکہ اس وقت کھلیں گے جبکہ اہل جنت ان کے پاس آویں گے جیسے دوزخ کے دروازوں کے متعلق تھا کہ اس وقت کھولے جاویں گے جس وقت اہل جہنم ان کے پاس آویں گے سو جہنم کے دروازے پہلے سے کھلے نہ ہونے کے وجوہ تو اوپر معلوم ہوئے اور جنت کے بارہ میں بھی ہمارے استاد رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ جنت کے دروازے بھی پہلے سے کھلے ہوئے نہ ہوں گے بلکہ بعد میں کھولے جاویں گے اور اس میں چند نکتے ہیں ایک تو یہ نکتہ کہ عادت ہے کہ دفعۃً نعمت پر نظر پڑنے سے حظ زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی کو ایک لاکھ روپیہ ملنے والا ہے اول اس کو خبر ملی کہ کلکتہ میں میرا اتنا روپیہ ہے پھر وہاں سے اس کی روانگی کی خبر ملی کہ وہاں سے چل دیا پھر معلوم ہوا کہ الہ آباد بنک میں آگیا ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ مراد آباد کے خزانہ میں آگیا ہے حتیٰ کہ لاکر سامنے رکھ دیا گیا تو اس کو خوشی تو ضرور ہوگی مگر اتنی جتنی اس صورت میں ہوگی کہ ایک شخص کو مطلق خبر نہیں اور وہم وگمان میں بھی نہیں کہ میرا کہیں اتنا روپیہ ہے یکلخت کوئی سب روپیہ سامنے لاکر رکھ دے کہ یہ تم کو ملا ہے اس صورت میں ایسا حظ ہوگا کہ عجب نہیں مارے خوشی کے شادی مرگ ہو جاوے ایسے واقعات ہوئے بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض جگہ کسی ملزم کو پھانسی کا حکم ہوا پھر اپیل میں رہائی کا حکم ہوا تو اس حکم کو یکلخت نہیں سنایا گیا اس وجہ سے کہ ناامیدی کے بعد ایک دم یہ خبر سن کر کہیں مارے خوشی کے مر نہ جائے اس کی وجہ زیادت حظ و سرور ہی ہے۔

معلوم ہوا کہ ایک دم نعمت پر نظر پڑنے میں زیادہ حظ ہوتا ہے بہ نسبت نظر تدریجی کے اس واسطے جنت کے دروازے بند ہوں گے اور جب جنتی اس کے پاس پہونچیں گے تب ایک دم کھول دیئے جائیں گے۔ اور ایک نکتہ ہے اس کے سمجھنے کے لئے دو مقدموں کو ملانے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ اہل جنت جنت میں جانے کے بعد باہر نہیں نکلیں گے ایسی جگہ میں سے کون نکلنا گوارا کرتا ہے۔ ہاں اہل دوزخ بعض بعض دوزخ میں سے

نکلیں گے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو چند روز کے بعد نجات پا کر نکالے جائیں گے غرض اہلِ جنت اندر جانے کے بعد پھر باہر نہ نکلیں گے۔ ایک مقدمہ یہ ہوا اور ایک مقدمہ یہ ہے کہ جنت باہر سے بھی مزین ہے اگرچہ عادت یہ ہے کہ باغ کو باہر سے نہیں سجایا کرتے جیسا کہ مشہور ہے۔

ع۔ بنقاش احتیاجے نیست دیوار گلستاں را

مگر وہاں ایسا نہیں وہاں اندر سے تو جنت ہے ہی جیسی ہے باہر سے بھی مزین اور مرصع ہے اور یہ ظاہر ہے کہ باہر کی زینت ایسی نہیں ہو سکتی جیسی اندر کی ہو گی کیونکہ اندر کی زینت مقصود اصلی ہے اور باہر کی بالتبع اور مقصود اور تابع میں فرق ہوتا ہے تو اگر دروازے جنت کے پہلے سے کھولدیئے جاویں تو اندر کی زینت کے سامنے باہر کی زینت کو کون دیکھے اس واسطے اول دروازے بند ہوں گے تاکہ باہر کی زینت کو بھی دیکھ لیں پھر کھولدیئے جاویں گے کیونکہ اندر سے باہر کون آوے گا نیز اس واسطے بھی جنت کے دروازے پہلے سے کھلے ہوئے نہ ہوں گے کہ جہنم میں تو لوگ بجبر واکراہ جاویں گے تو اگر دروازہ کھلے ہوئے ہونے کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے تو جہنم کے لئے ہو سکتی ہے کہ سب سامان عذاب کا تیار ہو گا صرف ڈھکیل دینے کی ضرورت ہو گی اگر دروازے بند ہوں تو شاید کچھ دیر لگے اور یہاں تو خوشی سے جاویں گے اور ہر قسم کا اطمینان ہو گا تو مزے لیتے ہوئے اور سیر کرتے ہنستے بولتے ہوئے جاویں گے تو کیا جلدی ہے کہ دروازہ پہلے سے کھلے ہوئے ہوں۔ باہر کی سیر کرکرا کے جب اندر جانا چاہئیں گے کھولدیئے جائیں گے۔ ان میں بعض نکتے حضرت استاذنا علیہ الرحمۃ کے ارشاد فرمائے ہوئے ہیں۔ یہ تقریر اس صورت میں ہے کہ وفتحت کا واؤ عاطفہ لیا جاوے کیونکہ اسی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دروازہ پہلے سے کھلے ہوئے نہ ہوں گے اور اگر واؤ کو حالیہ لیا جاوے تو حال قید ہوتا ہے عامل کے لئے تو معنی یہ ہوں گے کہ آئیں گے جنت کے پاس اس حال میں کہ دروازے کھلے پڑے ہوں گے اس صورت میں اس کا یہ مدلول ہو گا کہ دروازے پہلے سے کھلے ہوئے ہوں گے اس کے لئے دوسرا نکتہ ہو گا کہ وہ بھی لطف سے خالی نہیں وہ یہ ہے کہ جنت مشتاق ہو گی اہلِ جنت کی جیسے کوئی بڑا عزیز مہمان

گویا کسی کا بچہ مدت کے بعد دور دراز سے آوے تو اس کے لینے کے لئے ماں گود پھیلائے بیٹھی ہوتی ہے تو جیسے جنتی مشتاق ہیں جنت کے جنت بھی ان کی مشتاق ہے اور اس میں جو کچھ خدم وحشم حور و غلمان ہیں وہ سب بھی مشتاق ہیں۔ یہ مضمون حدیث سے بھی ثابت ہے یہ تو اہل جنت کے لئے لذت جسمانی ہوئی کہ ایک قول پر دروازے بند ہوں گے اور سیر کرتے ہوئے اور باہر کی آرائش دیکھتے ہوئے اطمینان کے ساتھ جاویں گے پھر ایک دم دروازے کھول دیئے جاویں گے یا دوسرے قول پر دروازے کھلے ہوئے ہوں گے اور جنت اور مافیہا ان کی مشتاق ہوں گی آگے لذت روحانی کا بیان ہے وقال لھم خزنتھا کہیں گے ان سے وہاں کے کارکن یعنی فرشتے سلام علیکم طبتم فادخلوھا خلدین۔ یہ اکرام ہے ان کا اور اظہار عظمت ہے کہ فرشتے ان کو سلام کریں گے اور مبارکباد دیں گے کہ تم اچھے ہے اب چین کرو اور جنت میں چلو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کیسی خوشی کا وقت ہے، اہل جنت جوش میں آکر کہیں گے الحمد للہ الذی صدقنا وعدہ حق تعالیٰ کا شکر ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ پورا کیا ایمان لانے پر ہم سے جنت کا وعدہ کیا تھا سو اس کو کر کے دکھا دیا یہاں ایک معقول شبہ ہے وہ یہ کہ حق تعالیٰ کا وعدہ پورا ہونا تو واجب اور ضروری ہے اس کے خلاف ہونا محال ہے پھر اس پر احسان ماننے اور شکر کرنے کے کیا معنی جو چیز ضروری اور یقینی ہے وہ تو ضرور ہی واقع ہوگی چاہے کوئی خوش ہو یا ناخوش اول تو یہ شبہ کسی نمک حرام ہی کو ہو سکتا ہے ورنہ سوچنے کی بات ہے کہ وعدہ کے بعد اس کا پورا ہونا یقینی سہی لیکن شروع سے وعدہ ہی کیوں کیا گیا ہمارا خدا تعالےٰ کے ذمہ کیا آتا تھا جو ہم سے وعدہ کیا گیا خود ہی مہربانی فرمائی کہ ہم کو ایک وعدہ کا امیدوار بنایا یہ وعدہ بھی ایک فضل ہے اور اس کا ایفاء بھی جو کہ اس وعدہ پر مرتب ہے دوسرا فضل ہے دوسرے یہ کہ وعدہ تو کیا تھا مگر کس شرط سے کیا تھا یعنی اس کے ساتھ کچھ شرط بھی تھی اس شرط کا پورا کر دینا یہ تو واجب نہ تھا اس کو محض اپنے فضل سے پورا کیا مان لیا جائے کہ ایمان لانا آپ کا فعل تھا مگر اس پر جزاء موعود کا مترتب ہونا موقوف تھا اس کے باقی رہنے پر اور یہ بقاء ایمان آپ سے نہیں ہو سکتا تھا یہ ادھر ہی سے فضل ہوا کہ اس کو باقی رکھا گیا ممکن تھا کہ حق تعالیٰ اس کو باقی نہ رکھتے تو اس صورت میں اس جزاء کے بھی آپ مستحق نہ ہوتے اور اس وعدہ کا پورا ہونا جو ایمان پر کیا گیا

تھا ضروری نہ ہوتا کیونکہ اس کی شرط نہ پائی گئی لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ اس شرط کو موجود کیا گیا اور اس پر اس وعدہ کا ایفا کیا گیا یہ محض فضل سے ہوا یا نہیں تو اب یہ احسان ماننا کہ بالکل بجا ہوا کہ شکر ہے خدا کا جس نے اپنا وعدہ ہم سے پورا کیا اور یہی معنی ہیں اس سوال کے ربنا واتنا ما وعدتنا علی رسلك ولا تخزنا یوم القیمة انك لا تخلف المیعاد کیونکہ اس میں بھی یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جب وعدہ کر لیا گیا تو پھر اس کے پورا کرنے کا سوال کیا معنے وہ تو خود ہی پورا ہوگا اس کے خلاف تو ہو ہی نہیں سکتا پھر مانگنے کی کیا ضرورت ہے اس کا جواب بھی یہی ہے کہ وعدہ بیشک کیا گیا ہے لیکن وہ وعدہ مشروط ہے بقاء ایمان کے ساتھ تو سوال در حقیقت اس بات کا ہے کہ یا اللہ ہم کو رسولوں کے طریقوں پر قائم رکھنا تا کہ اس وعدہ کے ہم مستحق ہوں تیسرے ایفا جو واجب ہے تو واجب علی اللہ نہیں ہے کہ موجب احسان نہ ہو واجب من اللہ ہے اور وہ موجب احسان ہو سکتا ہے واورثنا الارض اور وارث بنایا ہم کو زمین کا اس زمین سے مراد جنت کی زمین ہے کیونکہ جنت ہی کا بیان ہو رہا ہے نیز آگے اس کی تصریح نتبوأ من الجنة میں موجود ہے اس سے معلوم ہوا کہ جنت میں بھی زمین ہے اور اس کے مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب زمین ہے تو آسمان بھی ہے اور یہ ثابت ہے کہ جنت کے لئے خلود ہے تو اس کے آسمان اور زمین کیلئے بھی خلود ہوا تو اس سے ایک اور آیت کا اشکال بھی رفع ہوتا ہے وہ آیت وہ ہے جس میں اہل جنت اور اہل دوزخ دونوں کے لئے یہ لفظ ہے خلدین فیھا ما دامت السموٰت والارض جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں اس وقت تک رہیں گے جس وقت تک زمین و آسمان رہیں گے جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جنت اور نار دونوں میں قیام کیلئے ایک خاص مدت مقرر ہے جو کہ مدت ہے بقاء سماوات وارض کی اور جب کوئی مدت مقرر ہوئی تو خلود کہاں رہا اور یہ دوسری تصریحات کے خلاف ہے اس اشکال کے جواب کے لئے لوگوں نے تاویلیں کی ہیں ایک تاویل جو تفسیر مذکور کی بنا پر ہے یہ ہے کہ سماوات وارض سے مراد جنت کے آسمان اور زمین ہیں اور جنت کے لئے خلود ہے تو ان کے واسطے بھی خلود ہے تو گو دونوں فریق کے لئے مدت مقرر کی گئی مگر وہ مدت خود لا متناہی ہے تو ان کا رہنا بھی لا متناہی ہوا اور یہی معنی خلود کے ہیں تو یہ معنی ہوئے کہ اہل جنت اور اہل دوزخ جنت اور دوزخ میں رہیں گے جب تک

دونوں کے آسمان اور زمین کا وجود ہے اور ان کا وجود کب تک ہے ہمیشہ کے لئے ہے اور ان کا رہنا بھی ہمیشہ کے لئے ہوا باقی اس آیت میں جو لفظ الا ماشاء ربک وارد ہے مختصراً اس کو بھی سمجھ لینا چاہیئے یہ استثناء ہے خلود سے معنی یہ ہیں کہ خلود ہوگا مگر ان کے لئے جن کو حق تعالیٰ نہ چاہیں تو اس سے ظاہراً سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی جنت سے نکالا بھی جاوے گا حالانکہ یہ خلاف واقع اور خلاف تصریحات نصوص ہے اس کی توجیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ استثناء کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک وہ جو بعض اہل نار کے لئے ہوگی بعض لوگ (یہ عصاۃ مومنین ہیں) گناہوں کی وجہ سے چند روز کے لئے جہنم میں جاویں گے پھر نکال لئے جاویں گے تو خلود نہ ہونے کی یہ صورت ہوگی کہ بعض گنہگار اولاً جہنم میں جاویں گے پھر جہنم سے نکالکر جنت میں جاویں گے اور جنت میں ہمیشہ بطور خلود کے رہیں گے اور کبھی نکالے نہ جاویں گے مگر یہ خلود ان کا ابتدا کی طرف سے ان لوگوں کے خلود سے کم ہے جو ابتداءً جنت میں جاویں گے تو خلود جنت بھی بعض کے لئے اسی طرح استثناً کا مصداق بن سکتا ہے یہ تاویل اکثر لوگوں نے لکھی ہے ما دامت السمٰوٰت والارض کی اور بعض اہل زیغ اس قید کو دیکھ کر اس کے قائل ہو گئے کہ جنت اور نار فنا ہو جاویں گے اور خلود سے مراد مکث طویل لے لیا اور یہ کہا کہ گو جنت اور نار کا ہزاروں لاکھوں برس قیام رہے مگر اخیر میں فنا ہو جائیں گے لیکن یہ بالکل غلط ہے اور اہل حق کے عقیدہ کے خلاف ہے اہل حق سب خلود ہی کے قائل ہیں اور انھوں نے اس آیت ما دامت السمٰوٰت والارض میں وہی تاویل کی ہے جو میں نے بیان کی اس تاویل سے معنی بن گئے اور اشکال رفع ہو گیا مگر ایک معنی اور بھی ہو سکتے ہیں (ابتدا میں میں نے کہا تھا کہ آج کے بیان میں میں اپنی طرف سے کچھ نہ کہوں گا مگر عادت پڑی ہوئی ہے کہ جب کوئی مضمون قلب میں آ جاتا ہے تو بلا بیان کئے طبیعت نہیں مانتی علت جاتے ہی جاتے جاویگی تو اس وقت میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے اس کو میں بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ تاویل مذکور بن تو گئی اور اشکال رفع ہو گیا لیکن اس عنوان سے فائدہ کیا نکلا خلدین فیہا کے بعد ما دامت السمٰوٰت والارض کی ضرورت کیا تھی یہ کیوں فرمایا کہ ہمیشہ رہیں گے جب تک جنت کے آسمان زمین ہیں گے بیان خلود کے لئے تو خلدین فیہا بھی کافی تھا اس عنوان سے تو خواہ مخواہ ایک اشکال پیدا ہو گیا یہ جملہ نہ ہوتا تو کوئی بھی اشکال نہ ہوتا

یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ تاکید ہے خلود کی یہ ایسا ہے جیسے کسی کو کہیں تمھیں گاؤں دیا پوچھا گیا کب تک کے لئے جواب دیا جب تک گاؤں ہے اس کے معنے یہ نہیں ہوتے کہ مدت کی تحدید کردی کہ جب تک گاؤں آباد ہے اس وقت تک یہ زمین اس کو دی اور جب گاؤں اجڑ جاوے تو واپس لے لی جاوے گی بلکہ یہ لفظ اس واسطے کہا گیا ہے کہ عادت یہ ہے کہ گاؤں مدتوں رہتا ہے آدمی کی عمر سے زیادہ گاؤں کی عمر ہوتی ہے تو یہ مراد ہے کہ تمھیں تمام عمر کے لئے اور ہمیشہ کے لئے دیا گیا اور کبھی واپس نہیں لیا جائے گا گاؤں ہے اس معنی میں آتا ہے کہ ہمیشہ کے لئے دیا گیا اور کبھی واپس نہیں لیا جائیگا قرآن شریف میں محاورات کی رعایت بہت ہے تو ما دامت السمٰوات والارض سے مراد تحدید نہیں بلکہ وہی معنی مراد ہیں جو اس لفظ سے مراد تھے کہ جب تک گانوں ہے رہا یہ کہ ان دو ہی چیزوں کو کیوں بیان کیا یعنی سماوات اور ارض کو یوں کیوں نہ فرمایا دامت الجنت اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مکان میں فرش اور چھت اصل ہوتا ہے تو تمام اجزاء میں سے ان اجزاء کا نام لیا جو اصل ہیں تو اب یہ ایسا ہو گیا جیسے کسی کو گاؤں میں گھر دیں اور کہیں یہ گھر تمھیں دیا اس وقت تک کے لئے جب تک کہ یہ گانوں ہے کہ اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ ہمیشہ کے لئے اور گانوں کا نام اس واسطے لیا گیا ہے کہ اگر گھر کا نام لیتے اور یوں کہتے کہ جب تک گھر ہے تو ہمیشگی پر دلالت نہ ہوگی کیونکہ گھر منہدم ہونے والا ہے اور گانوں منہدم ہونے والا نہیں تو گانوں کا نام لینے سے ہمیشگی پر دلالت ہوگی اسی طرح جنت کے ان اجزا کا نام لیا جو اصل اور عمود ہیں اور بہ نسبت دیگر اجزاء کے عادتًا دیرپا ہو سکتے ہیں تو اس سے اور تاکید ہو گئی خلود کی یہ نکتہ ہوا ما دامت السمٰوٰت والارض میں (واللہ اعلم) واورثنا الارض مالک بنا دیا ہم کو زمین کا یعنی جنت کی زمین کا جب کہ آگے تصریح موجود ہے اور کسی خاص حصہ کا مالک نہیں بنایا بلکہ نتبوأ من الجنۃ حیث نشاء جنت میں سے جہاں ہم چاہیں جگہ لے سکتے ہیں یہ آزادی ہوگی کہ جہاں جس کا جی چاہیگا وہاں پہنچ جائیگا ایسا نہ ہوگا جیسے کوئی نظر بند ہوتا ہے کہ کسی ایک باغ میں یا ایک شہر میں رہتا ہے کہ اس سے باہر نہیں جا سکتا اہل جنت کے لئے کوئی حد نہ ہوگی بے قید کھلے آزاد ہوں گے جہاں چاہیں جائیں جو چاہیں کریں دوستوں سے ملیں نہ خانہ میں رہیں دیواروں سے لپٹیں

چھت پر چڑھیں غرض کسی قسم کی روک ٹوک نہ ہوگی کسی بات سے دل مارنا نہ پڑے گا عجب لطف ہوگا بقول مولانا محمد یعقوب صاحب کے چھوٹی سی خدائی ہوگی چھوٹی سی کے معنی یہ ہیں کہ حقیقی خدائی میں تو سب کچھ اختیار اور ارادہ سے ہوتا ہے اور اس میں ان کے اختیار سے تو کچھ نہ ہوگا مگر مرضی کے موافق سب کچھ ہو جاوے گا یعنی جس چیز کو ان کا جی چاہے گا فوراً حق تعالیٰ اس کو حکم دیں گے اور وہ ہو جائیگی یہی معنی ہیں اس آیت کے لکم فیھا ما تشتھیہ الانفس وتلذ الاعین. ترجمہ تمھارے واسطے اے اہل جنت جنت میں وہ ہے جس کو تمھارا دل چاہے اور جس سے آنکھیں لذت پائیں ما کا لفظ عام ہے تو جو کچھ کسی کا جی چاہے وہی ہوگا مثلاً چھت دار مکان میں بیٹھے ہیں اور دل چاہا کہ چھت نہ رہے تو چھت فوراً ہٹ جائے گی یا میدان میں ہیں اور جی چاہا کہ اس جگہ چھت دار مکان ہوتا تو فوراً خدائے تعالےٰ کے حکم سے ایک آن میں جیسا مکان خیال میں آیا تھا ویسا ہی موجود ہو جاوے گا اور جی چاہا کہ سائبان نہ رہے تو فوراً ہٹ جائے گا ایک پرندجو بصورت درخت پر بیٹھا ہے جی چاہا کہ اس کے کباب کھاتے بس یہ خیال آنا تھا اور وہ کباب بن کر قاب میں تیار ہو کر سامنے آگیا مزے سے کھائیے لطف یہ کہ یہاں کباب کھائے گئے اور ادھر دیکھتے ہیں کہ وہی پرند بزرگ دار بیٹھے چہچہا رہے ہیں جنت کی ہوا میں حیات ہے جیسے کسی نے کشمیر کی تعریف میں کہا ہے ؎

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر درآید
گر مرغ کباب ست کہ با بال و پر آید

(جو سوختہ جان کشمیر میں آجائے اگر مرغ کا کباب ہے تو بھی وہ مرغ بال و پر کے ساتھ زندہ ہو جاوے)

(یہ عرفی کا شعر ہے) یہ کشمیر کے بارہ میں تو مبالغہ ہے اور جنت کے بارہ میں حقیقت ہے قرآن شریف میں اس کی تصریح موجود ہے اکلھا دائم یعنی اس کے میوے ہمیشہ رہنے والے اور غیر فانی ہیں میوہ درخت سے ٹوٹ کر آنے کے بعد کھا لیا جائے گا اور درخت پر بجنسہٖ موجود رہے گا۔ اس پر ایک معقولی صاحب نے اعتراض کیا کہ جب وہ کھا لیا گیا تو فنا ہو گیا پھر دوام کہاں رہا میں نے کہا دوام نوعی مراد ہے نہ کہ شخصی یعنی جس کو کھایا وہی نہیں رہیگا بلکہ اسی جنس کا دوسرا اس کی جگہ فوراً پیدا ہو جائے گا تو دائم صحیح رہا۔ غرض جو چاہیں گے فوراً موجود ہو جائیگا دھوپ چاہیں تو دھوپ ہو جائے گی سایہ ہٹ جائے گا اس سے مراد دنیا کی سی دھوپ

نہیں جس سے تکلیف ہو بلکہ وہاں کی سی دھوپ جو جنت کے لائق ہے جس سے تکلیف بالکل نہ ہو یہ اس واسطے کہہ دیا کہ شاید کوئی اعتراض کرے کہ قرآن میں تو صاف موجود ہے لایرون فیہا شمسا ولا زمہریرا یعنی اہل جنت جنت میں نہ دھوپ پائیں گے اور نہ سردی اس سے معلوم ہوا کہ جنت میں دھوپ نہ ہوگی اور میں نے کہا کہ کوئی دھوپ کو چاہے گا تو جنت میں دھوپ بھی ہو جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی دھوپ نہ ہوگی جس سے تکلیف ہو۔ زمہریر کے مقابلہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ زمہریر سخت سردی کو کہتے ہیں تو مطلب یہ ہوا کہ وہاں نہ ایسی چھاؤں ہوگی جس سے سردی لگے اور نہ ایسی دھوپ ہوگی جس سے گرمی لگے پس ایسی دھوپ کا ہونا جو موجب تکلیف نہ ہو اس آیت کے خلاف نہ ہوا اور وہ بھی ہر وقت نہیں بلکہ اگر کسی کا جی دھوپ کو چاہے تو ہو جائے گی۔ بعضوں کا دل چاہے گا کہ ہمارے بیٹا ہوتا رہائے کوئی بے اولاد ہوگا یہ بھی ہو جائے گا۔ وہاں کیا دیر لگتی ہے فوراً تیار پلا پلایا برابر کا فرزند موجود۔ کسی کا کھیتی کو دل چاہے تو آناً فاناً میں کھیتی تیار اور غلہ اگھایا ہوا صاف شدہ سامنے آکر ڈھیر ہو گیا۔

یہی سوال حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا تو ایک شخص نے کہا کہ یہ کھیتی مانگنے والا کوئی انصاری ہوگا۔ یہ اس واسطے کہا کہ انصار اہل زراعت تھے۔ میں نے اپنے استاذ علیہ الرحمۃ سے سنا ہے ان کی نظر بہت وسیع ہے غالباً کسی روایت میں دیکھا ہوگا کہ جنت میں یہ بھی ہوگا کہ ایک پھل ہاتھ میں لیا کھانے کے لئے اور اس میں سے ایک دم ایک حور نکل آئی السلام علیکم پس دیکھ کر طبیعت پھڑک گئی۔ بعض میں سے ایک جوڑا پوشاک کا نکل آیا یہ بھی ایک حظ ہے کہ ایک نامعلوم چیز دفعۃً پیدا ہو جاوے نعمت کے ملنے سے خوشی تو ہر طرح ہوتی ہے لیکن اگر اس طرح ملے کہ اس کا وہم وگمان بھی پہلے سے نہ ہو تو عجب حظ ہوتا ہے۔ ایک رئیس کا قصہ اپنے استاذ علیہ الرحمۃ سے سنا ہے کہ ان کے یہاں دو قصباتی مہمان آئے تو باورچی نے ان کے سامنے ناشتہ لاکر رکھا جس میں صرف ایک

دستر خوان ڈیڑھ بالشت کا اور ایک چھوٹا پیالہ قورمہ کا اور ایک تشتری میٹھے چاول کی اور چار پتلی پتلی چپاتیاں اس مختصر ناشتے کو دیکھ کر مہمانوں کا جی جل گیا کہ یہ رئیس لوگ جیسے خود کم کھاتے ہیں جس کی وجہ دودھ گھی کی کثرت ہے ایسے ہی دوسروں کو بھی سمجھتے ہیں۔ خیر جبرًا و قہرًا وہ چاول اور چپاتیاں جھلا کر جلدی سے ختم کر دیں اور چپ ہو کر بیٹھ رہے خادم نے کہا حضرت نوش فرمایئے یہ اور جل گئے اور کہا کیا کھائیں اس نے پیالہ کو اٹھا کر توڑ کر سامنے رکھ دیا یہ نمکین بالائی جمائی ہوئی تھی اس کے بعد اس تشتری کے بھی ٹکڑے کر کے آگے رکھ دیئے وہ میٹھی بالائی تھی، پھر دستر خوان اٹھا کر ٹکڑے کر کے سامنے رکھ دیا کہ جناب ابھی تو بہت کھانا موجود ہے آپ گھبرائیے نہیں یہ دستر خوان باقر خانی روٹی تھی پورا دستر خوان ان سے کھایا بھی نہ گیا اور پیٹ بھر گیا تب ان کی آنکھیں کھلیں۔ دیکھئے اگر پہلے ان مہمان صاحب سے کہہ دیا جاتا کہ دستر خوان یہ ہے اور پیالہ یہ ہے تو اتنا حظ نہ آتا جتنا کہ دفعۃً معلوم ہونے کے بعد کھانے سے ہوا۔ اس سے ثابت ہوا کہ نعمت کا ایک غیر متوقع صورت اور نئی طریق سے نمودار ہونا باعث زیادت حظ کا ہوتا ہے اس کے واسطے کوششیں کی جاتی ہیں اور روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔

ایک مسلمان راجہ نے ایک مرتبہ لفٹنٹ گورنر کے لئے کسی کاریگر سے ایک مٹھائی کا انار بنوایا جس کی صورت بالکل انار کی سی تھی، دانے بھی ویسے ہی تھے، چھلکا بھی ویسا ہی تھا مگر تھی سب مٹھائی۔ ایک انار کے بنوانے میں ڈیڑھ سو روپیہ خرچ ہوتے تھے دیکھئے خدا تعالیٰ کی نعمتیں کہ ڈیڑھ سو روپیہ میں ایک انار تیار ہوا اور پھر بھی نقلی کا نقلی کہ نہ اس میں دانہ اصلی جیسا نہ گٹھلی اصلی جیسی بس صورت ہی صورت تھی۔ اور خدا کے بنائے ہوئے اصلی انار جن کی برابر یہ ڈیڑھ سو روپیہ کا انار کبھی نہیں ہو سکتا پیسے کے دو دو آتے ہیں سبحان اللہ) اور ایک شخص نے بیان کیا کہ کسی دعوت میں ایک قاب میں چنبیلی کے پھول لائے گئے کہ وہ حقیقت میں چاول پکے ہوئے تھے۔ کاریگر کی صنعت اور محنت دیکھئے کہ کوئی مصالحہ تیار کیا جس میں ایک ایک چاول کو آدھا آدھا ڈبو کر پکایا تھا

اس کے اثر سے وہ آدھا پھول کی طرح کھل گیا اور آدھا ڈنڈے کی طرح رہ گیا اور بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ قاب چنبیلی کے پھولوں سے بھری ہوئی ہے پھول اٹھانے کے لئے ہاتھ ڈالا گیا تو معلوم ہوا کہ چاول ہیں اور کھانے کی چیز ہے دیکھئے کتنا بکھیڑا کیا گیا صرف اس واسطے کہ نیا حظ حاصل ہو۔ اسی طرح جنت میں طرح طرح سے نئے حظ حاصل ہوں گے پھل میں سے کوئی پرند خوش الحان نکل آیا یا کوئی حور نکل آئی تاکہ اہل جنت کو ایک جدید حظ حاصل ہو سبحان اللہ نتبوا من الجنۃ حیث نشاء ترجمہ:۔ ہم جنت میں جہاں چاہیں جا سکتے ہیں اہل جنت سیر کرتے پھریں گے اور بالکل آزادی ہوگی جہاں چاہیں پھریں اور جہاں چاہیں رہیں کہیں روک ٹوک نہ ہوگی بالکل مخلے بالطبع ہونگے اس آزادی کا ترجمہ کسی مسخرہ نے آوارہ گردی کیا تھا۔ خیر لفظی ترجمہ تو بُرے عنوان سے یہ ہوسکتا ہے مگر یہ وہ آوارہ گردی نہیں ہے جو دنیا میں بری سمجھی جاتی ہے کیونکہ آوارہ گردی دنیا میں اس وجہ سے عیب ہے کہ مانع عن الکمالات ہے دنیا میں ضرورت ہے انسان کو بہت سے کمالات حاصل کرنیکی پڑھنے لکھنے کی صنعت و حرفت حاصل کرنے کی روپیہ کمانیکی مکان بنانے کی اولاد حاصل کرنیکی وغیرہ وغیرہ اور ان سب کی تحصیل چاہتی ہے مشغولیت اور مصروفیت کو جس سے آوارہ گردی مانع ہوتی ہے لہذا عیب سمجھی جاتی ہے اور جنت میں کوئی کمال حاصل کرنا نہیں ہے وہاں ہر چیز کا ذمہ حق تعالےٰ نے لیا ہے۔ ہم کو کسی مصروفیت اور مشغولیت کی ضرورت نہیں تو وہاں ادھر اُدھر آزاد پھرنا جس کو آوارہ گردی سے تعبیر کیا تھا کسی کمال کی تحصیل میں مانع نہیں بلکہ تمام کمالات کے حصول کا ثمرہ ہے کہ ہم ایسے فارغ ہیں کہ کسی کمال کی تحصیل باقی نہیں پھر آزادی سے کیوں نہ پھریں اس واسطے خوشی میں کہتے ہیں نتبوا من الجنۃ حیث نشاء اس میں یہ بھی داخل ہے کہ اہل جنت آپس میں احباب سے بھی مل سکیں گے امام شافعیؒ صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے جنت کی اس وقت سے تمنا ہوگئی گویا جب سے سنا ہے کہ وہاں دوستوں سے ملاقات ہوسکے گی اس سے معلوم ہوا کہ دوستوں سے ملنا بڑی چیز ہے اور ایسی نعمت ہے جس کی وجہ سے جنت کی تمنا ہوگئی گویا جنت ذریعہ ہے دوستوں سے ملنے کا تو دوستوں سے ملنا لذات جنت کا مکمل ہوا مگر وہی دوست جو خدائی دوست ہیں فنعم اجر العاملین ترجمہ۔ پس کیسا اچھا اجر ہے عمل کرنے والوں کا اس سے معلوم ہوا کہ یہ جنت اور ما فیہا جو کچھ ملا ہے یہ سب عمل کی بدولت ملا ہے بڑی چیز عمل ہے جس سے آجکل غفلت ہے عوام کی تو کیا شکایت کی جاوے اس واسطے کہ وہ علم ہی نہیں رکھتے جو شخص ایک

چیز کو جانتا ہی نہیں وہ اگر اس کے متعلق کوئی غلطی کرے تو چنداں تعجب کی بات نہیں تعجب اس شخص سے ہوتا ہے جو جانتا ہے اور پھر غلطی کرتا ہے ایک شخص وہ ہے کہ زہر کو پہچانتا اور جانتا نہیں وہ اگر کھالے تو کچھ تعجب نہیں اور اس شخص سے بہت تعجب ہوگا جو زہر کو پہچانتا اور جانتا ہے اور پھر کھاتا ہے گو اس پر چاندی کا ورق لپیٹ کر یا قند چڑھا کر اور کیوڑہ اور بید مشک کی خوشبو دیکر کھاتا ہو اس کو کوئی معذور نہیں کہے گا آجکل خدا کا نام لینے والے اور طریق کو جاننے والے دو گروہ ہیں اہل علم اہل احوال بلفظ دیگر علماء اور فقراء ایک گروہ علم پر مرتا ہے اور ایک فریق احوال پر علماء اس میں مست ہیں کہ پڑھے جاؤ اور پڑھائے جاؤ فلانے کا قول اس میں یہ ہے اور فلانیکا یہ ہے اور بڑی دوڑ ان کی قیل وقال ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے ؎

علم ظاہر سر بسر قیل ست وقال نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال

علم ظاہر سر بسر یعنی تمامتر قیل وقال ہے نہ اس سے کیفیت حاصل ہوتی ہے نہ حال حاصل ہوتا ہے، ان کا خیال اس طرف کبھی نہیں جاتا کہ کسی چیز کا علم مقصود بالذات بھی ہوتا ہے یا مقصود کسی خاص چیز سے تمتع ہے اور علم صرف اس کا ذریعہ ہے مثلاً مٹھائی ایک لذیذ چیز ہے اور قوی اور کثیر الغذا شے ہے تو کیا صرف اس کی ماہیت کا جان لینا یا اس کے خواص کا جان لینا مقصود ہے اور یہیں انتہا کر دینا چاہیئے۔ یا مقصود مٹھائی کا کھانا اور اس سے لذت اٹھانا اور بدن کو پرورش کرنا ہے اور ان کی ماہیت اور خواص کا علم ان اغراض کے حصول کا ذریعہ ہے ظاہر بات ہے کہ مقصود اور کام کی بات ثانی ہے نہ کہ اول علماء اسی غلطی میں مبتلا ہیں کہ علم دین کو مقصود سمجھ رکھا ہے اور تمتع بالدین کو نہیں میں ان دونوں میں فرق بتاتا ہوں اور وہ کچھ غامض بات نہیں فرق وہی ہے جو مٹھائی کی ماہیت اور خواص کے جاننے اور مٹھائی کے کھانے میں ہے اصل غلطی یہ ہے کہ دین نام رکھا ہے صرف احکام دین کے جاننے کا اور جب یہ حاصل ہے تو سمجھتے ہیں کہ ہم کو دین حاصل ہے حالانکہ دین نام ہے اس تعلق کے درست کرنیکا جو بندہ اور حق تعالیٰ کے درمیان میں ہے جس کے لئے مختصر اور جامع لفظ عبودیت ہے اس کے حاصل کرنے کا نام دین ہے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں جو بلا اہتمام حاصل ہو جائے بلکہ اس کے لئے کچھ طریقے ہیں جن کو خود خدائے تعالیٰ نے بتایا ہے اور وہ ایسے طول طویل اور غامض ہیں جنکے بتانے اور سمجھانے کے لئے انبیاء علیہم السلام کو بھیجنے کی ضرورت ہوئی وہ مدرک بالرائے نہیں

ان طریقوں کے جاننے کا نام علمِ دین ہے تو چونکہ یہ اچھی اور ضروری چیز کا علم ہے اس واسطے یہ بھی اچھا اور ضروری ہے لیکن مقصود بالذات نہیں بلکہ محض ذریعہ ہے تو ذریعہ میں مست ہو جانا مقصود سے رہ جانا ہے اور اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک حلوائی کامل فن ہے اور بڑا استاد ہے تمام شہر اس کا شاگرد ہے کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ مٹھائی ایسی نہیں جس کا بنانا وہ نہ جانتا ہو اور ساری عمر اس نے یہی کام کیا کہ مٹھائی بنائی اور بیچی اور لوگوں کو کھلائی لیکن میں بقسم کہتا ہوں کہ اگر اس نے مٹھائی کو منہ میں نہ رکھا ہو تو ساری عمر میں اس کا منہ میٹھا ایک دفعہ بھی نہ ہوا ہوگا۔ اس سے تو وہ شخص اچھا ہے جس کو مٹھائی بنانی تو ایک بھی نہیں آتی مگر لڈو اُسی سے خرید کر یا مانگ کر یا جس طرح بھی ہو گود میں بھر رکھے ہیں اور کھا رہا ہے اور مزے لے رہا ہے اور مقصود اس کو حاصل ہے یہی حالت ان عالم صاحب کی ہے کہ ساری عمر علم دین کی خدمت میں صرف کی اور علم کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں اور تمام شہر ان کا شاگرد ہے ہزاروں کو ان سے فیض ہو رہا ہے مگر حقیقت حال یہ ہے کہ یہ اس حلوائی کی طرح گدی پر چڑھے بیٹھے ہیں اور شاگردوں کو بھی بتلا رہے ہیں اور مٹھائی تمام شہر کو بھی کھلا رہے ہیں مگر خود کبھی نہیں کھائی تو واللہ باللہ ان کا منہ میٹھا نہیں ہونیکا ہزاروں آدمی ان کی بدولت دیندار ہو جاویں گے مگر ان کو دین کا ذائقہ بھی نہیں معلوم ہونے کا بس دین نام اس تعلق کا ہے جو حق تعالیٰ کے ساتھ ہے جس کا نام عبودیت ہے جس کی ضد تکبر ہے اہل علم اس کو غور کر لیں کہ ان میں عبودیت ہے یا اس کی ضد بس اس کی تفصیل میں زیادہ نہیں کرتا کیونکہ وہ علم رکھتے ہیں اور ان کی ماہیتوں کو وہ خود جانتے ہیں بس شکایت میں اس کی کرتا ہوں کہ اپنے احوال میں غور کیوں نہیں کرتے اور کیوں ہر وقت نگرانی نہیں رکھتے اور اگر خود سمجھ میں نہیں آتا تو کسی فن کے جاننے والے سے کیوں نہیں مشورہ کرتے اور کیوں اس کے سامنے اپنے حالات عرض نہیں کرتے تاکہ وہ بتلائے کہ اتنا حصہ اس میں عبودیت کا ہے اور اتنا تکبر کا علم کو منتہائے عروج کیوں قرار دے لیا ہے مگر جیسا کہ دوسروں کی اس سے اصلاح کرتے ہیں اپنی بھی تو کریں مٹھائی بیچ بیچ کر دوسروں کا منہ میٹھا کرتے ہیں اپنا بھی تو کریں اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ علم دین اور تمتع بالدین میں کیا فرق ہے تمتع بالدین مقصود ہے علم دین بالذات مقصود نہیں ہاں علم ذریعہ ہے تو ذریعہ کو حاصل کر کے بیٹھ نہ رہو ذریعہ کو مقصود نہ بناؤ بلکہ اس سے وہ چیز حاصل کرو

جس کا وہ ذریعہ ہے سیڑھی بناؤ چھت پر چڑھنے کے لئے بدون اس کے کام نہ چلے گا مگر سیڑھی بنانے ہی میں نہ رہ جاؤ بلکہ چھت پر بھی تو چڑھو اور سیڑھی بھی اتنی ہی بناؤ جتنی چھت پر چڑھنے کے لئے کافی ہو نہ یہ کہ ہزاروں گز لمبی بنائے جاؤ اور ساری عمر اس میں صرف ہو جاوئے چاہے چھت پر بارش ہوتی رہے اور ٹپک ٹپک کر گر ہی پڑے اور سارے گھر کو لے بیٹھے غرضکہ علم ذریعہ ہے عبودیت حاصل کرنے کا اس کو خود مقصود مت بناؤ بلکہ اس کے ذریعہ سے عبودیت حاصل کرو اور اس کو اتنا نہ بڑھاؤ کہ ساری عمر اس میں صرف ہو جاوے مقصود کی تکمیل رہ جاوے اور نفس و شیطان تمہارا کام تمام کر دیں اور ایسی حالت میں موت آجاوے بس مقصود پر نظر رکھو خوب سمجھو کہ اگر عالم اور محقق نہ ہوں گے تو کچھ حرج نہیں اور بندہ نہ ہو گے تو حرج ہے عبودیت حاصل کرو اور یہی سمجھو کہ عبودیت نام صرف نماز روزہ کا نہیں بلکہ اصلاح باطن اور تہذیب اخلاق بھی اس کا جزو ہے بلکہ جزو اعظم ہے تمام اجزاء دین کی تکمیل کا نام دین ہے عبادات معاملات معاشرات عادات اخلاق سب دین ہی ہیں صرف عبادات پر بھی بس نہ کرو نرے علم پر بس کرنا تو کیا یہ تو فرقہ علما کی کوتاہی کا بیان ہوا۔

اب لیجئے فقراء کو کہ وہ صرف کیفیت و حال میں مست ہیں علماء نے علم کو مقصود سمجھا تھا انھوں نے حال کو مقصود سمجھا ہے حالانکہ مقصود ابھی دور ہے اگر کسی کو کشف ہونے لگا یا رقت طاری ہونے لگی یا انوار نظر آنے لگے یا دست غیب یا اور کوئی کرامت حاصل ہوگئی تو بس دوڑ ختم ہوگئی اور حاصل ہوگئی اب ان کو اعمال کی ضرورت ہی نہیں رہی گویا اعمال اس واسطے کئے جاتے تھے کہ یہ کیفیت حاصل ہو جاویں۔ صاحبو واقع میں اس کا عکس ہے کہ مقصود اعمال ہیں اور یہ کیفیات اس واسطے طاری ہوتے ہیں کہ اعمال کا شوق بڑھے اس کی مثال ایسی ہے کہ بخار کے لئے دوا دی جاتی ہے مگر بعض وقت وہ کڑوی ہوتی ہے تو اس سے مریض کو نفرت ہوتی ہے اس واسطے اس پر قند چڑھا دیتے ہیں تاکہ خوش ذائقہ معلوم ہو اور طبیعت قبول کر لے یا سونے چاندی کے ورق

لپیٹ دیتے ہیں تاکہ خوش منظر ہوجاوے اور مریض خوشی سے کھالے اب کوئی قند کو اور سونے چاندی کے ورق کو مقصود سمجھ لے اور اسی کا طالب اور خریدار رہے اور اسی کو طبیب سمجھے جو قند اور ورق دے تو یہ غلطی ہوگی یا نہیں۔ اصل مقصود بخار کی دوا ہے چاہے کیسی ہی کڑوی کیوں نہ ہو اور اسی سے بخار کو فائدہ ہوگا قند اور ورق اس پر ہوں تو خوش گواری کا باعث ہے اور نہ ہوں تو مقصود میں کچھ خلل نہیں قند اور ورق کی تلاش میں اتنا مت پڑو کہ اصل دوا ہی سے رہ جاؤ اور اسی کو طبیب کی قابلیت اور شفقت کا معیار مت سمجھو ایسا نہ ہو کہ اس دھوکہ میں بخار بڑھ جاوے اور ہڈیوں میں رچ جاوے اس وقت یہ قند اور ورق کام نہ آویں گے غرض کام کی چیز دوا ہے اور قند و ورق صرف حلق میں اتر جانے کے معین ہیں۔ اب سمجھو کہ حالات اور کیفیات قند اور ورق کے مثل ہیں کہ طالب کے لئے سلوک میں باعث ازدیاد شوق ہوتے ہیں یہ خود مقصود نہیں ہیں کہ ان کے حاصل ہونے کے بعد اصل چیز یعنی تقرب الی اللہ کی ضرورت نہ رہے اور تقرب الی اللہ عبودیت سے ہوتا ہے۔ عبودیت کا حاصل ابھی باقی ہے اور عبودیت نام ہے اعمال کا یعنی دین کے اجزاء خمسہ کی تکمیل کا جو کہ عبادات اور معاملات اور عادات اور معاشرات اور اخلاق کا مجموعہ ہے اصل دوا یہ ہے کہ اور کیفیات اور حالات قند و ورق ہیں ان پر مت بھولو ان کو ذریعہ اور معین سمجھو اور مقصود پر نظر رکھو تری کیفیات سے کچھ نہیں ہوتا۔ عرفی سچ کہہ گیا ہے ؎

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال　　صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

(اگر اے عرفی صرف رونے سے محبوب مل جاتا تو سو برس تک میں رونے کی تمنا کرتا)

یہاں تک تو دونوں فریق کی کوتاہی کا بیان ہوگیا سو یاد رکھو کہ جنت اور جو کچھ آخرت میں ملے گا وہ عمل سے ملے گا نہ علم اور حال سے اسی واسطے کہتے ہیں فنعم اجر العاملین وتری الملئکۃ حافین من حول العرش یسبحون بحمد ربھم اور دیکھو گے فرشتوں کو پرے کے پرے عرش کے آس پاس کہ تسبیح کرتے ہوں گے حق تعالیٰ کی اور حمد کرتے ہوں گے۔

تسبیح کہتے ہیں تنزیہ کو صفات رذیلہ سے اور تحمید کہتے ہیں اثبات صفات جمیلہ کو وقضی بینھم بالحق ط ترجمہ اور بندوں کے درمیان یہ حکم اور فیصلہ بالکل صحیح طور پر کیا ہوا ہوگا یعنی ان کے اعمال کی یہ جزا ہوگی کسی کا حق مارا نہ جاوے گا قضی کے لفظ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ جو کچھ ہوگا خدائے تعالیٰ کے حکم سے ہوگا اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی حکومت اور الوہیت اور اہل جنت کی عبودیت اب بھی ختم نہ ہو جائے گی الوہیت تو کیا ختم ہوتی اس کا ظہور بھی ختم نہ ہوگا یہ اس کا ظہور ہی تو ہے کہ فرشتے تسبیح اور تحمید برابر کرتے ہوں گے جیسا کہ اب کرتے ہیں اور اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جب فرشتے ذکر کرتے ہوں گے تو اہل جنت بھی ذکر کرتے ہوں گے کیونکہ ذکر تمام نعمتوں سے اعلیٰ نعمت ہے جب یہ فرشتوں کو نصیب ہے تو اہل جنت کو کیوں نصیب نہ ہوگی اصل مقصود تو جنت سے نعمتیں ہی دینا ہے اور مستقل نصوص سے بھی ان کا مشغول ذکر ہونا ثابت ہے لا یسمعون فیها لغوا ولا تأثیما الا قیلاً سلاما سلاما وقالوا الحمد لله الذی اذهب عنا الحزن دعوٰهم فیها سبحانک اللهم اور خود اس مقام پر ہے وقالوا الحمد لله الذی صدقنا وعده۔ ہاں اہل جنت اس کے مکلف نہ ہوں گے یعنی ایسا نہ ہوگا جیسا دنیا میں ہے کہ یہاں ذکر کرنے کا حکم ہے اور طبیعتوں میں تقاضے اس کے خلاف رکھے ہوئے ہیں جو ذکر سے مانع ہوتے اور ان کے وجہ سے ذکر کے لئے قصد و اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے اور ذکر سے یہاں تکان بھی ہوتا ہے مگر وہاں نہ قصد کی ضرورت ہوگی نہ اہتمام کی نہ ذکر سے کچھ تکان ہوگا بلکہ ذکر داخل طبیعت ہوگا اور اندر سے خود طبیعت کے فعل سے ذکر برابر ہوتا رہے گا جیسے یہاں سانس لینے کا حال ہے کہ یہ بھی ایک حرکت ہے اور بہت سے اعضاء کے فعل سے اس کا وجود ہوتا ہے مگر اس کے لئے قصد کی ضرورت ہے نہ کسی اہتمام کی حتیٰ کہ سوتے میں بھی خود بخود جاری رہتا ہے اور نہ اس سے کچھ تکان ہوتا ہے بلکہ قوت اور بقائے حیات سب اس پر موقوف ہے۔ اسی طرح جنت میں ذکر ہوگا کہ سانس کے ساتھ خود تسبیح اور

تحلیل سب جاری ہوگی ذاکرین کے لئے بڑے بڑے مزے کی بشارت ہے کہ وہاں پاس انفاس جاری ہوگا اور بے تکان ہر وقت مزے لیں گے اور دنیا کی طرح کسی وقت تھک کر بند کرنے کی ضرورت نہ ہوگی اور فرشتوں کے ذکر میں اہل جنت کو ایک لطف اور ہے جس کو عشاق جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ محبوب کا ذکر اپنی زبان سے تو لذیذ ہے ہی محبوب کے ذکر کا دوسرے سے سننا بھی لذیذ ہے اہل ذکر اور اہلِ قلب اسی واسطے تو سمع پر مرتے ہیں سماع سے مراد سمع مروج مع مزامیر نہیں لاحول ولا قوۃ یہ تو ایسا ہے جیسے فرینی میں غلیظ ملا دینا ذکر مامور بہ اور محمود شے ہے جیسے فرینی لطیف اور مرغوب چیز ہے اس میں مزامیر کو ملا دینا ایسا ہے جیسے فرینی میں غلیظ ملا دینا یہ کثیف اور نا مرغوب اور قابلِ نفرت چیز ہے سماع سے مراد اچھی آواز کے ساتھ دوسرے سے کوئی اچھا کلام سن لینا مثلاً قرآن شریف کسی خوش آواز قاری سے سننا یا کوئی شعر اشعار متعلق سلوک دوسرے سے سن لینا چونکہ ذاکر اپنی زبان سے ذکر کرتے کرتے اس سے ایسا مانوس ہو جاتا ہے کہ اس سے التذاذ باقی نہیں رہتا یعنی اس کی لذت کا حس نہیں رہتا اس وقت کان سے جو ذکر سنتا ہے اس سے زیادہ لذّت پاتا ہے حتیٰ کہ اضطرار کی سی حالت ہو جاتی ہے کہ بلا اس کے چین ہی نہیں آتا حقیقی سماع یہ ہے جس میں لوگوں نے اس قدر غلو کیا ہے کہ محتاج بیان نہیں اس کی اصل یہ ضرور ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسرے سے قرآن سُنا تھا بس اس کو بعض لوگوں نے آڑ بنا کر تمام لہو و لعب اور منہیات کا دروازہ کھول دیا۔ انصاف سے دیکھئے اس سے تو صرف اتنا ہی سماع ثابت ہوتا ہے جتنا میں نے بیان کیا اور اگر اس میں کوئی توسع کرے تو ایسا ہوگا جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کھانا پینا بھی ثابت ہے تو کیا اس سے گندی چیزوں کے کھانے کا بھی ثبوت ہو جاوے گا۔ غرض محبوب کے ذکر کا سننا بھی لذیذ ہے اس واسطے فرشتے ذکر کرتے ہوں گے تاکہ یہ لذت بھی اہلِ جنت کو حاصل ہو۔

جنت میں حوروں کا گانا بجانا بھی ہوگا کیونکہ یہ بھی لذت سے خالی نہیں مگر

کہاں حوروں کا گانا بجانا کہاں ملائکہ کی تسبیح اور ذکر وہاں مذاق بالکل صحیح ہوں گے اس لئے جو لذت ذکر میں آوے گی وہ گانے بجانے میں نہیں آوے گی قضی بینھم کو ماقبل سے ربط یہ ہے کہ یہ بمنزلہ ذکر نتیجہ بعد القیاس کے ہے جیسے کہا جاتا ہے العالم حادث لانہ متغیر وکل متغیر حادث فالعالم حادث پہلے العالم حادث کو بصورت دعوےٰ کے لایا جاتا ہے پھر اس پر دلیل قائم کی جاتی ہے جس کو قیاس کہتے ہیں اس سے وہ دعویٰ ثابت ہو جاتا ہے۔ اب اس کو پھر دہراتے ہیں اور اب اس کو نتیجہ کہتے ہیں۔ ان آیات میں توحید کا اثبات تھا اور شرک کی نفی تھی قل افغیر اللہ تامرونی اعبد ایھا الجاھلون ولقد اوحی الیک والی الذین من قبلک لئن اشرکت لیحبطن عملک ولتکونن من الخاسرین میں یہ دونوں دعوے مذکور ہیں اس کو آئندہ آیات کے ساتھ تعلق ہے جو دعویٰ کو دلیل کے ساتھ ہوتا ہے جیسے العالم حادث کو لانہ متغیر حادث کے ساتھ تعلق ہے آئندہ آیات میں معاد کا ذکر ہے اور یہ ذکر جیسا کہ میں نے شروع میں بیان کیا تھا اسی مضمون توحید کی تاکید کے لئے لایا گیا ہے تاکہ قدرت حق تعالےٰ کی ثابت ہو جاوے اور اس خیال کا موقع کسی کو نہ رہے کہ حق تعالیٰ کسی بات سے عاجز ہیں اور اس بات کے لئے دوسرے خدا کی ضرورت ہے جیسا کہ بعض مشرکین نے کہا تھا کہ سات معبود ہیں بڑے بڑے کاموں کے لئے خدا ہے جو آسمان میں ہے اور معمولی کاموں کے لئے اور ہیں۔

معاد کے تمام کارخانہ کے بیان سے ظاہر ہو گیا کہ کمال بھی حق تعالیٰ ہی کے لئے ہے اور آثار کمال بھی حق تعالےٰ ہی کے لئے ہیں کوئی تصرف کسی دوسرے کے لئے نہیں ہے اس سے ربوبیت کے آثار بھی ظاہر ہو گئے اور الوہیت کے بھی اور اس سے توحید کی تاکید ہو گئی اور ثابت ہو گیا کہ تکوین بھی حق تعالےٰ ہی کا حق ہے اور تشریع بھی تکوین اثر ربوبیت ہے اور تشریع اثر الوہیت مضمون معاد سے ان سب باتوں کی اچھی طرح تاکید ہو گئی اب ان

دونوں نقطوں میں پھر اسی توحید اور ربوبیت اور الوہیت کے مضمون کا اعادہ کیا گیا ہے چنانچہ وقضی بینھم میں الوہیت کا بیان ہے اور الحمد للہ رب العلمین میں ربوبیت کا اور کلام کو ختم کیا مضمون ربوبیت پر اس سے کس قدر رافت و رحمت ٹپکتی ہے معاد کا بیان ختم ہوا۔

میں نے اول ہی میں کہدیا تھا کہ ان آیات سے مقصود اثبات توحید اور نفی شرک کا بیان کرنا ہے اور ساتھ ساتھ حق تعالٰے نے شکایت کی ہے اپنے حقوق نہ پہچاننے کی اور یہ حقوق بہت ہیں ان کے پہچاننے کے لئے علم کی ضرورت ہے اور ایک قسم کے علم کی ضرورت نہیں بلکہ متعدد علوم کی ضرورت ہے علم عقائد کی اور علم احکام کی، عبادات کی، معاملات کی، عادات کی، اخلاق کی اور ان علوم کے لئے بعض ان علوم کی بھی ضرورت ہے جو از جنس مبادی ہیں جن کو علوم آلیہ کہتے ہیں جیسے صرف و نحو معقول فلسفہ ان سب کی تعلیم کے جو مجالس متکفل ہیں ان ہی کا نام مدارس ہے اس سے مدارس کی ضرورت ثابت ہوگئی۔ چنانچہ اس ضرورت کو محسوس کرکے جابجا مدارس قائم کئے گئے ہیں جو فیض ان سے ہو رہا ہے وہ سب کو معلوم ہے ان مدارس کی ضرورت یاد دلانے اور شوق تازہ کرنے کے لئے ہر سال یہ علمی جلسے ہوتے ہیں ان سے ان مجالس کی بھی ضرورت ثابت ہوگئی غرض یہ ہے کہ کوئی کام بدون کئے نہیں ہوتا اہل مدارس جو کام کر رہے ہیں اس میں دو وجہ سے ضرورت ہے سب کے شریک رہنے اور ہمدردی کرنے کی ایک تو یہ کہ یہ کام ایک کے کرنے کا نہیں ہے۔

علماء کا کام درس تدریس ہے تو دوسروں کا کام مالی امداد ہونا چاہیئے۔ اگر علماء دونوں کام کریں تو ایک بھی نہیں ہوگا۔ دوسرے یہ کہ یہ کام صرف علما کی ضرورت سے نہیں کیا جاتا کیونکہ دین کی ضرورت صرف علما ہی کو نہیں ہے بلکہ ہر ہر فرد مسلمان کو اس کی ضرورت ہے تو کیا وجہ ہے کہ تمام کام علماء ہی کے ذمہ ڈال دیا جاوے انصاف سے دیکھئے تو انھوں نے ایسا بار اپنے ذمہ لے رکھا ہے جو آپ سے نہیں اُٹھ سکتا۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر وہ کام جو آپ کر رہے ہیں علما کرنے لگیں تو خیر میں یہ تو

نہیں کہتا کہ آپ سے اچھا کریں گے! گو اس دعویٰ کی بھی گنجائش ہے کیونکہ جس کام کو عوام کر سکتے ہیں اس کو اہل علم کیوں نہیں کر سکتے) تاہم بُرا بھلا تو کر ہی لیں گے اور وہ کام جو علماء کر رہے ہیں اگر آپ کریں تو برا بھلا بھی نہیں کر سکتے لہٰذا آپ کو ان کا ممنون ہونا چاہیئے اور غنیمت سمجھنا چاہیئے کہ انھوں نے آپ کے ذمہ ہلکا کام رکھا ہے اور خود بھاری کام لے لیا ہے غرض آپ اپنا کام تن دہی سے کئے جایئے وہ اپنا کام کر رہے ہیں اس طرح اس دینی کام کی تکمیل ہو سکتی ہے اور سب کو دینی فیض پہنچ سکتا ہے یہ سب کا کام ہے تو سب کو بٹانا چاہیئے اور رہی نکتہ چینی سو یہ ان کا کام ہے جو خود بھی کام کرنا نہیں چاہتے اور دوسرے کو بھی کام کرنے نہیں دیتے ان کے دل میں دین کی ضرورت ہی نہیں ہے لہذا اس کے ذرائع کی بھی ضرورت نہیں ہے اسی لئے ان ذرائع کے نہ ہونے سے ان کے دلوں پر کچھ الم اور قلق کا اثر نہیں ہوتا۔ اس نکتہ چینی کے متعلق ذرا تفصیل سے بیان کیا جاتا اور میں بعض واضح مثالوں سے اس کی خرابی سمجھاتا مگر بعض مثالیں ایسی ہیں کہ موجب ناگواری ہو سکتی ہیں اس واسطے ایک لطیف مثال پر بس کرتا ہوں جس سے توضیح مطلب ہو جاوے گی اور ناگواری بھی نہ ہوگی۔ وہ یہ ہے کہ یہ ان کی نکتہ چینی ایسی ہے جیسے فرشتوں نے کہا تھا جب ان کو خبر دی گئی کہ ہم زمین میں آدم کو خلیفہ بنانے والے ہیں تو انھوں نے کہا اتجعل فیھا من یفسد فیھا یعنی اے اللہ آپ اس کو خلیفہ بنائیں گے جو فساد کرے گا اس کا حاصل یہ ہے کہ فرشتوں نے ایک مضرت ان کے خلیفہ ہونے کی بیان کر دی یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس کے بعد حق تعالیٰ نے کیا کیا ان کے کہنے کا اتباع نہیں کیا اور اس اشکال سے حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت کو ملتوی نہیں کر دیا آپ کا مذاق اس وقت مدارس کے بارہ میں فرشتوں کے مذاق کے موافق ہے کہ آپ نے بھی ایک خرابی کی وجہ سے کام بند کر دینا مناسب سمجھا جیسے ملائکہ نے فساد کے اندیشہ سے حضرت آدم علیہ السلام کی بعثت کو موقوف کر دینے کی رائے پیش کی تھی مگر حق تعالیٰ نے اس مضرت پر

نظر نہیں فرمائی بلکہ مصلحت کو مقدم رکھا اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ اگر کسی کو مدرسہ کے متعلق کوئی اشکال بھی ہے تو یہ کیا ضرور ہے کہ مدرسہ کو جڑ سے اڑا دینے کی کوشش کی جاوے۔ اس خرابی کی اصلاح کی کوشش کیوں نہ کی جاوے آخر جو منافع اور مصالح اور ضرورتیں مدرسہ کے ساتھ وابستہ ہیں وہ کیسے پوری ہوں آپ کا ذہن تو وہاں گیا جہاں فرشتوں کا گیا کہ مضرت کی وجہ سے کام کو جڑ سے اڑا دیا جاوے اس میں آپ پر اعتراض نہیں کیا جاتا بلکہ تعریف کی جاتی ہے کہ آپ کا مذاق فرشتوں کا سا مذاق ہے لیکن اس کے مقابلہ میں دوسرا مذاق اس سے بھی اعلیٰ موجود ہے وہ وہ ہے جس طرح حق تعالے کا ارادہ ہوا کہ مصلحت کا القا کیا جاوے اور خرابی کو رفع کیا جاوے یہ مذاق ظاہر ہے کہ اعلیٰ اور ارفع ہے ایسا ہی آپ بھی کیجئے کہ اصلاح کیجئے اور جڑ سے نہ اڑائیے جڑ سے اڑانے پر ایک افیمی کا قصہ یاد آیا کہ افیم کی پینک میں تھے ایک مکھی ان کی ناک پر بار بار آکر بیٹھتی تھی کئی دفعہ اڑایا مگر بعض مکھی ضدی ہوتی ہے کہ جہاں سے اڑاؤ وہیں آکر بیٹھتی ہے یہ بہت تنگ ہوئے اور ایک دفعہ غصہ میں آکر اپنی ناک کو استرے سے کاٹ ڈالا اور کہا لے حرام زادی اب بیٹھ کہاں بیٹھے گی ہم نے تیرا اڈا ہی نہیں رکھا۔ حضرت یہ جڑ سے اڑانا تو ایسا ہے کہ مکھی کا تو کچھ بھی نہ بگڑا ان حضرت کی ناک گئی اسی طرح آپ مدرسہ کو جڑ سے اڑا دیں گے تو علماء کا کیا بگڑے گا ابواب رزق بہت سے ہیں وہ اور کوئی مشغلہ تلاش کرلیں گے مگر آپ کی ناک جاتی رہے گی یعنی دینی فیض سے محروم ہوجاؤ گے۔ اس پر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم نکتہ چینی اور اعتراض نہیں کرتے بلکہ اصلاح ہی چاہتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں اس سے مخالفت مقصود نہیں ہیں اس کے متعلق ایک اصول عرض کرتا ہوں اس کو پیش نظر رکھ کر جو کچھ کرنا ہو کیجئے وہ یہ ہے کہ معاملہ خدا کے ساتھ درست کرو جو کچھ کرو اس میں یہ دیکھ لو کہ اس میں ہماری غرض اور نفسانیت شامل ہے یا نہیں اور کسی کے کہنے سننے کی پروا مت کرو خدا کو حاضر ناظر جان کر بات کہو اگر تمہارا دل گواہی دیتا ہے کہ

ہمارا معاملہ حق تعالےٰ کے ساتھ صاف ہے اور اس میں کوئی غرض اور خواہش شامل نہیں ہے تو شوق سے کہو اس وقت وہ ضرور ایسی بات ہوگی جو اصلاح کے متعلق ہوگی مگر میں اس کی کچھ علامتیں بھی بتائے دیتا ہوں کیونکہ بعض وقت اپنے ہی فعل میں التباس ہوجاتا ہے اور آدمی سمجھتا ہے کہ یہ میرا فعل خالصًا لوجہ اللہ ہے حالانکہ اس میں بہت سی نفسانیتیں شامل ہوتی ہیں۔ ایک علامت یہ ہے کہ جو بات لوجہ اللہ ہوتی ہے وہ دل آزار پیرایہ میں نہیں ہوتی نہ سخت لہجہ میں ہوتی ہے بلکہ ایسی شفقت اور ہمدردی کے ساتھ ہوتی ہے جیسے باپ بیٹے کا کوئی عیب دیکھتا ہے تو اس کو آہستہ سے علیحدگی میں سمجھاتا ہے اور کسی کے سامنے گاتا نہیں پھرتا نہ اخباروں میں شائع کرتا ہے حتیٰ کہ اگر دس برس بھی بیٹا اس کا کہنا نہ مانے تب بھی اس کو یہ گوارا نہ ہوگا کہ کوئی دوسرا آدمی اس کے عیب کو سن لے اور جب سمجھائے گا علیحدگی میں سمجھائے گا ایسا نہ ہوگا کہ جیسے آجکل مدرسوں کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ ذراسی بات خلاف طبع پائی اور جھٹ سے اشتہار مخالفت میں شائع کردیا اخباروں میں دھوم مچادی اور ساتھ کے ساتھ لکھتے جاتے ہیں کہ ہم کو اصلاح مقصود ہے ہم مدرسہ کے بدخواہ نہیں ہیں صاحبو اس علامت کو پیش نظر رکھ کر دیکھئے۔ کیا آپ کا برتاؤ اپنے بیٹے کے ساتھ یہی ہوتا ہے کہ ذراسا عیب اس میں دیکھیں اور اخبار میں شائع کردیں اور کیا اس کو بھی اس لہجہ میں سمجھاتے ہیں جس لہجہ میں مدرسہ والوں سے گفتگو کرتے ہیں اگر حق پسند آدمی ہے تو وہ اسی سے ہیئت اور نفسانیت کو پہچان سکتا ہے اور ایک علامت یہ ہے کہ آدمی غور کرکے دیکھے کہ اگر میں ان کی جگہ ہوتا جو مدرسہ میں ہیں اور وہ میری جگہ ہوتے اور وہ مجھ پر اعتراض کرتے تو کیا ان کے اعتراض کو میں ٹھنڈے دل سے سنتا یا مجھے اس سے ناگواری ہوتی۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر اس پر نظر کرے اگر دل میں دوسرے کے اعتراض سے ناگواری پائے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ تم میں

اہلیت اور اصلاح کچھ نہیں صرف تعنت ہے اور یہ جتلانا چاہتے ہو کہ ہم بھی اہل رائے ہیں۔ اور ایک علامت اہلیت کی یہ ہے کہ اپنی بات پر بہت اصرار نہیں ہوتا صرف حق کو واضح کر دینا اور سمجھا دینا ہوتا ہے دیکھو حق تعالیٰ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جابجا فرمایا ہے لست علیهم بمصیطر۔ ولا تسئل عن اصحاب الجحیم۔ ولا تحزن علیهم۔ فان اعرضوا فما ارسلناك علیهم حفیظاً ان علیك الا البلاغ وغیرہ وغیرہ جب کفار کے ساتھ بھی یہ معاملہ تعلیم فرمایا گیا ہے تو اہل اسلام کے ساتھ تو کیا ہونا چاہیئے پس جس کو مدرسہ کی اصلاح مقصود ہوگی وہ ایک بار اپنی رائے پیش کر کے اس پر اصرار نہ کرے گا نہ مدرسہ والوں کے درپے ہوگا یہ علامتیں ایسی ہیں جن سے للہیت اور نفسانیت میں بخوبی فرق کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ آدمی انصاف پسند ہو اور عناد نہ رکھتا ہو دین کے کام میں شیطانیت اور نفسانیت کو شامل نہ کرو حق تعالیٰ کے ساتھ معاملہ صاف رکھو اگر معاملہ حق تعالیٰ کے ساتھ درست ہے اور للہیت کے ساتھ بات کہی گئی ہے تو بات دل کو لگ جاتی ہے اور ہر شخص کے دل پر اثر کرتی ہے اور یہ بات ایک ہی فریق سے نہیں کہی جاتی ہے بلکہ دوسرے فریق سے بھی بلکہ ہر شخص سے کہی جاتی ہے کہ جو کام کرو خلوص اور للہیت سے کرو نفسانیت سے نہ کرو ورنہ برکت جاتی رہتی ہے چاہے کیسا ہی نیک کام ہو اور چاہے ذرا سا کام ہو مگر خلوص کے ساتھ ہو تو اس میں برکت ہوتی ہے چاہے اس کا کوئی بھی معاون نہ ہو دیکھو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جس وقت آپ نے تبلیغ اسلام کا کام شروع کیا ہے کونسا مجمع تھا کیا امید کی جاسکتی تھی کہ یہ کام چلے گا مگر اس میں خلوص ہی خلوص تھا اس کا نتیجہ دیکھ لیجئے کہ کام ایسا چلا کہ آج تمام عالم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام موجود ہیں کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں مسلمان نہ ہوں۔

بس تو اہل مدرسہ سے یہ عرض اتنا ہوا کہ مخالفین کے اعتراضات کے دفعیہ وغیرہ کی بھی کوشش نہ کریں یہ بھی ایک مشغلہ ہے اپنا کام خلوص سے کئے جاویں۔ سب شور و غل آپ ہی دب جاویں گے۔ اب دعا کیجئے۔ ختم ۱ بجکر ۵۵ منٹ پر

(**ایک علم غیر منقول**) بعد وعظ خواجہ عزیز الحسن صاحب نے حضرت والا سے سوال کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے کہ جنت میں کسی کو کھیتی کی خواہش ہو گی تو فوراً کھیتی تیار ہو کر خرمن میں غلہ کا انبار موجود ہو جائے گا اس میں کیا حظ ہو گا حظ تو اس میں ہو سکتا ہے کہ زمین جوتی گئی کاشت ہوئی کھیتی ہری ہری پیدا ہوئی کاٹی گئی تب دانہ تیار ہوا ایک عرصہ تک مشغلہ رہا بہت سے لوگ جمع رہے ہنسنا بولنا رہا علیٰ ہذا جنت میں اولاد کی خواہش کسی کو ہو گی تو فوراً برابر کا لڑکا پلا پلایا تیار ہو جاوے گا۔ اس میں کیا بھی کیا حظ ہو گا حظ تو بتدریج پرورش کرنے میں ہوتا ہے فرمایا وہاں مذاق بالکل صحیح ہوں گے اصل مقصود پر نظر ہو گی حصول مقصود سے حظ ہو گا یہ یہاں کی بدمذاقی ہے کہ ذرائع میں لطف آتا ہے حالانکہ اُن میں مصائب بھی ہیں کہیں بیل مر گیا کہیں پانی کم برسا کھیتی خراب ہو گئی علیٰ ہذا کہیں حمل کی تکلیف کہیں وضع کی کہیں بچہ کی بیماری کی دنیا میں طبیعتیں ان ہی بکھیڑوں کی خوگر ہو گئی ہیں اس واسطے حظ آتا ہے جیسے بھنگی کے دماغ میں غلیظ کی بو بس جاتی ہے تو اس سے اس کی طبیعت مانوس ہو جاتی ہے ورنہ یہ بکھیڑے کوئی حظ کی چیز نہیں اور یہ بھی عرض کیا کہ حوریں نہایت ہی حسین ہوں گی فرمایا جی ہاں اس کے حسن کا بیان نہیں ہو سکتا حور دراصل ایک دوسری ہی مخلوق ہے از جنس انسان نہیں ہے جنت کی مخلوق ہے عورتوں کے ساتھ اس کو اس لئے تشبیہ دی گئی ہے کہ اور کوئی نظیر اس کی یہاں موجود نہیں تم بحمد اللہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات۔

(**التماس کاتب**) یہ وعظ احقر نے اپنے عزیز بھائی مولوی حکیم محمد یوسف مرحوم کی طرف سے لکھا ہے عزیز مرحوم وعظ نویسی کے بہت دلدادہ تھے۔ پیشہ طبابت چھوڑ کر بے حد محنت اور جانفشانی کے ساتھ مختصر نویسی سیکھی اور تھانہ بھون میں حضرت والا کے قدموں میں جا پڑے اور وعظ لکھتے رہے۔ بہت سے وعظ ان کے لکھے ہوئے آپ کی نظر سے گذرے ہوں گے مگر ان کی عمر نے وفا نہ کی اور ۱۳۳۹ھ میں انھوں نے انتقال کیا حضرت مدظلہٗ کو ان کے ساتھ اس قدر انس تھا کہ بعد انتقال بار بار فرمایا کہ بعض اپنے عزیزوں کا رنج میرے دل سے بھول گیا مگر مولوی

یوسف کا رنج نہیں بھولتا. ناظرین دعا فرماویں کہ حق تعالیٰ اس وعظ کا ثواب ان کو پہونچا دیں اور جنت الفردوس میں ان کو اعلیٰ درجہ عطا فرماویں اور جس کسی کو اس وعظ سے کتابت کا یا تصحیح کا یا طبع کا کوئی تعلق ہو سب پر نظر رحمت فرماویں اور حضرت مدظلہ کے فیض مواعظ کو تا بمدتہائے دراز قائم رکھیں" ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد" یہاں ایک خواب بھی لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جو از جنس مبشرات ہے. بعد انتقال عزیز مولوی محمد یوسف مرحوم کے احقر محمد مصطفےٰ نے ایک روز بحالت اطمینان خواب میں دیکھا کہ عزیز موصوف سخت بیمار رہیں اور حضرت مولانا مدظلہٗ ان کے پاس تشریف لائے ہیں ایک شخص نے آکر کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ مولوی یوسف کی شان میں ایک قصیدہ آسمان سے اترا ہے وہ قصیدہ اس شخص نے سب کے سامنے پڑھا جس میں ایک مصرع یہ بھی تھا "آنکہ نامش یوسفِ جنت نشاں" اس قصیدہ کو سن کر حضرت مولانا نے فرمایا کہ اس کی تعبیر یہ ہے کہ مولوی یوسف اس مرض سے جانبر نہیں ہوں گے اس کو سن کر مولوی یوسف پر رنج کا اثر ہوا لیکن طبیعت کو سنبھال کر کہا کہ میں حق تعالےٰ کے حکم پر بخوشی راضی ہوں اس کے بعد احقر کی آنکھ کھل گئی وہ قصیدہ پورا یاد تھا چاہا کہ فوراً اٹھ کر پنسل کاغذ لیکر لکھ لوں لیکن اٹھتے اٹھتے سب ذہن سے اُتر گیا صرف مصرعہ مذکورہ یاد رہ گیا تعبیر اس کی بالکل ظاہر ہے حق تعالیٰ اس کو وقوع میں لائیں اور حضرت مولانا کا ان کے سامنے یہ لفظ کہنا کہ تعبیر یہ ہے کہ مولوی یوسف جانبر نہ ہوں گے اور ان کا صبر کرنا دلیل شہادت نصیب ہونے کی ہے خدا ہمچنیں کناد اور حضرت مولانا کا یہ دل شکن لفظ بحالت مرض ان کے سامنے کہنا خلاف رحم وشفقت نہیں ہے کیونکہ بجنسہ یہی واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منقول ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس حضور صلے اللہ علیہ وسلم بوقت وفات تشریف لائے اور آسمان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ تم اس مرض سے جانبر نہیں ہو گی. انھوں نے عرض کیا میں حق تعالےٰ کے حکم کو بخوشی قبول کرتی ہوں اس کے بعد رحلت فرما گئیں ۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس واقعہ کو دیکھ ہی رہی تھیں کمال تعجب

ہوا کہ باوجودیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے خاص محبت تھی مرتے وقت ایسا دلشکن لفظ کیوں فرمایا آخر بعد ان کی وفات کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اس میں کیا مصلحت تھی ارشاد فرمایا میں نے ان کا نامہ اعمال دیکھا تو کوئی نیکی ایسی نہ تھی کہ اس میں نہ ہو سوائے شہادت کے۔ اس واسطے میں نے یہ تدبیر کی کہ ان کو ایک رنج پہونچایا جاوے اور وہ اس پر صبر کریں اور شہادت سے بھی محروم نہ جائیں چونکہ اس وعظ میں زیادہ تر جنت ہی کا بیان ہے اور ایسا بیان ہے کہ شاید حضرت والا کے دوسرے کسی وعظ میں جنت کا ایسا بیان نہیں ہوا اس واسطے یوسف جنت نشاں کے ایصال ثواب کے لئے یہ وعظ انسب ہوا نیز یہ وعظ دوسرے وعظوں سے طریقہ بیان میں ممتاز اور نئی شان کا ہے جیسا کہ وعظ شروع میں تحریر کیا گیا ہے۔ اور یوسف مرحوم وعظ کے زیادہ دلدادہ تھے۔ اس واسطے بھی ان کے لئے مناسب ہوا۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم مرحوم نے ایک لڑکا خورد سال چھوڑا ہے اور ان کی تمنا تھی کہ خدائے تعالیٰ اس کو عالم باعمل کریں ناظرین اس کے لئے بھی دعا فرماویں۔ ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلاً للذین آمنوا ربنا انک رؤف رحیم۔ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ رسولہ النبی الامی الکریم۔ آمین۔

گفتہ مجذوب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ | از حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری مجذوب خلیفہ ارشد
مجدد الملۃ حکیم الامۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ
مکمل غزلیات وقطعات
ترتیب وانتخاب از جناب سوز شاہجہانپوری صاحب الحمد للہ تیار ہوگئی ہے۔
قیمت /۴۰ روپے۔ علاوہ خرچہ ڈاک
جذب القلوب الیٰ دیار المحبوب صلے اللہ علیہ وسلم۔ مجلد -/۲۵ علاوہ خرچہ ڈاک
ملنے کا پتہ
مکتبہ تھانوی۔ مسافرخانہ بندر روڈ کراچی

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلۂ

التَّبْلِیْغ کا وعظ

ملقب بہ

شکر النّعمۃ بذکر رحمۃ الرّحمۃ

منجملہ ارشادات

حکیم الاُمّۃ مجدّدُ الملّۃ حضرت مولانا محمّد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر:- محمّد عبدالمنان غُفرلہٗ

مکتبہ تھانوی —— دفتر الابقاء

مسافرخانہ بندر روڈ کراچی ۱
ایم۔ اے جناح روڈ

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ

ملقب بہ

شکر النعمۃ بذکر رحمۃ الرحمۃ

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	لِمَ	من ای شان	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَلْاَشْتَات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کیسے ہوا	کس لئے ہوا	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی مقدار تخمینی	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون	۔ ربیع الثانی ۱۳۳۳ھ یوم جمعہ	۲ گھنٹے	بیٹھ کر	بشکریہ ایک نعمت خاص جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوئی جسکا ذکر ایک وعظ کے ایک حاشیہ میں ہے،	رافت و رحمت حضور صلی اللہ علیہ وسلم برحال امت	مولوی ظفر احمد صاحب تھانوی سلمہم اللہ تعالیٰ	۱۰۰	عام امت کے لئے مفید تھا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمدا عبدہٗ و رسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و علیٰ اٰلہ و اصحابہ و بارک و سلم۔

امّا بعد فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ رَّحِیْمٌ ۝

(باقی ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ)

(پرنٹنگ محل کراچی) ۱

(ترجمہ) اے لوگو! تمھارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو
تمھارے جنس (بشر) سے ہیں جن کو تمھاری مضرت کی بات نہایت گراں
گذرتی ہے تمھاری منفعت کے بڑے خواہشمند رہتے ہیں (یہ حالت تو
سب کے ساتھ ہے بالخصوص) ایمانداروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق (اور) مہربان ہیں)

یہ ایک آیت ہے سورۂ برارت کے ختم کے قریب کی جس میں کچھ فضائل بیان فرمائے گئے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر چند[لہ] کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مثل ذکر اللہ کے کسی وقت کے ساتھ خاص نہیں ہر وقت ہونا چاہیئے کیونکہ حق تعالیٰ نے جس طرح اپنی اطاعت فرض فرمائی ہے اُسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بھی فرض کی ہے مَنْ اَطَاعَ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (جس اطاعت کی رسول کی پس تحقیق اس نے اطاعت کی اللہ کی) وَ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ (اور اطاعت کرو اللہ کی اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی) تو جو شان اطاعت کی ہے وہی شان ذکر کی بھی ہے کہ جس طرح حق تعالیٰ کی اطاعت فرض ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بھی فرض ہے اور جس طرح ذکر اللہ باعث ثواب ہے اور کسی وقت کے ساتھ مقید نہیں اسی طرح ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی موجب ثواب ہے اور کسی وقت کے ساتھ مقید نہیں بلکہ یہ بھی ہر وقت ہی ہونا چاہیئے حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب کی حکایت اس پر مجھے یاد آگئی کسی نے مولانا سے دریافت کیا کہ میلاد شریف کرنا کیسا ہے آپ نے فرمایا کہ بھائی ہم تو ہر وقت میلاد شریف کیا کرتے ہیں کیونکہ ہم لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں محمد اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں) پڑھتے ہیں اسمیں ہر وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔ پس ہم تو ہمیشہ ذکر میلاد کرتے ہیں کیونکہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدا نہ ہوئے ہوتے تو ہم رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہونے کا ذکر کیسے کرتے

[لہ] اس ہر چند کا ربط آئندہ کی اس عبارت سے ہے کہ مگر اس وقت مضمون کو الخ میں نے وہاں بھی حاشیہ میں اس ربط پر تنبیہ کر دی ہے ۱۲ منہ

واقعی خوب جواب دیا۔ مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے مقصود تو رسالت ہی تھی ورنہ نفس پیدائش میں تو سب شریک ہیں تو جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا ذکر کرتا ہے وہ پیدائش کا ذکر بابلغ وجہ کرتا ہے کہ پیدائش کا بھی ذکر کرتا ہے اور جو اس سے مقصود تھا اُس کو بھی بیان کرتا ہے۔ اور جو لوگ صرف میلاد کا ذکر کرتے ہیں وہ ایسی چیز کا تذکرہ کرتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں اور ہر فرد بشر میں مشترک ہے وہ مقصود کا ذکر نہیں کرتے جس کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی تھی اور پھر ذکر بھی جب قیود کے ساتھ ہو تو یہ اُن کی کمی ذکر کو مستلزم ہے کیونکہ جب تک خاص مہینہ خاص مجمع کی صورت اور خاص طریقہ ذکر میلاد نہ ہو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد سے محروم رہتے ہیں اور یہ منطقی مسئلہ بھی ہے کہ عام کی ساتھ جس قدر تخصیصات زیادہ ہوں گی اُسی قدر اس کے افراد کم ہوں گے مثلاً مطلق جسم کا وجود بہت زیادہ ہے جسم نامی کا اس سے کم حیوان کا اس سے بھی کم انسان کا سب سے کم۔ غرض یہ بات مشاہد بھی ہے کہ قیود اور تخصیصات بڑھانے سے شئے کا وجود کم ہو جاتا ہے اور عقلی مسئلہ بھی ہے تو ہر طرح یہ بات ثابت ہوگئی کہ ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جو لوگ قیود کے پابند ہیں وہ ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہت کم کرتے ہیں اور جو لوگ کسی قید کے پابند نہیں وہ ہر وقت ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کر سکتے ہیں اور اس کے ساتھ اگر ایک مقدمہ یہ بھی ملا لیا جاوے کہ مَنْ اَحَبَّ شَيْئًا اَكْثَرَ ذِكْرَهٗ کہ جس کو کسی چیز سے محبت ہوا کرتی ہے وہ اس کو کثرت سے یاد کیا کرتا ہے تو آپ خود فیصلہ کرلیں گے کہ ذکر رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں قیود کو لازم کرلینا یہ کمی محبت کی دلیل ہوئی یا نہیں۔ بخلاف اُن کے جو قیودات کے پابند نہیں کہ وہ ہر وقت ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں رہتے ہیں۔ ہاں ان کے نزدیک صرف ایک قید کی ضرورت ہے وہ کیا اخلاص کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خلوص دل سے ہونا چاہیئے کیونکہ بدون خلوص کے عمل مقبول نہیں ہوتا مگر یہ قید بھی قبولیت کے لئے ہے نفس عمل کے لئے اس کی بھی ضرورت نہیں بلکہ محققین ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم

ہی کیا خود مطلق ذکر کے لئے بھی یوں ہی فرماتے ہیں کہ خلوص قلب کا انتظار نہ کرنا چاہیئے بلکہ جس طرح ہو ذکر کرنا چاہیئے اس کی برکت سے شدہ شدہ خلوص بھی پیدا ہو جاویگا یہ سب باتیں حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ کے یہاں جاکر حل ہوئیں۔ چنانچہ حاجی صاحب ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ ریا ہمیشہ ریا ہی نہیں رہتی۔ پہلے ریا ہوتی ہے پھر عادت ہو جاتی ہے پھر عبادت بن جاتی ہے غرض ریا ہمیشہ ریا نہیں رہا کرتی آخر کار مبدل بخلوص ہو جاتی ہے۔ پھر وہ خلوص موجب قرب ہو جاتا ہے تو اہلِ تربیت کے نزدیک ابتداء عمل کے لئے اخلاص کی قید بھی ضروری نہیں وہ تو یوں فرماتے ہیں کہ جس طرح ہو ذکر کرنا چاہیئے خلوص کا انتظار نہ کرنا چاہیئے دوسرے یہ کہ بعض اعمال سے دوسروں کو نفع پہونچ جاتا ہے پھر ان کی برکت سے اس عامل کا کام بن جاتا ہے فقیہ ابو اللیث رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ جب سے ریا کار مر گئے ابواب خیر بند ہو گئے اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ریا بھی کوئی اچھا عمل ہے۔ نہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں بہت سے لوگ نام آوری کے لئے خانقاہیں اور سرائے مدرسے وغیرہ بنایا کرتے تھے مقصود ان کا صرف نام ہوتا تھا۔ مگر جب ان سے مخلوق کو نفع پہونچا تو کوئی ان میں خدا کا خاص بندہ بھی ہوتا تھا وہ بانی کے حق میں دعاء خیر کرتا تھا حق تعالیٰ اس کی دعا قبول فرماتے تھے۔ اس طرح وہ ریا بواسطہ نافع ہو جاتی تھی۔ شیخ شیرازی نے خوب کہا ہے ؎

خورش دہ بہ کنجشک و کبک و حمام — کہ شاید ہمائے درافتد بدام
چو ہر گوشہ تیر نیاز افگنی — بناگاہ بینی کہ صیدے کنی

(چڑیا چکورا اور کبوتر وغیرہ کے لئے دانہ ڈالو شاید ہما بھی جال میں پھنس جائے
جب ہر طرف تیر نیاز ڈالے گا تو اچانک کسی دن دیکھیگا کہ کوئی شکار کر لے گا)

سو جب سے لوگوں نے نام آوری کے واسطے یہ کام کرنے چھوڑ دیئے تو ابواب خیر بند ہو گئے کیونکہ محض خدا کی رضا کے لئے کام کرنے والے ہر زمانہ میں بہت کم ہوتے ہیں اور جو ہوتے ہیں وہ غرباء ہیں جن میں ان ابواب کی وسعت نہیں تو

اس طریقہ سے ابواب خیر گو یا بند ہو گئے اور اس میں ریاء کا اذن نہیں بلکہ تو ہم ریاء کو مانع قرار دینے کا امر ہے۔

غرض جیسا ذکر اللہ کے لئے محققین کے نزدیک خلوص کی قید نہیں تو اسی طرح ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی خلوص کا منتظر نہ ہونا چاہیئے۔ جس طرح ہو اور جس قدر ہو سکے کام کرنا چاہیئے۔ اسی طرح یہ بھی نہ خیال کرنا چاہیئے کہ ہم ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قابل کہاں ہمارا ایسا مُنہ کہاں جو ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کریں۔ اس خیال نے بہت آدمیوں کو افعال خیر سے روک رکھا ہے۔ ایک شخص نے مجھ سے دعا کے واسطے کہا کہ میرے ذمہ قرض بہت ہے دعا کیجئے میں نے کہا کہ بھائی میں دعا کروں گا تم بھی دعا کیا کرو ان شاء اللہ تعالیٰ حق تعالےٰ سے امید ہے کہ تمہارا قرض اتار دیں گے وہ صاحب اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ جی ہمارا منہ اس قابل کہاں ہے جو ہم دعا کریں میں نے کہا کہ تمہارا منہ تو اس سے بھی بڑی چیز کے قابل ہے وہ کیا ہے اسلام ظاہر ہے کہ اسلام سے بڑھ کر کوئی عبادت اور طاعت نہیں ہو سکتی تمام عبادات کا رتبہ اس سے کم ہے اس کے لئے تمہاری زبان بھلی قابل ہو گئی اس وقت نہ یہ عذر کیا کہ میں کلمہ اپنی زبان سے کیونکر نکالوں میرا منہ اس قابل کہاں جب تمہارا منہ اسلام کے لئے قابل ہے تو دعا کے لئے کیوں قابل نہ ہوگا اس کا مرتبہ تو اس سے بہت کم ہے جاؤ فضول خیالات میں نہیں پڑا کرتے خدا سے خود بھی دعا کرنا چاہیئے۔ بلکہ صاحب ضرورت کی دعا میں زیادہ امید قبولیت ہے کیونکہ وہ پریشان ہو کر گھبرا کر دعا کرتا ہے اور حق تعالےٰ مصیبت زدہ کی دعا جلدی قبول فرماتے ہیں اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَیَکْشِفُ السُّوْٓءَ الآیۃ (یا وہ ذات جو بیقرار آدمی کی سنتا ہے جب وہ اس کو پکارتا ہے اور اس کی مصیبت کو دور کرتا ہے۔)

غرض یہ بھی ایک شیطانی دھوکہ ہے کہ ہم اس قابل کہاں جو ذکر اللہ یا ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کریں ہم اس لائق کہاں جو خدا سے دعا کریں اس دھوکہ میں پڑ کر

بہت لوگ خدا کی نعمت سے محروم پڑے ہوئے ہیں اور فی ذاتہ تو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بیشک ایسی ہی چیز ہے کہ ؎

ہزار بشویم دہن بمشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

یعنی ہزاروں لاکھوں دفعہ منہ کو خوشبودار بنایا جاوے جب بھی اس کے قابل نہیں ہو سکتا مگر بھی کام شروع ہی کر دینا چاہیئے گو وہ کام ناقص ہوگا مگر رحمت حق سے وہی قبول ہو جاوے گا۔ مولانا خوب فرماتے ہیں ؎

ایں قبول ذکر تو از رحمت است
چوں نماز مستحاضہ رخصت است

خوب مثال دی کہ جیسے استحاضہ والی عورت جس کو ہر وقت خون جاری رہتا ہے شریعت اس کو حکم دیتی ہے کہ ایسی حالت میں تو نماز پڑھتی رہ حق تعالیٰ اپنی رحمت سے قبول فرمالیں گے۔ ظاہر ہے کہ جب اس کا خون بہ رہا ہے تو وہ حقیقت میں ناپاک ہے مگر اس حالت میں بھی اس کی نماز قبول ہو جاتی ہے تو اسی طرح گو ہمارا منہ مثلاً خدا کی یاد کے قابل نہیں مگر شریعت کا حکم ہے کہ قابل ہو یا نہ ہو کام کرنا چاہیئے حق تعالیٰ قبول فرمانے والے ہیں اور یہیں ایک راز غامض ہے وہ یہ کہ اگر کوئی بدون طہارت غیر مامور بہا کے اطاعت نہ کرے یا نہ ہو سکتی ہو اور یہی انتظار رکھے کہ جب تک ہم ذکر کے قابل نہ ہو جاویں ذکر شروع نہ کریں تو جس وقت بھی یہ شخص ذکر شروع کرے گا یا کوئی طاعت کرے گا تو اس وقت اپنے آپ کو طاہر اور اس کے قابل سمجھے گا حالانکہ حق تعالیٰ کی عظمت حقوق کے اعتبار سے کوئی بھی قابل اور طاہر نہیں ہو سکتا۔ اور کسی اور کی تو کیا مجال ہے جبکہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْكَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ کہ اے اللہ میں بھی آپ کی ثنا نہیں کر سکتا تو جب بھی ہم طاعت کریں گے وہ ناقص ہی ہوگی۔ تو جو لوگ اس انتظار میں پڑے ہوئے ہیں کہ جب ذکر کے قابل ہوں گے اس وقت شروع کریں گے وہ

عجب میں مبتلا ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کبھی قابل بھی ہو سکتے یہ کتنا بڑا مرض ہے ۔

صاحبو، ہم جب بھی عبادت کریں گے وہ خدا کی عظمت کی نسبت سے ناقص ہی رہے گی کبھی بھی اس کے لائق نہیں ہو سکتی اور جس درجہ کے تم متمنی ہو وہ تو مستحیل ہے تو یہ خیال باطل ہے اس کو دل سے نکال دینا چاہیئے ورنہ اس خیال میں پڑ کر یا تو کام سے رہ جاؤ گے اگر ہمیشہ اپنی نا قابلیت پیش نظر رہی اور اگر کبھی شروع کرو گے تو دوسری بلا میں گرفتار ہو گے کہ اپنے آپ کو صاف العبادت کے قابل سمجھو گے یہی وہ راز ہے جس کی وجہ سے اہل تربیت فرماتے ہیں کہ اپنے کو ریاکار ہی سمجھ کر تم کام شروع کر دو اور یہی سمجھتے رہو کہ تم کسی قابل نہیں اور نہ کبھی قابل ہو سکتے ہو حق تعالیٰ سب قبول فرمالیں گے اور اگر کچھ نقصان بھی رہے گا تو تمھارا اپنے آپ کو ناقص سمجھنا اس نقصان کی تلافی کر دے گا۔ واقعی عجیب دربار ہے کہ اپنے عمل کو ناقص سمجھنے سے اس کی تکمیل ہو جاتی ہے ؎

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیر خویش　　عذر بدرگاہِ خدا آورد
ورنہ سزاوار خداوندیش　　کس نتواند کہ بجا آورد

(بندہ وہی بہتر ہے کہ اپنی کوتاہی کا عذر دربار خداوندی میں لائے ورنہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ اس کی عظمت خداوندی کے لائق کوئی طاعت بجالائے)

اس انتظار کی بالکل ایسی ہی مثال ہے جیسا کہ امثال میں مذکور ہے کہ ایک ناپاک شخص کا دریا پر گذر ہوا دریا نے اس کو پکارا کہ میرے پاس آجا میں تجھے پاک کر دوں اس نے کہا کہ میں کس منہ سے آؤں تو پاک صاف اور میں گندہ ناپاک۔ دریا نے کہا کہ تو چاہتا ہے کہ پاک ہو کر میرے پاس آئے اور بدون میرے پاس آئے تو پاک نہیں ہو سکتا تو ہمیشہ ناپاک ہی رہے گا بس تو اسی حالت میں ناپاک ہی میرے پاس چلا آ تجھے میں ہی پاک کر سکتا ہوں مجھ سے دور رہ کر تو پاک نہیں ہو سکتا ۔

صاحبو! اسی طرح ہم چاہتے ہیں کہ اپنے گمان کے موافق پاک صاف ہو کر خدا کی طرف رخ کریں۔ حالانکہ بدون خدا کی طرف رخ کئے تم پاک ہی نہیں ہو سکتے ۔

بس اس کا تو یہی طریقہ ہے کہ تم جیسے بھی ہو چلے آؤ ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ
گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

(واپس آ واپس آجو کچھ بھی تو ہے واپس آجا اگر چہ کافر اور آتش پرست و بت پرست بھی ہے تو واپس آ)

رحمت متوجہ ہو کر تم کو خود پاک کر دے گی۔ اسی طرح بعض لوگ خدا کی یاد کے لئے منتظر رہتے ہیں کہ دنیا کے جھگڑوں سے نجات ہو جائے تو پھر فارغ ہو کر اللہ اللہ کریں۔ کوئی کہتا ہے کہ بیٹے کا نکاح ہو جائے تو بے فکر ہو کر خدا کو یاد کریں فلاں زمین کے مقدمہ سے چھٹکارا ہو جائے تو آخرت کی فکر میں لگیں مگر میں بقسم کہتا ہوں کہ ان جھگڑوں سے نجات خدا کی یاد کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ خدا سے لگاؤ پیدا کرو رفتہ رفتہ سب تعلقات خود ہی کم ہو جائیں گے اس کے بغیر کبھی تعلقات سے نجات نہیں ہو سکتی۔ اس طرح تو آپ روز یہی کہتے رہیں گے کہ آج یہ قصہ پیش آ گیا اس سے فراغت ہو جائے تو پھر کام میں لگوں پھر کوئی دوسرا جھگڑا کھڑا ہو جائے گا تو آپ اُس سے فارغ ہونے کا انتظار کریں گے تو ہمیشہ یہی حال رہے گا ؎

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم
باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

(ہر رات کو ارادہ کرتا ہوں کہ کل یہ جنون چھوڑ دوں جب کل آتی ہے تو پھر اس کو کل پر ٹال دیتا ہوں)

دنیا کے قصوں سے کبھی نجات نہیں نصیب ہوگی کوئی شاعر دنیا کے بارہ میں خوب کہتا ہے

وَمَا قَضٰی اَحَدٌ مِّنْهَا لُبَانَتَهٗ
لَا یَنْتَهِیْ اَرَبٌ اِلَّا اِلٰی اَرَبٍ

(کوئی شخص اس کی حاجتوں کو پوری نہ کر سکا ایک حاجت سے فارغ ہوا دوسری حاجت پیش آ گئی۔)

۔ یہ لوگ وصل کے لئے منتظر ہیں فضل ، موقوف ہے وصل پر تو ان کو کبھی خدا کے ساتھ لگاؤ پیدا کرنے کی توفیق نہیں ہو سکتی ہمیشہ انتظار ہی میں رہیں گے۔ یہاں تک کہ ایک دن موت آکر دبالے گی اور دنیا سے خالی ہاتھ رخصت ہو جائیں گے۔ بس اگر وصل خدا چاہتے ہو تو ان جھگڑوں کے ختم ہونے کا انتظار نہ کرو ایسی حالت میں خدا کی یاد میں لگ جاؤ پھر وہ خود ہی سب تعلقات کو ختم کر دے گا۔ اور رحمت حق متوجہ ہو کر تم کو اپنی ہی طرف کھینچ لے گی وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ اس کے لئے کوئی راہ نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ رزق پہونچاتا ہے جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا

مولانا فرماتے ہیں ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش　　تا دمِ آخر دمے فارغ مباش
تا دمِ آخر دمے آخر بود　　کہ عنایت با تو صاحب سر بود

(اس راہ (سلوک) میں ادھیڑ بن میں لگے رہو یعنی خوب کوشش کرو آخر دم تک بیکار نہ رہو آخری وقت تو کوئی گھڑی ایسی ضرور ہو گی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہمراز اور رفیق بن جائے گی)

یہ مسئلہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں حل ہوا۔ حاجی صاحب سے جب کوئی یہ کہتا کہ حضرت نوکری چھوڑ دوں تو آپ ارشاد فرماتے کہ نوکری مت چھوڑو تم کام میں لگے رہو کام کرتے کرتے پھر تم خود ہی چھوڑ دو گے کسی سے پوچھو گے بھی نہیں سبحان اللہ! بڑے محقق تھے۔ غرض یہ ہے کہ جس طرح بھی ہو کام میں لگ جانا چاہیے اور یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ ہم اس قابل کہاں جو ذکر خدا و ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کریں۔ تم کام شروع کر دو حق تعالیٰ شانہ سب قبول فرمالیں گے وہ فقط کاملین ہی کے خریدار نہیں وہ ناقص کے بھی خریدار ہیں چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ دیکھئے فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے تمام مسلمانوں سے ان کی جان و مال جنت کے بدلے خرید لئے ہیں اس میں

مومنین کا لفظ ہے یہ نہیں فرمایا کہ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْکَامِلِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ (یعنی اللہ تعالیٰ نے کاملین کی جانوں اور مالوں کو (جنت کے بدلے) خرید لیا ہے) اور اس میں ایک راز ہے وہ یہ ہے کہ وہ بازار جس درجہ کا کھرا ہے اس کے قابل متاع تو کسی کے پاس بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ کاملین کو بھی جو جزا عطا ہو گی وہ اس قدر ہو گی کہ ان کے اعمال کی ان کے مقابلہ میں کچھ بھی حقیقت نہ ہو گی وہ محض فضل ہی فضل ہو گا اس لئے اس بازار میں کھوٹے کھرے کی پوچھ ہی نہیں۔ سبحان اللہ! کیا عجیب بازار ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را
کہ بیک گل می خری گلزار را

(ایسا بازار کہاں پاؤ گے کہ ایک پھول کے بدلہ میں چمن ہی خرید لو)

یعنی ایک پھول کے بدلے پر باغ عطا فرماتے ہیں اور باغ بھی کیسا جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ (ایسے باغ جن کے نیچے نہریں جاری ہیں) ایسا بازار کہیں دیکھا بھی ہے جس میں اس کا کچھ بھی خیال نہیں کہ یہ تو ایک پھول لے کر آیا ہے اتنے بڑے باغ کا یہ مستحق نہیں واقعی خود اپنے عمل سے اس کو کون پا سکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ارشاد فرمایا کہ لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّۃَ اَحَدٌ بِعَمَلِہٖ کہ جنت میں اپنے عمل کی وجہ سے کوئی داخل نہیں ہو گا۔ سب رحمتِ خداوندی سے جنت میں جائیں گے۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا وَلَا اَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ بھی اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں داخل نہ ہوں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سر پر ہاتھ رکھ لیا اور فرمایا وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِرَحْمَتِہٖ یعنی نہیں ہاں اگر خدا کی رحمت متوجہ ہو جائے تو میں بھی اللہ کی رحمت سے جنت میں جاؤں گا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے ہیں تو اور تو کس شمار میں ہیں بالکل سچ فرمایا ؎

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را   کہ بیک گل می خری گلزار را
(ایسا بازار کہاں پاؤ گے کہ ایک پھول کے بدلہ میں چمن ہی خرید لو)
نیم جاں بستاند و صد جاں دہد   انچہ در وہمت نیاید آں دہد

رفانی اور حقیقت جان لیتے ہیں اور اس کے بدلہ میں باقی رہنے والی جان عطا کرتے ہیں جو وہم و گمان سے بلند و بالا ہے)

غرض ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی ذکر خدا کی طرح ہر وقت ہونا چاہیئے اس کے لئے کسی قید کا پابند نہ ہونا چاہیئے ظاہر میں بس ایک قید ضروری معلوم ہوتی تھی اخلاص کی مگر محققین اسکو بھی ضروری نہیں سمجھتے یعنی اس میں مبالغہ کرنے کو تو ذرا غور کرو کہ جو شخص اتنا توسع کرے گا اس کو زیادہ توفیق ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوگی یا اس شخص کو جو اتنی قیود میں جکڑا ہوا ہے کہ مہینہ بھی خاص ہو مجمع بھی ہو لوبان بھی ہو کچھ غزل گانے والے بھی ہوں مٹھائی بھی ہو پھر یہ لوگ دعوی کرتے ہیں کہ ہم محب رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں میاں اگر محب رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے تو جس طرح بن پڑتا محبوب کو یاد کیا کرتے ان قیدوں کے پابند نہ ہوتے۔ بھلا کہیں عاشق بھی اپنے محبوب کی یاد میں کسی چیز کا پابند ہوا کرتا ہے۔ محبت ہی دل میں نہیں جو اتنے قصوں کے منتظر ہو۔ میں سچ کہتا ہوں کہ ان رسوم نے لوگوں کو خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد سے بہت روک رکھا ہے۔ میں نے ایک واقعہ خود دیکھا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے بیعت کی درخواست کی آپ نے فرمایا کہ دوسرے وقت پر رکھو دوسرے وقت اور چند آدمی بیعت ہونے آئے۔ حاجی صاحب نے ان صاحب سے بھی فرمایا کہ بھائی آؤ تم بھی بیعت ہو جاؤ تو آپ فرماتے ہیں کہ حضرت میں نہیں ابھی بیعت ہوتا میں تو مٹھائی لا کر بیعت ہوں گا لاحول ولا قوۃ الا باللہ ان رسوم نے کیسا لوگوں کا راہ مار رکھا ہے۔ بھلا اس سے بڑھ کر کیا خوش نصیبی تھی کہ شیخ خود بلائے کہ آؤ ہم تمھارے خریدار بنتے ہیں اور وہ عاشق صاحب ہیں کہ مٹھائی نہ ہونے کی وجہ سے رُکے جاتے ہیں بس سوا اس کے کہ تعلق کی کمی ہے اور کیا کہا جا سکتا ہے تو بس اگر محبت ہے تو یہ قیود خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ کس قدر مانع ذکر ہیں اس لئے چاہیئے کہ جس طرح ذکر اللہ کے لئے کوئی قید نہیں اٹھتے بیٹھتے کھڑے ہوئے لیٹے ہوئے سب طرح کر سکتے ہیں اسی طرح ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی کوئی قید لازم نہ کریں۔ رہا نماز وغیرہ کے لئے جو قیود ہیں ان میں خاص مصالح و حکمتیں ہیں اور وہ قیدیں ایک

خاص طریق ذکر کے لئے ہیں مطلق ذکر اللہ کے لئے تو نہیں ہیں۔ اور پھر وہ بھی نص ہے۔ اور یہاں کونسی نص ہے۔ بعض لوگ اہل عرب کے دستور سے استناد کرتے ہیں کہ وہاں بھی تو قیود ہیں میں کہتا ہوں کہ بیشک وہاں بھی کچھ قیود ہیں تو پھر کیا ہوا۔ اہل عرب کے فعل سے کوئی شرعی حکم تو نہیں بدل سکتا اور اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ہندوستان کے لوگوں کو اہلِ عرب کے فعل سے استناد کرنے کا کوئی حق بھی نہیں کیونکہ وہ لوگ ان قیود کے اس قدر پابند نہیں ہیں اگر اتفاق سے مجمع ہو گیا تو مجمع میں ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہو گیا اور کہیں مجمع کی بھی قید نہیں دو چار آدمی کھانا کھانے بیٹھے جی چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر سنیں ایک دوسرے سے کہتا ہے یا مولانا المولد الصغیر یعنی مختصر طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر میلاد تو سنا دو اس نے مولد مختصر سنا دیا پھر کھانا شروع کر دیا اگر کہیں مجمع میں میلاد کا ذکر ہوا تو مٹھائی وغیرہ کی وہ ایسے بہت پابند نہیں ایک شخص مٹھائی تقسیم کرنے اٹھتا ہے جہاں تک تقسیم ہو گئی بانٹ دی جب ختم ہو گئی صاف کہدیا خلاص کہ بس جاؤ ختم ہو گئی نہ صاحب خانہ کو اس کا خیال ہوتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے میری ناک کٹے گی نہ ان لوگوں کو کچھ خیال ہوتا ہے جن کو مٹھائی نہیں ملی کہ دیکھو ہم مٹھائی سے رہ گئے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجمع صرف ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اکٹھا ہوا تھا مگر خوش طبعی کے لئے مٹھائی بھی تقسیم ہو گئی یہ نہیں کہ مجمع کی علّت غائی صرف مٹھائی ملنا ہو جیسا کہ ہندوستان میں ہے کہ صاحب خانہ جب دیکھتا ہے کہ لوگ بہت جمع ہو گئے اور مٹھائی کم ہے تو فوراً ایک آدمی کو مٹھائی کے لئے چلتا کرتا ہے اور مولود خواں سے اشارہ سے کہدیتے ہیں کہ ذرا کوئی غزل گانی شروع کر دو ابھی مٹھائی نہیں آئی۔ اب مولود تو ختم ہو چکا تھا مگر مٹھائی کے واسطے گلا پھاڑ پھاڑ کر مولود خواں صاحب غزلیں گا رہے ہیں جس سے سننے والے بھی سمجھ جاتے ہیں کہ یہ سارا جوش و خروش مٹھائی کے اشتیاق میں ہے اور جہاں وہ مٹھائی آئی سارا جوش ختم ہوا بھلا ان لوگوں کو اہلِ عرب کے فعل سے استناد کرتے ہوئے شرم نہیں آتی وہ اللہ کے بندے مٹھائی کے واسطے مجلس میں جمع نہیں ہوتے نہ صاحب خانہ ہی کو اس کا اہتمام ہوتا ہے نہ آنے والوں کو اس کا خیال ہوتا ہے۔ ہندوستان کے

مولود کی مثال تو شیعوں کی مجلس حسینؓ جیسی ہے۔ لکھنؤ میں محرم کے مہینے میں جا بجا مجلس حسینؓ ہوتی ہے۔ ایک شیعی شخص نے ایک سنی وکیل صاحب سے کہا کہ آپ مجلس حسینؓ میں شریک نہیں ہوتے انھوں نے کہا کہ مجلس حسینؓ تو میں نے آج تک یہاں کہیں ہوتے ہوئے سنی نہیں اس نے کہا واہ صاحب لکھنؤ میں خدا جھوٹ نہ بلوائے روزانہ بچاس جگہ تو مجلس حسینؓ آجکل محرم میں ہوتی ہے ان وکیل صاحب نے کہا کہ صاحب میں نے تو کہیں بھی مجلس حسین نہیں سنی اور اگر آپ کو میرا اعتبار نہ ہو تو تھوڑی دیر آپ یہاں تشریف رکھیے ابھی معلوم ہو جائے گا۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص دعوت دینے آیا کہ فلاں نواب صاحب کے یہاں آج مجلس ہے۔ وکیل صاحب نے پوچھا کہ بھائی کاہے کی اس نے کہا کہ فیرینی کی اس کے بعد دوسرا شخص آیا کہ فلاں رئیس صاحب کے یہاں رات کو مجلس ہے انھوں نے پوچھا کہ میاں کاہے کی مجلس ہے اس نے کہا کہ شیرمال کی۔ تیسرا آیا اس نے کہا شیرینی کی وکیل صاحب نے اُن صاحب سے کہا کہ آپ نے سن لیا۔ امام حسینؓ کا تو کہیں بھی ذکر نہیں کہیں شیرمال کی مجلس ہے کہیں فیرینی کی ہے کہیں شیرینی کی ہے۔ امام حسینؓ کی مجلس ہوتی تو بھلا ایسی بات تھی کہ میں شریک نہ ہوتا وہ دوسرے صاحب کہنے لگے کہ میاں تم تو بڑے مذاقی آدمی ہو۔

غرض یہی حال آجکل ہماری مجالس میلاد کا ہے کہ اکثر مٹھائی کی بدولت مجمع ہو جاتا ہے۔ اگر مٹھائی تقسیم نہ ہو تو نہ کوئی پڑھے اور نہ کوئی سننے آوے خدا کو بھی دھوکہ دینا چاہتے ہیں کہ ہم ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے ہیں اور اسی قبیل سے ہمارے یہ میانجی رمضان کے حافظ غضب دکھاتے ہیں سارے رمضان تو وہ تیز قرآن پڑھتے ہیں کہ یَعْلَمُوْنَ تَعْلَمُوْنَ کے سوا کچھ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا رکوع میں بمشکل تمام شاید ایک بار سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمُ کہتے ہوں ترویحہ تو گویا ہوتا ہی نہیں اور جب ختم کا دن ہوتا ہے اور ذرا مٹھائی کے آنے میں دیر ہو جائے تو اب کوئی حافظ صاجب کی قرارت دیکھے کیسے گا گا کر لحن کے ساتھ قرآن پڑھتے ہیں لمبے رکوع اور لمبے سجدے ترویحہ بھی خوب لمبا کریں گے اور پکار پکار کر سُبْحَانَ ذِی الْعِزَّۃِ وَالْجَبَرُوْتِ سُبْحَانَ ذِی

الْمُلْكِ وَالْمَلَكُوْتِ سُبْحَانَ الْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّ الْمَلٰٓئِكَةِ وَالرُّوْحُ (پاک ہے وہ ذات جو زندہ جس کو موت نہیں آئے گی پاک ہے پاک ہے پروردگار ہے ملائکہ اور روح کا) اور بہت سی دعائیں پڑھیں گے کوئی پوچھے کہ آج یہ زور زور سے کس کو یاد کر رہے ہیں فقط مٹھائی کو کیونکہ آج حافظ صاحب کی حالت یہ ہو رہی ہے کہ ہر ترویحہ کے اوپر ادھر اُدھر جھانک لیتے ہیں کہ مٹھائی آگئی یا نہیں اگر انھیں نماز شروع کرنے کے بعد بھی معلوم ہو جائے کہ مٹھائی آگئی ہے تو اسی وقت سے وہ قرارت اور لحن اور لمبے رکوع لمبی ترویح سب رخصت ہو جاتے ہیں واقعی ان میاں جیوں کی تو ساری قرارت اور ساری ترویح ختم کے دن مٹھائی ہی کے واسطے ہوتی ہیں گویا مٹھائی کیا ہے جنت ہے کہ جس طرح جنت میں پہونچکر سارے اعمال معاف ہو جائیں گے اسی طرح اس مٹھائی کے آتے ہی وہ قرارت اور ترویح سب رخصت ہو جاتے ہیں اب خیال کیجیے کہ ان رسوم نے ہماری حالت کو کہاں تک پہنچا دیا اس پر اگر کوئی خدا کا بندہ اس سے منع کرے تو اس کو برا بھلا کہنے کو تیار ہوتے ہیں اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الْعَظِیْمَ (میں استغفار کرتا ہوں اللہ عظیم سے) معلوم ہوا کہ محبت کی علامت یہ ہے کہ محبوب کے ذکر کے واسطے کسی وقت اور کسی قید کا پابند نہ ہو جیسا اس وقت بلا کسی قید و تخصیص کے بیان کے لئے یہ آیت اختیار کی گئی ہے جس میں حق سبحانہ تعالےٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بیان فرمائے ہیں ارشاد فرماتے ہیں لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْكُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝ ترجمہ آیت کا یہ ہے۔ کہ اے لوگو تمھارے پاس (ہمارے) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) آئے ہیں جو کہ تمھیں میں سے ہیں اُن پر تمھاری مشقت (اور تکلیف) بہت گراں ہوتی ہے وہ تم پر (تمھاری بہبودی کے لئے) بہت حریص ہیں مسلمانوں پر بہت زیادہ شفیق و مہربان ہیں۔) پس ہر چند[1] کہ جیسا اس ذکر مبارک کا مقتضا ہے کہ اس میں کوئی قید نہ ہو اس وقت بھی کوئی قید نہیں جیسا

---

[1] یہ ہر چند گو یا تکرار ہے اُس ہر چند کی جو بالکل شروع وعظ میں ہے ۱۲ منہ

میں ابھی بیان کرچکا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے لئے کوئی قید نہیں اور کسی وقت کی پابندی نہیں جس وقت چاہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکرو۔ مگر تاہم[عہ] کوئی خاص داعی دینی خاص وقت پر اس کا محرک ضرور ہوتا ہے چنانچہ اس وقت جو میں نے اس مضمون کو اختیار کیا ہے اس کا داعی[عہ] ایک خاص تازہ انعام ہے جو اس بندہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار مقدس سے ہوا ہے جس کے شکریہ میں متحیّر تھا کہ کیا کروں کیا نہ کروں بعض احباب نے مشورہ دیا کہ اگر آج وعظ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بیان کردیئے جائیں تو یہ بھی اس انعام کے شکریہ کی ایک صورت ہوسکتی ہے کہ بیان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی

[عہ] یہ عبارت مرتبط ہے وعظ کے شروع کی اس عبارت سے ہر چند الخ ۱۲ منہ

[عہ] جامع وعظ کہتا ہے کہ حضرت حکیم الامۃ نے اپنی زبانِ مبارک سے وعظ میں اس انعام خاص کو ذکر نہیں فرمایا مگر چونکہ بدون اس کے معلوم کئے ناظرین کو خلجان رہتا اس لئے احقر اس کو بیان کردینا ضروری سمجھتا ہے وہ انعام خاص یہ ہوا کہ ایک شخص صالح ذاکر شاغل جن کو حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بیداری وخواب میں اکثر ہوتی ہے ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حکیم الامۃ مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب کو میرا سلام پہنچا دینا وہ صاحب متردد ہوئے کہ میں تو تھانہ بھون کبھی گیا بھی نہیں مولانا کو سلام کیسے پہونچاؤں گا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے ارشاد فرمایا کہ تمھارے مولوی صاحب (اس سے مراد یہ روسیاہ جامع وعظ احقر ظفر ہے) وہاں جب جائیں گے ان سے کہدینا وہ پہونچادیں گے۔ جامع وعظ کہتا ہے کہ جب میں نے حضرت حکیم الامۃ کو یہ مضمون پہونچایا مولانا کی عجیب حالت ہوگئی تھی جس کو میں بیان نہیں کرسکتا۔ جواب میں ارشاد فرمایا کہ میری سمجھ میں تو کوئی لفظ بھی ایسا نہیں آتا جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سلام مبارک کا جواب دوں پھر بعد میں فرمایا کہ یوں جی چاہتا ہے کہ آج درود شریف زیادہ پڑھوں وہ بھی ان الفاظ سے کہ اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ مولانا کی اس واقعہ سے جو حالت ہوتی وعظ کے وقت اس کا کسی قدر ظہور ہوتا تھا اگر حضرت مولانا ضبط کامل سے کام نہ لیتے تو واقعی سننے والوں پر قیامت آجاتی مَتَّعَ اللّٰہُ الْمُسْلِمِیْنَ بِطُوْلِ بَقَائِہٖ ۱۲ منہ

امت کو نفع پہونچ جانے کی امید ہے اس وقت وعظ لکھنے کا سامان بھی نہ تھا کیونکہ جمعہ کی نماز کے لئے آتے ہوئے رستہ ہی میں یہ مشورہ ہوا مگر خدا تعالیٰ کو چونکہ منظور تھا وقت کے وقت سب انتظام ہوگیا اس لئے میں نے اس آیت کو بیان کے لئے اختیار کیا تاکہ اس نعمت کے شکریہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ فضائل بیان ہونے سے کچھ تسلی ہوجاوے۔ گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بے شمار ہیں اور مختلف قسم کے ہیں جن کا سب کا بیان کرنا تو اس وقت دشوار ہے بلکہ سب کے بیان کے لئے تو عمر بھی کفایت نہیں کرسکتی مگر میں اس وقت ایک خاص فضیلت کا بیان کرنا چاہتا ہوں جس کو حق تعالیٰ نے بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُفٌ الرَّحِيْمٌ میں بیان فرمایا ہے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عنایت اور شفقت ورحمت کو بیان کروں گا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو امت کے حال پر ہے کیونکہ وہ نعمت خاص بھی عنایت وشفقت ہی کے قبیل سے ہوئی ہے۔ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمارے حال پر یہ شفقت ہی تو ہے کہ ہم جیسے نالائقوں کے حال پر بھی توجہ فرماتے ہیں ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہاں اور ہم کہاں تو اس ذکر کی ایک تو یہ وجہ ہے کہ انعام کے وقت ایک خاص جوش ہوا کرتا ہے منعم کے احسانات وفضائل کے تذکرہ کرنے کا دوسرے اس بیان کی آجکل امت کو ضرورت بھی ہے ان شاء اللہ تعالیٰ یہ ذکر امت کے لئے بھی بہت نافع ہوگا کیونکہ میں اس وقت یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ آجکل امت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق میں بہت کمی اور کوتاہی ہورہی ہے چنانچہ بہت لوگ تو صرف یہی سمجھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک پیغمبر تھے احکام الٰہی پہونچا دینا آپ کا فرض منصبی تھا آپ نے احکام پہنچا دیئے اب ہم کو ان پر عمل کرکے قرب الٰہی حاصل کرنا چاہیئے یہ لوگ بجز اعتقاد تبلیغ احکام اور ان میں آپ کی اطاعت کرلینے کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تعلق پیدا کرنے ضروری نہیں سمجھتے حالانکہ نصوص سے تصریحاً معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے اس اطاعت کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دوسرے خاص تعلقات پیدا کرنے کو بھی ضروری قرار دیا ہے جن میں سے ایک حق تو آپ کی عظمت کرنا ہے یعنی یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کی تعظیم پوری طرح بجالاؤ چنانچہ ارشاد ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ (اے ایمان والو! اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم (کی اجازت) سے پہلے تم سبقت مت کیا کرو) عہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیشقدمی مت کرو آپ کی آواز پر اپنی آواز کو بلند نہ کرو جس طرح آپس میں چیخ پکار کر باتیں کرتے ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس طرح باتیں نہ کرو۔ دوسری آیت میں ارشاد ہے۔ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے ہیں اور ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور اس نور کا اتباع کرتے ہیں ان کے ساتھ بھیجا گیا ہے ایسے لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں) دیکھئے ایمان بالرسول پر اکتفا نہیں فرمایا عَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ (ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں) کی بھی قید زیادہ فرمائی جس سے معلوم ہوا کہ فلاح اور کامیابی آخرت کے لئے جس طرح آپ پر ایمان لانا شرط ہے آپ کی عظمت عہ کرنا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح ارشاد ہے لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ۔ (تاکہ تم ایمان لاؤ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اور حمایت کرو ان کی یعنی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اور مدد کرو ان کی) دوسرا حق آپ کے ساتھ محبت کرنا ہے کہ وہ بھی بیحد ضروری ہے اور یہ بنص حدیث حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک ایسا حق ہے جس کے بدون ایمان کامل نہیں ہوتا۔ چنانچہ ارشاد ہے لَا یُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰۤی اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّلَدِهٖ وَوَالِدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ (تم میں سے کوئی مومن کامل نہ ہوگا جب تک میری محبت اس کو اپنے لڑکے اور اپنے باپ اور سب لوگوں سے زیادہ نہ ہوگی) دیکھئے کتنی صاف حدیث ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جب تک میرے ساتھ محبت

عہ اے ایمان والو! تم اپنی آوازیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے بلند مت کیا کرو اور نہ ان سے کھل کھلا کر بولا کرو جیسے تم آپس میں ایک دوسرے سے کھل کھلا کر بولا کرتے ہو) عہ فی روح المعانی عزروہ ای عظموہ ووقروہ کما قال ابن عباسؓ وقال الراغب التعزیر النصرۃ مع التعظیم ۱۲ منہ

سب سے زیادہ نہ ہو گی کوئی شخص مومن (کامل) نہیں ہو سکتا۔ دوسری حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی محبت کو خدا کی محبت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے لَنْ يُّؤْمِنَ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِمَّا سَوَاهُمَا (ہرگز کوئی شخص تم میں سے مومن کامل نہیں ہو سکتا جب تک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ماسوا سے زیادہ نہ ہو جائے)

ان آیات و احادیث سے معلوم ہوا کہ جس طرح حق تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت فرض ہے اسی طرح حق تعالیٰ کی عظمت و محبت کے ساتھ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت کرنا بھی فرض ہے گو فرق مراتب کا لحاظ ان سب میں ضرور ہو گا حق تعالیٰ کی اطاعت و عظمت و محبت کی اور شان ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و عظمت و محبت کی دوسری شان ہے مگر ہیں سب فرض اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اور حقوق بہت سے ہیں مگر اس وقت کلی طور پر ان ہی تین حقوق کو بیان کرنا چاہتا ہوں جن کا ذکر اجمالاً ابھی کر چکا ہوں جب آپ دیکھیں گے کہ ان تین حقوق میں ہم نے کس قدر کوتاہیاں کر رکھی ہیں تو اس سے باقی حقوق میں کوتاہی کا خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔ سو کلی طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ تین حقوق ہیں ایک اطاعت ۱ دوسری محبت ۲ تیسری عظمت ۳۔ اب ان میں کوتاہی دیکھئے کہ بعض لوگ صرف اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ضروری سمجھتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کو نہ تعلق عظمت ہے نہ تعلق محبت مگر میں سچ کہتا ہوں کہ بدون محبت و عظمت کے اطاعت بھی پوری طرح نہیں ہو سکتی قدم قدم پر اتباع سنت وہی کرے گا جس کے دل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت رچی ہوئی ہو گی۔ اس لئے گو وہ اپنے آپ کو مطیع رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور عامل بالحدیث کہیں۔ مگر سوائے چند مسائل اختلافیہ کے جن کو وہ رات دن گایا کرتے ہیں باقی افعال و اعمال کو ان کے کوئی دیکھے کہ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے وہ اتباعِ حدیث کا کتنا خیال کرتے ہیں۔ رات دن آمین و رفع یدین کی حدیثیں تو تلاش کرتے ہیں کبھی یہ بھی فکر ہوئی کہ حدیث سے

معلوم کریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح کھانا کھاتے تھے کس طرح بیٹھتے تھے کس طرح معاملات و معاشرات میں برتاؤ کرتے تھے تقوٰی کے کن دقائق کی رعایت فرماتے تھے باطنی اخلاق میں آپ کا کیا رنگ تھا۔ ہم نے تو کبھی ان لوگوں کو سوائے چند اختلافی مسائل کے باقی اعمال میں اتباع سنت کا گرویدہ نہ پایا اور جن میں بزعم خود اتباع کرتے ہیں وہاں بھی اطاعت کا نام ہی نام ہے زیادہ محرک اس کا وہی نفسانیت و تعصب و گروہ بندی ہے جس کی وجہ وہی ہے کہ اطاعت پوری طرح بدون محبت کے ہو نہیں سکتی۔

اور بعض لوگ صرف محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ضروری سمجھتے ہیں تو انھوں نے فقط محبت کو لے لیا ہے مگر یہ بھی محض اُن کا دعوٰی ہی دعوٰی ہے اور ظاہر ہے دعوٰی بدون دلیل مسموع (سننے کے قابل) نہیں ہو سکتا اور دلیل مفقود بس ان کے نزدیک تو محبت اس کا نام ہے کہ کبھی مجلس میلاد منعقد کر لی۔ نعتیہ غزلیں پڑھ دیں یا سُن لیں اس کے سوا ان کو کچھ بھی خیال نہیں کہ ہم جو کچھ حرکتیں کرتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُن سے راضی ہیں یا ناراض۔ ہم نے مدعیین محبت کو دیکھا ہے کہ شراب پیتے ہیں سود لیتے ہیں زنا میں مبتلا ہیں مگر سال میں ایک دو مرتبہ ربیع الاول میں میلاد کی مجلس منعقد کر کے محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دم بھرتے ہیں کیا یہ لوگ ابن مبارکؒ کا قول بھول گئے ؎

تَعْصِی الرَّسُوْلَ وَاَنْتَ تُظْهِرُ حُبَّهٗ هٰذَ الْعَمْرِیْ فِی الْفِعَالِ بَدِیْعٌ
لَوْ كَانَ حُبُّكَ صَادِقًا لَاَطَعْتَهٗ اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ یُّحِبُّ مُطِیْعٌ

(تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے اور آپ کی محبت اظہار کرتا ہے اپنی جان کی قسم یہ کاموں میں نادر بات ہے اگر تو آپ کی محبت میں صادق ہوتا تو آپ کے اطاعت کرتا اس لئے کہ محب محبوب کا مطیع اور فرمانبردار ہوتا ہے)

کیا غضب ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دعوٰی ہے اور سر سے پیر تک مخالفت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں غرق ہیں بھلا یہ بھی کہیں عاشق کا طریقہ ہوا کرتا ہے۔ یہ عجیب محبت ہے کہ عاشق کو محبوب کے ناراض ہو جانے کی ذرا بھی پرواہ نہ ہو۔ مین لقسم

کہتا ہوں کہ جو برتاؤ یہ لوگ محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ کرکے احکام رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کرتے ہیں اگر کوئی ان کے ساتھ یہی برتاؤ کرے کہ اُن کی محبت کا دعویٰ کرکے مجلس میں بیٹھ کر ان کی مدح سرائی کر دیا کرے مگر ان کا حکم کوئی بجا نہ لاوے تو یہ لوگ خود اس کی محبت کو اس کے منہ پر دے ماریں گے پھر جائے افسوس ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہی برتاؤ کرکے خوش ہیں اور نازاں ہیں اور ذرا بھی نہیں ڈرتے کہ یہ محبت تو اس قابل ہے کہ الٹی ہمارے منہ پر ماری جائے۔

اس جگہ ایک شبہ ہوسکتا ہے اس کو بھی سمجھ لینا چاہیئے وہ یہ کہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ ایک شخص نے شراب پی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن پر حد جاری فرمائی پھر ان سے یہ حرکت صادر ہوئی پھر آپ نے اُن پر حد جاری فرمائی جب کئی مرتبہ ایسا ہوا تو کسی دوسرے صحابی نے اُن پر لعنت کی کہ خدا اس پر لعنت کرے بار بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں اس پر حد جاری ہوتی ہے اور شراب پینے سے باز نہیں آتا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو لعنت کرنے سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اِنَّہٗ یُحِبُّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ کہ اس کو برا بھلا مت کہو اس کو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے اس حدیث کو نقل کرکے شیخ عبد الحق نے اس سے یہ مسئلہ استنباط (کسی بات کا کسی بات میں سے نکالنا) کیا ہے کہ اس حدیث سے ایک عجیب بات معلوم ہوئی کہ معصیت کے ساتھ بھی محبت خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم جمع ہوسکتی ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود شراب پینے کے اِن شخص کو محب اللہ والرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خطاب دیا تو شاید آج کل کے مدعیان محبت بھی اس حدیث سے سہارا ڈھونڈھیں کہ گو ہم دوسرے گناہ کرتے ہیں مگر پھر بھی اس حدیث کے مطابق ہم اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے محب ہوسکتے ہیں جواب یہ ہے کہ اس وقت نفس محبت میں گفتگو نہیں اور نہ میں نفس محبت کی آپ سے نفی کرتا ہوں جب کسی شخص نے کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ پڑھ لیا تو کسی قدر تو محبت اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو ہی گی گفتگو محبت مطلوبہ میں ہے جس کی تحصیل مامور بہ ہے اور

جس کے بعد دعوٰی محبت تسلیم کیا جا سکے چونکہ دعوٰی بدون قدر معتد بہ کے صحیح نہیں کیا کوئی شخص ایک پیسہ کا مالک بن کر اپنے کو مالدار کہہ سکتا ہے آپ کو اس حالت کے ساتھ اپنے آپ کو محب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہنے کا منہ نہیں شاید تم یہ کہو کہ پھر کیا ان صحابی میں محبت مطلوبہ نہیں تھی کیا اُن میں وہ درجہ محبت کا موجود نہ تھا جو شریعت کو مطلوب ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ قیاس آپ کا صحیح نہیں کیونکہ ہر شخص کی معصیت بھی برابر نہیں ہو سکتی دیکھئے ایک تو وہ شخص ہے جس کو ہر وقت اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی دُھن ہو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں جان و مال و آبرو قربان کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرتا پھر کسی وقت شیطان نے دھوکہ دیدیا نفس کی شرارت غالب آگئی اور گناہ صادر ہو گیا۔ پھر گناہ کر کے بھی چین سے نہیں بیٹھتا جب گناہ سے فارغ ہوا اور آنکھیں کھلیں تڑپ گیا اور بے قرار ہو گیا کہ ہائے کیا کروں میرا خدا مجھ سے ناراض ہو گیا ہو گا اب خدا کو کس طرح راضی کروں ماعز اسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ صحاح میں موجود ہے کہ ان سے زنا کی حرکت صادر ہو گئی تھی فوراً بیقرار ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مجمع عام میں آکر عرض کیا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ طَهِّرْنِیْ فَقَدْ هَلَكْتُ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تباہ ہو گیا مجھے پاک فرما دیجئے تنہائی میں بھی نہ کہا ایسے خدا کے خوف سے بے چین ہوئے کہ مجمع عام میں آکر زنا کا اقرار کیا نہ آبرو کا خیال کیا نہ بدنامی کا۔

ع۔ عاشق بدنام کو پروائے ننگ و نام کیا

حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ ان کی بات پر توجہ نہیں فرمائی ہر بار میں آپ نے ٹالنا چاہا اور یہ فرمایا کہ شاید تم نے چھو لیا ہو گا شاید تم نے بوسہ لے لیا ہو گا۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ اس پر حد قائم نہ ہو خدا سے توبہ استغفار کر لے کیونکہ اس طرح سے بھی گناہ معاف ہو سکتا ہے مگر ان کو تو خدا پر جان فدا کرنے کی دُھن لگی ہوئی تھی۔ صاف صاف لفظوں میں بیان کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے تو اس طرح کیا تب آپ نے مجبور ہو کر حکم دیا کہ

ان کو باہر میدان میں لے جا کر رجم کر دو یعنی پتھر مار مار کر جان سے مار ڈالو اس وقت کسی صحابی کے بدن پر ان کے خون کی چھینٹ آپڑی تھی تو ان کی زبان سے کوئی سخت لفظ ماعزؓ کی شان میں نکل گیا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت غصہ ہوئے اور فرمایا کہ ماعزؓ اسلمی نے ایسی کامل توبہ کی ہے کہ اگر سارے مدینہ والوں پر بھی اس کو تقسیم کیا جاوے تو سب کی مغفرت ہو جائے ظاہر ہے کہ ایک شخص کی توبہ کے جب اس قدر حصے کئے جائیں گے تو بظاہر ہر شخص کے کیا بانٹے آئے گا مگر ماعزؓ کی توبہ اس قدر کامل توبہ تھی کہ اس کے ہزارہا حصے کرنے کے بعد بھی ہر حصہ ایک مسلمان کی مغفرت کے لئے کافی تھا تو اُن کے لئے تو کیا کچھ ہوا ہو گا تو بھلا ایسی خطا کو کوئی خطا کہہ سکتا ہے جس سے ایسی توبہ کاملہ نصیب ہو۔ ع ایں خطا از صد صواب اولیٰ ترست

(یہ خطا سو صواب سے بہتر ہے)

صحابہ کی معصیت پر کن کا منہ ہے جو اپنی معصیت کو قیاس کرے ان حضرات کی معصیت توبہ کاملہ کا سبب بن جاتی تھی جس سے ان کو مقام توبہ جو بڑا عالی مقام ہے نصیب ہوتا تھا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ معصیت سبب قریب خیر کا ہو سکتی ہے نہیں نہیں معصیت ہمیشہ موجب شر ہی ہوتی ہے کہ سبب سخط حق ہے مگر کبھی سبب بعید خیر کے لئے بن جاتی ہے اس طرح کہ معصیت سے خدا تعالےٰ ناراض ہوئے اور اس شخص کو اپنے دل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ خدا تعالیٰ ناراض ہیں اس سے بے چین ہو گیا اور ایسی ندامت طاری ہوئی جو کبھی نہ ہوتی تھی اس وقت حق تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہو جاتی ہے اور پہلے سے زیادہ مقامات عطا ہو جاتے ہیں تو اس طرح وہ معصیت سبب بعید کا بن گئی۔

ایک دوسرا واقعہ ہے کہ حضرت عمر بن العاصؓ یا اُن کے صاحبزادے عبداللہ زمین مصر میں اسلامی لشکر کے سردار بنے ہوئے تھے کہ لشکر میں سے چند آدمیوں نے شراب پی لی چونکہ اس وقت تک شراب کی حد مقرر نہ ہوئی تھی اس لئے سالار لشکر نے امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لکھ کر بھیجا کہ یہاں لشکر

میں بعض لوگوں نے شراب پی ہے ان کو کیا سزا دی جائے غور کیجئے کہ لشکر دشمن کی زمین میں موجود ہے اور ذرا بھی ان کی رعایت کا خیال نہیں بلکہ حکم سزا کے لئے امیر المؤمنین کی خدمت میں قاصد بھیجا جارہا ہے حالانکہ دنیا کا قاعدہ ہے کہ جب لشکر دشمن کی زمین میں ہوتا ہے تو اس کی بہت رعایت اور خاطر کی جاتی ہے مگر حضرات صحابہ میں یہ مضمون تھا ہی نہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے صحابہ کے اجماع کے بعد ۸۰ کوڑے شراب پینے کی سزا لکھ کر بھیجدی۔ اب جس وقت یہ حکم پہنچا ہے تو یہ نہیں ہوا کہ سالار لشکر نے تفتیش کی ہو کہ شراب کس کس نے پی بلکہ آپ نے ایک اعلان فرما دیا کہ جس کسی نے شراب پی ہو وہ آکر اپنے آپ کو پاک کرالے بس اتنا اعلان ہونا تھا کہ لوگ آنے شروع ہوئے۔ ایک آتا ہے کہ حضرت میں نے شراب پی تھی، اس کے بعد دوسرا آتا ہے کہ میں نے بھی شراب پی تھی۔ اب غور کیجئے کہ ان لوگوں پر کوئی ثبوت تھا نہ گواہ تھے نہ تفتیش کی گئی خود ہی ان کے اقرار سے جرم کا ثبوت ہو رہا ہے اور ہر شخص پر ۸۰ کوڑے پڑرہے ہیں اور یہ لوگ صحابہ بھی نہیں تھے بلکہ تابعین تھے ہر شخص خوشی کے ساتھ اپنی زبان سے شراب پینے کا اقرار کرتا ہے اور کوڑے کھا کر چلا جاتا ہے ایک تو گنہگار یہ تھے ایسے گنہگاروں کی نسبت ارشاد ہے اِنَّهٗ يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ کہ ان کو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے اور یہ گناہ شیطانی دھوکہ سے صادر ہو گیا۔ ایک وہ شخص ہے کہ جس کو کبھی خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اٹھتے بیٹھتے خیال بھی نہیں آتا شریعت کو دو پیسے میں بیچ ڈالتا اسے گوارا ہے جس وقت جو جی میں آتا ہے کر گزرتا ہے ہر کام میں بے باک ہے حلال و حرام کی تمیز ہی نہیں گناہ کرنے کے بعد بھی کچھ زیادہ پریشان و پشیمان نہیں ہوتا کیا ایسے شخص کو بھی اِنَّهٗ يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (اسکو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے) میں داخل کیا جا سکتا ہے اور کیا ان لوگوں کو بھی یہ کہنے کا منہ ہے کہ ہم اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے محب ہیں۔ بلکہ حضرت اگر سچ مچ محبت ہوتی تو کبھی زبان سے بھی یہ دعوے نکل سکتے سچے عاشقوں کی تو زبان

رس جاتی ہے زبان سے اظہار ہو ہی نہیں سکتا اب رہی یہ بات کہ جب وہ زبان سے نہیں دعویٰ کرتے تو دوسرے کیسے سمجھیں کہ ان کو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے۔ سو بات یہ ہے کہ وہ زبان سے اگرچہ ظاہر نہ کریں مگر عشق بھی کہیں چھپا رہا ہے کھل ہی جاتا ہے ؎

می تواں داشت نہاں عشق ز مردم لیکن
زردی رنگِ رخ و خشکی لب را چہ علاج

شاعر کہتا ہے کہ تم آدمیوں سے عشق کے تذکرہ کو چھپا سکتے ہو مگر چہرہ کی زردی اور لبوں کی خشکی کو کس طرح چھپالو گے۔ غرض عشق ایسی بلا ہے کہ پوشیدہ رہ نہیں سکتا کہ عشق و مشک را نتواں نہفتن (عشق اور مشک کو نہیں چھپا سکتے) بلکہ مولانا تو فرماتے ہیں کہ عشقِ بے زبان عشق زبانی سے بھی زیادہ روشن ہوتا ہے کیونکہ زبانی محبت تو صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہے اور عشق بے زبان کے ساتھ تو دلیل بھی موجود ہے فرماتے ہیں ؎

گرچہ تفسیر زباں روشن گرست
لیک عشق بے زباں روشن ترست

(اگرچہ زبان کا بیان روشن گر ہے لیکن عشق بے زبان زیادہ روشن ہے کیونکہ وہ رموز ذوقیہ سے ہے جس کو زبان۔ سے اچھی طرح نہیں کہا جا سکتا)

اسی لئے محققین کاملین کا عشق اکثر بے زبان ہی ہوتا ہے اور وہ بے زبان رہ کر بھی سب کچھ کر گذرتا ہے ہاں کبھی کبھی کامل بھی بے قرار ہو کر بول اٹھتا ہے کہ ؎

دل میرود ز دستم صاحبدلاں خدارا
دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

(ضبط انتہا کو پہونچنے کی وجہ صاحبدلوں! دل نکلا جاتا ہے وہ دردِ عشق جو پوشیدہ تھا افسوس ظاہر ہوا جاتا ہے)

یعنی جب ضبط انتہا کو پہونچ جاتا ہے اور تاب ضبط نہیں رہتا تو بے تاب ہو کر زبان سے بھی اظہار ہو جاتا ہے تو پھر

ایسے وقت میں یعنی جب کہ عشق نے زبان کو زبان لگتی ہے تو پھر قیامت کا سامنا ہے پھر اس کے سننے کے واسطے بڑا مضبوط کلیجہ چاہیئے اُس وقت اُس کی بالکل یہ حالت ہوتی ہے ؎

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

(میرے دل میں ایسا درد عشق ہے کہ ظاہر کروں زبان جل جائے۔ اگر خاموش رہوں تو ڈرتا ہوں کہ ہڈیوں کا گودا جل جائے)

پھر اگر اس پر کوئی ملامت بھی کرنے لگے تو اس وقت تو اس کے جوش کا ٹھکانا ہی نہیں رہتا وہ بے تاب ہو کر پھر یوں کہتا ہے ؎

ساقیا برخیز و درده جام را　خاک بر سر کن غم ایام را
گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں　مانمی خواہیم ننگ و نام را

(اے ساقی اٹھ اور جام محبت عطا کر اور ایام گذشتہ کے غم کے سر پر خاک ڈال)

غرض اس کا زبان سے ظاہر ہونا غضب ہے قیامت کا سامنا ہے اس کا پوشیدہ ہی رہنا بہتر ہے مگر وہ بے زبان ہو کر بھی سب کچھ کر ڈالتا ہے اس کے ظاہر ہونے کی ضرورت ہی نہیں وہ اخفا پر بھی مخفی نہیں رہا کرتا۔ سو ایسا عاشق اگر کوئی غلطی کر گذرے وہ بیشک یُحِبُّ اللہَ وَرَسُوْلَہٗ (وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتا ہے) کا مصداق رہتا ہے نہ یہ کہ بے باکی کرے اور مدعی محبّت بنا رہے۔ پس ایسے بے باک عاصی کی نسبت اِنَّہٗ یُحِبُّ اللہَ وَرَسُوْلَہٗ (بلاشک وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتا ہے) وارد نہیں ہوا وہ اُنھیں حضرات کی بابت ارشاد ہے جو اپنی جان و مال کو خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان کر چکے تھے ہر وقت رضا جوئی اور اتباع کے گرویدہ رہتے تھے۔ خیر کبھی نفس کی شرارت سے گناہ بھی صادر ہو گیا پس معیار یہ ہے

عہ جامع وعظ کہتا ہے کہ اس وقت سامعین کی عجیب حالت تھی بعض پر بہت زیادہ وجد غالب ہوا اگر حضرت مولانا ضبط نہ فرماتے تو نہ معلوم کیا قیامت برپا ہوتی اللّٰھم متعنا بطول بقائہٖ ۱۲ منہ

کہ اگر نیکیاں زیادہ ہوں اور معاصی کم تو وہ خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا محب ہے اور اگر نیکیاں کم ہوں اور گناہ زیادہ اس کو محب نہیں کہیں گے اس کو ابن مبارک کا قول سنایا جائے گا کہ اگر تجھ کو محبت ہوتی تو زیادہ تر اطاعت کرتا خیر کبھی اتفاقاً معصیت کا بھی صدور ہو جاتا مگر جب سرکشی کا پلہ بھاری ہے تو اس کو محب کون مان لے گا۔ محبت ایسی سستی چیز نہیں محبت کے لئے بڑے امتحان کی ضرورت ہے ؎

وَجَائِزَۃٌ دَعْوَی الْمَحَبَّۃِ فِی الْھَوٰی
وَلٰکِنَّ لَا یَخْفٰی کَلَامُ الْمُنَافِقِ

(عشق میں محبت کا دعویٰ جائز ہے۔ لیکن منافق کا کلام پوشیدہ نہیں رہتا)

چنانچہ جس طرح اطاعت نہ ہونا ایک امتحان ہے دوسرا امتحان عظمت کا نہ ہونا ہے چنانچہ اس کا یہ حال ہے کہ اُن کے قلب میں عظمت کا نشان تک نہیں حالانکہ محب کے دل میں محبوب کی عظمت بھی لوازمِ محبت سے ہے۔ یہ کیسی محبت ہے کہ محبوب کی ذرا بھی عظمت نہیں۔

عظمت کا حال سنئے یہ لوگ اپنے اشعار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بہت بیہودہ الفاظ استعمال کرتے ہیں کہیں فتنہ کہتے ہیں کہیں لفظ ستم استعمال کر لیے ہیں اور بعض تو اس سے بھی زیادہ غضب کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ک ف ر کے لفظ سے خطاب کرتے ہیں۔ خدا کی پناہ یہ لوگ کس قدر بیباک ہیں۔ بعضے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی مدح اس طرح کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی شان میں گستاخی ہو جاتی ہے۔ بھلا خیال کیجئے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو ایسی مدح سے کیا خوشی ہو سکتی ہے غور کیجئے کہ اگر کوئی شخص صاحب کمشنر کے سامنے پیشکار کی ایسی مدح کرے کہ حضور جو کچھ ہیں بس آپ ہی ہیں آپ ہی کے قبضے میں سارا اختیار ہے بدون آپ کے کوئی حاکم کچھ نہیں کر سکتا تو اس وقت پیشکار کا ناگواری و شرمندگی سے کیا حال ہوگا۔ آیا اس مدح سے اس کو کچھ خوشی ہوگی یا ندامت کے مارے سیروں اس پر پانی پڑے گا۔ کہ حاکم بالا کے سامنے میں کیا چیز ہوں جو اس کی تنقیص کر کے یہ شخص میری مدح کرتا ہے۔ بعینہ یہ حال

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسی مدح سے بیزار چنانچہ حدیث میں ایک مقام پر وارد ہے۔ لَا تُسَوِّدُوْا وَجْهِیْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ کہ قیامت کے روز تم میرا منہ کالا مت کر دینا۔ یہ ایسی مدح کی نسبت اور ایسے مداحین کی بابت بھی ارشاد ہے۔ اللہ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منور چہرۂ مبارک اور اس کی بابت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ کہ میرا منہ کالا مت کرنا توبہ توبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور ایسا کیوں ہوتا (فِدَاهُ اَبِیْ وَاُمِّیْ) (میرے باپ اور ماں آپؐ پر قربان ہوں) ان مداحین ہی کا قیامت میں منہ کالا ہوگا۔ مگر اس کلمہ میں آپ اپنی سخت ناگواری کا کس قدر اظہار فرماتے ہیں۔ دیکھئے صاحبو! کیا یہ شعر بے ادبی کا نہیں ۔؎

پئے تسکین خاطر صورتِ پیراہنِ یوسفؑ
محمدؐ کو جو بھیجا حق نے سایہ رکھ لیا قد کا

استغفر اللہ العظیم اس شاعر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہ ہونے کا مضمون باندھا ہے اور اس پر کیا عجیب توجیہ اختیار کی ہے جس سے وہ اپنے دل ہی میں خوش ہولیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو اس سے یقیناً سخت ناراض ہوں گے یہ بات مشہور ہے کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہیں تھا اب بجائے اس کے کہ یہ کہا جاتا کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سرتاپا نور ہی نور تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ظلمت نام کو بھی نہ تھی اس لئے آپ کے سایہ نہ تھا کیونکہ سایہ کے لئے ظلمت لازمی ہے شاعر صاحب اس مضمون کو اس طرح باندھتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں بھیجا تو بیقرار ہو گئے کہ اب میرا محبوب مجھ سے جدا ہوتا ہے کہاں دیکھوں گا تو تسکین خاطر کے لئے آپ کا سایہ رکھ لیا کہ اسی کو دیکھ کر تسکین کر لیا کریں گے جیسا کہ یوسف علیہ السلام کو جب یعقوب علیہ السلام نے جدا کیا تو ان کو پیراہن یوسفی سے تسلی ہوتی تھی۔ الٰہی توبہ الٰہی توبہ دیکھئے اس مضمون میں حق سبحانہ تعالیٰ کی کس قدر بے ادبی کی گئی ہے اول تو حق تعالیٰ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں بیقرار ماننا کہ ان کے واسطے تسلی کی ضرورت ثابت کی حالانکہ خدا تعالیٰ اس سے بالکل منزہ اور پاک ہیں جب خدا کو بھی بے قراری ہونے لگے اور تسکین خاطر کی ضرورت ہو تو پھر خدائی

کس طرح باقی رہے گی۔ دوسرے اس سے یہ لازم آتا ہے کہ دنیا میں آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم خدا سے ایسے دور پڑ گئے کہ خدا تعالیٰ ان کو دیکھ بھی نہ سکتے۔ تھے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کس قدر تنقیص ہے کہ خدا تعالے سے بعید مانا اور خدا پر کیسا دھبہ لگایا کہ دنیا میں بھیج کر وہ اپنے محبوب کو دیکھ بھی نہیں سکتے گویا بصیر کی صفت نہ رہی تھی کیا خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی عظمت ہونی چاہیئے۔

کبھی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی مدح میں انبیاء علیہم السّلام کی اہانت کی جاتی ہے اس کی بالکل ایسی مثال ہے کہ ایک بھائی کی مدح اس طرح کی جائے کہ اس کے دوسرے بھائی کو اس۔ کے سامنے گالیاں دی جائیں کیا ایسی مدح۔ سے کوئی شخص خوش ہو سکتا ہے جس میں اس کے دوسرے بھائی کو بُرا بھلا کہا جائے اور بھائی بھی کیسے دو قالب و یک جان، انبیاء علیہم السلام آپس میں سب بھائی بھائی ہیں اور ان میں ایسا اتفاق ہے کہ ہرگز دوسرے کی اہانت کو ایک گوارا نہیں کر سکتا اور انبیاء علیہم السلام کی یہ توہین کہیں تو تہذیب کے ساتھ ہوتی ہے کہیں بد تہذیبی سے چنانچہ بد تہذیبی کے ساتھ توہین کی یہ مثالیں ہیں کسی شاعر نے آپ کی نعت لکھنے کے لئے خیالی سیاہی تیار کی ہے تو اس میں کہا ہے " دیدۂ یعقوب کھرل الخ" استغفر اللہ یعقوب علیہ السلام کی شان میں کس قدر گستاخی ہے کسی دوسرے شاعر نے اس کا خوب جواب دیا ہے ؎

ابھی اُس آنکھ کو ڈالے کوئی پتھر سے کُچل — نظر آتا ہے جسے دیدۂ یعقوب کھرل
توبہ ہے یوں ہو کہیں عین نبی مستعمل — کوئی تشبیہ نہ تھی اور نصیب اجل

کبھی یوسف علیہ السّلام کی توہین کی جاتی ہے اور عیسیٰ علیہ السلام تو بھلا تختۂ مشق ہیں ان کی شان میں تو بہت ہی گستاخی کی جاتی ہے۔ ایک صاحب کہتے ہیں ؎

برآسمانِ چہارم مسیح بیمار است — تبسّم تو برائے علاج درکار است

(چوتھے آسمان پر عیسیٰ علیہ السلام بیمار ہیں آپ کا تبسّم علاج کیلئے درکار ہے)

کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان چہارم پر بیمار ہیں ان کی شفاء کے لئے آپ کے تبسّم کی ضرورت ہے۔ بھلا جو نبی بیماروں کو اچھا کرتے ہوں ان کو محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تبسّم کو

شفا ثابت کرنے کے لئے بیمار مانا جائے یہ کتنی بڑی گستاخی ہے۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تبسم کا شفا ہونا اس کے بدون بیان نہ ہوسکتا تھا پھر آسمان پر بیمار کیونکر ہو سکتے ہیں وہ تو ایسی جگہ ہیں جہاں ان کو نہ کھانے کی ضرورت نہ پینے کی نہ آب و ہوا وہاں کی خراب جو بیمار ہونے کا احتمال بھی ہو۔

اور یہ کرتے ہیں کہ امیر خسروؒ کی غزل جو کسی محبوب مجازی کی شان میں ہے تضمین کر کراکے اس کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی نعت میں پڑھتے ہیں جس میں یہ مصرع بھی ہے۔

اے نرگس زیبائے تو آوردہ رسم کافری

(اے محبوب تیری نرگس زیبا رسم کافری لائی ہے)

اور اگر اس قسم کے مضامین کسی بزرگ کے کلام میں پائے جائیں تو اس کو غلبۂ حال پر محمول کیا جائے گا۔ مگر ان شاعروں کے کلام میں ہم کو تاویل کی کیا ضرورت۔ جن کو نہ محبت ہے نہ خاک محض تک بندی ہی چاہتے ہیں یہ تو بدتہذیبی کے ساتھ اہانت انبیا علیہم السلام کی مثالیں تھیں۔ بعض لوگ تہذیب کے ساتھ انبیا علیہم السلام کی توہین کرتے ہیں اور اس میں عوام کی تو کیا شکایت کی جائے خواص تک مبتلا ہیں گو میرے اس بیان سے بعض خشک علماء ناخوش ہوں گے مگر جو بات ناحق ہوگی اس کو تو بیان کیا ہی جائے گا بعض واعظین مصنفین و مدرسین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت دیگر انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں اس طرح سے ثابت کرتے ہیں کہ اُس سے اُن کی تنقیص لازم آجاتی ہے گو ان کی نیت تنقیص کی نہ ہو مگر اس طرح مقابلہ میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی فضیلت بیان کرنا جس سے دوسرے انبیاء کی تنقیص کا وہم بھی ہو جائز نہیں اسی لئے میں نے یہ کہا تھا کہ بعض لوگ تہذیب کے ساتھ انبیاء کی توہین کرتے ہیں اُس کی ایک مثال یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ مشہور ہے کہ ان کے پتھر پر عصا مارنے سے پانی کے چشمے جاری ہوگئے تھے اب بعض مدرسین اس کی کوشش کرتے ہیں کہ انبیاء سابقین کے ہر معجزہ کے مقابلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کو ان سے افضل و اکمل ثابت کریں۔ چنانچہ اس معجزۂ موسوی کے مقابلہ میں بھی یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ بیان

کرتے ہیں کہ اگر موسیٰ علیہ السّلام کے عصا مارنے سے پتھر سے چشمے جاری ہو گئے تو ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں سے غزوۂ حدیبیہ میں پانی جاری ہو گیا تھا جس سے تمام لشکر سیراب ہو گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معجزہ کو معجزۂ موسوی سے افضل ثابت کرنے کے لئے اس طرح تقریر کرتے ہیں کہ پتھر سے پانی نکلنا کچھ زیادہ عجیب نہیں کیونکہ بعض پتھروں سے چشمے نکلتے ہیں مگر لحم وشحم سے پانی کا جاری ہو جانا یہ بہت عجیب ہے اس تقریر سے مفضول اور افضل دونوں کی تنقیص لازم آتی ہے مفضول کی تنقیص تو ظاہر ہے کہ اس تقریر میں موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کی وجہ اعجاز کو کمزور کر دیا گیا ہے کہ پتھر سے پانی کا نکلنا کچھ چنداں جائے تعجب نہیں گویا موسیٰ علیہ السّلام کا معجزہ کوئی بڑا بھاری معجزہ نہ تھا استغفر اللہ ایک ایسے معجزہ کو جسے حق سبحانہ تعالےٰ نے جا بجا امتنان و اظہار قدرت کے لئے بیان فرمایا ہے اعجاز میں کمزور اور معمولی بتلانا کتنا بڑا غضب ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص اس سے اس طرح لازم آتی ہے کہ ان حضرات نے اس واقعہ کے معجزہ ہونے کو اس پر موقوف کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں سے پانی نکلتا تھا حالانکہ اس کا کہیں ثبوت نہیں احادیث سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک پیالہ میں پانی منگا کر اپنا دستِ مبارک اس میں رکھ دیا تو وہ پانی اُبلنے لگا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کے درمیان سے ابلتا ہوا نظر آتا تھا۔ اس سے یہ کہاں معلوم ہوتا ہے کہ لحم وشحم سے پانی نکلتا تھا بلکہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک رکھ دینے سے وہ پانی بڑھنے لگا اور جوش مارنے لگا اور انگلیوں کے درمیان سے اس کا اُبلنا نظر آتا تھا اب جن صاحب نے اس معجزہ کے اعجاز کو اس بات پر موقوف کیا ہے کہ پانی لحم وشحم نے نکلا تھا جس کا کچھ ثبوت نہیں تو گویا در پردہ وہ اس اعجاز کے معجزہ ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ کیونکہ لحم وشحم سے تو پانی کا نکلنا ثابت ہی نہ ہوا۔

ایک دوسرے صاحب کہتے ہیں۔

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات
تو عین ذات می نگری در تبسمی

مطلب ان کا یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام تو ایک تجلّی صفاتی سے بے ہوش ہو گئے اور آپ نے تجلّی ذاتی کا مشاہدہ کیا اور تبسّم ہی فرماتے رہے۔ بھلا ان حضرات سے کوئی پوچھے کہ کیا تم تجلّی طور کے وقت موجود تھے جو تم نے قطعی فیصلہ کر دیا کہ موسیٰ علیہ السلام پر تجلّی صفاتی ہوئی تھی یا تم شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے جو یقین کے ساتھ حکم لگاتے ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تجلّی عین ذات ہوئی تھی یا محض تخمین اور قیاس سے جو چاہا حکم لگا دیا حالانکہ شب معراج کا حال کسی کو کیا معلوم ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تجلّی کیسی ہوئی تھی۔

ایک بزرگ سے کسی نے سوال کیا تھا کہ شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حق تعالیٰ کی کیا کیا باتیں ہوئیں؟ انھوں نے جواب میں یہ شعر فرمایا ؂

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد

(اب کس کی ہمت ہے کہ باغ کے مالی سے یہ پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا اور پھول نے کیا سُنا اور صبا نے کیا کیا)

واقعی خوب ہی جواب دیا اس وقت کسی کی کیا طاقت جو ان اسرار کو یقینی طور پر معلوم کر سکے اگر قسمت میں ہے تو جنت میں جا کر معلوم کر لیں گے باقی یہاں اول تو کسی کو معلوم کس طرح ہو سکتا ہے اور جو کسی کو کشف سے کچھ معلوم بھی ہوتا ہے تو وہ ظنّی ہے اس پر یقین کیونکر ہو سکتا ہے مگر یہ حضرت تو بڑی پختگی کے ساتھ بلا کھٹکے فرماتے ہیں۔

ع تو عین ذات می نگری در تبسمی (آپ نے تجلّی ذاتی کا مشاہدہ کیا اور تبسم ہی فرماتے رہے)

گویا یہ بھی معراج کے وقت سارا معاملہ دیکھ رہے تھے پھر اس شعر میں جو فضیلت شاعر صاحب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمائی ہے وہ فضیلت بھی تو نہیں بن سکتی۔ وہ فضیلت یہ بیان کی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ایک تجلّی صفاتی سے بے ہوش ہو گئے تھے اور آپ عین ذات کے مشاہدہ کے وقت بھی تبسّم ہی میں رہے۔ اگر تھوڑی دیر کو ان کی خاطر یہ مان بھی لیا جائے کہ موسیٰ علیہ السلام پر تجلّی صفاتی ہوئی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تجلّی ذاتی تو جو نقص

یہ موسیٰ علیہ السلام پر لگاتے ہیں اگر معاذ اللہ وہ کوئی نقص ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں اس سے زیادہ لازم آئے گا کیونکہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام سے ایک بار درخواست کی تھی کہ تم مجھے ایک دفعہ اپنی اصلی صورت دکھلا دو حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمایا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ دیکھ نہ سکیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے تو ایک دن حضرت جبریل علیہ السلام اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوئے نہایت حسین وجمیل صورت تمام آفاق آسمان کو ان کے پَر گھیرے ہوئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جوان کو ایک نگاہ بھر کر دیکھا تو آپ بیہوش ہو کر گر پڑے تو اگر کوئی یہودی اس واقعہ سے یہ اعتراض کرے کہ موسیٰ علیہ السلام تو خدا کی تجلّی سے بیہوش ہوئے تھے اور تمھارے نبی ایک فرشتہ کو دیکھ کر بیہوش ہو گئے اگر خدا کو دیکھ کر بیہوش ہو جانا کوئی نقص کی بات ہے تو ظاہر ہے کہ فرشتہ کو دیکھ کر بے ہوش ہونا اُس سے بڑھ کر نقص ہوگا تو اس وقت یہ شاعر صاحب کہاں جائیں گے جو فرماتے ہیں ؎

موسیٰؑ زہوش رفت بیک جلوۂ صفات
تو عین ذات می نگری در تبسمی

(موسیٰ علیہ السلام تو ایک تجلّی صفاتی سے بے ہوش ہو گئے اور آپ نے تجلّی ذاتی کا مشاہدہ کیا اور تبسم بھی فرماتے رہے)

بے سمجھے ایسی بات کہہ ڈالنا بھی غضب ہے۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت ثابت کرنے بیٹھے تھے مگر الٹا اعتراض لازم آ گیا۔ کسی نے سچ کہا ہے۔

ع "دوستی بے خرد چوں دشمنی است"

(بے عقل کی دوستی دشمنی کی طرح ہے)

اب اس کی حقیقت سنئے بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شبِ معراج میں بے ہوش نہ ہونا کوئی ایسا امر نہ تھا جس کے مقابلہ میں موسیٰ علیہ السلام کے بے ہوش ہو جانے کو دلیل مفضولیت کی ٹھیرائی جاوے نہ موسیٰ علیہ السلام کا کوہ طور پر بے ہوش ہونا کوئی ایسی حالت تھی جس کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شب معراج میں بے ہوش نہ ہونے کو دلیل

افضلیت کہا جاوے۔ بلکہ وجہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر تجلّی الٰہی عالمِ ناسوت میں ہوئی تھی اور اس عالم میں قویٰ انسانی کمزور ہوتے ہیں اس لئے وہ بے ہوش ہو گئے اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اسی عالم میں تجلّی ہوتی تو آپ بھی بے ہوش ہو جاتے چنانچہ جبریل علیہ السلام کو دیکھ کر آپ کا بے ہوش ہو جانا ثابت ہے آخر اس کی کیا وجہ تھی فقط یہی کہ عالم ناسوت میں آپ کے قویٰ کمزور تھے۔ اور شب معراج میں آپ اس لئے بیہوش نہ ہوئے کہ وہ عالم ملکوت ہے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ملکیت غالب تھی آپ کے قویٰ متحمل ہو گئے تھے عالم ملکوت میں اگر موسیٰ علیہ السلام پر بھی تجلی ہوتی تو وہ بھی بے ہوش نہ ہوتے۔

غرض یہ طریقہ ہرگز پسندیدہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل دیگر انبیاء کا مقابلہ کر کے اس طرح بیان کئے جائیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی اُس سے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی تنقیص لازم آجاتی ہے اور اگر یہ نہ بھی ہو تب بھی آخر دیگر انبیاء علیہم السلام کا ادب بھی تو لازم ہے جب ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کا ادب کرتے تھے تو ہم کو ضرور ان کا ادب کرنا چاہیئے۔ پس اسلم یہ ہے کہ اس بارہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا اتباع کیا جائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لَا تَفَضِّلُوْا بَیْنَ اَنْبِیَاءِ اللّٰہِ مطلب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ہے کہ تم انبیاء میں ایک کو دوسرے پر محض اپنی رائے سے کسی وجہ سے افضل نہ ثابت کرو۔ یہ مطلب نہیں کہ انبیاء سب برابر ہیں کسی کو کسی پر فضیلت نہیں کیونکہ بعض مقامات پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کچھ اپنے فضائل ذکر فرمائے ہیں کیونکہ امت پر ان فضائل کا اعتقاد ضروری تھا سو اُن فضائل منصوصہ کے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں لَا تَفَضِّلُوْا بَیْنَ اَنْبِیَاءِ اللّٰہِ (انبیاء علیہم السّلام کے درمیان ایک کو دوسرے پر اپنی رائے سے فضیلت مت دو) سے تفضیل بالرائے کی نفی مقصود ہے کہ تم خود اپنی رائے سے وجہ فضیلت تراش کر کے انبیاء میں تفضیل مت کرو کہ اس میں اندیشہ دیگر انبیاء کی تنقیص کا ہے اور فضائل منصوصہ کے بیان کرنے میں یہ اندیشہ نہیں کیونکہ وہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک کے ارشاد فرمودہ ہیں ان میں سے کسی کی تنقیص نہیں۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ)

مثلاً فضائل منصوصہ یہ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اَنَا خَاتِمُ النَّبِیِّیْنَ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں۔ اَنَا اَوَّلُ شَافِعٍ وَاَوَّلُ مُشَفَّعٍ میں سب سے پہلے شفاعت کروں گا۔ اور سب سے پہلے میری شفاعت قبول کی جائے گی۔ اَنَا صَاحِبُ لِوَاءِ الْحَمْدِ وَاٰدَمُ وَمَنْ بَعْدَہٗ تَحْتَ لِوَائِیْ میرے ہی ہاتھ میں لوار الحمد ہوگا آدم علیہ السلام سے لیکر قیامت تک کے تمام آدمی میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے لَوْ کَانَ مُوْسٰی حَیًّا لَمَا وَسِعَہٗ اِلَّا اتِّبَاعِیْ اگر اس وقت موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو میرا ہی اتباع کرتے اور اس کے سوا فضائل منصوصہ بکثرت ہیں اگر کسی کو شوق ہو تو یہ فضائل بیان کرے مگر اپنی طرف سے تراش کر ناوجوہ فضائل بیان کرنا خطرہ سے خالی نہیں۔ کیا کہوں علمار تک اس میں مبتلا ہیں ایک تفسیر کی کتاب جو داخل درس ہے اور سب اُس کو پڑھتے پڑھاتے ہیں اس تک میں ایسے مضامین موجود ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب بنی اسرائیل کو لیکر حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے چلے تو طلوع شمس کے بعد فرعون نے ان کو جالیا اس کا لشکر قریب پہونچ گیا تو بنی اسرائیل نے گھبرا کر کہا کہ بس ہم تو پکڑے گئے اس پر موسیٰ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کَلَّا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ (بلا شک اللہ تعالیٰ میرے ساتھ ہے وہ مجھ کو راہ پر پہونچا دے گا) اس پر وہ مفسر لکھتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے اس قول سے ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو ترجیح ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غار ثور میں صدیق اکبرؓ سے فرمایا تھا جبکہ کفار غار کے قریب پہونچ گئے اور وہاں جاکر باتیں کرنے لگے کہ یہاں تک تو نشان قدم کا پتہ چلتا ہے یہاں سے آگے نشان قدم نہیں معلوم ہوتے نہ معلوم آسمان پر چڑھ گئے یا زمین میں غائب ہو گئے تو حضرت صدیق اکبرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر یہ لوگ اپنے پیروں کی طرف نگاہ کریں تو ہم کو دیکھ لیں گے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (مت غمگین ہو یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے) وہ مفسر فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے مَعِیَ فرمایا بصیغہٗ

واحد متکلم کہ خدا میرے ساتھ ہے اور ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مَعَنَا بصیغہ جمع متکلم فرمایا کہ خدا ہمارے ساتھ ہے موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھ کسی کو شریک نہیں فرمایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جمع کے صیغہ سے دوسروں کو بھی اپنے ساتھ شریک فرمایا دوسرے موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ذکر کو خدا کے ذکر سے مقدم فرمایا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ (بے شک اللہ میرے ساتھ ہے) پہلے مَعِیَ ہے پھر رَبِّیْ ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا تعالیٰ کے ذکر کو اپنے ذکر سے مقدم فرمایا اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا بس کہتا ہوں کہ بلاغت کوئی کمالات نبوت سے نہیں نبوت کے کمالات دوسری قسم کے ہیں۔ بلاغت کو اس میں کیا دخل اس کی تو بالکل ایسی مثال ہوئی کہ جیسے کوئی یہ دعویٰ کرے کہ یوسف علیہ السلام تمام انبیاء سے زیادہ حسین تھے اس لئے وہ سب سے افضل تھے ظاہر ہے کہ اس کا یہی جواب دیا جائے گا کہ حسنِ صورت کمالات نبوت سے نہیں اس لئے اس سے فضیلت ثابت نہیں ہوسکتی۔ بس اسی طرح بلاغت کلام بھی کوئی شرائط نبوت سے نہیں جس کی وجہ سے ایک نبی کی دوسرے کے اوپر فضیلت ثابت کی جاسکے ورنہ اگر فضیلت کے یہی معنی ہیں کہ ہر بات میں افضل ہو تو شاید یہ بھی دعویٰ کیا جائے گا کہ فلاں ولی سے رستم افضل ہے کیونکہ رستم کی قوت جسمانی اُس ولی سے زیادہ تھی مگر ظاہر ہے کہ اس سے اُس ولی کی طرف کوئی نقص عائد نہیں ہوسکتا کمالات ولایت میں قوت جسم کو کیا دخل ہاں قوت قلبیہ مقبولین کی سب اقویاء سے زیادہ ہوتی ہے جس کا اندازہ قوت فیضان سے ہوسکتا ہے یہ گفتگو تو تسلیم کے بعد تھی ورنہ ہم یہ ہی تسلیم نہیں کرتے کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول بلاغت میں کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے کم ہے کیونکہ بلاغت کلام کے معنی یہ ہیں کہ کلام مقتضیٰ حال کے موافق ہو تو ان دونوں اقوال میں سے کسی کو دوسرے سے ابلغ اُس وقت کہا جاسکتا ہے جبکہ یہ ثابت کردیا جائے کہ دونوں یکساں حال میں صادر ہوئے اور دونوں حال بالکل متحد تھے اور یہ ثابت نہیں ہوسکتا بلکہ واقعات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں جگہ حال مختلف تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایک اکھڑ جاہل قوم تھی جس وقت لشکر فرعون کو اس نے آتے ہوئے دیکھ لیا تو موسیٰ علیہ السلام کے قول پر بھی ان کو اعتماد نہ رہا کہ

حق تعالیٰ میری مدد فرمائیں گے اور اس قوم ظالم سے مجھ کو نجات دیں گے انھوں نے بڑی پختگی اور یقین کے ساتھ یہ کہہ ڈالا کہ اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ کہ اب تو ہم یقیناً پکڑے گئے جملہ اسمیہ اور اِنَّ و لَام تاکید ان کے کلام میں موجود ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام ان لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کے وعدوں سے بے اعتقاد ہو کر کہا تھا اب فرمایئے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ معیت حق کہاں باقی رہی تھی یہ حال اسی کو چاہتا ہے کہ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ (یقیناً اللہ میرے ساتھ ہے) بصیغۂ واحد استعمال کیا جائے۔

اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو دیکھئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اِنَّ اللہَ مَعَنَا بصیغۂ جمع ارشاد فرمایا وہاں کیا حال تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس وقت فقط صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے اور یہ کہیں ثابت نہیں کہ نعوذ باللہ صدیق اکبر ؓ نے کوئی بے اعتقادی کی بات ظاہر کی ہو یا اُن کے کسی حال سے بے اعتقادی ظاہر ہوئی ہو بلکہ سچ پوچھئے تو حضرت صدیق اکبر کو جو اس وقت حزن تھا وہ اپنی جان کے اندیشہ کی وجہ سے نہ تھا ورنہ اپنے کو سانپ کے منہ میں نہ دیتے۔ بلکہ ان کا سارا حُزن فقط حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کہیں بال بیکا نہ ہو جائے۔ تو ایک تو وہ حال تھا کہ ساتھ میں بے اعتقاد قوم تھی جس نے دشمن کو آتے ہوئے دیکھ کر یقین کر لیا کہ بس ہم گرفتار ہو جائیں گے اور موسیٰ علیہ السلام کے وعدوں کے ہوتے ہوئے کیسے پختگی کے ساتھ زبان سے یہ لفظ نکال گئے اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ (اب تو ہم یقیناً پکڑے گئے) یہ بھی نہ خیال کیا کہ ہم خدا کے حکم سے نکلے ہیں خدا تعالیٰ نے مدد کا وعدہ فرمایا ہے ایسی قوم کے لئے یہی جواب زیبا تھا جو موسیٰ علیہ السلام نے دیا کَلَّا اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ کہ سب سے پہلے لفظ کَلَّا بڑھایا جو لغت عربی میں ڈانٹنے اور دھمکانے کے لئے بولا جاتا ہے گویا کہ گلے پر طمانچہ مار دیا کہ ہرگز نہیں خدا میرے ساتھ ہے وہ مجھ کو راہ پر پہونچائے گا۔

دوسری جگہ یہ حالت ہے کہ ساتھ میں ایک صدیق ؓ ہے جس سے کبھی بے اعتقادی

وہم بھی نہیں ہوا۔ ہمیشہ ہر بات کو سب سے پہلے ماننے والا ہے اور جان نثار رہے کہ اس کو اپنی جان کا غم نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا غم تھا اس کو معیت حق میں کیونکر نہ شریک کیا جاتا اور کیونکر اس کی تسلی نہ کی جاتی اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا لَا تَحْزَنْ غم نہ کرو اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا خدا ہم دونوں کے ساتھ ہے۔

غرض کہ موسیٰ علیہ السلام کا کلام اس حال کے مقتضی کے بالکل موافق تھا اگر وہ حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آتا تو بقاعدہ بلاغت حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی غالباً اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ (یقیناً میرا رب میرے ساتھ ہے) ہی فرماتے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام اس حال کے مقتضی کے موافق تھا اگر یہ حال موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوتا تو وہ بھی غالباً اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (یقیناً اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے) ہی فرماتے۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ اپنی طرف سے تراشی ہوئی وجہ فضیلت کا یہ حال ہوتا ہے کہ اس کو ذرا سے تأمل کے بعد ایک ادنیٰ طالب علم نے توڑ دیا۔ اب بھلا ان حضرت مفسر سے کوئی پوچھے کہ جیسا آپ نے دونوں اقوال کو تو دیکھا تھا احوال کو بھی تو دیکھا ہوتا کہ موسیٰ علیہ السلام کا قول کس موقعہ پر صادر ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کیسے موقعہ پر صادر ہوا۔ اس کے بعد یہ بھی کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ذکر کو خدا کے ذکر سے مقدم کیا اور ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے خدا کے ذکر کو اپنے ذکر سے مقدم کیا۔

اے صاحبو کیا اس تقریر میں موسیٰ علیہ السلام پر سخت اعتراض نہیں ہوا کہ معاذ اللہ ان کو بولنا بھی نہ آتا تھا اُن کو بات کرنے کا بھی سلیقہ نہ تھا کہ خدا کے ذکر سے اپنے ذکر کو مقدم کر دیا، میں یہ نہیں کہتا کہ مفسر کے دل میں بھی یہ اعتراض ہوگا مگر ان کی اس تقریر سے ہر سننے والے کو موسیٰ علیہ السلام کی نسبت یہی بدگمانی پیدا ہوگی۔ استغفر اللہ العظیم مگر میں کہتا ہوں کہ اس سے بھی موسیٰ علیہ السلام کا قول کسی طرح غیر ابلغ نہیں ہو سکتا۔

بات یہ ہے کہ میں ابھی بیان کر چکا ہوں کہ حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہیوں کے قول سے چونکہ بے اعتقادی اور عدم یقین بروعدۂ خداوندی کا ظہور ہو چکا تھا اس لئے موسیٰ علیہ السلام اس جواب میں ناراضی کے ساتھ یہ بات ظاہر فرماتے ہیں کہ

جب تمہارے اعتقاد و یقین کی یہ حالت ہے تو فقط میرے ہی ساتھ معیت حق شامل ہے تمہارے ساتھ معیتِ حق نہیں تو آپ کا مقصود حصر بیان فرمانا ہے اور قاعدۂ بلاغت مشہور ہے۔ تَقْدِیْمُ مَا حَقُّهُ التَّاخِیْرُ یُفِیْدُ الْحَصْرَ (جس کا حق مؤخر کرنے کا اس کو مقدم کر دینا حصر کا فائدہ دیتا ہے) اس لئے آپ نے لفظ مَعِیَ کو رَبِّیْ سے مقدم فرمایا تو حصر کے لئے کسی لفظ متأخر کو مقدم کر دینا یہ تو عین بلاغت ہے اس سے موسیٰ علیہ السلام کے قول کی کامل بلاغت باقی رہی یا کم ہوئی اور ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ حصر مقصود نہ تھا اس لئے آپ نے اپنے ذکر کو مقدم نہ فرمایا چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود صدیق اکبر کو بھی معیت حق میں شامل کرنا تھا کیونکہ اُن سے جس جاں نثاری کا ظہور ہوا تھا اُس کی وجہ سے وہ اس قابل تھے کہ ان کو معیت حق میں شریک کیا جائے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حصر مقصود ہوتا تو شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی بقاعدۂ بلاغت اپنے ذکر کو مقدم فرماتے تو یہ غیر ابلغ کیا ہوا۔ غرض معلوم ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دیگر انبیاء علیہم السلام کی آپ کے مقابلہ میں تنقیص کی جائے۔ ایسی عظمت سے نہ خدا تعالیٰ راضی ہیں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہیں ایک بار اسی قسم کا واقعہ دربار نبوی صلی اللہ علبہ وسلم میں پیش ہوا کہ ایک صحابی کے ساتھ کسی یہودی کی گفتگو ہوئی مسلمان صحابی نے ضمن قسم میں یہ فرمایا تھا کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے افضل ہیں۔ وہ یہودی قسم ہی کے ضمن میں کہتا تھا کہ حضرت موسےٰ علیہ السلام تمام انبیاء سے افضل ہیں۔ صحابی نے غصہ میں آکر یہودی کے ایک طمانچہ مارا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت لایا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی پر غصہ ظاہر فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ لَا تُفَضِّلُوْا بَیْنَ اَنْبِیَاءِ اللّٰهِ (انبیاء علیہم السلام کے درمیان اپنی رائے سے ایک کو دوسرے پر فضیلت مت دو) اگرچہ اس یہودی کا قول حقیقت میں غلط تھا اور صحابی حق پر تھے جو بات وہ کہہ رہے تھے غلط نہ تھی فی الواقع حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام سے بھی افضل ہیں مگر اس وقت ان صحابی کے فعل سے حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی تنقیص کا شبہ ہو سکتا تھا اگرچہ ان کی نیت

یہ نہ تھی) اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی گفتگو سے منع فرما دیا۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ یہ طرز جو بعض حضرات علماء نے اختیار فرمایا ہے اچھا نہیں اس میں بڑا خطرہ ہے اگرچہ ان کی نیت تنقیص کی نہ ہو مگر اس قسم کی تقریر سے جو کہ مقابلہ کی صورت سے منتشر ہوتے ہوں تنقیص لازم آ ہی جاتی ہے۔

یہ گفتگو تھی حقیقی عظمت نہ کرنے والوں کے ایک گروہ کے باب میں اور ان حقیقی عظمت نہ کرنے والوں کا ایک گروہ اور بھی ہے یعنی آجکل کی نئی تعلیم یافتہ جماعت۔ وہ یہ کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی عظمت کو جانتے ہی نہیں گو ظاہر میں عظمت کرتے ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت بوجہ ملکیت اور سلطنت کے کرتے ہیں انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام کمالات میں سے صرف انتظام مملکت اور تمدن وسیاست کو منتخب کرلیا ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بیان کریں گے تو اُن سب کا خلاصہ یہ نکلے گا کہ بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک بڑے بیدار مغز بادشاہ اور ریفارمر تھے کہ آپ نے اپنی خداداد قابلیت سے عرب جیسی جاہل قوم کو مہذب بنا دیا اور اُن کے باہمی اختلافات کو رفع کر کے سب کو متحد و متفق بنا کر حکمرانی اور سلطنت کے قابل اُن کو بنا دیا حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصلی کمالات وہ ہیں جو بحیثیت نبوت کے ہیں گو آپ میں اور شیون و کمالات بھی تھیں مگر وہ دوسرے کمالات اس کمال نبوت کے تابع ہیں ان میں سے ایک ملک و سلطان ہونا بھی ہے۔ مگر آجکل کی نئی تعلیم یافتہ جماعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام فضائل میں درجہ شان ملکیت وبادشاہت کی وجہ سے آپ کی عظمت کرتے ہیں آپ کی نبوت ورسالت کے کمالات سے بحث نہیں کرتے کہ آپ کی معرفت وعلم کیسا تھا آپ سے معجزات وخوارق کیسے کیسے صادر ہوئے بلکہ اکثر تو مغربی تعلیم کے اثر سے مغلوب ہو کر معجزات کا انکار ہی کرتے ہیں چنانچہ آجکل ایک جدید سیرت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم چھپی ہے جس پر تمام نئی تعلیم یافتہ جماعت غش ہے مگر اس کو اول سے آخر تک دیکھنے سے جو خلاصہ نکلتا ہے وہ صرف یہی ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم ایک بہت بڑے مدبر و بیدار مغز بادشاہ تھے یا ایک مصلح قوم ریفارمر تھے اور اس سیرت کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی بادشاہ کی سیرت ہے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کسی اولوالعزم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے کیونکہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات رسالت کی بحث ہی نہیں۔

میں جب ضلع فتحپور گیا تو ایک صاحب میرے ملنے والے ہیں انھوں نے ایک شخص کے ہاتھ وہ سیرت میرے پاس بھیجی کہ ذرا اس کو دیکھ لو اور یہ بتلا دو کہ یہ سیرت دیکھنے کے قابل ہے یا نہیں۔ میں نے یہ عذر کیا کہ بھائی میں اس وقت سفر میں ہوں اس وقت ساری کتاب کا دیکھنا دشوار ہے اور دو تین مواقع دیکھ کر میں یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس میں کیا خوبی ہے اور کیا خرابی ہے۔ جب میں وطن پہونچوں گا وہاں بھیجدی جائے تو میں وہاں دیکھ کر اس کا فیصلہ کر سکتا ہوں۔ اسی مجلس میں ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے کہا کہ آپ کو اس ساری کتاب کے دیکھنے کی ضرورت نہیں میں ایک موقع دکھاتا ہوں بس اسی کو دیکھ لینا کافی ہے۔ چنانچہ انھوں نے ایک موقع نکال کر دکھایا اس جگہ مصنف نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت کمالات کو ظاہر کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام میں انتظام سلطنت کی قابلیت نہ تھی۔ نوح علیہ السلام میں رحمت و شفقت کا مضمون نہ تھا۔ میں نے کہا لو بھائی اس کتاب کا حال تو اسی موقع سے معلوم ہو گیا اس میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی فضیلت ثابت کی گئی ہے آپ کے بھائیوں کو عاری عن الفضائل (فضائل سے خالی) بتلا کر۔ اسی سے قیاس کر لو کہ جب مصنف کے دل میں انبیاء علیہم السلام کی یہ وقعت ہے تو اور کیا کچھ گل کھلائے ہوں گے۔

ع: قیاس کُن زگلستانِ من بہار مرا (میرے چمن ہی سے میری بہار کا اندازہ کرلو)

میرے نزدیک وہ سیرت ہرگز قابل دیکھنے کے نہیں۔ جس میں انبیاء علیہم السلام کی تنقیص کی گئی ہو۔

(۱) جواب یہ کتنا بڑا غضب ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ان میں سلیقہ ملکداری نہ تھا حالانکہ احادیث صحاح میں وارد ہے کہ حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام آخر زمانہ میں نزول فرمائیں گے اور اس وقت وہ بادشاہت بھی کریں گے اور انتظام سلطنت بہت خوبی کے ساتھ انجام دیں گے۔ تو جس شخص کے انتظام سلطنت کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدح فرمائیں، اب کسی کا کیا منہ ہے جو ان پر یہ الزام لگائے کہ ان میں سلیقہ ملک داری نہ تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے زمانہ میں چونکہ ساری عمر زہد و پارسائی کے ساتھ بسر کی اس لئے

اس سے یہ قیاس کر لیا گیا کہ ان کو انتظام سلطنت آتا ہی نہ تھا سو خود یہ قیاس کتنا غلط قیاس ہے۔ بھلا بادشاہت نہ کرنے سے یہ کیونکر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُن میں قابلیت ہی نہ تھی۔ قابلیت نہ ہونا تو یوں معلوم ہو سکتا ہے کہ بادشاہت کرتے اور اچھے طریقے سے نہ کرتے۔ اس باب میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت موجود ہے کہ عیسیٰ علیہ السّلام آخر زمانہ میں نازل ہوں گے اور مسلمانوں پر بادشاہت کریں گے اور نہایت عدل و خوبی کے ساتھ بادشاہت کریں گے اور ان میں ایسی قابلیت ہو گی کہ ایک بہت بڑے قانون کا انتظام خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے سپرد فرماتے ہیں وہ یہ کہ جزیہ کو موقوف کر دیں گے۔ جس پر بظاہر یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام تو شریعت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متبع ہو کر تشریف لائیں گے پھر وہ شریعت کے کسی حکم کو کیونکر منسوخ کریں گے مگر میری تقریر سے جواب نکل آیا وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جزیہ کو موقوف کر دیں گے۔ اگرچہ صورتًا خبر ہے مگر معنًا انشاء ہے گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو امر فرما گئے ہیں کہ اپنے زمانہ میں آپ جزیہ کو موقوف فرما دیں۔ پس حضور صلے اللہ علیہ وسلم ان کو اتنا بڑا مدبر تسلیم فرماتے ہیں کہ ان کے سپرد اتنا بڑا قانون فرماتے ہیں کسی دوسرے کو یہ اجازت نہیں دیتے بات یہ ہے کہ ان میں ملکہ سلطنت کامل ہے۔ مگر جب تک حق تعالےٰ نے اُس سے کام لینے کو نہیں فرمایا اس سے کام نہیں لیا اور جب اس سے کام لینے کا حکم ہو گا کام لیں گے۔

حضرت سیدنا نوح علیہ السلام پر یہ الزام لگایا کہ ان میں ترحم کم تھا افسوس کہ یہ لوگ قرآن کو بھی تو نہیں دیکھتے۔ قرآن میں حضرت نوح علیہ السّلام کے بارہ میں ارشادِ خداوندی موجود ہے وَاُوْحِیَ اِلیٰ نُوْحٍ اَنَّہٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِکَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ○ وَاصْنَعِ الْفُلْکَ بِاَعْیُنِنَا وَوَحْیِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اِنَّھُمْ مُّغْرَقُوْنَ ○ ترجمہ ان آیاتِ کریمہ کا یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کی طرف یہ وحی بھیجی گئی کہ بس اب آپ کی قوم میں سے بجز ان لوگوں کے جو کہ ایمان لا چکے ہیں، اور کوئی بھی ایمان نہ لائیگا تو آپ اُن کے افعال سے رنجیدہ نہ ہوجیے۔ معلوم ہوا کہ نوح علیہ السلام کو اپنی قوم کے

افعال سے رنج ہوتا تھا اور رنج ہونا شفقت کی دلیل ہے شفقت نہ ہوتی تو ان کے افعال کی کچھ بھی پرواہ نہ ہوتی یہی سمجھتے کہ جیسا کریں گے ویسا بھریں گے مگر نہیں ان کو بوجہ شفقت کے رنج ہوتا تھا ہاں جب تو حق تعالیٰ نے منع فرما دیا کہ بس اب مت رنج کرو تو پھر رنج نہیں کیا اور ان کی طرف سے دل کو خالی کر لیا اس کے بعد حکم ہوتا ہے کہ تم ایک کشتی ہمارے سامنے اور ہمارے حکم سے بناؤ اور ان ظالموں کی بابت اب کوئی بات ہم سے نہ کیجیو یہ بالیقین غرق ہوں گے۔

بھلا جب حق تعالیٰ نے صاف صاف منع فرما دیا کہ اب ان لوگوں کی بابت مجھ سے بات نہ کیجیو تو حضرت نوح علیہ السلام ان کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کیسے ظاہر کر سکتے تھے۔ مگر انھوں نے پھر بھی جہاں ذرا سی گنجائش پائی شفقت کو ہاتھ سے نہیں دیا۔

حق تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا تھا کہ ہم تمھارے اہل کو غرق نہ کریں گے جب نوح علیہ السلام کا بیٹا غرق ہونے لگا تو حق تعالیٰ سے اس کی سفارش کی وَنَادٰی نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ ٥ یعنی نوح علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی کہ یا اللہ میرا بیٹا بھی تو میرے اہل میں سے ہے اور آپ کا وعدہ سچا ہے یعنی آپ وعدہ فرما چکے ہیں کہ تمھارے اہل کو ہم غرق نہ کریں گے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نوح وہ تمھارے اہل میں سے نہیں تھا اس کے اعمال بُرے تھے اور تمھارے اہل سے مراد وہ لوگ تھے جو کہ آپ کے خاندان کے ہوں اور متبع بھی ہوں تو دیکھئے شفقت نہ ہوتی تو بیٹے کے واسطے عرض نہ کرتے۔ شائد آپ یہ کہیں کہ اپنے بیٹے کے لئے دعا کرنا اور سفارش کرنا یہ تو دلیل شفقت نہیں ہو سکتی کیونکہ اپنے بیٹے سے تو باپ کو شفقت ہوا ہی کرتی ہے جواب یہ ہے کہ اول تو نوح علیہ السّلام پیغمبر تھے اور انبیاء علیہم السّلام مثل اپنی اولاد کے دوسروں کو بھی سمجھتے ہیں۔ مگر چونکہ دوسروں کی سفارش کے لئے کوئی گنجائش نہ رہی تھی اس لئے نہ کر سکے۔ اور بیٹے کے بارہ میں چونکہ عرض معروض کی گنجائش تھی بوجہ وعدۂ سابق کے اس لئے ذرا سی گنجائش پر بھی نہ چوکے اور فوراً عرض کر ہی دیا اس سے

ہم یہی سمجھیں گے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو دوسروں پر بھی شفقت تھی مگر بوجہ گنجائش باقی نہ رہنے کے ان کے لئے عفو کی دعا نہ کر سکے ۔

دوسرے یہ کہ یہ تو مسلم کہ باپ کو بیٹے کے ساتھ محبت و شفقت ہوا کرتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی قاعدہ ہے کہ جب بیٹا انتہا درجہ کا سرکش و نافرمان ہو تو وہ شفقت جاتی رہتی ہے۔ چنانچہ امتحان کے طور پر ان والدین کا حال دیکھ لیا جاوے جن کی اولاد نافرمان ہے کہ وہ کس قدر اپنی اولاد سے بیزار رہتے ہیں۔ خصوصاً مذہبی مخالفت یہ تو ایسی مخالفت ہے کہ اس کے بعد تو شفقت رہا ہی نہیں کرتی خصوصاً انبیاء علیہم السّلام کہ ان کی محبت و بغض تو سب فی اللہ ہوتا ہے۔ خیر! ابراہیم علیہ السلام کے والد ابراہیم علیہ السّلام کو مخالف فی الدین اور بتوں کی برائی کرتے ہوئے دیکھ کر غصے میں آکر کہتے ہیں قَالَ اَرَاغِبٌ، اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰٓاِبْرٰهِیْمُ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا کہ اے ابراہیم کیا تم میرے بتوں سے بے رُخ ہو اگر تم اس بے رُخی سے باز نہ آؤ گے تو میں تم کو پتھر مار کر قتل کر دوں گا. اور میرے پاس سے مدۃ العمر کے لئے دور ہو جاؤ۔ تو انبیاء کا تو مخالف فی الدین کے ساتھ کیا حال ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ نوح علیہ السّلام کا وہ بیٹا اُن کا نہایت نافرمان اور سرکش بیٹا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ دین میں مخالف تھا۔ اس کے بعد بھی نوح علیہ السلام کی یہ شفقت کہ جب طوفان آیا تو اُس نافرمان سے آپ فرماتے ہیں کہ اے بیٹے ہمارے ساتھ تو بھی کشتی میں سوار ہو جا اور کافروں کے ساتھ مت رہ نہیں تو غرق ہو جائے گا۔ اس نے اس بات کو بھی منظور نہ کیا۔ یہاں تک کہ اس کو بھی موج طوفان نے غرق کر دیا۔ اس قدر سرکشی کے بعد بھی جب وہ غرق ہو گیا تو نوح علیہ السلام پھر بھی حق تعالیٰ شانہٗ سے اس کی بابت عرض معروض کرتے ہیں۔ یہ نہیں خیال کرتے کہ کمبخت اپنے ہاتھوں تباہ ہوا. میں کیا کروں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السّلام میں شفقت بہت ہی زیادہ تھی ورنہ اس قدر سرکشی کے بعد کیسا ہی باپ ہو اس کو بھی شفقت نہیں رہا کرتی اس سے ثابت ہوا کہ اُن کی صفت شفقت و مرحمت میں ذرا کمی نہ تھی پس پھر جو قوم

کے لئے بد دعا کی معلوم ہوا کہ بامر حق تھی۔ تیسری بات یہ تھی کہ نوح علیہ السلام نے جو بد دعا اپنی قوم کے حق میں کی تھی اگر وہ دعا بے رحمی کی تھی تو حق تعالیٰ شانہٗ اس کو ہرگز قبول نہ فرماتے، مگر جب حق تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرمالیا تو معلوم ہوا کہ وہ بددعا بے رحمی کی نہ تھی اگر اس بد دعا کی وجہ سے نوح علیہ السّلام بے رحم ہوئے تو پھر حق تعالیٰ کو بھی بے رحم کہو کہ انھوں نے ایسی بے رحمی کی بد دعا کو قبول فرمالیا۔ اور ایک نوح علیہ السّلام ہی کی دعا کو نہیں۔ حق تعالےٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی بد دعا کو بھی اسی طرح قبول فرمایا تھا۔ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓی اَمْوَالِھِمْ وَاشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْا حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ ۝ (ہمارے پروردگار ان کے اموال کو ہلاک کر اور ان کے دلوں پر سختی کر کہ بس وہ ایمان نہیں لائیں گے جب تک آپ کے دردناک عذاب کو نہ دیکھ لیں)

تو اے جنٹلمینو! یہ الزام تم نوح علیہ السلام کو کیا دیتے ہو کہ وہ بے رحم تھے صاف یوں ہی کہہ دو نا کہ خدا تعالیٰ بھی معاذ اللہ بے رحم ہیں۔ کیا خدا تعالےٰ کے دربار میں ممکن ہے کہ جا بیجا درخواستیں منظور ہو جایا کریں جس کا نہ کوئی ضابطہ ہے نہ کوئی قانون اگر یہ ہے تو حق تعالےٰ کا دربار کیا ہوا شاہانِ اودھ کی کچہری ہوئی کہ جو کسی نے کہہ دیا بس ہو گیا چاہے حق ہو چاہے ناحق تو کیا معاذ اللہ خدا کے دربار میں اندھیر کھاتہ ہے کہ کچھ قاعدہ ہی مقرر نہیں کہ کس دعا کو قبول کرنا چاہیئے کس دعا کو قبول نہ کرنا چاہیئے بس جس کی دعا چاہی منظور کرلی خواہ وہ کیسی ہی بے رحمی کی دعا ہو اور جس کی چاہے رد کردی خواہ وہ اچھی ہی ہو کیا نعوذ باللہ خدا کا دربار اُس آنریری مجسٹریٹ کے دربار جیسا ہوگا جس کو بوجہ ریاست کے آنریری مجسٹریٹ بنا دیا گیا تھا مگر لیاقت خاک نہ تھی جب آپ کے پاس مقدمات آنے شروع ہوئے تو بڑی فکر ہوئی کہ کیا کروں مقدمات کس طرح فیصل کروں تو آپ ایک دوسرے آنریری مجسٹریٹ کی عدالت میں گئے کہ دیکھوں وہ کس طرح مقدمات فیصل کرتا ہے تو اس وقت ان کے ہاتھ میں ایک مقدمہ کی مسل آئی اس کے بارہ میں انھوں نے پڑھ کر کہا کہ منظور پھر ایک دوسری مسل آئی اس کو دیکھ کر انھوں نے کہا کہ نامنظور۔ یہ اناڑی مجسٹریٹ بہت خوش ہوئے کہ بس ہم کو فیصلہ کرنا آگیا۔

اب آپ عدالت کرنے بیٹھے مقدمات کی مسلیں پیش ہوئیں پس جو اول ہاتھ میں آگئی اسے کہدیا منجور جو اس کے بعد ہاتھ میں آگئی وہ نامنجور (نامنظور) بس اب کیا تھا دو منٹ میں مقدمات طے ہونے لگے منجور نامنجور دو لفظوں میں قصہ پاک ہوا۔ نہ مسل کا پڑھنا نہ سننا نہ یہ خبر کہ یہ قابل منظوری کے ہے یا نہیں۔ بس طاق سلسلہ میں آجانا چاہیئے وہ منظور ہوگئی کوئی جو جفت عدد کے سلسلہ میں پڑگئی وہ نامنظور ہوگئی۔ تو کیا معاذ اللہ خدا کے دربار کو بھی ایسا ہی سمجھ رکھا ہے کہ وہاں بھی اس کا خیال نہیں کیا جاتا کہ درخواست قابل منظوری کے ہے یا نہیں فقط منظور و نامنظور سے فیصلہ کیا جاتا ہے استغفر اللہ العظیم خدا کی کیا عظمت ہے اور اگر یہ احتمال نہیں تو پھر ماننا پڑے گا کہ سیدنا نوح علیہ السلام کی بددعا بے رحمی کی وجہ سے ہرگز نہ تھی ورنہ حق تعالیٰ شانہ اس کو ہرگز قبول نہ فرماتے کیا حق تعالےٰ کے ذمہ رسول کی ہر بات ماننا ضروری ہے۔ بہت دفعہ ایسا ہوا ہے کہ حق تعالےٰ شانہٗ نے انبیاء علیہم السلام کی دعا کو قبول نہیں فرمایا تو اگر نوح علیہ السّلام کی بددعا قابل قبول نہ ہوتی تو حق تعالےٰ اس کو بھی رد فرما دیتے معلوم ہوا کہ نوح علیہ السّلام کی قوم اسی قابل تھی کہ ان کو بالکل تباہ کر دیا جائے وہ ہرگز قابل رحم نہ تھی یہاں تک کہ تنگ آکر نوح علیہ السلام نے اُن پر بددعا کی۔ ساڑھے نو سو برس تک تو ان کو سمجھایا نصیحت کی مگر وہ ہمیشہ ان پر سختیاں ہی کرتے رہے یہاں تک کہ اکثر وعظ و نصیحت کے وقت ان کو اس قدر تکلیف پہونچاتے تھے کہ وہ بے ہوش ہو جاتے تھے جب نو سو برس تک ان کی یہی حالت رہی تب اُن کے حق میں بددعا کی اس قدر ایذا شاید ہی کسی نبی کو اپنی قوم سے پہونچی ہو پھر حق تعالیٰ شانہٗ کا یہ ارشاد نازل ہوا کہ اب یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے۔ ان کے بارے میں ہم سے بات نہ کیجئے نہ ان کے افعال سے رنج کیجئے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ رحم کے قابل ہی نہ تھے مگر ایک نئے مجتہد صاحب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں لکھتے ہیں کہ نوح علیہ السّلام میں ترحم زیادہ نہ تھا۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائل بیان ہو رہے ہیں کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی اہانت کی جارہی ہے اور پھر آپ کی بھی اگر تعظیم کی تو بحیثیت بادشاہ ہونے کے۔

غرض اس، اس طرح لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق میں کوتاہی کر رہے ہیں کہ کوئی صرف اطاعت کو ضروری سمجھتا ہے محبت وعظمت سے ان کو تعلق نہیں کوئی محبت کا دم بھرتا ہے اطاعت وعظمت سے اس کو واسطہ نہیں کوئی آپ کی عظمت کرتا ہے تو اس طرح کہ محض بادشاہت کی حیثیت سے اور یا اس طرح کہ جس سے دیگر انبیاء کی توہین ہو جاتی ہو بلکہ بعض مرتبہ حق تعالےٰ شانہٗ کی بے ادبی ہو جاتی ہے اس لئے اس کی تلافی کی ضرورت ہے اور تلافی ہوتی ہے کوتاہیوں کا سبب دریافت ہونے سے اور سبب ان سب کوتاہیوں کا یہ ہے کہ لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محض ضابطہ کا تعلق ہے۔ کوئی خصوصیت کا تعلق نہیں حالانکہ نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تعلق بھی ہونا چاہیئے اور خاص تعلق پیدا ہونے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے فضائل وکمالات بیان کئے جائیں۔

دوسرے یہ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے وہ انعامات واحسانات بیان کئے جائیں جو ہمارے حال پر آپ نے فرمائے ہیں تو یہ دو امر ضروری ہوئے پھر ان میں بھی باہم ایک تفاوت ہے وہ یہ کہ فضائل وکمالات سن کر خاص تعلق بہت کم لوگوں کو پیدا ہوتے ہیں اکثر یہی دیکھا جاتا ہے کہ اَلْاِنْسَانُ عَبْدُ الْاِحْسَانِ۔ انسان احسان کا غلام ہے جب کسی کے احسانات اپنے اوپر بہت دیکھتے ہیں اکثر خاص تعلق اُس سے پیدا ہو جاتا ہے۔ البتہ جو خاص اہل معرفت ہیں اُن کا تو مذاق یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو کوئی بھی نفع نہ پہونچے جب بھی وہ جان ومال سے آپ پر فدا ہیں جیسا عارف شیرازی محب للنفس کا مذاق بقاء محبت کے باب میں فرماتے ہیں ؎

ہر چند آزمودم ازوے نبود سودم
مَنْ جَرَّبَ الْمُجَرَّبَ حَلَّتْ بِهِ النَّدَامَه

(میں نے ہر چند آزمایا مجھ کو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا جو شخص تجربہ کار کا تجربہ کرتا ہے اس کو ندامت اٹھانی پڑتی ہے)

تو محب اللہ کا تو کیا پوچھنا اُن کی تو یہ حالت ہے کہ اگر ان کو وحی قطعی سے بھی معلوم ہو جاوے کہ ہماری قسمت میں ابدالآباد کے لئے جہنم میں رہنا مقدر ہے تب بھی ان کی محبت میں ذرا کمی نہ ہو گی نفع نہ ہونے کی صورت میں جمیع عاشقین یہی کرتے ہیں کہ محبوب کی رضا کو اپنی رضا پر مقدم کرتے ہیں اور اپنی محرومی پر بھی دل خوش رہتے ہیں ؎

میلِ من سوئے وصال و میلِ او سوئے فراق
ترک کامِ خود گرفتم تا برآید کامِ دوست

(میرا میلان وصل کی طرف ہے اور محبوب کا خیال فراق کی طرف میں نے اپنی مراد کو ترک کر دیا تاکہ محبوب کی مراد پوری ہو جائے)

مگر یہ خاص ہی عاشقین کا مذاق ہے سب کا یہ مذاق نہیں ہوتا۔ اسی لئے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم لوگ عاشق احسانی ہیں عاشق ذاتی یا صفاتی نہیں (کیونکہ عاشق کی تین قسمیں ہیں ایک عاشق ذاتی، ایک عاشق صفاتی، ایک عاشق احسانی۔ عاشق ذاتی تو محض محبوب کی ذات ہی کو محبت کے قابل سمجھتا ہے چاہے اس میں کوئی بھی کمال نہ ہو۔ اور عاشق صفاتی محبوب سے بوجہ اس کے کمالات کے محبت کرتا ہے۔ اور عاشق احسانی وہ ہے جو بوجہ محبوب کے احسانات کے اُس سے محبت کرتا ہے) تو فرمایا کہ بھائی ہم لوگ عاشق احسانی ہیں جب تک راحت سے گذرتی رہے تو محبت قائم رہتی ہے اور اگر ذرا ادھر سے عطا میں کمی ہو جائے تو ہماری محبت کمزور ہو جاتی ہے۔ اسی لئے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ترک لذات امر نہ فرماتے تھے بلکہ فرمایا کرتے تھے کہ خوب کھاؤ پیو اور کام بھی خوب کرو۔ اس کا راز یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں لوگوں میں قوت تھی اس لئے راحت و تکلیف دونوں حالت میں ان کو حق تعالےٰ سے تعلق یکساں رہتا تھا اور اب ضعف ہے اگر مزید نعمتیں ملتی رہیں تب تو حق تعالےٰ سے محبت بڑھتی رہتی ہے اور نہیں تو مشقت و تکلیف میں وہ حالت نہیں رہتی اور فرمایا کہ یہی راز ہے کہ شریعت نے حج کے واسطے زاد و راحلہ کی شرط لگائی کیونکہ ہم لوگ عاشق احسانی ہیں جب راحت کے ساتھ حج کریں گے تو خدا تعالیٰ کے ساتھ محبت زیادہ ہو گی اور اگر زاد و راحلہ

نہ ہوا اور سفر میں کلفت درپیش ہوئی تو بجائے محبت کے اور دل میں رکاوٹ پیدا ہو گی مگر یہ زاد و راحلہ کی قید اُن ہی ضعفاء کے لئے ہے جو کہ عاشق احسانی ہیں ورنہ اقویاء کی بابت تو خود نص میں ذکر ہے وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَّعَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ يَّأْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝ حق تعالیٰ شانہٗ نے ابراہیم علیہ السلام کو حکم فرمایا تھا کہ لوگوں میں حج کا اعلان کر دو لوگ آپ کے پاس پیدل اور دُبلی اونٹنیوں پر سوار ہو کر آویں گے معلوم ہوا کہ بعض لوگ پیدل بھی آویں گے جن کے پاس زاد و راحلہ نہ ہو گا اور ان کو پیدل جانے میں گناہ بھی نہ ہو گا۔ کیونکہ حق تعالیٰ اس مقام پر اُن آنے والوں کی مدح فرما رہے ہیں تو معلوم ہوا کہ پیدل آنے والے بھی حق تعالیٰ کے یہاں ممدوح ہوں گے تو یہ لوگ ضعفاء نہیں ہیں یہ لوگ اقویاء ہیں جن کے واسطے زاد و راحلہ کی کوئی قید نہیں اُن کو اس سفر کی کسی کلفت سے پریشانی نہیں ہوتی۔

ایک ایسے ہی عاشق کا قصہ یاد آگیا کہ وہ حج کے لئے چلے مگر بالکل آزاد تھے کہ وضع داری رسمی سے بھی آزاد کبھی گاتے کبھی دف بجاتے لوگ اُن کو مسخرہ سمجھتے تھے کسی کو بھی نہ معلوم تھا کہ یہ کوئی عاشق ہے۔ جب مکہ مکرمہ پہنچے اور بیت اللہ کا طواف کرنے چلے تو دروازہ کے باہر ہی سے خانہ کعبہ نظر آیا مطوف نے کہا کہ یہ کعبہ ہے بس بیقرار ہو گئے اور بے ساختہ زبان پر جاری ہو گیا ؎

چو رسی بکوئے دلبر بسپار جانِ مضطر
کہ مبادا بارِ دیگر نرسی بدیں تمنا

(در محبوب پر جب پہنچ جاؤ تو اپنی جان کو اس پر فدا کر دو شاید پھر تمنائے دلی پورا کرنے کا موقع نہ ملے)

اور فوراً بیہوش ہو کر گرے اور جاں بحق ہو گئے تو بھلا جو ایسے عاشق ہوں کہ وصال کی تاب بھی نہ لا سکیں سفر کی مشقت سے ان کی محبت میں کمی ہو سکتی ہے ان کی تو اگر بوٹی بوٹی بھی کر دی جاوے تب بھی محبت میں زیادتی ہی ہوتی رہے مگر ہم لوگ زیادہ تر چونکہ عاشق احسانی ہیں اس لئے شریعت نے زاد و راحلہ کی شرط پر حج کو واجب کیا ہے۔ گو بعض وقت

ہم لوگوں کو بھی شبہ ہو جاتا ہے کہ ہم بھی عاشق ذاتی ہیں مگر بات یہ ہے کہ اس وقت احسانات خداوندی ذہن میں حاضر نہیں ہوتے اور محبت دل میں پاتے ہیں اس لئے یوں سمجھ جاتے ہیں کہ ہم عاشق ذات ہیں ورنہ واقع میں وہ محبت مسبّب ان احسانات ہی سے ہوتی ہے البتہ عشق ذات جب ہوتا کہ اگر سچ مچ بھی تمام احسانات وانعامات بند ہو جاتے حتیٰ کہ نہ باطن میں کچھ نور محسوس ہو نہ ظاہر میں کوئی راحت ہو تب بھی محبوب کی رضا کو اپنی رضا پر مقدم کر کے اُس حال میں بھی محبت میں کمی نہ آنے دے اور زبان حال و قال سے یوں کہتا رہے ؎

روزہا گر رفت گو رو باک نیست
تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست

(ایام تلف ہونے پر حسرت نہ کرنا چاہیئے اگر گئے بلا سے گئے عشق جو اصلی دولت ہے اور سب خرابیوں سے پاک وصاف ہے اس کا رہنا کافی ہے)

الغرض ہم لوگ چونکہ عاشق احسانی ہیں اس لئے ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تعلق آپ کے وہ احسانات سن کر پیدا ہونے کی زیادہ توقع ہے جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے اوپر فرمائے ہیں پس اس لئے ایک وجہ تو یہ ہے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات بیان کرنے کی جن کا ذکر اس آیت کے اخیر میں ہے بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (ایمان داروں کے ساتھ بڑے شفیق اور مہربان ہیں) اور اس وقت اسی جزو کا بیان کرنا زیادہ مقصود ہے۔ دوسری وجہ اس کے اختیار کرنے کی ایک یہ بھی ہوئی کہ فضائل تو اکثر لوگ بیان کر دیتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات کا ذکر لوگ بہت کم کرتے ہیں تو یہ مضمون نیا مضمون ہوگا۔ نیز اس بیان کا جو اصل محرک ہے وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس بندہ پر ایک خاص عنایت اور انعام ہی ہے جس کا ذکر[ف] اجمالاً اوپر بھی آیا ہے اس لئے یہی جی چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات بیان کروں اسی واسطے اس وعظ کا نام (شُکْرُ النِّعْمَۃِ بِذِکْرِ رَحْمَۃِ الرَّحْمَہ) رکھتا ہوں جس کے یہ

[ف] اور بندہ جامع وعظ نے اُسی جگہ حاشیہ میں اس مجمل کو مفصل بھی کر دیا ہے ۱۲ منہ

معنی ہیں کہ شکر ایک نعمت کا رحمت مجسم کی صفت رحمت کے ذکر کے ذریعہ سے پس، لفظ رحمت اول سے مراد معنی لغوی اور دوسری سے ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کیونکہ آپ کا ایک نام مقدس رحمت بھی ہے۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نسبت خود ارشاد فرمایا ہے اَنَا رَحْمَۃٌ مُّھْدَاۃٌ کہ میں ایک رحمت ہوں خدا تعالیٰ کی طرف سے بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے آپ کو رحمت فرمایا۔ دوسرے قرآن شریف میں حق تعالے شانہٗ کا ارشاد ہے وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ کہ ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔ غرض حدیث و قرآن دونوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رحمت ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اس مقام پر ایک شبہ بھی ہو سکتا ہے وہ یہ کہ وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ (ہم نے تمام جہان والوں پر آپ کو رحمت بنا کر بھیجا ہے) سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام عالم کے لئے رحمت ہونا معلوم ہوتا ہے اور بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ رَّحِیْمٌ (مسلمانوں پر بڑے شفیق اور مہربان ہیں) سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مسلمانوں پر رحمت فرماتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ رَّحِیْمٌ میں رحمت خاص مراد ہے کہ وہ مسلمانوں کے سوا کسی پر نہیں اور وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ میں رحمت عامہ مراد ہے رحمت عامہ کفار کو بھی شامل ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عام رحمت ایک تو یہ ہے کہ تمام عالم کا وجود آپ کی برکت سے ہوا کہ آپ کے نور کی شعاعوں کی برکت سے تمام عالم کا مادہ بنا۔ دوسری رحمت عامہ یہ ہے کہ یوم میثاق میں تمام جہان کو توحید کی تعلیم فرمائی۔ اہل سیر نے بیان کیا ہے کہ جس وقت حق تعالےٰ نے تمام مخلوق کو پشت آدم علیہ السلام سے ظاہر فرما کر اُن سے یہ ارشاد فرمایا کہ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں) تو سب کے سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کی طرف تکنے لگے کہ آپ کیا جواب دیتے ہیں تو سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بَلٰی ہاں (بیشک ہمارے رب ہیں) فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب نے بَلٰی کہا۔ تیسرے یہ کہ حضرت نوح علیہ السّلام کی کشتی نے آپ ہی برکت سے نجات

پائی یہ بھی تمام عالمین پر رحمت ہے۔ کیونکہ نوح علیہ السلام آدم ثانی ہیں کہ ان کے بعد سلسلہ بنی آدم انھیں کی اولاد سے جاری ہوا اس وقت جس قدر انسان ہیں وہ سب ان کے تین بیٹوں ہی کی نسل سے ہیں چنانچہ قرآن شریف میں ارشاد ہے وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ کہ ہم نے نوح علیہ السلام ہی کی اولاد کو دنیا میں باقی رکھا (باقی سب کو ہلاک کر دیا!)

تو اُس وقت تمام عالم گویا اپنے آباء کی پشت میں تھا اور اس کشتی کو نجات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ہوئی تو یہ احسان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام عالم پر ہے کہ آپ ہی کی برکت سے سب فناء سے محفوظ رہے۔ حیوانات موجودہ بھی اُن ہی حیوانات کی نسل سے ہیں جو کشتی میں تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو نار سے نجات حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی برکت سے ہوئی یہ بھی تمام عالم پر رحمت تھی کیونکہ انبیاء علیہم السّلام بکثرت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہوئے اور اس وقت ان کی اولاد بھی بہت کثرت سے موجود ہے تو وہ ایک بڑے حصۂ عالم کے یا پدر نسبی ہیں یا پدر روحانی تو اس طرح یہ فیض بھی ایک عالم کو پہنچا ان دونوں واقعات کو مع دیگر برکات کے حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چند اشعار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کیا تھا وہ اشعار اس وقت مجھے یاد نہیں ہیں "نشر الطیب" میں لکھے ہیں (جامع وعظ احقر ظفر عرض کرتا ہے کہ اس موقع پر جی چاہتا ہے کہ اُن اشعار کو مع ترجمہ حضرت حکیم الامۃ نقل کر دوں تاکہ ناظرین کے لئے زیادہ موجب لذت ہو)

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے مدینہ منورہ میں واپس تشریف لائے تو حضرت عباس بن عبد المطلب نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اجازت دیجیے کہ کچھ آپ کی مدح کروں (چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح خود طاعت ہے اس لئے) آپ نے ارشاد فرمایا کہو اللہ تعالیٰ تمہارے مُنہ کو سالم رکھے اُنھوں نے یہ اشعار آپ کے سامنے پڑھے ؎

مِنْ قَبْلِهَا طِبْتَ فِي الظِّلَالِ وَفِي   مُسْتَوْدَعٍ حَيْثُ يُخْصَفُ الْوَرَقُ
ثُمَّ هَبَطْتَ الْبِلَادَ لَا بَشَرٌ   اَنْتَ وَلَا مُضْغَةٌ وَّلَا عَلَقُ
بَلْ نُطْفَةٌ تَرْكَبُ السَّفِيْنَ وَقَدْ   اَلْجَمَ نَسْرًا وَّاَهْلَهَا الْغَرَقُ
تَنْقُلُ مِنْ صَالِبٍ اِلٰى رَحِمٍ   اِذَا مَضٰى عَالِمٌ بَدَا طَبَقُ
وَرَدْتَ نَارَ الْخَلِيْلِ مُكْتَتَمًا   فِيْ صُلْبِهٖ اَنْتَ كَيْفَ يَحْتَرِقُ
حَتّٰى احْتَوٰى بَيْتُكَ الْمُهَيْمِنُ مِنْ   خِنْدَفَ عَلْيَاءَ تَحْتَهَا النُّطُقُ
وَاَنْتَ لَمَّا وُلِدْتَ اَشْرَقَتِ   الْاَرْضُ وَضَاءَتْ بِنُوْرِكَ الْاُفُقُ
فَنَحْنُ فِيْ ذٰلِكَ الضِّيَاءِ وَفِي النُّوْرِ سُبُلَ الرَّشَادِ نَخْتَرِقُ

ترجمہ : زمین پر آنے سے پہلے آپ جنت کے سایہ میں خوش حالی (اور راحت) میں تھے اور نیز (اُس) ودیعت گاہ میں تھے جہاں (جنت کے درختوں کے) پتے اوپر تلے جوڑے جاتے تھے (یعنی آپ صلب آدم علیہ السلام میں تھے سو زمین میں آنے سے پہلے جب آدم علیہ السلام جنت کے سایوں میں تھے آپ بھی تھے اور پتّوں کا جوڑنا اشارہ ہے اس قصہ کی طرف کہ جب آدم علیہ السلام نے اس منع کئے ہوئے درخت سے کھا لیا اور جنّت کا لباس اتر گیا تو درختوں کے پتّے ملا ملا کر بدن ڈھانکتے تھے یعنی اس وقت بھی آپ اُن کی پشت میں تھے (اور آپ ہی کی برکت سے آدم علیہ السلام کی یہ خطا معاف ہوگئی اور حق تعالےٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی) اس کے بعد آپ نے بلادِ (زمین) کی طرف نزول فرمایا اُس وقت آپ نہ بشر تھے نہ مضغہ نہ علقہ (کیونکہ یہ حالتیں پیدائش کے بہت قریب ہوا کرتی ہیں اور اس وقت آپ کی پیدائش قریب کہاں تھی اور یہ زمین کی طرف نزول فرمانا بواسطہ آدم علیہ السلام کے ہوا کہ جب وہ زمین پر آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے ساتھ زمین پر نزول فرمایا مگر اس وقت آپ نہ بشر تھے اور نہ مضغہ نہ علقہ) بلکہ (پشت آبار میں محض ایک مادۂ مائیہ بصورت نطفہ تھے اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اس طرح بصورت نطفہ تو تمام انبیاء بلکہ تمام عالم آدم علیہ السّلام کی پشت میں تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس میں کونسی فضیلت ثابت ہوئی جواب

یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود دوسروں کے وجود سے ممتاز تھا کہ دوسرے تو محض بصورت نطفہ تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس کی پشت میں بصورت نطفہ تشریف فرما ہوتے تھے اس کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کو بھی کچھ تعلق ہوتا تھا کہ اس تعلق روحی کی برکتیں آپ کے اُن اجداد میں ظاہر ہوتی تھیں۔ چنانچہ حضرت عباسؓ نے اگلے شعر میں ابراہیم علیہ السلام کے سوزش نار سے بچ جانے کی نسبت یہ بات فرمائی ہے کہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی پشت میں تھے وہ کیونکر جل سکتے تھے تو یہ برکتیں اُس تعلق روح ہی کی وجہ سے تو ظاہر ہوئیں، کبھی وہ مادہ کشتی نوح میں سوار تھا اور حالت یہ تھی کہ نسر بُت اور اس کے ماننے والوں کے لبوں تک طوفان غرق پہونچ رہا تھا مطلب یہ کہ بواسطہ نوح علیہ السلام کے وہ مادہ راکب کشتی تھا مولانا جامیؒ نے اسی مضمون کی طرف اشارہ فرمایا ہے

؎ زجودش گر نگشتے راہ مفتوح
بجودی کے رسیدے کشتیٔ نوح

یعنی اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا سے راہ کشادہ نہ ہوتا تو سلامتی کے ساتھ کوہ جودی پر نوح علیہ السلام کی کشتی کس طرح پہونچتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی برکت سے وہ کشتی پار ہوگئی اور وہ مادہ (اسی طرح واسطہ در واسطہ ایک صلب سے دوسرے رحم تک منتقل ہوتا رہا جب ایک طرح کا عالم گذر جاتا تھا دوسرا طبقہ شروع ہو جاتا تھا یہاں تک اسی سلسلہ میں آپ نے نار خلیل علیہ السلام میں ورود فرمایا چونکہ آپ اُن کی پشت میں مختفی تھے تو وہ کیسے جل سکتے تھے (پھر آگے اسی طرح آپ منتقل ہوتے رہے) یہاں تک کہ آپ کا خاندانی شرف جو کہ (آپ کی فضیلت پر) شاہد ظاہر ہے اولاد خندف میں سے ایک بلند چوٹی پر جا کر یں ہوا جس کے تحت کے اور حلقے (یعنی دوسرے خاندان مثل درمیانی حلقوں کے) تھے (خندف لقب ہے آپ کے جدّ بعید مدرکہ بن الیاس کی والدہ کا) اور آپ جب پیدا ہوئے تو زمین روشن ہوگئی اور آپ کے نور سے آفاق منور ہوگئے سو ہم اس ضیا، اور نور میں ہدایت کے رستوں کو قطع کر رہے ہیں (چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اشعار پر سکوت فرمایا اس لئے حدیث تقریری سے ان مضامین کا صحیح اور رحمت ہونا ثابت

ہوگیا) اِنتہی تَرجُمَۃ مَعَ بَعضِ حَذفٍ وَزِیَادَۃٍ رَومًا لِلاِختِصَارِ وَالْاِیضَاحِ ۱۲ (پورا ہوگیا اس کا ترجمہ مع بعض حذف کرنے اور زیادہ کرلے کے ساتھ ایضاع اور اختصار کا قصد کرکے)۔

ایک رحمۃ عامہ حضور صلی اللہ کی یہ ہے کہ اس امت کے اوپر سے وہ سخت سخت عذاب ٹل گئے جو پہلی امتوں پر آئے تھے کہ بعض قومیں سور بندر بنادی گئیں کسی کا تختہ اُلٹ گیا کسی پر آسمان سے پتھر برسے یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تو برکت ہے کہ اس امت کے کفار پر ایسے عذاب نہیں آتے۔ اور اس رحمت کو عام اس لئے کہا گیا کہ کفار کو بھی شامل ہے جو کہ امت اجابت میں داخل ہیں ایک رحمت عامہ یہ ہے کہ آپ کی امت میں سے جو کوئی ایک نیک کام کرے اس کا ثواب کم از کم دس گنا ضرور ملے گا۔ اور اگر زیادہ خلوص ہو تو سات سو تک بلکہ اس سے بھی زیادہ ثواب ملتا ہے اس کا عام ہونا اس اعتبار سے ہے کہ حدیث اَسْلَمْتَ اَسْلَفْتَ مِنْ خَیْرٍ (اسلام لایا تو اپنی گذشتہ نیکوں کے ساتھ) سے ثابت ہے کہ کافر جب مسلمان ہوجاتا ہے تو اس کی گذشتہ نیکیاں بھی اس کو ملتی ہیں تو ان نیکیوں میں یہ مضاعف ہوگا تو اس طرح یہ رحمت بھی کفار کو شامل ہوئی ایک عام رحمت یہ ہے کہ حق تعالے نے اس امت کے اوپر وہ سخت سخت احکام نازل نہیں فرمائے جو پہلی امتوں پر تھے مثلاً بعض معاصی سے توبہ کا طریقہ یہ تھا کہ مجرم اپنی جان دیدے اس کے بدون توبہ قبول نہیں ہوتی ناپاکی کپڑے میں لگ جائے تو کپڑا کاٹ دینے کا حکم تھا۔ اس شریعت میں نہ احکام نہ بہت سخت ہیں کہ عمل دشوار ہو نہ ایسے آسان کہ کچھ کرنا ہی نہ پڑے۔

اب یہاں یہ ایک سوال ہوسکتا ہے کہ دنیا میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سب کے حق میں رحمت عامہ ہونا ثابت ہوگیا مگر آخرت میں کفار کے لئے آپ کی رحمت کیا ہوگی کیونکہ کفار تو ابداً آباد کے لئے جہنم میں رہیں گے ان کے حق میں آپ کی رحمت کا ظہور کس طرح ہوگا اسی طرح جن مومنین کی بعد سزا کے مغفرت ہوگی ان کے حق میں آپ کی رحمت کیا ظاہر ہوئی۔

اس کے جواب کے لئے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے اس کے سمجھنے کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت کا ظہور کفار کے حق میں آخرت میں بھی ہوگا وہ مقدمہ یہ ہے کہ بھلا اگر کوئی شخص بڑا سخت جرم کرے جس کی سزا میں وہ بیس سال کی سزائے قید کا مستحق ہو تو اگر حاکم اس میں سے دس سال کم کر دے تو یہ رحمت ہوگی یا نہیں اسی طرح اگر کوئی شخص بہت سخت سزا کا مستحق ہوا اور اس میں سے کچھ تخفیف کر دی جائے تو یہ بھی رحمت ہوگی یا نہیں ظاہر ہے کہ دونوں صورتیں رحمت میں داخل ہیں۔

اب سمجھئے کہ قیامت کے روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم جن گنہگار مسلمانوں کے لئے جو کہ جہنم میں جائیں گے سفارش فرمائیں گے اگر یہ شفاعت نہ ہوتی تو اُن کی میعاد اور زیادہ ہوتی تو میعاد کی کمی یہ رحمت ہوئی کوئی ہزار برس کے عتاب کا مستحق تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش سے اس میں کمی کر دی جائے مثلاً پانچسو برس کے بعد وہ جہنم سے نکال دیا جائے تو رحمت ہونا اس کا ظاہر ہے اور کفار کے حق میں یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میعاد میں کمی کر دی جائے عذاب تو ان کو ابدالآباد تک ہوگا مگر بقول شیخ عبد الحق محدثؒ جو عنقریب آتا ہے عذاب میں تخفیف کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے حق میں بھی شفاعت فرمائیں گے چنانچہ بعض کفار کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے تخفیف عذاب کا ذکر تو صحاح میں بھی آتا ہے کہ ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو طالب کو کچھ آپ کی خدمت سے نفع بھی ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں نہ ہوتا تو ابو طالب سر سے پاؤں تک آگ میں غرق ہوتے مگر میری وجہ سے یہ ہوا کہ ان کو صرف دو جوتیاں آگ کی پہنائی جائیں گی جس سے ان کا بھیجا مثل ہانڈی کے پکنے لگا اور اس پر بھی وہ یہ سمجھیں گے کہ مجھ سے زیادہ عذاب کسی کو نہیں۔ ابو لہب کے بارہ میں حدیث میں آتا ہے کہ چونکہ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ کی خوشی میں بشارت لانے والی باندی کو آزاد کر دیا تھا ہر پیر کے دن ذرا سا ٹھنڈا پانی پینے کو

مل جاتا ہے باقی عام کفار کے حق میں تخفیف کی شفاعت مجھے کسی حدیث سے تو نہیں معلوم ہوئی مگر شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ایک کتاب اشعۃ اللمعات میں لکھا ہے کہ قیامت کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت دس طرح کی ہوگی اُن میں ایک شفاعت یہ بھی ہوگی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عام کفار کے لئے شفاعت فرمائیں گے کہ یہ لوگ جس سخت عذاب کے مستحق ہیں اس میں کچھ کمی کردی جائے۔ چنانچہ آپ کی برکت سے اُن کے عذاب میں کمی کردی جائے گی گو کم ہونے کے بعد بھی وہ اس قدر سخت ہوگا کہ وہ اس کو بھی بہت سمجھیں گے خدا محفوظ رکھے وہاں کا تو ذرا سا عذاب بھی ایسا ہوگا کہ ہر شخص یہی سمجھے گا کہ مجھ سے زیادہ کسی کو عذاب نہیں۔

چنانچہ ابو طالب کو حالانکہ بہت ہی کم عذاب ہوگا مگر وہ یہی سمجھیں گے کہ مجھ سے زیادہ کسی کو بھی عذاب نہیں تو گو کفار کو اس کمی کا احساس نہ ہو مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تو رحمت ہونے میں شک نہیں رہا۔ آپ کی رحمت تو ان کے ساتھ بھی پائی گئی اور چونکہ شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ بڑے محدث ہیں اس لئے انھوں نے جو یہ دس قسمیں شفاعت کی لکھی ہیں کسی حدیث ہی سے معلوم کرکے لکھی ہوں گی گو ہم کو وہ حدیث نہیں ملی مگر چونکہ شیخ کی نظر حدیث میں بہت وسیع ہے اس لئے انکا یہ قول قابل تسلیم ہے اور ایک ضروری بات استطرادًا یاد آگئی کہ جیسا کفار کو عذاب کی کمی کا احساس نہ ہوگا اسی طرح جنتیوں کو اپنے درجہ کی کمی کا احساس نہ ہوگا حالانکہ وہاں مدارج بہت مختلف ہوں گے کوئی اعلیٰ کوئی ادنیٰ مگر ہر شخص یہی سمجھے گا کہ میرے پاس جس قدر نعمتیں ہیں اتنی کسی کے پاس نہیں ہیں اور شیخ کے اس قول پر یہ اشکال نہ کیا جاوے کہ یہ نص کے خلاف ہے قرآن میں تو کفار کے بارہ میں ارشاد ہے لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝ (نہ ہلکا کیا جاوے گا ان سے عذاب اور وہ نہ ڈھیل دئے جائیں گے) کہ کفار سے عذاب کم نہ کیا جائے گا۔ اور شیخ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے حق میں بھی تخفیف عذاب کی شفاعت

فرمائیں گے دونوں میں تعارض ہو گیا بات یہ ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس قدر عذاب آخر میں ان کے لئے طے ہو جائے گا پھر اُس سے کمی نہ کی جائے گی اور یہ اس لئے ارشاد فرمایا گیا تاکہ کوئی آخرت کے عذاب کو دنیا کے عذاب پر قیاس نہ کرے کہ جس طرح دنیا کی آگ کا قاعدہ ہے کہ پہلے پہل بہت تیزی کے ساتھ بھڑکتی ہے پھر کم ہوتے ہوتے ٹھنڈی ہو جاتی ہے ایسی ہی جہنم کی آگ بھی ہو گی کہ رفتہ رفتہ ہزار دو ہزار سال کے بعد اس کی تیزی کم ہو جائے گی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہاں کی آگ ایسی نہیں جیسی اول دن تیز ہو گی ہمیشہ ویسی ہی رہے گی۔ اور یہ مطلب نہیں ہے کہ جس عذاب کے وہ قانوناً مستحق ہوں گے اس میں کسی کی شفاعت سے بھی کمی نہ ہو گی بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس قدر عذاب ان کے لئے طے ہو کر قرار پا جائے گا وہ ہمیشہ ایک حال پر رہے گا۔ زمانہ دراز گذر جانے سے اس میں کمی واقع نہ ہو گی واللہ اعلم تو نفی اس تخفیف کی ہے اور اگر کوئی اس تخفیف کی نفی پر یہ شبہ کرے کہ زمانہ دراز گذر جانے کے بعد اگرچہ عذاب کم نہ ہو گا مگر ان کا بدن تو سن ہو جائے گا تو ان کو عذاب محسوس نہ ہونا چاہیئے کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ بدن جب ایک کیفیت کا عادی ہو جاتا ہے تو پھر اس کا احساس نہیں ہوتا جیساکہ آجکل بعض جنٹلمین انگریزوں کی تقلید سے سخت سردی میں بھی ننگے سر رہتے ہیں مجھے بڑی حیرت تھی کہ یہ لوگ ننگے سر کس طرح رہتے ہیں ان کو تکلیف نہیں معلوم ہوتی تحقیق سے معلوم ہوا کہ پہلے پہل تو تکلیف ہوتی ہے پھر بدن سن ہو جاتا ہے سردی کا احساس ہی نہیں ہوتا تب سمجھ میں آیا کہ واقعی یہی ہو گا۔

اس انگریزی تقلید پر بطور جملہ معترضہ کے ایک مضمون ذہن میں آگیا کہ گو یہ لوگ قصد کرتے ہیں تقلید کا مگر تقلید بھی نصیب نہیں ہوتی کیونکہ دونوں کے فعل کی وجہ الگ الگ ہیں چنانچہ انگریز لوگ ننگے سر رہنے کو شوقیا اختیار نہیں کرتے بلکہ وہ سخت سرد ملک کے رہنے والے ہیں ان کو ہندوستان کی سردی زیادہ نہیں ستاتی علاوہ ازیں وہ لوگ غذائیں بہت گرم کھاتے رہتے ہیں اس لئے

وہ اگر ننگے سر رہیں تو کچھ تعجب نہیں۔ مگر جو لوگ ہندوستان کے رہنے والے ہیں اُنکے لئے تو یہاں کی سردی بھی بہت کچھ ہے وہ خواہ مخواہ ان کی نقل کرتے ہیں۔

ایک شخص بیان کرتے تھے کہ ان کے ساتھ ریل میں ایک جنٹلمین سوار تھے جو بوجہ کم وسعتی کے گبردن کا کوٹ پتلون پہلے ہوئے اور ساتھ میں نہ رضائی نہ چادر اور سردی کا سخت موسم ایک اسٹیشن پر کسی انگریز نے برف منگا کر پیا جنٹلمین صاحب کو بھی تقلید سوجھی آپ نے بھی برف والے سے برف خرید کر پیا۔ انگریز لوگ تو چونکہ گرم غذاؤں کے عادی ہیں ان کو تو سردی کے موسم میں برف پینے سے تکلیف نہیں ہوتی اور وہ لوگ شراب بھی پیتے ہیں مگر جنٹلمین صاحب کی تو برف پی کر یہ حالت ہوئی کہ سر سے پیر تک لگے تھر تھر کانپنے وہ شخص بیان کرتے تھے کہ جب وہ بہت ہی کانپنے لگے تو میں نے اپنی رضائی اُن کو اڑھائی جب ذرا ان کی کانپنی بند ہوئی اس وقت ان کو معلوم ہوا ہوگا کہ رضائی کمبل وغیرہ ساتھ لینے میں یہ راحت ہے۔

اسی طرح گرمی کے زمانہ میں یہ لوگ لوٹہ وغیرہ تک ساتھ رکھنے کو بدتہذیبی سمجھتے ہیں ایک بزرگ جو کہ کالج بھاولپور میں پروفیسر ہیں بیان فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ گرمی کے زمانہ میں میرا بھاولپور سے سفر ہوا، میرے ساتھ ٹھنڈے پانی کی صراحی وغیرہ بھی تھی کیونکہ سفر لمبا تھا راستہ میں پانی کہیں ملتا ہے کہیں نہیں ملتا اُسی گاڑی میں ایک جنٹلمین بھی سوار تھے صراحی وغیرہ کو دیکھ کر کہنے لگے کہ یہ کیا بھنگیوں کا سا برتن لیا ہے، میں نے کچھ جواب نہ دیا اور ایک تختہ پر لیٹ رہا وہ صاحب بھی ایک اوپر کے تختہ پر لیٹ گئے اب ان کو پیاس لگی اور شدت کی لگی، تھوڑی دیر صبر کیا آخر بے تاب ہو کر صراحی کی طرف دیکھنے لگے۔ میں نے جب دیکھا کہ ان کا پیاس سے برا حال ہے اور صراحی پر ان کی نیت ہے مگر عار کے مارے مانگتے نہیں تو میں قصداً لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں تاکہ وہ سمجھیں کہ یہ سو گیا ہے اور پانی پی لیں۔ چنانچہ جب ان کا خیال یہ ہوا کہ میں سو گیا ہوں تو وہ صاحب تختہ پر سے اُتر دبے پاؤں صراحی کے پاس آئے مگر بار بار مجھے دیکھتے بھی جاتے تھے کہ یہ کہیں جاگ نہ گیا ہو آخر کو صراحی منہ سے

لگائی جب خوب پانی پی چکے اور اٹھنے لگے میں نے فوراً ان کا ہاتھ پکڑ لیا کہ کیوں صاحب آپ نے بھنگیوں کے برتن میں سے کیوں پانی پیا اسے ہے اب نہ پوچھئے کہ اُن کا مارے ندامت کے کیا حال ہوا سیروں پانی ان کے اوپر پڑ گیا پھر میں نے خوب ہی ان کی خبر لی پھر ان کو یہ معلوم ہوگیا کہ یہ پروفیسر کالج بھاولپور رہیں تو بہت ہی معافی چاہی. مگر تعجب ہے کہ یہ لوگ سر کو تو کھلا رکھتے ہیں اور پیروں کی بہت حفاظت کرتے ہیں ہر وقت موزے چڑھے رہتے ہیں کسی وقت بھی نہیں اترتے خیر یہ لوگ پیر کی تعظیم کرتے ہیں اور ہم سر کی کہ عمامہ وغیرہ سے اس کی حفاظت کرتے ہیں ہم پیر کی اتنی تعظیم نہیں کرتے نہ اسکی حفاظت کرتے ہیں ہمکو تو موزے پہنکر اور زیادہ پریشانی ہوتی ہو اگر کبھی سخت سردی میں پہن بھی لیتے ہیں تو جہاں ذرا گرمی ہوگئی پھر بدون نکالے چین نہیں آتی اور سر کو بدون ڈھانکے ہم کو چین نہیں آتی یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ **اصل مضمون یہ تھا** کہ یہ بات معلوم ہوگئی کہ سردی یا گرمی کی جب عادت ہوجاتی ہے تو بدن سُن ہوجاتا ہے تو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ اگرچہ جہنم کا عذاب ہمیشہ ایک حال پر رہے مگر بدن سُن ہوجانے کے بعد جب اس کا احساس نہ ہوگا تو خود بخود عذاب میں کمی ہوجائے گی تو اس تخفیف کی نفی صحیح نہ ہوئی۔ اس کا جواب حق تعالیٰ شانہ نے قرآن میں خود ارشاد فرمایا ہے ۔

كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا۔ کہ جب ان کی ایک کھال گل جائے گی تو ہم ان کو دوسری کھال پہنا دیں گے ۔ تاکہ اچھی طرح ہمیشہ عذاب کا احساس پورا ہوتا رہے تو اب یہ شبہ بھی زائل ہوگیا غرض بعد شفاعت جس قدر عذاب ان کے لئے طے ہوجائے گا اس میں تخفیف نہ ہوگی نہ ذاتاً نہ حسًا ۔

پس شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تحقیق لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ (اُن سے عذاب کم نہ کیا جائے گا) کے مخالف نہیں ۔ اب آپ کو معلوم ہوگیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام عالم کے لئے رحمت ہیں یہاں تک کہ کفار کے لئے بھی رحمت ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اب تو یہ کہنے کو جی چاہتا ہے ؎

دوستاں را کجا کنی محروم تو کہ با دشمناں نظر داری

(دوستوں کو کب محروم کروگے جبکہ دشمنوں پر آپ کی نظر عنایت ہے)

اور یہ کہنے کو جی چاہتا ہے ؎

نماند بعصیاں کسے در گرو　　کہ دارد چنیں سید پیشرو

(وہ شخص گناہوں کی وجہ سے جہنم میں نہ رہیگا جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسا پیشوا اور سردار رکھتا ہو)

اور ؎　　طُوْبیٰ لَنَا مَعْشَرَ الْاِسْلَامِ اِنَّ لَنَا
مِنَ الْعِنَایَۃِ رُکْنًا غَیْرَ مُنْھَدِمِ

(مسلمانو! ہمارے لئے خوشخبری ہے کہ عنایت ربانی سے ایک ایسا مضبوط رکن جو منہدم ہونے والا نہیں ہے)

اس تمام تقریر سے رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ اور بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ رَّحِیْمٌ میں شبہ تعارض مرتفع ہوگیا پس رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃ عامہ کا ذکر ہے اور بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ رَّحِیْمٌ میں رحمت خاصہ کا جو مومنین کے ساتھ خاص ہے۔ جس کا ثمرہ ہے رضاء حق و قرب حق و نجات ابدی کہ یہ صرف مسلمانوں کے لئے ہے کفار کو اس سے حصہ نہیں ملے گا۔ اے صاحبو اس تقریر سے آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ آپؐ کو ہم ناکاروں سے کتنی محبت ہے تو اب تو طبعًا بھی آپؐ سے محبت کرنا لازم بلکہ آپ کے احسانات کا تو مقتضا یہ ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی آپ لوگوں سے محبت نہ ہوتی تب بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت آپ کے ذمہ فرض تھی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو محسن ہیں سو محسن کے ذمہ محسن الیہ کی محبت ضرور نہیں ہوا کرتی لیکن محسن الیہ کے ذمہ محسن کی محبت بوجہ اس کے احسان کے ضروری ہوتی ہے۔ مگر باایں ہمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم سے اس قدر محبت ہے کہ آپ لوگوں کو اُس قدر نہیں بلکہ ہماری محبت جسقدر بھی ہے یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی محبت کا پرتو ہے اول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم سے محبت ہوئی پھر آپؐ کی کشش سے ہم کو آپ کے ساتھ محبت ہوئی چنانچہ مشہور مقولہ ہے ؎

عشق اول در دلِ معشوق پیدا می شود
(عشق پہلے معشوق کے دل میں پیدا ہوتا ہے)
اگر از جانب معشوق نباشد کششے ؛ طلب عاشق بیچارہ بجائے نہ رسد
(اگر معشوق کی جانب کچھ کشش نہ ہو تو بیچارہ کی طلب کمال کو نہیں پہونچ سکتی)

اور راز اس کا یہ ہے کہ محبت ہوتی ہے معرفت سے اور ہم کو آپ کی معرفت کامل نہیں اور آپ کو ہماری معرفت کامل ہے ہم نے تو صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ کمالات مجملاً سن لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہو گئی مگر ان کمالات کی کنہ و حقیقت نہیں سمجھے ؎

وَكَيْفَ يُدْرِكُ فِي الدُّنْيَا حَقِيقَتَهُ　　قَوْمٌ نِيَامٌ تَسَلَّوْا عَنْهُ بِالْحُلُمِ

یعنی وہ لوگ آپ کی کنہ حقیقت کیونکر سمجھ سکتے ہیں جو کہ خواب ہی میں زیارت سے مشرف ہونے کو تسلی کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے کمالات کی کنہ و حقیقت نہ سمجھنے کا راز یہ ہے کہ کمالات حقیقت میں وجدانی ہیں اور وجدانی ادراک وجدان ہی سے ہوتا ہے اور وجدان کا حصول موقوف ہے اتصاف بالوجدانی پر پس ادراک کمالات نبوت کا متصف بالنبوۃ ہی کو ہو سکتا ہے اور ہم میں نہیں۔ اس لئے ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت کاملہ حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ جن مقامات کو ہم نے دیکھا بھی نہیں ہم ان کی حقیقت کیونکر سمجھ سکتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری معرفت پوری طرح حاصل ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری کنہ حقیقت معلوم ہے اس لئے جتنی محبت ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے ساتھ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اور اس تقریر سے یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہو گئی ہو گی کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت غیر نبی کو نہیں ہو سکتی اس لئے ہم کو مقامات انبیاء علیہم السلام میں موازنہ کرنا بھی رائے سے جائز نہیں کیونکہ جب ہم کو مقامات انبیاء علیہم السلام کی معرفت نہیں تو ہم ان کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے تو ہم سے اس میں غلطی کا واقع ہونا بعید نہیں۔ شیخ ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ باوجودیکہ امت میں بہت بڑے صاحب کشف ہیں اور کشف میں ان کا بڑا پایہ ہے مگر پھر بھی انھوں نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ مقامات انبیاء

علیہم السلام میں گفتگو کرنا نہ چاہیئے کیونکہ غیر نبی کو نبی کے مقامات کا علم نہیں ہو سکتا مثلاً آپ کا خوف وخشیت انبیاء علیہم السلام کے خوف وخشیت کے ساتھ محض لفظی مناسبت رکھتا ہے باقی دونوں کی حقیقت یوں تعبید ہے وہ اور چیز ہے یہ اور چیز ہے۔ غرض جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت ہم کو کما حقہ حاصل نہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری معرفت پوری طرح ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی محبت ہمارے ساتھ زیادہ ہوئی یہ تو دلیل کلی سے اثبات تھا اس کے علاوہ واقعات بھی شاہد ہیں چنانچہ آپ دیکھ لیجیے اور بتلایئے آپ نے کتنی راتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں بیدار رہ کر گذاری ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کی سفارش کے لئے ایک ایک آیت میں صبح کر دی چنانچہ آپ ایک مرتبہ رات کو تہجد میں قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔ جب اس آیت پر پہنچے اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (اگر آپ ان کو عذاب دیں آپ کے بندے ہیں اگر آپ ان کو بخشدیں تو آپ غالب اور حکمت والے ہیں) تو امت کو یاد کر کے بار بار اسی آیت کو دہراتے رہے یہاں تک صبح ہو گئی۔ اللہ اکبر امت کا کس قدر خیال تھا بتلایئے آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فاقہ کو یاد کر کے کتنے فاقے کئے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری عمر فقط آپ کی خاطر فاقہ سے گذار دی شاید کوئی یہ کہے کہ ہماری خاطر کیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو روپیہ پیسہ ملتا ہی نہ ہوگا جو آپ نے فاقہ سے زندگی بسر کی میں کہتا ہوں کہ یہ بات غلط ہے کہ آپ کو ملتا نہ تھا حق تعالیٰ شانہ کے حکم سے ملائکہ نے حاضر ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ اگر آپ فرمائیں تو آپ کے لئے پہاڑوں کو سونا بنا دیا جائے اور وہ ہمیشہ آپ کے ساتھ رہا کریں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قبول نہیں فرمایا اور حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ الٰہی میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک روز پیٹ بھر کر کھایا کروں تو آپ کا شکریہ ادا کروں دوسرے روز بھوکا رہوں تو صبر کروں تو یہ فاقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اختیار فرمایا یہ نہ تھا کہ آپ کو

دنیا نہ مل سکتی تھی اب رہی یہ بات کہ باوجود ملنے کے کیوں نہ لی سو اس کی یہ وجہ نہ تھی کہ دنیا کی کثرت سے کچھ آپ کو باطنی ضرر پہنچتا۔ جس کی وجہ سے آپ نے فاقہ اختیار کیا۔ دنیا مردار آپ کے دل کو کیا مشغول کرسکتی تھی جب آپ کے غلامانِ غلام ایسے ہوئے ہیں کہ ان کے دل کو باوجود کثرتِ مال کے اس سے ذرا بھی لگاؤ نہیں ہوا نیز انبیاء علیہم السلام میں بعض نے سلطنت کی خواہش کی تھی تو کیا معاذ اللہ انھوں لے ایک مضر چیز کی درخواست کی تھی ہر گز نہیں انبیاء علیہم السلام کے دل میں دنیا کی ذرا بھی گنجائش نہیں ہوسکتی آ۔ پھر اگر آپکے پاس، مال و دولت بکثرت بھی جمع رہتا تب بھی آپ کو اس سے کچھ ضرر نہ تھا گر۔ پھر جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فاقہ کشی کو اختیار فرمایا تو اس کی کیا وجہ تھی صرف امت کا خیال کہ اگر میں ذرا بھی دنیا کی طرف ہاتھ بڑھاؤں گا تو میری امت اس کو بھی سنت سمجھے گی اور میری سنت سمجھ کر مال و دولت جمع کرنے کی طرف جُھک جائے گی میرے واسطے تو اگرچہ مال و دولت مضر نہیں ہوسکتا مگر امت کو اس سے ضرر پہونچے گا تو محض ہماری خاطر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ساری عمر فاقہ کی تکلیف برداشت کی حتیٰ کہ شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تین برتن پیش کئے گئے ایک شہد کا ایک شراب کا ایک دودھ کا تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے دودھ کو اختیار فرمایا یہ بھی امت کے حال پر رحمت تھی حالانکہ اگر آپ شراب کو اختیار فرمالیتے تو چونکہ وہ دنیا کی شراب نہ تھی جنت کی شراب تھی حلال اور پاکیزہ تھی کچھ آپ کا ضرر نہ ہوتا۔ نہ آپکو گناہ ہوتا۔ اسی طرح اگر شہد کو لے لیتے مگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم اگر ذرا بھی لذات کی طرف میلان فرماتے تو امت کو اُس سے حصہ ملتا اور امت کے لئے وہ میلان مضر ہوتا اسی لئے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ کو اختیار فرمایا تو جبریل علیہ السلام نے خوش ہو کر عرض کیا اِخْتَرْتَ الْفِطْرَةَ وَلَوْ اَخَذْتَ الْخَمْرَ لَغَوَتْ اُمَّتُكَ یعنی آپ نے دین کو اختیار فرمایا اور اگر آپ شراب کو اختیار فرماتے تو آپ کی امت گمراہ ہوجاتی۔ عالم برزخ میں دودھ دین کی صورت ہے۔ چنانچہ اگر کوئی خواب میں دودھ پیتے ہوئے یا پلاتے ہوئے دیکھے تو اس کی تعبیر دین ہوگی جیسا کہ خود حضور صلی اللہ

علیہ وسلم نے بھی تعبیر اپنے اس خواب کی ارشاد فرمائی جس میں خود دودھ نوش فرما کر بچا ہوا حضرت عمرؓ کو عطا فرمانا دیکھا تھا۔ اس کی مناسبت سے اپنا ایک خواب یاد آگیا۔

میں نے ایک بار خواب میں دیکھا کہ ایک مجمع ہے جس میں لوگوں کو چھاچھ تقسیم ہو رہی ہے میرے سامنے بھی پیش ہوئی تو میں نے انکار کر دیا میں نے نہیں پی۔ جب میں بیدار ہوا تو تعبیر خود بخود دل میں یہ آئی کہ جس طرح دودھ کے معنی عالم میں دین کے ہیں چھاچھ کی تعبیر صورت دین ہے جس میں معنی نہیں سو یہ مجمع بھی عمل بالحدیث کا مدعی ہے گویا اس خواب میں یہ بتلایا گیا تھا کہ ان لوگوں میں دین کی صورت ہی صورت ہے روح دین کی نہیں ہے۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شب معراج میں دودھ کو اختیار فرمایا اس کی برکت یہ ہوئی کہ امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دین کا خیال بہت ہے۔ کاملین کے سامنے ناقصین چاہے کیسے ہی معلوم ہوتے ہوں مگر مجموعی طور پر امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) دیگر اقوام یہود و نصاریٰ کے مقابلہ میں دین کے اہتمام میں بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ امت محمدیہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے ناقص بھی یہود و نصاریٰ کے مقابلہ میں دینداری میں کامل ہیں سو دیکھا آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کی کیا کیا رعایتیں اور ان پر کیا کیا عنایتیں فرمائی ہیں۔ اللہ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شفقت اور یہ محبت دیکھ کر تو ہم کو بدرجہ اولیٰ عاشق اور جان نثار ہو جانا چاہیئے اور یوں کہنا چاہیئے ؎

گر بر سر و چشم من نشینی   نازت بکشم کہ نازنینی

(اگر تو میرے سر اور آنکھوں پر بیٹھے تو تیرا ناز اٹھاؤں اس لئے کہ تو نازنین ہے)

بلکہ اگر آپ قتل بھی کرنا چاہیں تو زبان قال و حال سے یہ کہنا چاہیئے ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت   سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ آپ کی تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت رہے کہ ان پر آپ کا خنجر چلے)

اور ہم تو کیسے محبت نہ کریں آپ کی تو محبوبیت میں تو یہ شان ہے کہ جانوروں تک نے آپ کو سجدہ کیا ہے اور اس سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ حجۃ الوداع میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کی تو سو اونٹ نحر فرمائے تھے ایسے غریب بھی کہیں نہ دیکھے ہونگے بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ کو بہت کچھ دیا تھا مگر آپ جمع نہیں فرماتے تھے آپ کا فقر اختیاری تھا۔ غرض حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حج وداع میں سو اونٹ نحر فرمائے تھے۔ نحر کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک پیر اونٹ کا ران سے ملا کر تسمہ سے باندھ دیا جاتا ہے اور اونٹ تین پیروں پر کھڑا رہتا ہے پھر گلے کے نیچے جو گڑھا ہے اس میں برچھا مارا جاتا ہے۔ اونٹ کو اسی طرح ذبح کیا جاتا ہے اس کا ذبح اسی طرح آسان ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سو میں سے ترسٹھ اونٹ خاص اپنے دستِ مبارک سے ذبح کئے تھے اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت کا حال بھی معلوم ہوتا ہے کہ ماشاء اللہ بہت ہی قوی ہاتھ تھا جو ترسٹھ اونٹ کھڑے کھڑے ذبح کر دیئے۔ غرض احادیث میں یہ قصہ مذکور ہے کہ جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اونٹ نحر فرمائے ہیں تو ہر اونٹ آہستہ آہستہ باوجود پیر بندھا ہوا ہونے کے آپ کی طرف بڑھتا تھا یعنی پہلے مجھے ذبح کیجئے۔ حدیث میں یہ لفظ ہیں کُلُّهُنَّ يَزْدَلِفْنَ اِلَيْهِ (ہر ایک ان میں سے آپ کی طرف بڑھتا تھا) بالکل اس شعر کا مصداق تھے ؎

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ برکف　　　بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

(صحرا کے تمام ہرنوں نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ لیا ہے اس امید میں کہ کسی دن شکار کو آئے گا)

پس ہم پر عقلاً نقلاً ہر طرح فرض ہوا کہ آپ سے محبت کریں اور محبت کا مقتضا ہے کثرتِ ذکر اور اس ذکر کی ایک بہت اچھی اور مقبول اور محبوب فرد درود شریف ہے بخصوص جبکہ اس میں بھی ہمارا ہی نفع زیادہ مقصود ہو اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو درود شریف کی فضیلت بتلائی ہے تاکہ اس کے ذریعے سے امت کو بہت کچھ برکات و درجات عالیہ و ثواب عطا ہوں۔

کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ درود تعلیم فرمانے کا نفع تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ہوتا ہے کہ امت آپ کے لئے دعا کرتی ہے امت کو کیا نفع سو یہ شبہ غلط ہے کیونکہ اس کی تو ایسی مثال ہے کہ ایک آقا ہے اس کے ایک لڑکا ہے جس کو وہ بہت چاہتا ہے وہ لڑکا اپنے باپ کے نوکر سے کہتا ہے کہ ابا جان سے کہدو کہ آج عید ہے ہم کو ایک روپیہ دے دیں۔ وہ لڑکا جانتا ہے کہ باپ کو خود میرا خیال ہے وہ عیدی کا روپیہ خود ہی دیتے مگر پھر جو نوکر کے ذریعہ سے کہلواتا ہے اس میں اس کا خود کوئی نفع نہیں بلکہ اس وساطت سے وہ نوکر آقا کی نظر میں بلند مرتبہ ہو جائے گا۔ کہ یہ ہمارے بیٹے سے محبت کرتا ہے۔ اب اگر وہ نوکر بے وقوف یہ سمجھنے لگے کہ میں بیٹے سے بھی بڑھا ہوا ہوں کہ میں نے اس کو روپیہ دلوایا ورنہ اس کو نہ ملتا۔ یہ اس کی حماقت ہوگی یا نہیں بلکہ اس کو تو اس وساطت سے خود ایک شرف حاصل ہو گیا۔ بیٹے کو تو روپیہ ملتا ہی۔ بلاتشبیہ اسی طرح اس جگہ سمجھئے کہ آپ کے درود پڑھنے سے جو درجات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوں گے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ آپ کی ضرورت نہیں وہ درجات تو حق تعالےٰ خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو عطا فرماتے ہی البتہ یہ رحمت ہے کہ ہم کو اس وساطت سے مشرف فرما دیا کہ اس واسطہ سے ہم کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے قرب حاصل ہو جاتا ہے۔ اور میرے پاس اس دعوے کی کہ ان مراتب کا عطا فرمانا تو حق تعالیٰ کو منظور ہی تھا دلیل موجود ہے حق تعالیٰ شانہ نے جس آیت میں ہم کو درود شریف کا امر فرمایا ہے اس میں امر سے پہلے یہ ارشاد فرمایا ہے اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ حق تعالیٰ اور ملائکہ علیہم السلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں) صیغۂ تجدد ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمیشہ درود بھیجتے رہتے ہیں چاہے کوئی درود بھیجے یا نہ

ضروری اطلاع: اگر آپ خط وکتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیں۔

بھیجے اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ سے بڑھ کر کس کا درود ہو سکتا ہے اور حق تعالےٰ ہمیشہ درود نازل فرماتے رہتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو درجات عالیہ عطا ہونے والے ہیں وہ تو حق تعالےٰ خود ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرور ہی عطا فرمائیں گے اگر تم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے درود پڑھو گے تو اس سے تم کو بھی نفع ہو گا باقی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور درود شریف میں علاوہ اس کے کہ وہ ایک ذکر ہے جو مقتضٰی محبت کا ہے اور بھی فضائل ہیں چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ وَاحِدًا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ عَشْرًا جو میرے اوپر ایک بار درود بھیجے گا حق تعالیٰ اُس پر دس بار درود بھیجیں گے ایک فائدہ درود میں بہ نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر شریف کے دوسرے طرق کے یہ ہے کہ ذکر بسیط ہے اور ذکر بسیط متفرق اذکار سے زیادہ سہل و دلچسپ ہوتا ہے۔ پھر اس میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ذکر اللہ بھی ہے اور ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی کیونکہ درود شریف میں اللہ کا نام بھی ضرور ہوتا ہے تو خلوت میں اس سے زیادہ دلچسپ ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی طریقہ نہیں۔ البتہ جلوت میں اگر مجمع مشتاق ہو تو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات اخلاق وغیرہ کا بھی ذکر کر دیا جائے یہ ذکر ولادت سے بھی افضل ہے کیونکہ ولادت بھی تو اسی کے واسطے ہوئی تھی یہ کمالات مقصود بالولادت ہیں ان کا ذکر اس کے ذکر سے افضل ہو گا درود کی اور فضیلت بھی آئی ہے چنانچہ ایک صحابی نے چند اوراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کئے کہ میں چند وظائف پڑھتا ہوں جن میں درود شریف ربع کے قریب ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا لَوْ زِدْتَ لَکَانَ خَیْرًا لَّکَ (اگر اس سے زیادہ کرتا تو تیرے لئے یہ بہتر تھا) انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نصف کے قریب درود شریف پڑھا کروں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہی فرمایا کہ اگر اور بڑھاؤ گے تو بہتر ہو گا یہاں تک کہ انھوں نے عرض کیا کہ میں سارا وظیفہ درود شریف ہی کا رکھوں گا اور کچھ نہ پڑھوں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اِذًا یَکْفِیْ ھَمَّکَ وَیَغْفِرُ ذَنْبَکَ کہ اگر ایسا کرو گے تو

تمھارا تمام فکر دور ہو جائے گا اور گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب لوگ ایسا ہی کریں کہ تمام اوراد چھوڑ کر درود شریف ہی کا وظیفہ اختیار کرلیں اس کے بارہ میں ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ بہت عمدہ ہے ان سے پوچھا گیا کہ استغفار افضل ہے یا درود شریف انھوں نے فرمایا کہ اُجلے کپڑوں میں تو عطر اچھا ہوا کرتا ہے اور میلے کپڑوں میں صابن غرض ہر ایک کی حالت کا جدا مقتضا ہے۔ اس لئے کوئی یہ نہ کرے کہ تمام اوراد چھوڑ دے اور صرف درود شریف کو اختیار کرلے یہ اپنے شیخ سے پوچھ کر کرنا چاہیئے ایک حق آپ کی محبت کا یہ ہے کہ قبر شریف کی زیارت سے مشرف ہو خصوص جو حالت حیات میں زیارت سے مشرف نہیں ہوتے وہ روضۂ اطہر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہی سے برکات حاصل کرلیں۔ کہ وہ برکات اگرچہ زیارت حیات کے برکات جیسے بالکل نہ ہوں مگر ان کے قریب قریب ضرور ہیں حدیث میں ارشاد موجود ہے مَنْ زَارَنِیْ بَعْدَ مَمَاتِیْ فَکَاَنَّمَا زَارَنِیْ فِیْ حَیَاتِیْ (جس شخص نے میرے مرنے کے بعد زیارت میری قبر کی کی گویا اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی)

اس سے بھی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات خود بھی قابل توجہ ہے اگر آپ تعلق صرف مبلغ ہی ہونے کی حیثیت سے ہوتا تو زیارت قبر مسنون نہ ہوتی کیونکہ اس وقت تبلیغ کہاں ہے افسوس کہ بعض لوگ ایسے خشک ہیں کہ وہ زیارت قبر شریف کی فضیلت کو نہیں مانتے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے ناجواز کے قائل ہیں

کانپور میں ایک مرتبہ ایک مترجم اربعین حدیث میں بچوں کا امتحان تھا جلسہ امتحان میں ایسے ہی ایک شخص تھے جو کہ زیارت قبر شریف کو ناجائز سمجھتے تھے ایک بچہ کا امتحان شروع ہوا اس نے اتفاق سے یہ حدیث پڑھی مَنْ حَجَّ وَلَمْ یَزُرْنِیْ فَقَدْ جَفَانِیْ (جس نے حج کیا اور میری زیارت نہ کی تو اس نے مجھ پر ظلم کیا) ان صاحب نے اعتراض کیا کہ لَمْ یَزُرْنِیْ فرمایا ہے تو یہ آپ کی حالت حیات کے ساتھ خاص ہے بعد وفات زیارت ثابت نہیں طالب علم بچہ تھا اشکال سمجھا بھی نہیں نہ اس کو جواب معلوم تھا وہ سادگی سے آگے بڑھنے لگا۔ خدا کی شان آگئے

جو حدیث موجود تھی وہ اس اعتراض ہی کا جواب تھی آگے یہ حدیث تھی کہ مَنْ زَارَنِیْ بَعْدَ مَمَاتِیْ فَکَاَنَّمَا زَارَنِیْ فِیْ حَیَاتِیْ (جس نے میرے مرنے کے بعد زیارت کی گویا اس نے میری زندگی میں زیارت کی) جتنے علماء اس وقت موجود تھے سب نے ان صاحب سے کہا لیجئے حضرت آپ کے اعتراض کا جواب منجانب اللہ ہو گیا۔ بس خاموش رہ گئے

بعضے لوگ زیارت قبر شریف پر ایک شبہ کرتے ہیں کہ اب تو قبر کی بھی زیارت نہیں ہوتی کیونکہ قبر شریف نظر نہیں آتی اس کے گرد پتھر کی دیوار قائم ہے جس کا دروازہ بھی نہیں یہ عجیب لغو اشکال ہے میں کہتا ہوں کہ اگر زیارت قبر کے لئے قبر کا دیکھنا ضروری ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے بھی یہ شرط ہو گی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جائے حالانکہ بعض صحابہ نابینا تھے عبداللہ بن ام مکتوم صحابی ہیں یا نہیں۔ مستورات کے بارے میں کیا کہو گے جس طرح صحابیت کے لئے حکمی زیارت کافی مانی گئی ہے اسی طرح زیارت قبر شریف میں بھی حکمی زیارت کو کیوں نہ کافی مانا جائے گا۔ یعنی ایسی جگہ پہونچ جانا کہ اگر کوئی حائل نہ ہو تو قبر شریف کو دیکھ لیتے یہ بھی حکماً زیارت قبر شریف ہے۔ تیسرا شبہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے کرتے ہیں کہ امام مالک کا قول ہے یَکْرَہُ قَوْلُ الرَّجُلِ زُرْتُ قَبْرَ النَّبِیِّ عَلَیْہِ السَّلَامُ یعنی امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ بات کہنی مکروہ ہے کہ میں نے قبر شریف کی زیارت کی تو جب زیارت قبر کا قول تک مکروہ ہے تو فعل زیارت تو کیسے مکروہ نہ ہو گا۔ جواب یہ ہے کہ امام مالک کا یہ قول اول تو ثابت نہیں اور اگر ثابت بھی ہو تو ان کا یہ مطلب نہیں جو تم کہتے ہو ورنہ ان کو اس قدر ہیر پھیر کی کیا ضرورت تھی وہ صاف ہی نہ فرماتے کہ یُکْرَہُ زِیَارَۃُ قَبْرِ النَّبِیِّ عَلَیْہِ السَّلَامُ (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی زیارت مکروہ ہے) یہ قول کی کراہت بیان کرنا اس سے زیارت کی کراہت نکالنا اس تکلف کی ان کو کیا ضرورت تھی بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبر شریف میں زندہ ہیں اس لئے زیارت کرنے والے کو یہ نہ کہنا چاہئے کہ میں نے قبر کی زیارت کی کیونکہ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زندہ نہ ہونے کا شبہ ہوتا ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ میں نے حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں۔ غرض دنیا میں ایسے بھی خشک مذاق موجود ہیں جن کو زیارت قبر کا خود تو کیا شوق ہوتا اس کو حرام کہہ کے دوسروں کو بھی روکنا چاہتے ہیں مگر جو زیارت کر چکے ہیں ان سے پوچھو کہ کس قدر برکات حاصل ہوتے ہیں۔ بس اب بیان کو ایک واقعہ پر ختم کرتا ہوں جس سے زیارت قبر شریف کے برکات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قبر شریف میں زندہ ہونا معلوم ہوگا۔ سید احمد رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ جب وہ مزار شریف پر حاضر ہوئے عرض کیا اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَاجَدِّیْ (دادا صاحب السلام علیک) جواب ہوا وَعَلَیْکَ السَّلَامُ یَاوَلَدِیْ (بیٹا! وعلیک السلام) اس پر ان کو وجد ہوا اور بے اختیار یہ اشعار زبان پر جاری ہوئے

فِیْ حَالَةِ الْبُعْدِ رُوْحِیْ کُنْتُ اُرْسِلُھَا تَقَبِّلُ الْاَرْضَ عَنِّیْ وَھِیَ نَائِبَتِیْ
فَھٰذِہٖ دَوْلَةُ الْاَشْبَاحِ قَدْ حَضَرَتْ فَامْدُدْ یَمِیْنَکَ کَیْ تَحْظٰی بِھَا شَفَتِیْ

(یعنی دوری میں تو روح کو قدم بوسی کے لئے اپنا نائب بنا کر بھیجا کرتا تھا
اب جسم کی باری آئی ہے اب تو ذرا ہاتھ بڑھا دیجئے تاکہ میں اس کو
بوسہ دوں)

بس فوراً قبر شریف سے ایک منور ہاتھ جس کے روبرو آفتاب بھی ماند تھا باہر نکلا انھوں نے بے ساختہ دوڑ کر اس کا بوسہ لیا اور وہاں ہی گر گئے[1]

ایک بزرگ سے جو کہ اس واقعہ میں حاضر تھے کسی نے پوچھا کہ آپ کو اُس وقت کچھ رشک ہوا تھا۔ فرمایا ہم تو کیا تھے اس وقت ملائکہ کو رشک تھا۔ تتمہ قصہ کا یہ ہے کہ جب آپ نے دیکھا کہ لوگ مجھ کو نظر قبول سے دیکھ رہے ہیں آپ اٹھ کر ایک دروازہ میں جا پڑے اور حاضرین کو قسم دے کر کہا کہ سب میرے اوپر سے گزریں چنانچہ عوام تو گزرنے لگے اور اہل بصیرت دوسرے راستہ سے نکلے سبحان اللہ کیا نوازش ہے۔

اب اس بیان کو ایک نکتہ پر ختم کرتا ہوں کہ اس آیت میں جو حق تعالیٰ شانہٗ نے رَءُوْفٌ الرَّحِیْمٌ دو لفظ ارشاد فرمائے اس میں کیا نکتہ ہے مجھ کو اس وقت لغت سے

---

[1] جناب سید احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تصنیف کردہ کتاب بنیان المشید منگا کر ضرور پڑھیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کتاب کے پڑھنے کو فرمایا ہے۔ ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ تھانوی مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

رجوع کرنے کا موقعہ نہیں ملا کیونکہ وعظ کا ہونا جمعہ کی نماز کے لئے آتے ہوئے راستہ ہی میں طے ہوا پہلے سے خیال ہوتا تو میں کتب لغت دیکھ کر آتا مگر جو بات اس وقت ذہن میں ہے وہ یہ ہے کہ رؤف کا مصدر ہے رأفت جس کے معنی ہیں شدت رحمت اور شدت ایک کیفیت ہے تو اس میں مبالغہ کیفاً ہے اور رحیم میں بھی مبالغہ ہے اور بوجہ تقابل کے شاید اس میں مبالغہ ہو کمّاً پس مجموعہ کا حاصل یہ ہوا کہ آپ کی رحمت کیفاً بھی زیادہ ہے اور کمّاً بھی اب دعا فرمایئے کہ حق تعالےٰ شانہ ہم کو ہمیشہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی توفیق دیں اور آپ کی محبت و اطاعت و تعظیم ہی میں وفات دیں اور قیامت میں آپ کا قرب نصیب ہو آمین۔

(**التماس جامع**) اس وعظ کے جلد صاف کر دینے کا اکثر احباب کو بہت تقاضا تھا اور واقعی یہ انمول جواہر جو اس وعظ میں ہیں ایسے ہی اشتیاق کے قابل ہیں مگر کیا کہوں تعلیم کی مشغولی کی وجہ سے بہت دیر ہو گئی تاہم بحمداللہ بہت جلد صاف ہو گیا۔ احباب سے تاخیر کی تکلیف کی معافی چاہتا ہوں اور اللہ واسطے درخواست کرتا ہوں کہ جو صاحب اس سے منتفع ہوں میرے واسطے بھی دعائے خیر فرمائیں کہ حق تعالیٰ اپنی محبت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کامل اور اتباع کامل عطا فرمائیں اور بیت اللہ و بیت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بعافیت تامہ ظاہریہ و باطنیہ نصیب ہو آمین یا رب العالمین وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا ومولٰنا محمد وعلیٰ آلہ و اصحابہ وامتہ عدد خلقہ ورضی نفسہ ومداد کلماتہ صلوٰۃ لاغایۃ لہا ولا انتہا ولا امد لہا ولا انقضاء صلوٰۃ تدوم بدوامک وتبقی ببقائک صلوٰۃ ترضیک وترضیہ وترضی بہا عنا یارب العالمین آمین فقط والسلام۔ احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ۔ ٢٧ جمادی الاولیٰ ١٣٣٧ھ

رسالہ الابقاء کی اشاعت کی ترقی کے لئے کوشش اور دعا کی بہت ہی ضرورت ہے۔ اس سال بہت وی۔ پی واپس آگئے اور بہت نے انکار کر کے الابقاء بند کرا دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ براہ کرم ضرور کوشش و دعا فرماویں۔ والسلام طالب دعا و کوشش محمد عبدالمنان غفرلہ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلہ التبلیغ کا وعظ

مسمّٰی بہ

ومضان فی رمضان

بسلسلہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: محمد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبۂ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافرخانہ بندر روڈ کراچی ۱
ایم۔اے جناح روڈ

سلسلہ التبلیغ کا وعظ مسمیٰ بہ

ومضان فی رمضان

این	متی	کم	کیف	لم	ماذا	من ای شان	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کیونکر ہوا	کس لئے ہوا	کیا مضمون تھا	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	کس نے ضبط کیا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون ضلع مظفر نگر	۲۴ شعبان سنہ ۱۳۳۸ھ بروز جمعہ	۔	بیٹھ کر	۔	۔	۔	خواجہ عزیز الحسن صاحب	۔	۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید :- پیشتر حضرت والا نے جمعہ کے دوسرے خطبہ کے ختم کے قریب رمضان المبارک کے متعلق ایک مختصر سی تقریر فرمائی جو ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔ اس کے بعد نماز سے فارغ ہو کر مستقل وعظ فرمایا۔ وہ مختصر تقریر اور مفصل وعظ بالترتیب نقل کئے جاتے ہیں۔

تقریر قبل وعظ

صاحبو! ہم لوگوں کو خوش ہونا چاہیئے کہ رمضان المبارک کا مہینہ آرہا ہے سب جانتے ہیں کہ روزہ کتنی بڑی عبادت ہے اور یہ مہینہ کس قدر بابرکت ہے

ہمیں چاہیئے کہ روزہ کے حقوق ادا کرنے کا بہت اہتمام رکھیں اور ہمیشہ اس کے حقوق ادا کرتے رہیں۔ رمضان المبارک کے مہینہ کے ختم تک اس کا خاص طور سے خیال رکھیں کہ کوئی گناہ سرزد نہ ہونے پائے۔ بالخصوص غیبت، بری نگاہ، حرام روزی بالکل ہی چھوڑ دیں۔ گو یہ گناہ ہمیشہ ہی برے ہیں اور ان کو ہمیشہ ہی کیلئے چھوڑ دینا چاہیئے۔ مگر رمضان میں بالخصوص ان سے اور زیادہ بچنا چاہیئے۔ ایک عبادت رمضان المبارک کی تراویح ہے۔ اس میں پریشان نہ ہوں کہ صاحب گرمی میں کھڑا نہیں رہا جاتا ابھی تو بفضلہ راتوں کو ٹھنڈ رہتی ہے۔ اور اگر کچھ مشقت بھی ہو تو کیا ہے۔ یہ رمضان المبارک کی خاص عبادت ہے۔ آخر دنیا کے واسطے بھی تو کتنی کتنی مشقتیں اٹھاتے ہیں۔ صرف ایک گھنٹہ کا کام ہے۔ پھر تھوڑی تھوڑی دیر بعد سلام پھیرتے رہتے ہیں اور ہر چار رکعت کے بعد آرام کے لئے وقفہ ملتا رہتا ہے اس میں پنکھا جھل لیا کریں۔ لیکن امام کے ساتھ فوراً نماز میں شامل ہو جانا چاہیئے یہ نہیں کہ جب امام رکوع میں جانے لگا تب شریک ہوئے۔ غرض اس مبارک مہینہ میں نہایت خوشی کے ساتھ اور نہایت رغبت اور شوق کے ساتھ عبادت کرنی چاہیئے اور جتنے گناہ ہیں سب کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ یہ اجمالاً حقوق ہیں رمضان المبارک کے۔ باقی اُس سے قبل کا حق یہ ہے کہ چاند کی تحقیق کی جائے۔ سو اب تک جو تحقیق ہوئی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شعبان کی پہلی بدھ کے روز تھی، تو بدھ بدھ ۲۹، لہذا بدھ کے روز چاند کی تلاش چاہیئے۔ بدھ کے دن چاند کو دیکھیں اگر نظر آجائے تو دوسرے دن سے روزے رکھیں اور تراویح اُسی دن سے شروع کر دیں ورنہ ۳۰ دن پورے کر کے شروع کریں یہ ہے حکم چاند کے متعلق۔ لیکن جو کوئی چاند دیکھے وہ مدرسہ میں اطلاع کر دے کیونکہ بہت سے مسائل ایسے باریک ہیں جن کو اہلِ علم ہی جانتے ہیں۔ لہذا خود اپنی تحقیق پر عمل نہیں چاہیئے کسی عالم کے فتوے کے موافق عمل کرنا چاہیئے۔ اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ شعبان کی پہلی منگل کو تھی تو پھر چاند منگل کی شام کو بھی دیکھنا چاہیئے۔ بہرحال یہ چاند کے احکام ہیں

اور وہ جو میں بیان کر چکا ہوں اجمالاً روزے کے حقوق تھے۔ میں نے اس واسطے اتنے جملے اس وقت کہہ دیئے ہیں کہ بعد نماز کے شاید بعضے بعضے بیچارے چلے جاویں۔ ورنہ اگر بعد نماز کے بھی ٹھیرنا ہو تو بیان کا بھی ارادہ ہے جس کا جی چاہے سننے کے لئے ٹھیر جائے۔ اور جو اس وقت حاضر نہیں ہیں ان کو بھی یہ احکام پہونچا دیں خصوص عورتوں کو غیبت سے بچنے کی اور نماز کی پابندی کی ذرا زیادہ تاکید کر دیں۔ یہ غیبتیں بہت کرتی ہیں اور اپنے روزوں کو تباہ کرتی ہیں۔ اور اکثر نماز کی بھی پابند کم ہوتی ہیں، خوب اچھی طرح سمجھا دیں کیونکہ مردوں کے ذمہ اُن کا حق ہے۔ سمجھا بھی دیں اور جب خلاف کریں ٹوک بھی دیں کہ دیکھو تم نے کیا کہا تھا اور اب تم کیا کر رہی ہو۔

اصل وعظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(خطبۂ ماثورہ) فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط شهر رمضان الذی انزل فیه القراٰن هدی للناس و بینات من الهدٰی و الفرقان فمن شهد منكم الشهر فلیصمه و من كان مریضًا او علٰی سفر فعدة من ایام اخر یرید اللہ بكم الیسر ولا یرید بكم العسر و لتكملوا العدة و لتكبروا اللہ علٰی ما هدٰكم ولعلكم تشكرون ط۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ رمضان المبارک کا مہینہ قریب ہے اس واسطے مناسب بلکہ ضروری معلوم ہوا کہ رمضان المبارک کے متعلق کچھ حقوق اور کچھ ضروری مضامین بیان کر دیئے جاویں۔ (یہیں تک بیان فرمانے پائے تھے کہ حضرت کی خانقاہ کے مقیمین میں سے ایک اہل علم احقر کے لکھنے کی طرف جبکہ میں وعظ کو قلمبند

کر رہا تھا دیکھنے لگے۔ اس حرکت سے لکھنے والے کی توجہ بٹ جاتی ہے اور اسکو سخت خلجان ہونے لگتا ہے۔ حضرت نے ان کو ڈانٹا کہ لکھتے ہوئے کو کیوں دیکھتے ہو۔ یہ کیا لغو حرکت ہے۔ افسوس آپ نے یہ قدر کی بیان کی۔ کیا ایک وقت میں دو طرف یکساں توجہ ہو سکتی ہے۔ جب آپ لکھنا دیکھیں گے تو سنیں گے کیا، پتھر۔ اور یہ مسئلہ بھی معلوم ہے کہ وعظ میں بالکل نہ بیٹھے یہ تو جائز ہے لیکن بیٹھے اور پھر دوسری طرف متوجہ رہے یہ جائز کہاں ہے۔ کیا آپ نے یہ بات نہیں پڑھی اذا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فاستمعوا له وانصتوا کیا اس کی شانِ نزول نہیں معلوم مگر آپ لوگ تو محض صیغوں کی تحقیق کے لئے پڑھتے ہیں عمل کے لئے تھوڑا ہی پڑھتے ہیں۔ پھر حضرت نے اُن کو آگے کی صف سے اٹھا دیا اور فرمایا اس جگہ سے اٹھو اور پیچھے جا کر بیٹھو۔ پھر فرمایا میں آپ کو خصوصیت کے ساتھ کہتا ہوں کہ جب میں یہاں سے فارغ ہو کر خانقاہ میں واپس پہونچ جاؤں تو آپ اس واقعہ کو مجھے یاد دلایئے تاکہ آپ کے حق میں میں فیصلہ کروں۔ آپ خانقاہ میں رہنے کے قابل نہیں۔ اس پر وہ صاحب خاموش بیٹھے رہے فرمایا آپ سنتے ہیں یا نہیں۔ پھر بھی وہ صاحب کچھ نہ بولے۔ فرمایا ارے صاحب میں آپ سے کہتا ہوں۔ مولانا میں آپ سے کہہ رہا ہوں بولئے یاد دلایئے گا یا نہیں اتنے کہنے کے بعد انہوں نے جواب دیا کہ یاد دلاؤں گا۔ پھر حضرت نے فرمایا آخر یہ حرکت نالائق کی تھی کیوں۔ انھوں نے پھر سکوت اختیار کیا۔ حضرت نے فرمایا خیر نہ جواب دیجئے۔ میں آپ کے حق میں فیصلہ کرتا ہوں کہ آپ یہاں نہیں رہ سکتے پھر فرمایا یہ خدا کے طالب ہیں صاحب انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ فقط نفلیں پڑھنی اور وظیفے گھونٹنے ہی کو بزرگی سمجھتے ہیں۔ ان سے کوئی پوچھے بھلا کیا فائدہ ہوا لکھتے ہوئے دیکھنے سے۔ کیا لکھے ہوئے وعظ گھر میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کیا وہاں آنکھیں نہیں تھیں۔ جو آپ نے یہ جمعہ کا دن اور یہ وعظ ہی کا وقت اس کے لئے تجویز کیا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ خوامخواہ

ابتدا، بیان ہی میں پریشان کر دیا قلب کو۔ کچھ نہیں جی سے

وجائزة دعوی المحبة فی الھوی ولکن لا یخفی کلام المنافق

(محبت میں دعوٰی جائز ہے مگر منافق کا کلام تو مخفی نہیں رہ سکتا)

طلب نہیں ہے۔ خلوص نہیں ہے۔ اگر طلب ہوتی خلوص ہوتا تو غنیمت سمجھتے کہ اللہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام سنائے جا رہے ہیں۔ کان لگا کر سننا چاہیئے مگر وہ تو خناس نے یوں قلب میں ڈال رکھا ہے کہ ایک ہی وقت میں دونوں کام کر سکتے ہیں۔ سن بھی سکتے ہیں، دیکھ بھی سکتے ہیں۔ حالانکہ ؎

ایں خیال ست و محال ست و جنوں۔ دو کام ایک وقت میں ہو نہیں سکتے۔

اب میں پھر از سر نو مضمون شروع کرتا ہوں پھر اس طرح فرمانا شروع کیا)

یہ سب کو معلوم ہے کہ رمضان المبارک کا مہینہ قریب آ پہنچا ہے۔ لہذا مناسب بلکہ واجب ہے کہ رمضان المبارک کے متعلق کچھ ضروری مضامین بیان کر دیئے جائیں۔ اور وہ مضامین مختلف ہیں ایک قسم تو اُن مضامین کی ہے فضائل رمضان المبارک کے ایک قسم ہے آداب رمضان المبارک کے ایک قسم ہے حقوق رمضان المبارک کے۔ حقوق اور آداب میں میں نے اپنی اصطلاح کے موافق یہ فرق رکھا ہے کہ حقوق تو وہ ہیں جو واجب ہوں اور آداب وہ ہیں جو غیر واجب ہوں یعنی تطوع ہوں۔ خلاصہ یہ کہ حقوق کی ہی دو قسمیں ہیں ایک واجب ایک غیر واجب۔ لیکن میں آسانی تعبیر کے واسطے ایک قسم کا نام آداب رکھتا ہوں اور ایک کا حقوق غرض یہ کہ رمضان المبارک کے متعلق مضامین مختلف ہیں۔ اب دیکھنے کے قابل یہ بات ہے کہ کونسا مضمون زیادہ ضروری ہے اوس کو مقدم رکھا جائے اور اگر وقت ہے تو دوسرے مضامین کے متعلق بھی بیان کر دیا جائے ورنہ ضروری امر تو فوت نہ ہو۔ تو ان تینوں قسموں کی شان اور درجہ میں غور کرنے سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ سب سے زیادہ ضروری کونسی قسم ہے یعنی یہ ظاہر ہے کہ جو حقوق واجب ہیں وہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں لہذا

ان کے متعلق جو مضمون ہوگا وہی سب سے زیادہ ضروری ہوگا کیونکہ حقوق کے فوت ہونے سے مضرت ہے اور آداب کے فوت ہونے سے مضرت نہیں گو منفعت میں کمی واقع ہو جائے اور تمام عقلا کا اس پر اتفاق ہے کہ مضرت کا دفع کرنا زیادہ ضروری ہے بہ نسبت منفعت کے حاصل کرنے کے۔ تو حقوق کا آداب سے زیادہ ضروری اور زیادہ اہم ہونا اس طرح ثابت ہوا۔ رہا فضائل کا درجہ۔ سو وہ دراصل ترغیب کے لئے موضوع ہیں۔ تو یہ شعبہ علم کے باب میں سے ہے نہ کہ عمل کے اور حقیقت میں مقصود علم سے بھی عمل ہی ہے۔ عمل ہی کی اعانت کے واسطے فضائل کا علم ظاہر کیا جاتا ہے تاکہ عمل کی رغبت پیدا ہو۔ کیونکہ طبیعتیں ضعیف ہیں۔ محض امر اور نہی عمل کے لئے محرک نہ ہوتے ان کی تاثیر میں قوت پیدا کرنے کے لئے شارع نے طریقہ اعانت کا یہ رکھا کہ ترغیب اور ترہیب سے بھی کام لیا یعنی رغبت دلا کر اوامر پر ابھارا اور خوف دلا کر نواہی سے روکا۔ تو حقیقتاً فضائل ترغیب کے لئے بیان کئے جاتے ہیں جن کا تعلق علم سے ہے اور اس علم سے بھی مقصود عمل ہے۔ پھر عمل میں بھی دو درجے ہیں۔ ایک درجہ کا تعلق تو آداب سے ہے اور ایک درجہ کا تعلق حقوق سے ہے۔

خلاصہ یہ کہ علم و عمل میں مقصود حقوق کا اہتمام ہے۔ لہذا تینوں قسموں میں اہم اور اقدام یہی ہوا یعنی حقوق کا اہتمام۔ لہذا میں اس وقت اسی مضمون پر اکتفا کرتا ہوں کیونکہ حقوق فی نفسہ بھی اہم ہیں۔ علاوہ اس کے ہم لوگ زیادہ کوتاہی انہی کے متعلق کرتے ہیں یعنی رمضان المبارک کے حقوق کی ہم کو پروا اور اہتمام نہیں۔ اس کے فضائل کا تو کم و بیش علم ہے بھی تفصیلاً نہیں تو اجمالاً تو ضرور ہے کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ رمضان المبارک بہت فضائل کا مہینہ ہے بہت اجر کا مہینہ ہے۔ بہت عبادت کا مہینہ ہے۔ بہت برکت کا مہینہ ہے یہ سب جانتے ہیں۔ غرض بقدر ضرورت فضائل رمضان المبارک کا تو علم ہے بھی۔ رہے آداب سو اول تو یہ اس درجہ کا ضروری مضمون نہیں جس درجہ کا

حقوق کے متعلق مضمون ہے مگر خیر جس درجہ میں بھی مطلوب ہے اس پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بھی کسی قدر اہتمام ہے یا یوں کہئے کہ اگر اہتمام نہیں تو علم تو ضرور ہے۔ جہاں فضائل کا علم ہے آداب کا بھی کسی قدر علم ہے کیونکہ جب رمضان کے متبرک ہونے کا علم ہے اور متبرک چیز کے لئے ادب کا لحاظ عادۃً لازم ہے تو جب برکت کا اعتقاد ہوا تو ادب کی بھی ضرورت قلب میں پیدا ہوگئی۔ غرض اُس کا بھی کسی درجہ میں اہتمام اور علم ہے گو وہ اجمال کے درجہ میں ہے لیکن بقدر ضرورت اس کے ساتھ بھی علم متعلق ہے۔ باقی رہے حقوق سو ان کے متعلق نہایت درجہ کا اغلال واقع ہو رہا ہے علماً بھی اور عملاً بھی یعنی اس طرف کبھی ذہن بھی نہیں جاتا کہ رمضان المبارک کے کچھ حقوق بھی ہیں اس واسطے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ رمضان آنے سے لوگ زوائد کا تو اہتمام کرتے ہیں مثلاً دودھ کا بندوبست کرلیا جاتا ہے، صفائی کرالی جاتی ہے کچھ برف کا انتظام سوچ لیا جاتا ہے۔ شکر کھجوریں تخم بالنگو وغیرہ جمع کرلیا جاتا ہے۔ یہ دیکھ لیتے ہیں کہ گھر میں لکڑی بھی ہے، غسل وُسل کا بھی اہتمام ہوتا ہے۔ یہ تو اہتمام ہوتے ہیں لیکن یہ کبھی ذہن میں بھی نہیں آتا کہ بھائی رمضان المبارک کا مہینہ آتا ہے۔ لاؤ غیبدت سے بچنے کا کوئی انتظام کریں۔ یہ کہیں نہیں ہوتا کہ باہم مشورہ کرکے چند احباب نے یہ طے کرلیا ہو کہ اگر کوئی غیبت کرنے لگا کرے تو ایک دوسرے کو روک دیا کرے ٹوک دیا کرے۔ اکثر دنیا کے کاموں میں تو ایک دوسرے سے اعانت لی جاتی ہے۔ دین کا کام ایسا آسان سمجھ رکھا ہے کہ اس میں کسی کی اعانت کی حاجت ہی نہیں سمجھی جاتی اس کے لئے کبھی ذہن میں آتا ہی نہیں کہ آپس میں التزام کرلیں۔ کانپور میں ہم نے دیکھا کہ بعض محبین نے یہ التزام کرلیا تھا کہ جب رمضان المبارک کا مہینہ آتا تو ایک دو دن پہلے ایک دوسرے سے درخواست کرتے تھے اور آپس میں مشاورت کرلیتے تھے کہ جس کے منہ سے غیبت نکلے دوسرا فوراً روک دے کہ روزہ ہے۔ روزہ میں غیبت مت کرو۔ لیکن ایسا

التزام بہت ہی شاذ و نادر ہے۔ بس یہ دیکھ لیجئے کہ میں نے ساری عمر میں اس قسم کا یہ ایک ہی جلسہ دیکھا ہے۔ بہرحال ان لوگوں کو توجہ تو تھی۔

اسی طرح اس کا ذہن میں بھی کبھی خیال نہیں آتا کہ بھائی قرآن مجید سننے کا زمانہ آرہا ہے کوئی ایسا حافظ تلاش کرو جو اچھا اور صحیح پڑھتا ہو۔ بھائی اس کے پیچھے تراویح پڑھنا چاہیئے جو تجوید کے ساتھ قرآن مجید پڑھتا ہو۔ کلام مجید جس کو رمضان المبارک کے مہینہ کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے کیونکہ وہ نازل ہی اس ماہ مبارک میں ہوا ہے کبھی اس کے سننے میں بھی آپ کو اہتمام کی فکر ہوئی ہے بلکہ اہتمام تو ایسے سامان کا کیا جاتا ہے جس میں اور سستی بڑھے۔ اور اگر کوئی تجوید کے ساتھ پڑھنے والا حافظ تجویز کیا جاتا ہے تو مخالفت کی جاتی ہے کہ تراویح میں دیر لگے گی کھڑا نہیں رہا جائے گا۔ غرض رمضان المبارک کے لئے پہلے سے اور تو سب اہتمامات اور انتظامات کئے جاتے ہیں کہ سحری میں یہ ہو، افطاری میں یہ ہو لیکن ہم نے کہیں نہیں دیکھا کہ اپنے نفس کو آمادہ کیا ہو کسی نے کہ میں مطلق غیبت نہ کروں گا یا گناہوں کے ترک کا عزم کیا ہو کہ میں بالکل گناہ نہ کروں گا تو گویا رمضان المبارک کے حقوق کے باب میں بہت ہی زیادہ کوتاہی اور بہت ہی بے پرواہی ہے۔ عملاً بھی کوتاہی ہے اور علماً بھی کوتاہی ہے۔ اہتمام بھی حقوق کا کم ہے اور ان کا علم بھی کم ہے۔ اس واسطے یہ مضمون ضروری ہوا۔ تو میں اس وقت رمضان المبارک کے حقوق کے متعلق بیان کرنا چاہتا ہوں۔ آیت جو میں نے تلاوت کی ہے اُس میں ہرچند مضمون فضائل رمضان کا ہے۔ لیکن میں اسی آیت سے حقوق رمضان کو مستنبط کرنا چاہتا ہوں۔ بعض مقدمات کی تمہید کے بعد سو ایک مقدمہ تو اجمالاً میری تقریر سے معلوم ہوا ہوگا کہ رمضان المبارک کے چند حقوق ہیں اُن کا خلاصہ کیا ہے یہ ہے کہ جملہ معاصی کو ترک کرنا چاہیئے خواہ وہ معاصی یوم کے متعلق ہوں یا لیل کے متعلق ہوں۔ عبادت کے متعلق ہوں یا عادت کے متعلق ہوں یا معاملات کے

متعلق ہوں۔ یہ گویا خلاصہ ہے حقوق رمضان کا کہ کل معاصی کو ترک کر دے اس میں وہ امور بھی آگئے جن سے روزہ میں خلل آجاتا ہے یا تراویح میں خلل آجاتا ہے۔ غرض سب معاصی سے احتراز لازم ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہے جو خلاصہ ہے حقوق رمضان کا۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ معصیت اپنی ذات کے اعتبار سے بھی اور اپنے اثر کے اعتبار سے بھی ایک قسم کی ظلمت اور تاریکی ہے۔ حدیثوں سے اس کی تائید ہوتی ہے یعنی معصیت کے اُن آثار سے جو بیان کئے ہیں جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے۔ اُن آثار کا حاصل یہ ہے کہ فرماتے ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کوئی گناہ کرتا ہے ایک سیاہ دھبہ اُس کے قلب کے اوپر پیدا ہوجاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کرلیتا ہے تو حق تعالےٰ اُس دھبہ کو صاف کر دیتا ہے اور اگر توبہ نہیں کرتا اور پھر عود کرتا ہے اس گناہ کی طرف اور اس پر اصرار کرتا ہے تو وہ دھبہ پھیلتا ہے۔ پھر پھیلتے پھیلتے وہ بہت بڑا ہوجاتا ہے یہاں تک کہ محیط ہوجاتا ہے سارے قلب کو۔ پھر استشہاد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت فرمائی کلّا بل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون ط اس کا ترجمہ مولانا نے کیا ہے ؎

ہر گنہ زنگے ست بر مرآتِ دل　　دل شود زیں زنگ ہا خوار و خجل
چوں زیادت گشت دل را تیرگی　　نفس دوں را بیش گردد خیرگی

(ہر گناہ سے دل پر زنگ لگ جاتا ہے اور دل اس زنگ سے ذلیل اور بے وقعت ہوتا ہے)

(اور جب دل کی تاریکی زیادہ ہوجاتی ہے تو نفس ذلیل کی پریشانی اور حیرانی بڑھ جاتی ہے)

اور یہ ایک ایسا امر ہے کہ اگر انسان تھوڑا سا بھی اپنے قلب کی طرف رجوع کرے تو فقط یہی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے اس لئے بیشک سچ ہے۔

بلکہ خود بھی مشاہدہ کر لیجیئے۔ اول تو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خبر کے بعد ہم کو مشاہدہ کا انتظار ہی نہیں چاہیئے کیونکہ اس کی ضرورت ہی نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خبر دے دینا ہمارے لئے مشاہدہ سے بھی بڑھ کر ہے۔ لیکن تا بَدہ کے واسطے عرض کرتا ہوں کہ اگر ذرا بھی وسوسہ ہو تو خود مشاہدہ کر لیجیئے اور اپنے قلب کی طرف رجوع کر کے اور اپنے قلب کو ٹٹول کر دیکھ لیجیئے کہ گناہ صادر ہو جانے کے بعد قلب میں ظلمت محسوس ہوتی ہے یا نہیں اور ممکن ہے اگر کوئی کہے کہ ہم تو رات دن گناہ کرتے ہیں ہمیں تو اپنے قلب میں کچھ بھی ظلمت محسوس نہیں ہوتی جیسے کسی سرحدی دیہاتی نے ایک وعظ میں یہ سن کر کہ بغیر وضو کے نماز ہی نہیں ہوتی یہ کہا تھا کہ بارہا کردیم و شد ہم نے تو بہت دفعہ بے وضو پڑھی اور ہو گئی۔ تو وہ جاہل حقیقت ہی نہ سمجھا تھا نماز کے ہونے کی۔ بس منہ میں جو آیا بک دیا۔ اسی طرح ممکن ہے کہ کوئی یوں کہے کہ ہم تو ہمیشہ گناہ کرتے ہیں ہمیں تو کچھ بھی ظلمت محسوس نہیں ہوتی۔ ہمارا قلب تو اچھا خاصہ تر و تازہ رہتا ہے۔ ویسا ہی خوش بہ خوش جیسے گناہ کرنے سے پہلے تھا۔ ذرا بھی میلا نہیں ہوتا۔ تو میں اس کی تکذیب تو نہیں کرتا لیکن یہ کہوں گا کہ وہ جھوٹ تو نہیں بولتا مگر دھوکہ میں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بے چارہ غریب نے ظلمت کے مقابل جو چیز ہے یعنی نور اس کا کبھی مشاہدہ ہی نہیں کیا۔ اسے کبھی احساس ہی نور کا نہیں ہوا۔ اور یہ مسلّم مسئلہ عقلیہ ہے کہ الاشیاء تعرف باضدادها ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ جس نے کبھی نور نہ دیکھا ہو وہ بے چارہ کیا سمجھے کہ ظلمت کیا چیز ہوتی ہے۔ جیسے کسی نے تنگ کوٹھری میں پرورش پائی ہو تو اس کو کوٹھری کے اندر تنگی نہیں ہو گی۔ کیونکہ اسے خبر ہی نہیں کہ میدان فراخ کس کو کہتے ہیں اور فراخی کیسی ہوتی ہے ؎

چو آن کرمیکہ در سنگے نہان ست
زمین و آسمانِ دے ہمان ست

(مثل اس کیڑے کے کہ وہ پتھر میں پوشیدہ ہوتا ہے اس کے لئے زمین اور آسمان وہی پتھر کا (ترجمہ)

لیکن جس شخص نے میدان دیکھا ہوگا اگر اس کو کوٹھری میں قید کر دیا جائے تو اس کی وحشت کا کچھ ٹھکانا اور اس کی تنگی کی کچھ انتہا نہ ہوگی۔ اسی طرح جس نے انوار کا مشاہدہ کیا ہو اگر اس کو ظلمات میں لا کر ڈال دیں تو اس کی وحشت کی کچھ انتہا نہ ہوگی اور اگر کسی نے ظلمت ہی ظلمت دیکھی ہو نور کبھی نہ دیکھا ہو اسے ظلمت سے کیا وحشت ہو سکتی ہے جس نے عمر بھر ظلمت میں پرورش پائی ہو وہ کیا جانے کہ نور کیسا ہوتا ہے اور انوار کس کو کہتے ہیں جیسے گوہ کا کیڑا کہ چونکہ اس کو خوشبو کی خبر نہیں اس لئے بدبو کی بھی خبر نہیں۔ اس لئے وہ خوشبو اور بدبو کا نام سن کر سوچتا ہے کہ خوشبو کیا چیز ہوتی ہے پھول میں کیا بات ہے جو سب لوگ اس کی تمنا کرتے ہیں اگر اس کے سامنے پھول لائے جائیں تو وہ تو یہی کہہ دے کہ ان میں کیا رکھا ہے۔ ہم تو انہیں نہیں چاہتے۔ لوگ کہتے ہیں خوشبو خوشبو ہماری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ خوشبو بھی کوئی چیز دنیا میں ہے۔ اور کہتے ہیں کہ پاخانہ میں بدبو ہوتی ہے صاحب ہم تو عمر بھر سے اسی میں رہتے ہیں ہمیں تو کبھی نہیں محسوس ہوئی۔ تو بھائی بات یہ ہے کہ بدبو کا احساس تو اسی کو ہو سکتا ہے جس کو خوشبو کا ادراک ہو چکا ہو۔ تم کیا جانو کہ بدبو کیا چیز۔ ہے کاش خوشبو کا ادراک بھی کبھی نہیں ہوا ہوتا تو تم دیکھتے کہ پاخانہ میں زندگی بسر کرنا موت ہو جاتا۔ چونکہ ابتداء ہوش سے ہمیشہ خدا تعالیٰ کے معاصی میں مبتلا رہے ہو۔ ابتداء سے ظلمت ہی ظلمت دیکھی ہے نور کبھی دیکھا ہی نہیں تو یہ وجہ ہے کہ ظلمت کا ادراک نہیں ہوتا۔ یعنی ظلمت کا تو ادراک ہوتا ہے لیکن اس کے ظلمت ہونے کا ادراک نہیں ہوتا۔ اس واسطے کہ جو ظلمت میں ہوگا اُسے ظلمت مشاہدہ تو ہوگی لیکن یہ نہیں سمجھے گا کہ یہ ظلمت ہے کیونکہ اس نے کبھی نور کو نہیں دیکھا۔ جس نے کبھی دھوپ نہ دیکھی ہو وہ سایہ کی حقیقت ہی نہیں جان سکتا اس واسطے کہ سایہ مقابل ہے دھوپ کے لہذا سایہ کی معرفت دھوپ سے ہو سکتی۔ ہے اور دھوپ کی معرفت سایہ سے ہو سکتی ہے۔ ایک کی معرفت کا مدار دوسرے کی معرفت پر ہے دونوں لازم ملزوم ہیں اور حضرت یہاں تک

اس قاعدہ کا اثر ہے کہ بعضے اہل اللہ نے جن پر غلبہ ذکر کا تھا قسم کھاکر مدتوں بعد کسی غافل کے واقعہ کو دیکھ کر کہا کہ واللہ ہم یہ نہ جانتے تھے کہ دنیا میں کوئی غافل بھی ہے۔ یہ گمان تھا کہ دنیا میں جتنے لوگ ہیں سب ذاکر ہیں۔ تو بات یہی ہے کہ چونکہ وہ ابتدا ہی سے ولی مادر زاد تھے ذکر ان کے لئے امر فطری ہو گیا تھا جیسے حدیث میں اہلِ جنت کی صفت یہ آئی ہے یلہمون التسبیح کما یلہمون النفس تسبیح کا انہیں الہام ہوگا جیسے سانس بلا اختیار آتا ہے اسی طرح سبحان اللہ سبحان اللہ یا اللہ اللہ بے اختیار ان کے منہ سے نکلا کرے گا۔ کسی وقت غفلت طاری نہ ہوگی بعض اولیاء کی شان دنیا میں بھی ایسی ہی رہی ہے کہ ان پر کبھی غفلت طاری نہیں ہوئی وہ ہمیشہ ذاکر ہی رہے۔ اور چونکہ خود ہر وقت ذکر میں مشغول رہے انہیں اہل دنیا کی غفلت کا احساس ہی نہیں ہوا اور خبر بھی نہ ہوئی کہ دنیا میں اہلِ غفلت بھی موجود ہیں۔ جب کسی کو معصیت میں مبتلا دیکھنے کا اتفاق ہوا اس وقت متنبہ ہوئے اور حیرت سے پوچھا کہ اللہ اکبر کیا ایسے بھی لوگ دنیا میں ہوا کرتے ہیں جو حق تعالیٰ کی یاد سے غافل ہوں۔

غرض جب اہل نور نے اہلِ ظلمت کو نہ پہچانا تو اگر اہلِ ظلمت اہلِ نور کو نہ پہچانیں تو تعجب کیا۔ تو بہر حال معصیت کا ظلمت ہونا محسوس نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس شخص نے کبھی طاعت کے نور کو نہیں دیکھا۔ اگر نور طاعت کو کبھی دیکھ لیتا تب معلوم ہوتا کہ معصیت میں کیسی ظلمت ہوتی ہے۔ اگر یقین نہیں آتا تو اسکو امتحان کر کے دیکھ لو۔ امتحان ہی کے طریقے سے تھوڑے دنوں طاعت کر کے دیکھو۔ زیادہ نہیں دو چار ہی دن سہی بلکہ ایک ہی دن سہی یا ایک ہی رات سہی۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

خواب را بگذار امشب اے پسر سبحان اللہ
خواب را بگذار امشب اے پسر یک شبے در کوئے بے خوابان گذر[1]

---

[1] (اے لڑکے خواب کو ایک روز ترک کر یعنی سونے کے بجائے کسی اللہ والے کے پاس ایک رات گذارلے)

ایک دن تو ایسا کرو کہ رات کو سونا چھوڑ دو اور جاگنے والوں کے محلہ میں کو گذر جاؤ تب تمھیں معلوم ہو کہ جاگنا کتنی بڑی دولت ہے جس کے سامنے کی کوئی حقیقت نہیں۔ اب تک تو تم نے یہی دیکھا کہ سونا کیا ہے، ایک دن جاگنا بھی تو دیکھ آؤ کہ کیا ہے۔ تب معلوم ہو کہ ہم کتنے بڑے خسارہ میں ہیں اور کس قدر ٹوٹے میں ہیں۔ غرض ؎ یک شبے در کوئے بے خواباں گذر۔ صرف ایک شب جاگ کر بے خوابوں کو دیکھ لو۔ یہ بھی نہیں کہتے کہ جا کر ان کے ساتھ عبادت کر لو نہیں بلکہ صرف ان کی حالت ہی دیکھ لو۔ ان کے پاس کو ہی جا کر گذر جاؤ ان کے انوار تم پر منعکس ہوں گے اس وقت منکشف ہوگا کہ ہم سراسر خواب میں ہیں، سراسر غفلت میں، سراپا ظلمت میں ہیں۔ بہرحال امتحان یہ ہے کہ تھوڑے دنوں طاعت اختیار کر کے دیکھ لو تمھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ طاعت میں کیسا نور ہے اور کیا کیفیت ہے اور اس کیفیت کو ذہن میں محفوظ رکھ کر پھر اس حالت کے اثر کو ذہن میں مستحضر کرو جو حالتِ غالبہ ہے ہماری یعنی معاصی۔ اس کے بعد جو کیفیت طاعت کی ذہن میں محفوظ ہے اس سے اس حالت غالبہ کے اثر کا موازنہ کرو اس وقت معلوم ہوگا هل تستوی الظلمات والنور کہ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس وقت محسوس ہوگا کہ وہ نور تھا یہ ظلمت ہے۔ وہ اور چیز تھی یہ اور چیز ہے۔ تو عبادت اگر خلوص سے بھی نہ کرو محض امتحان ہی کے لئے کرو جب بھی ان شاء اللہ تعالیٰ یہ تفاوت محسوس ہونے لگے گا اور اگر خلوص سے کہیں نصیب ہو گئی عبادت تب تو کچھ انتہا ہی نہیں۔ میں کہتا ہوں امتحان ہی کے لئے کچھ دن عبادت کر لو اور یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ اکابر کا ارشاد ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امتحان کی نیت سے بھی عبادت کر لینا خالی نہیں حقیقت پر پہونچنے سے ایک درجہ میں۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں ؎

سالہا تو سنگ بودی دل خراش   آزموں را یک زمانے خاک باش

(ایک عمر تو پتھر دلخراش رہا کچھ دن کے لئے تواضع اختیار کر کے تو دیکھ اور خاک ہو جا)

یوں نہیں فرمایا ع از خلوصے یک زمانے خاک باش۔ بلکہ یوں فرمایا ہے۔ ع آزموں رایک زمانے خاک باش۔ یعنی خلوص سے توفیق طاعت نہیں تو امتحان ہی کے لئے کچھ روز خاک بن کر دیکھ لو۔ پتھر تو بہت دنوں بن کر دیکھا لیکن کیا دیکھا کچھ بھی نہیں۔ اب کچھ روز خاک بن کر بھی دیکھو تب تفاوت معلوم ہوگا۔ کیا معلوم ہوگا۔ یہ معلوم ہوگا ؎

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ　　　خاک شو تا گل بروید رنگ برنگ

(موسم بہار میں کیا تجھے نظر نہیں آتا کہ سنگ یعنی پتھر پر سبزہ نہیں اُگتا اس لئے تو خاک ہو جا تاکہ اس تواضع کی برکت سے تیرے اندر اخلاق اور اعمال کے پھول پیدا ہوں)

تفاوت یہ معلوم ہوگا کہ مدتوں پتھر رہے تھے لیکن کبھی ایک پھول بھی نہ کھلا۔ لاکھ بارشیں ہوتی رہیں خاک بن کر دیکھا تو بس ایک بارش ہی کافی ہو گئی۔ طرح طرح کے پھول کھل گئے۔ تمام میدان معطر و معنبر ہوگیا۔ تو مولانا نے تصریح فرمائی ہے کہ ع آزموں رایک زمانے خاک باش۔ امتحان ہی کے لئے کچھ روز خاک بن کر دیکھو۔ تو معلوم کیا آپ نے تفاوت معلوم کرنے کا طریقہ۔ اس طرح سے اگر امتحان کیا جائے گا تو ظلمت اور نور میں تفاوت معلوم ہو جائے گا۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ واقعی معصیت سخت ظلمت ہے۔ چنانچہ جن کو نور نصیب ہو گیا ہے ان کا خود مشاہدہ ہے کہ جن گناہوں سے پہلے مدتوں تک پریشانی تو کیا ہوتی حظ حاصل ہوتا رہا۔ اور جن گناہوں میں مدتوں مشغول رہنے سے بھی حس نہیں ہوتا تھا پریشانی کا آج عزم تو کیا ان کا حدیث النفس بھی ہونے لگتا ہے تو بے انتہا پریشان ہو جاتا ہے اور یہ حالت ہو جاتی ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

بر دل سالک ہزاراں غم بود
گر زباغ دل خلالے کم بود

(سالک کے قلب پر ہزاروں غم ٹوٹ پڑتے ہیں اگر اس کے باغ دل سے ایک تنکا بھی کم ہو جاوے یعنی قرب میں ذرا بھی کمی ہونا عاشقوں کو برداشت نہیں)

ایک تنکا بھی اگر باغِ دل میں کم ہو جاتا ہے تو بس پوچھو مت کیا حالت ہوتی ہے لیکن یہ پریشانی اسی کو محسوس ہوتی ہے جو سالک ہو چنانچہ حدیث میں ہے کہ جس کی عصر کی نماز جاتی رہی فکانما وُتِرَ مالُهُ واهلُهُ وہ لٹ گیا اس کا سارا مال و دولت چھن گیا۔ تو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اوروں کو تو علم الیقین کے ذریعہ سے صادق معلوم ہوتا ہے لیکن اہل اللہ اس ارشاد کو عین الیقین کے ذریعہ سے سچ جانتے ہیں۔ اور اہل اللہ کی تو بڑی شان ہے ہم لوگوں کو جن کو نہ کچھ علم ہے نہ ادراک ہے البتہ فھو منھم میں داخل ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اسی کی برکت سے اُن حضرات کا ایک چھینٹا ہم پر بھی پڑ گیا ہے اور ایک حالت تمیُّز کی پیدا ہو گئی ہے۔ اس وقت ایک نظیر یاد آ گئی۔ حدیث شریف میں عشا کے بعد بات چیت کرنے کی ممانعت اور کراہت آئی ہے۔ اس کا اعتقاد تو تھا طالب علمی کے زمانہ میں لیکن ذوقاً اس کا درجہ مضرت نہیں معلوم تھا۔ اس وقت اس فعل سے وحشت عقلی تھی طبعی نہ تھی اور اب یہ کیفیت ہے الحمد للہ کہ عشاء کے بعد اگر کوئی سامنے بھی آ کھڑا ہوتا ہے تو سچ جانئے اس قدر غصہ آتا ہے گولی مار دوں۔ کیوں غصہ آتا ہے۔ اب میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ بس اُن حضرات کی صحبت کا اثر ہے اور کچھ بھی نہیں۔ ع ولیکن مدتے با گل نشستم۔ لیجئے اتنی تمیز تو اندھے ہونے پر بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ حالانکہ ہم اندھے ہیں لیکن اتنا حس تو ہمیں بھی ہونے لگا ہے۔ اور واقعی بعضے اندھوں کو دیکھا ہے کہ ٹٹولنے سے بیل کا رنگ بتا دیتے ہیں یعنی کمر پر ہاتھ پھیرا اور بتلا دیا کہ سفید ہے۔ گو باصرہ صحیح نہیں لیکن لمس کرتے کرتے لامسہ میں بھی باصرہ مودع ہو گیا اور ودیعت ہو گیا۔ گو آنکھیں درست نہیں لیکن چھوتے چھوتے تکرارِ اتصال کی برکت سے ہاتھوں ہی میں آنکھوں کی صفت پیدا ہو گئی کہ ٹٹولنے سے رنگ محسوس ہونے لگا۔ اسی طرح حضرات اہل اللہ کی صحبت میں رہتے رہتے ہمیں بھی کچھ محسوس ہونے لگا ہے

کہ ہاں واقعی عشار کے بعد جاگنا بڑی وحشت اور کراہت کی چیز ہے۔ تو میں نے یہ ایک نمونہ پیش کیا ہے۔ پس جب اہل اللہ کی صحبت سے کچھ تھوڑی بہت تمیز ہم لوگوں کو بھی ہونے لگی کہ پہلے جو علم الیقین تھا وہ پھر گویا آنکھوں سے نظر آنے لگا۔ تو جو پوری پوری اطاعت کرے گا وہ تو کیوں نہ دیکھ لے گا کہ واقعی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ و تراهله وماله وہ بالکل ٹھیک ہے ٹھیک تو پہلے بھی مانے ہوئے تھا لیکن اب خود اپنی آنکھوں سے نظر آگیا اور اس کو مشاہدہ ہوگیا کہ واقعی میں لٹ گیا۔ اسی کو کہتے ہیں مولانا ؎

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود
گر ز باغِ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل پر ہزاروں غم ٹوٹ پڑتے ہیں اگر ان کے قلب کے باغ سے ایک تنکا بھی کم ہوجاوے)

تو یہ گویا مضرت ہے معاصی کے درمیان میں اور یہ گویا ضرر ہے نافرمانی کے درمیان میں۔ لیکن یہ ضرر اُسے محسوس ہوتا ہے جو کبھی طاعت کے نفع کا مشاہدہ کر چکا ہو۔ تو گویا انعکاس سے انوار کے تھوڑا بہت احساس ظلمت کا ہونے لگتا ہے۔ تو بہرحال کیا اس کا امتحان ممکن نہیں ہے۔ اُس امتحان سے بھی محسوس ہونے لگتا ہے کہ واقعی معصیت کے درمیان میں پریشانی ہوتی ہے پریشانی اس کو اپنی آنکھوں سے نظر آنے لگتی ہے۔ تو اس کو میں بیان کر رہا تھا کہ یا تو گناہوں میں مدتوں مشغول رہنے پر بھی پریشانی کا احساس نہ ہوتا تھا یا طاعت اختیار کرنے کے بعد آج حدیث النفس ہونے سے ہی بے حد غم اور پریشانی لاحق ہوجاتی ہے۔ اور جو ابتدا ہی سے طاعت میں مشغول ہیں ان کی حالت تو پوچھو ہی مت معصیت کے دیکھنے ہی سے پریشان ہوجاتے ہیں۔ خود ارتکاب بھی نہیں کیا دوسرے مرتکب ہی کو دیکھ کر یہ حالت ہوتی ہے کہ ایک بزرگ تھے۔ انھوں نے کسی کو کہیں معصیت میں مبتلا دیکھ لیا۔ گھر جو گئے اور پیشاب جو کیا تو دیکھا کہ بجائے

پیشاب کے خون آتا ہے۔ اس قدر کلفت اور تکلیف انہیں ہوئی محض معصیت کے ارتکاب کو دیکھنے سے معصیت کے ارتکاب کو دیکھ کر ہی اس قدر دلگیر ہوئے کہ پریشانی میں پیشاب کی راہ سے خون آنے لگا۔ خود ارتکاب تو بڑی چیز ہے حضرات اہل اللہ تو دوسرے کو مرتکب دیکھکر بھی بے حد پریشان ہوتے ہیں اسی واسطے بھاگتے ہیں مخلوق سے کہ اہلِ ظلمت کے دیکھنے سے بھی انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ بہرحال دوسرا مقدمہ یہ ہوا کہ معصیت کے درمیان میں ظلمت ہے۔ تو ایک مقدمہ تو میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ رمضان المبارک کے حقوق کا حاصل ترکِ معصیت ہے۔ دوسرا مقدمہ یہ ہوا کہ معاصی جو ہیں وہ ظلمت ہیں اور تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ ہر چیز اپنی ضد سے فرار کرتی ہے یہ قاعدہ عقلی ہے یعنی ظلمت نور سے بھاگتی ہے اور نور ظلمت سے مرتفع ہو جاتا ہے۔ اور ہر چند کہ ہر ضد میں احتمال ہے دوسری ضد کے رافع ہونے کا لیکن بعض اضداد میں بعض خارجی دلائل سے یہ خاصیت زیادہ پائی جاتی ہے اور یہ امر مشاہدہ سے متعین ہے کہ ایک ضد پر یہ خاصیت رافع ہونے کی زیادہ صادق آتی ہے اور ایک ضد پر کم یعنی مثلاً نور اور ظلمت ہے۔ محض تضاد کی بنا پر تو نور سے ظلمت رفع ہو جاتی اور ظلمت سے نور مرتفع ہو جاتا کیونکہ فی نفسہ دونوں میں صفت ارتفاع یکساں ہے لیکن اگر غور سے مشاہدہ کیا جائے تو نور میں زیادہ قوت رفع کی ہے اور ظلمت میں کم قوت ہے۔ نور میں تو اس قدر قوت ہے کہ ظلمتیں چاہے کتنی ہی جمع ہو جائیں نور ان کا رافع ہو جاتا ہے۔ ظلمت میں یہ خاصیت نہیں۔ البتہ ظلمت میں یہ خاصیت ہے کہ اگر اسباب ظلمت کے جمع ہو جائیں تو وہ نور کے ساتر ہو جاتے ہیں۔ مزیل نہیں ہوتے تو نور تو رافع ظلمت ہے اور ظلمت ساتر نور ہے اپنے اسباب کے اعتبار سے۔ دیکھئے چراغ جس وقت جلایا جاتا ہے تو اس کا نور تو مکان کی تاریکی کو رفع کر دیتا ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے مکان میں تاریکی گھس ہی نہیں سکتی۔ جبتک چراغ گھر میں موجود ہے تاریکی

کے آنے کی مجال نہیں۔ باقی ظلمت تو خاصیت فی نفسہ تو اس کی بھی یہی ہے کہ وہ نور کو مرتفع کر دیتی لیکن قضیہ شرطیہ کے درجہ میں رہی کہ اذا جاءت الظلمۃ ارتفع النور لیکن مقدم ہی کا وجود نہیں اس لئے کہ یہی ممکن نہیں کہ نور کے ہوتے ہوئے ظلمت آوے البتہ اگر کسی تدبیر سے اور کسی طریق سے آسکے تو وہ حکم صحیح ہوگا مگر وہ براہ راست آتی ہی نہیں البتہ اگر اس کا کوئی سبب ایسا ہو جو نور کا ساتر بن جاوے تو ظلمت اپنے سبب کے واسطے سے نور کی ساتر ہو جاتی ہے جیسے کوئی چراغ روشن ہے۔ اس کے اوپر کسی نے آکر ہنڈیا رکھدی تو ظلمت بواسطہ ظرف کے ظاہر ہوئی۔ اور اصل میں ظرف صرف ساتر ہو گیا نور کا۔ تو ظرف سبب ہے ظلمت کا۔ اس کے واسطے سے ظلمت نمودار ہوئی۔ یہ نہیں ہوا کہ ظلمت نے بالکل رفع کر دیا ہو نور کو صرف ظرف ساتر بن گیا نور کا۔ اور جہاں تک احاطہ اُس ظرف کا ہے وہاں تک ساتر ہے حد سے اور جو حد سے خارج ہے۔ وہاں تک ساتر نہیں۔ چنانچہ ہنڈیا دائرہ کی شکل ہے۔ تو ہنڈیا کے اِدھر اُدھر تو ستر ہے نور کا۔ لیکن دائرہ کے اندر اندر وہ ظرف حائل نہیں بلکہ اندر تو اور زیادہ نور بڑھ گیا ہے کیونکہ نور کا خاصہ ہے کہ جتنا اس کی شعاعوں کو محدود کرتے جایئے اتنی ہی اس کی قوت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ البتہ ہنڈیا کے باہر نور کو زائل کہئے یا مستور کہئے یا مضمحل کہئے وہاں البتہ وہ مضمحل ہو گیا ہے۔ باقی نور کو اس کی حاجت نہیں کہ کسی سبب کے واسطے سے پھیلے یہ نہیں ہے کہ خود نور کے علاوہ کوئی اور سبب نور ہو بہ خلاف ظلمت کے جو اپنے اثر رفع نور میں سبب کی محتاج ہے جیسا کہ ہنڈیا کی مثال سے واضح ہو چکا ہے یعنی چراغ پر جو ظرف کو رکھا گیا تو جس حد تک وہ ظرف مظلم تھا وہیں تک ظلمت پھیل سکی اور جو اُس کی حد سے باہر تھا وہاں ظلمت نہ پہونچ سکی۔

یوں سمجھئے کہ دو طرفین ہیں اُس کی حد کی۔ ایک تو باہر کی طرف اور ایک اندر کی طرف۔ باہر کی طرف جو حد ہے یعنی جو اس کی محیط ہے وہاں سے تو نور کو دفع کر سکا اور جو حد اندر کی طرف ہے وہاں سے نور کو زائل نہیں کر سکا۔ یہاں تو وہ ظرف

اُس کو ایک حد خاص تک دفع کر سکا باقی نور میں ایسی قوت ہے کہ وہ سارے ظلمت یا مزیل ظلمت حد کے اندر اندر تک نہیں۔ یہ نہیں کہ جہاں تک چراغ ہو وہاں تک تو وہ نور ہوا اور جہاں تک چراغ نہ ہو وہاں تک نہ ہو۔ نہیں بلکہ نور اپنی شعاعوں سے نورانی کرتا ہے اور وہ خاص اس حد تک نہیں جس حد تک چراغ ہے۔ البتہ اگر کسی وجہ سے کہیں شعاع نہ پہونچی تو وہاں البتہ ظلمت رہے گی لیکن پھر بھی شعاعیں وہ چیز ہیں کہ جس حصہ میں ظلمت ہے وہاں بھی ظلمت محضہ نہیں ہے بلکہ ایسی ظلمت کہ مرکب ہے نور ظلمت سے جس سے وہ نور ضعیف ہو گیا جس کو ظل کہتے ہیں۔ چنانچہ سایہ کی حقیقت یہی ہے کہ وہ ایک کیفیت ہے جو مرکب ہے ظلمت اور نور سے بہرحال یہ تو سائنس کا مسئلہ ہے جو تفنن کے طور پر ذہن میں آ گیا۔ اس مضمون سے جو میں بیان کر رہا تھا اس کا کچھ زیادہ تعلق نہیں لیکن کچھ تعلق ضرور ہے کیونکہ طاعت جو نور ہے اور معصیت جو ظلمت ہے ان میں سے بھی ہر ایک کا دوسرے پر اثر ہوتا ہے۔ نور طاعت کا تو یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ ظلمتِ معصیت کو دور کر دیتا ہے اور ظلمت معصیت کا یہ اثر ہوتا ہے کہ اگر ظلمتِ معصیت ہو تو نور طاعت کا اثر کم ہوتا ہے۔ صرف اس قدر تعلق ہے اس مضمون سے مگر مقصود اصلی یہ فرع بیان کرنا نہیں بلکہ مقصود اصلی یہ ہے کہ ظلمت اور نور میں تضاد ہے یعنی نور جو ہے وہ ظلمت کا رافع ہوا کرتا ہے۔ یہ گویا تیسرا مقدمہ ہوا میں ان تینوں مقدمات کا مختصراً پھر اعادہ کرتا ہوں۔

پہلا مقدمہ تو یہ ہے کہ رمضان المبارک کے حقوق یہ ہیں کہ جملہ معاصی کو ترک کر دے۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ معصیت ظلمت ہے۔ تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ نور دافع ظلمت ہے۔ ان تینوں مقدمات کے بعد سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ اس آیت میں جو میں نے تلاوت کی ہے رمضان المبارک کے حقوق کی طرف اشارہ ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں رمضان المبارک کی ایک خاص فضیلت فرمائی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ مہینہ نورانی ہے چنانچہ نورانی ہونا اس کا بھی مذکور ہو گا۔

اب اُن مقدمات کو مستحضر کر لیجئے کہ نور کی خاصیت ہے دفع ظلمت جب نور کی خاصیت دفع ظلمت ٹھہری تو اس کا مقتضا یہ ہوا کہ ظلمت دفع ہو اور وہ تھی معصیت تو معصیت کو ترک کرنا گویا حقوق رمضان میں سے ہوا۔ یہ دلالت ہوگئی۔ اس طرح یہ مہینہ نورانی ہے وہ اس طرح کہ حق جل وعلا شانہ فرماتے ہیں شهر رمضان الذی انزل فیه القرآن هدی للناس وبینات من الهدی والفرقان۔ یعنی یہ ایسا مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا ہے اور قرآن کی خاصیت ہے هدی للناس وبینات من الهدی والفرقان۔ یہ سب مادے دلالت کر رہے ہیں قرآن مجید کے نور ہونے پر هدًی۔ بیّنات فرقان ہدیٰ وبینات تو ظاہر ہے رہا فرقان سو فرقان کسے کہتے ہیں۔ ممیز بین الحق والباطل کو یعنی قرآن مجید سے فرق ہوتا ہے حق اور باطل میں اور یہ حقیقت شناسی ہی نور ہے کیونکہ نور یہ تھوڑا ہی ہے کہ اس میں چمک اور دمک ہو۔ کہیں چمک اور دمک پر مغرور نہ ہو جانا کہ کچھ تارے سے نظر آنے لگے تو سمجھ لیا کہ ہمارے قلب میں نور پیدا ہوگیا۔ ارے وہ نور ہی کب ہے قلب میں نو وہ نور ہے کہ اس کے آگے نور شمس کی بھی کچھ حقیقت نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

شمس تبریزی کہ در نور مطلق است
آفتاب ست وزانوار حق ست

(حضرت شمس تبریزی کہ وہ سراپا ہدایت ہیں بلکہ آفتاب ہدایت ہیں اور حق تعالےٰ کے نور خاص کے حامل ہیں)

اب شمس تبریزی کوئی نور تھے۔ کیا ان سے کوئی لالٹین روشن ہو جاتی تھی۔ حکما بھی نور کی حقیقت کو کچھ سمجھے ہیں مگر عوام وہاں تک نہیں پہونچے۔ حکماء علم کو کہتے ہیں کہ نور ہے حالانکہ علم آنکھوں سے نظر آنے والا نور نہیں مثلاً ہم کو علم ہے کہ زَیْدٌ قَائِمٌ تو کیا اس علم کی وجہ سے کوئی چمک نظر آنے لگی۔ اگر اندھیری کوٹھری میں بھی تصوّر کریں اور زید کا ادراک کریں تو کیا کوئی چمک محسوس ہوگی۔ اس تصوّر سے کونسی

چمک پیدا ہوگئی۔ عوام نور کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ جب اللہ تعالیٰ کی یہ صفت سنتے ہیں کہ اللہ نور السموات والارض تو یہ سمجھتے ہیں کہ نور حق بھی کوئی چمکدار چیز ہوگی۔ اے صاحبو چمک اس کے سامنے کیا چیز ہے وہ تو وہ نور ہے کہ چمک بھی ظلمت ہے اس کے سامنے۔ مگر جہلا یہی سمجھتے ہیں کہ اللہ کے نور میں بھی چمک ہوتی ہے چنانچہ اس وقت دو قصے بیساختہ یاد آگئے۔ ایک تو ہمارے ننہال ہی کا ہے۔ ہمارے ننہال میں ایک بزرگ تھے ذاکر شاغل۔ یہیں تھانہ بھون کا واقعہ ہے۔ اس زمانہ میں دیا سلائی نئی نئی چلی تھی بہت سے لوگوں نے تو دیکھی بھی نہ تھی۔ ایک درویشی کا مدعی جاہل شخص کہیں سے آگیا۔ اُس نے اُن سے کہا کہ میں تمہیں خدا کا نور دکھا دوں گا۔ یہ مشتاق تھے ہی انہیں باور آگیا۔ واقعی طلب وہ چیز ہے کہ بہت سے طالب دھوکوں میں بھی مبتلا ہوجاتے ہیں جب حقیقت نہ معلوم ہو۔ مقام وعدہ کا غوث گڈھ قرار پایا کہ وہاں چل کر دکھائیں گے۔ غوث گڈھ ایک چھوٹا سا گاؤں یہاں سے تین کوس کے فاصلہ پر ہے۔ وہاں بستی کے باہر ایک ویران مسجد ہے۔ اُس نے کہا کہ اس مسجد میں لیجا کر تمہیں اللہ کا نور دکھائیں گے کیا سب کے سامنے اللہ میاں کو اپنا جلوہ دکھلاتے ہوئے نعوذ باللہ شرم آتی تھی۔ کیا نعوذ باللہ ان میں عورتوں کی صفت ہے۔ مگر صاحب طلب عجیب چیز ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ طلب کے اندر ایک شان حیرت کی ہوتی ہے۔ جب علم پر طلب غالب ہو اسی واسطے یوں دعا کرنی چاہیے کہ حق تعالیٰ طلب اور علم دونوں عطا فرمائے۔ نرے عشق اور نرے طلب کے اندر عقل مغلوب ہوجاتی ہے۔ بہت لوگ عشق میں کہیں کے کہیں چلے گئے ہیں۔ عقل مغلوب ہونے پر یاد آیا۔ ایک بنیہ کی تھالی گم ہوگئی تھی۔ اُس نے سب جگہ تو دیکھا ہی مگر گھڑے کے اندر بھی دیکھا کسی نے کہا ارے بے وقوف تھالی اور گھڑے کے اندر یہ کیا حماقت ہے۔ تو اس نے جواب دیا کہ یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ گھڑے کے اندر تھالی نہیں جاسکتی مگر احتیاطاً دیکھ لیا۔ تو وہ کیا بات تھی۔ حرص تھی۔ اجی کسی کو

عشق دنیا کا کسی کو عشق دین کا۔ اس بنیہ پر اس قدر عشق بھالی کا غالب ہوا کہ جہاں ہونا عقل بھی جائز نہیں رکھتی وہاں بھی تلاش کر لیا۔

اس قصّے سے بھی وہی مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ جب طلب کا غلبہ ہوتا ہے تو سمجھ جاتی رہتی ہے اور جب عشق غالب ہوتا ہے تو عقل برباد ہو جاتی ہے۔ لکھے پڑھے آدمی جاہل کے کہنے میں آگئے۔ غوث گڈھ پہونچے۔ اس نے کہا کہ پہلے دو رکعت پڑھو پھر کچھ وظیفہ بتا دیا کہ ایسے آنکھیں بند کئے پڑھتے رہنا جس وقت میں کہوں فوراً آنکھ کھول دینا۔ پھر جو دیکھوگے وہ اللہ کا نور ہوگا۔ بے چاروں نے سارے جتن کئے۔ اول دو رکعتیں پڑھیں پھر بیٹھے غریب آنکھیں بند کرکے اور وظیفہ پڑھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد پیچھے سے آواز آئی ہوں۔ انھوں نے جو آنکھ کھولی تو دیکھا کہ تمام مسجد روشن ہے۔ تو ظالم نے کیا شرارت کی تھی کہ پس پشت کھڑے ہوکر ایک دیا سلائی جلا کر ہوں کر دیا۔ دیکھا تمام مسجد نور سے روشن ہے۔ مگر لکھے پڑھے آدمی تھے وہ یوں کہتے تھے کہ میں نے دیکھا کہ میرا سایہ بھی پڑ رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ تو خدا کا نور ہے اس میں ظلمت کیسی۔ یہ خدا کا نور کیسا ہے جس میں ظلمت کے دفع کرنے کی بھی قوت نہیں۔ مجھے اس پر ہوا شبہہ مُڑ کر جو دیکھا تو آپ ہاتھ میں جلتی ہوئی دیا سلائی لئے کھڑے ہیں۔ اُٹھ کر اور جوتہ نکال کر دہ جوتہ دہ جوتہ۔ پیر صاحب کی خوب ہی مرمت کی۔ کہا نالائق یہ خدا کا نور ہے۔ جب نجات ہوئی صاحب اس دھوکہ بازسے۔ تو غرض وہ کیا بات تھی۔ اس نے نور چمک کا نام سمجھا تھا اسی سے دھوکہ دینا چاہا۔ دیکھئے علم بھی کیا کام کی چیز ہے اور زیادہ دھوکہ تو جب ہوتا جب اس نور کے ساتھ ظلمت بھی نہ ہوتی۔ چنانچہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اس شعبدہ پر ایک حکایت اپنے استاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یاد آئی۔

مولانا فرماتے تھے کہ ہم نے بچپن میں سنا تھا کہ دیوالی کی رات کو جن بازاروں میں نکلتے ہیں اور ان کی پہچان یہ ہے کہ ان کے سایہ نہیں ہوتا۔ دیوالی کی رات آئی ہم شوق

میں اور جنون میں بازار میں پہنچے۔ دیوالی کے چراغ جل رہے تھے۔ دیکھا کہ مجمع تو بہت ہے مگر کسی کے سایہ نہیں نہ اِدھر نہ اُدھر۔ بہت سے لوگ ان میں ایسے بھی تھے جنھیں اُسی دن اول بار دیکھا تھا۔ پہلے سے بالکل جان پہچان ہی نہیں تھی۔ ان پر تو جن ہونے کا گمان ہوسکتا تھا لیکن بہت سے ایسے بھی تھے جن سے جان پہچان تھی ان کے بارہ میں یہ تاویل کرلی کہ ممکن ہے کہ جن ان کی صورت میں آگئے ہوں جن سے جان پہچان ہے۔ مگر پھر اپنے کو جو دیکھتے ہیں تو یہاں بھی سایہ نہیں۔ بڑے حیران کہ اے اللہ اپنا تو علم ہے کہ میں محمد یعقوب ہوں، میں کیسے جن ہوسکتا ہوں مولانا ذہین تھے بچپن کا قصہ ہے مگر ذہانت بچپن ہی سے غضب کی تھی سوچا تو فوراً ذہن میں آگیا کہ میاں چاروں طرف تو چراغ ہیں آخر سایہ ہو کدھر۔ یہ وجہ ہے سایہ نہ پڑنے کی۔ جن دن کوئی نہیں تو اس شعبدہ باز کو سوجھی نہیں ورنہ وہ بھی کوئی ایسا ہتھکنڈ کرتا کہ مشتاق زیارت کو اپنا سایہ بھی نظر نہ آتا۔ مگر باطل کے پیر نہیں اللہ تعالیٰ کسی اور طریق سے اس کو رسوا فرما دیتے۔ تو غرض عوام کا یہ اعتقاد ہے کہ نور چمک کو کہتے ہیں۔

ایک اور شخص تھا۔ ہمارے یہاں کانپور میں آیا تھا۔ اس کی بھی تمنا یہ تھی کہ کسی طرح خدا کا نور دیکھ لوں۔ چنانچہ اسی تمنا میں میرے پاس بھی آیا تھا میں نے کہا کہ بھائی خدا کا نور تو خود میں نے بھی نہیں دیکھا۔ پھر میں تمھیں کیا دکھا سکتا ہوں اور میں کیا دیکھتا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی نہیں دیکھا تو ہماری تمہاری تو کیا حقیقت ہے۔ اور انھوں نے تمنا بھی کی لیکن تمنا پر بھی صاف جواب مل گیا کہ لن ترانی اور لن فرمایا یعنی کبھی نہیں دیکھ سکو گے۔ لیکن یہ تابید بھی مؤبد نہیں بلکہ مقید ہے اور محدود ہے۔ تابید کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک دنیا کی تابید اور ایک آخرت کی تابید۔ آخرت کی تابید تو غیر محدود ہے لیکن دنیا کا جو ابد ہے وہ حقیقۃً ابد ہی نہیں کیونکہ ابد تو وہ ہے کہ لا آخر لہٗ جس کا اخیر نہ ہو۔ لیکن یہ بھی محاورات میں ابد ہی کہا جاتا ہے۔ اور جس طرح ابدیت کے صیغہ سے کبھی مدت محدودہ مراد ہوتی ہے

اسی طرح کبھی مدت محدودہ کے صیغہ سے بھی ابدیت مراد ہوتی ہے جیسے شیطان کے بارہ میں ارشاد ہے ان علیك لعنتی الیٰ یوم الدین یہاں الیٰ یوم الدین سے مراد ابد غیر محدود ہے مگر بعض کج فہم لوگ اس کو ابدیت غیر محدود سمجھ کر شیطان کی نجات کے قائل ہوگئے کہ صرف قیامت تک اس پر لعنت رہے گی پھر نہ رہے گی حالانکہ یہ بات نہیں بلکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مراد تو ہوتی ہے ابدیت غیر محدود لیکن اس کو تعبیر اس طرح کرتے ہیں جیسے کہ تابید محدود کو تعبیر کرتے ہیں اس واسطے کہ ہم لوگوں کی عقول ضعیفہ کی رعایت سے قرآن مجید ہمارے محاورات میں نازل ہوا ہے۔ سو ہم ابدیت غیر محدودہ کو بھی اسی طرح تعبیر کیا کرتے ہیں کہ قیامت تک یہ بات نہ ہوگی یعنی کبھی نہ ہوگی دوسرے یہ کہ دنیا دار العمل ہے اور اس کا منتہا قیامت ہے پس جب ایک شخص دنیا کے ختم تک ملعون رہا اب دار الجزاء میں ناجی ہونے کا اس کے کب احتمال ہے اس طرح بھی ابدیت غیر محدودہ لازم آگئی گو لفظ کو اس پر دال نہ مانا جائے اس واسطے میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید کے سمجھنے کے لئے عربی کی صرف و نحو کے علاوہ محاورات سے علم کی بھی ضرورت ہے۔ محاورات نہ جاننے ہی کی وجہ سے یہ سمجھے کہ الی یوم الدین میں غایت حقیقہ ہے پس شیطان قیامت تک تو مردود رہے گا بس قیامت میں مرحوم ہو جائے گا نعوذ باللہ بالکل غلط بلکہ عجب نہیں کفر ہو یہ اعتقاد اس واسطے کہ شیطان کے مردودِ ابدی ہونے پر سب کا اجماع بھی ہے اور منصوص بھی ہے اس آیت میں کمثل الشیطان اذ قال للانسان اکفر فلما کفر قال انی بریٔ منك انی اخاف اللہ رب العالمین فکان عاقبتهما انهما فی النار خالدین فیها و ذلك جزاء الظالمین۔ بہر حال یہ ابدیت کبھی ختم نہ ہوگی۔ اور لن ترانی میں اس کا عکس ہے کہ لفظاً ابدیت کا ہے مگر مراد مدت محدودہ ہے سو بعض کو اس میں غلط فہمی ہوئی اور اسی غلط فہمی کی وجہ سے معتزلہ اس کے قائل ہوگئے کہ یہاں تابید دائمی مراد ہے۔ آخرت میں بھی رویت نہ ہوگی۔ مگر یہ غلط ہے۔ یہی عقیدہ متواتر المعنی ہے کہ آخرت میں رویت باری تعالیٰ ہوگی اور وہ جب عوام مؤمنین کو بھی ہوگی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان تو بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔

ان کو کیوں نہ ہوگی۔ اسی واسطے یہاں لن ترانی محمول ہے تابید محدود پر نہ کہ تابید دائم پر بہرحال میں نے اس شخص سے کہا کہ یہاں دنیا میں رویت شرعاً محال ہے۔ کہنے لگا میں جانتا ہوں اور یہ میرا عقیدہ ہے مگر کیا کروں شوق ایسا ہے کہ میں اس تمنا سے باز نہیں آسکتا۔ میں تو طلب کروں ہی گا چاہے کامیابی نہ ہو۔ چنانچہ اس کی کیفیت یہ تھی کہ بے انتہا سوزش اور درد اور کرب میں مبتلا تھا رات بھر اس قدر بے چین رہتا تھا کہ کچھ نہ پوچھئے۔ جانے کتنا زمانہ اسی حالت میں گذر چکا تھا۔ اس کے پاس بیٹھنے سے ایک درد اور سوزش سی محسوس ہوتی تھی۔ پہلے وہ ہندو تھا۔ کبھی کہتا تھا کہ میں مذہب بھی اسی تمنا میں بدل چکا ہوں۔ چنانچہ اسلام کے قبل بھی اسی طلب میں تھا یعنی ہندو ہونے کی حالت میں بھی کہنے لگا میں بڑے بڑے رشیوں جوگیوں اور منیوں سے ملا لیکن سب نے جواب دیدیا کہ یہاں تو یہی مالا جپنا ہے۔ بھائی ہم تمھیں خدا کا نور نہیں دکھا سکتے۔ البتہ ایک نے وعدہ کیا کہ پرمیشر کی جوت ہم تمھیں دکھائیں گے۔ پھر اس نے کیا کیا کہ مغرب اور عشاء کے درمیان مجھے جھونپڑی کے اندر لیجاکر باہر کی طرف اشارہ کیا دور ایک روشنی نظر آئی جو چل رہی تھی اور آہستہ آہستہ آگے کو اچھلتی ہوئی سرک رہی تھی۔ اس نے کہا دیکھو یہ ہے جوت پرمیشر کی۔ میں اس کی طرف دوڑا تو اس نے جھٹ میرا ہاتھ پکڑ لیا کہ ہاں ہاں یہ کیا کرتا ہے ارے یہ پرمیشر کی جوت ہے جل جاوے گا۔ وہ جوت ایسی تھوڑا ہی ہے کہ اس کی کوئی تاب لا سکے۔ میں نے کہا میں تو مرنے ہی کو پھر رہا ہوں۔ اگر پرمیشر کی جوت میں جل کر مر جاؤں تو اس سے بڑھ کر کیا ہے۔ یہ تو میری عین تمنا ہے۔ غرض وہ بوڑھا تھا میں جوان۔ ہاتھ چھوڑا کر دوڑتا ہوا جو اس روشنی کے پاس پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کچھوا ہے اس کے سر پر بہت سی مٹی جمی ہوئی ہے اور اس مٹی پر ایک چراغ رکھا ہوا ہے جس میں موٹی سی بتی پڑی ہوئی ہے۔ کہتا تھا کہ اول تو میں اس روشنی کو دیکھتے ہی دھوکہ میں آگیا کہ ہو گا نور اللہ میاں کا۔ جب میں نے اس روشنی کو اچھلتے ہوئے دیکھا تو اس پر مجھے شبہ ہوا۔ واقعی عقل بھی بڑی نعمت ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ نور اچھلتا کیوں ہے۔ آدمی بھی جو شریف ہوتا ہے اس میں بھی وقار ہوتا ہے۔ اچھلتا کودتا نہیں۔

(باقی ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ)

یہ تو پرمیشر ہے یہ اُچھلتا کودتا بچوں کی طرح کیوں چلتا ہے اس سے مجھے شبہ ہوا اس لئے میں بھاگا کہ آخر دیکھوں تو کیا ماجرا ہے۔ اُس نے مجھے پکڑا بھی مگر میں ہاتھ چھوڑا کر بھاگ ہی گیا۔ لوٹ کر اُسے کہا واہ باوا جی اچھا پرمیشر دکھایا۔ وہ ہنسنے لگا کہ بچہ میرے پاس تو یہی ہے کہ جھونپڑی میں رہ اور بس پڑا موج کیا کر۔ یہاں تو بیٹھے پوری کچوری اور بالائی اور مٹھائی لیے جاؤ۔ بس بیٹھو اور پجو۔ لیکن ان کو بھلا ان چیزوں کی کب ہوس تھی یہاں تو طلب ہی اور تھی اور یہ خود بڑا شخص تھا مشہور جوگی تھا ریاضت مجاہدے بہت کیا کرتا تھا۔ اسی دوران میں خدا کے نور کی طلب دل میں پیدا ہو گئی۔ اس لئے کہا کہ باوا جی یہ چیزیں مجھے درکار نہیں مجھے تو خود یہ سب حاصل تھا اب میں نے اس کو جو چھوڑا ہے تو اسی طلب کے اندر کہ کسی طرح خدا کو دیکھ لوں۔ اسی طلب کے اندر یہ نیازمندی اختیار کی ہے۔ مگر صاحبو طلب عجیب چیز ہے واقعی اگر اس نے خدا کو نہیں دیکھا تو اس طلب کا نتیجہ اتنا تو ہوا کہ اس وقت خدا کے دیکھنے کے قابل تو ہو گیا۔ یعنی مسلمان تو بنا۔ ہائے ؎

کششے کہ عشق دارد نہ گذاردت بدینسان
بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد

(وہ کشش جو عشق اپنے اندر رکھتا ہے اس کی خاصیت یہ ہے کہ محبوب اگر جنازہ پر نہ آوے گا تو مزار پر ضرور آوے گا)

طلب تو وہ چیز ہے کہ مطلوب کو دروازہ پر حاضر کر دیتی ہے۔ پھر طالب کو مطلوب کے دروازہ پر حاضر کر دینا تو کچھ بھی مشکل نہیں۔ یہ وہ مضمون ہے جس سے حضرت صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے ایک اعتراض کا جواب دیا تھا کیونکہ۔ اس طرح کہ معراج شریف کے قصہ میں کفار حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور انہیں اطلاع دی کہ تم نے سنا بھی تمہارے دوست نے ایک اور بھی

دعویٰ منکر کیا ہے کہ مجھے آسمان پر بلایا گیا تھا مجھے معراج ہوئی ہے۔ میں سب آسمانوں بلکہ عرش تک کی سیر کر آیا ہوں۔ تم نے سُنا بھی یہ ایک اور نئی بات ہوئی ہے۔ اب تک تو صرف نبوت ہی کا دعویٰ تھا۔ یہ اس سے بھی بڑھ کر ہوئی آپ نے فرمایا بڑھ کر تو نہیں ہے بلکہ گھٹ کر ہے۔ جب میں اس کی تصدیق کر چکا ہوں کہ آسمان والے یعنی فرشتے ان کے پاس آتے ہیں تو اگر یہ آسمان والوں کے پاس پہنچا دیئے گئے تو عجب ہی کیا ہے۔ جس کے یہاں بادشاہ آتا ہو اگر اس کو دربار میں بلالے تو واللہ کچھ بھی حیرت کی بات نہیں۔ میں جب جبریل (علیہ السلام) کی نسبت جو کہ سدرۃ المنتہیٰ کے بسنے والے ہیں اور عرش جن کا نشیمن یہ تصدیق کر چکا ہوں کہ وہ خود محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دروازہ پر حاضر ہوتے ہیں تو اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جبریل (علیہ السلام) کے نشیمن پر تشریف لیجانیکا دعویٰ فرمائیں تو کیا میں ان کی تکذیب کر دوں گا۔ تم لوگ بے وقوف ہو کہ ایسی موٹی بات میں مجھ کو دھوکہ دینے آئے ہو۔ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہتے ہیں تو مجھے ایمان لانے اور انھیں سچا سمجھنے میں کوئی تامل نہیں ہوسکتا۔ یہ وہ جواب ہے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے کفار کے مقابلہ میں پیش کیا تھا۔ غرض عشق میں یہاں تک خاصیت ہے کہ ؎

کشتے کہ عشق دارد نہ گذاردت بدینسان
بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد (اوپر ترجمہ ہے)

اس پر ایک لطیف نکتہ بعض اہلِ لطائف نے کہا ہے بعضے نکتے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ علوم تو نہیں ہوتے محض نکتے دل خوش کُن ہوتے ہیں لیکن اگر متایّد ہوں نصوص سے تو ان میں بھی ایک علم کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ دعویٰ تو نہیں کیا جاتا احتمال کا درجہ ہے۔ ایک محمل ہے یہ بھی جو حدیث میں ہے کہ جب مومن دفن کر دیا جاتا ہے تو اس کے پاس فرشتے آکر تین سوال کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی سوال ہوتا ہے ما تقول فی ھذا الرجل

یعنی یہ کون بزرگ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں جو ہمارے پیغمبر ہیں۔ جو ہماری ہدایت کے لئے حق کے یہاں سے بینات لائے اور آیات لائے۔ یہ ہے مضمون حدیث کا۔ یہاں یہ سوال کیا گیا ہے ہذا محسوس باشارۂ حسیہ کے لئے ہے۔ وہاں قبر میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کہاں ہوں گے جو ہذا سے پوچھا جاوے گا۔ جمہور نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ ہر مومن کے ذہن میں اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم حاضر ہوں گے علم ضروری کے طور پر حق تعالیٰ کی تائید سے اس کی یہ صورت ہوگی کہ مومن کے قلب میں اس وقت علم ضروری کے طور پر یہ ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت پوچھ رہے ہیں یہ جواب بالکل کافی ہے۔ لیکن بعض اہل لطائف اس طرف بھی گئے ہیں۔ یہ تھا تو احتمال کے درجہ میں مگر عشاق نے محقق کرلیا ہے شوق میں۔ اس کا دعویٰ تو نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں تمنا اور شوق کے درجہ میں کیا حرج ہے اگر اس امید سے متلذذ ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ کیوں نہ کہدیا جاوے کہ اس کے اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان میں جتنے حجاب ہیں وہ سب اٹھا دیئے جاویں گے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ نما ہوں گے۔ اب چونکہ یہ شخص مشرف بالزیارت ہے اور پہچانتا ہے کہ یہ آپ ہیں۔ اس لئے فرشتوں کے سوال کا جواب آسانی کے ساتھ دے رہا ہے۔ اور یہ رفع حجاب جو ہے اس میں بھی دو احتمال ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جگہ پر رہیں، یہ اپنی جگہ پر رہے اور درمیان کے حجاب اٹھیں۔ اور ایک یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کرم فرمائیں بعض عشاق شدتِ شوق میں اس طرف چلے گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود مومن کی قبر میں تشریف لائیں گے۔ بعضے عشاق نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر موت کی تمنا اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے شوق میں کرے تو جائز ہے کچھ حرج نہیں۔ شوقًا الی القاء اللہ تو تمنا موت کی جائز ہے ہی شوقًا الی القاء رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی تمنا موت کی جائز ہے۔

استاذی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت زندہ دل تھے۔ اُن پر شوق کی حالت غالب تھی۔ صاحب حال بزرگ تھے۔ اس حدیث کے متعلق کسی طالب علم نے سوال کیا تھا کہ قبر میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت مشہور ہے اس کی کیا اصل ہے یہ سن کر مولانا پر حالت طاری ہو گئی۔ اور یہ شعر پڑھا ؎

کشتۂ کہ عشق دارد نگذاردت بدینسان
بہ جنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد (ترجمہ اوپر ہو چکا ہے)

اور فرمایا کہ مقتضیٰ تو اس تعلق کا جو ہم کو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر اتنی طویل ہوتی کہ آپ ہر امتی کے جنازہ پر خود تشریف لاکر نماز جنازہ پڑھتے مگر خدا کی حکمتیں ہیں آپ کی وفات ہی میں مصلحت تھی۔ خیر اگر یہ دولت حاصل نہ ہوسکی تو کیا عشق کی خاصیت خالی جاسکتی ہے۔ اگر جنازہ پر نہیں تو مزار ہی پر لاکر کھڑا کر دیا کہ دیکھ لو یہ وہی محبوب ہیں جن کے شوق اور محبت میں تم نے عمر گنوادی اور اپنے آپ کو فنا کر دیا۔ مگر یہ سب مشتاقین کے نکات ہیں اور ممکن ہے کہ ان کے گمان کے موافق ان کے اس شوق کو پورا بھی کر دیا جائے۔ کیا عجب ہے کہ گو یہ زیارت عام نہ ہو لیکن حق تعالیٰ بعض خاص خاص عشاق کی کشش شوق میں یہ خاصیت محقق کر دیں اور ان کے اس اُمنیہ کو انا عند ظن عبدی بی کی بنا پر پورا کر دیں تو کچھ بعید نہیں ہے۔

بہر حال میں اس کو عرض کر رہا تھا کہ طلب وہ چیز ہے کہ خود مطلوب کو طالب کے دروازہ پر حاضر کر دیتی ہے تو اگر طالب کو مطلوب کے دروازہ پر حاضر کر دے تو کیا تعجب ہے۔ تو اس شخص کی طلب نے اس کو مطلوب کے دروازہ پر تو پہنچا ہی دیا جو اسلام ہے اور جو باب حقیقی ہے رویت باری تعالےٰ کا۔ خیر رویت نہیں ہوئی تو رویت کے قابل تو بنا دیا۔ ہوسناک کے لئے تو کم ہے مگر

طالب صادق اور عاشق کے لیے تو یہی بہت کچھ ہے ؎

مرا از زلف تو موئے بسند ست
ہوس را رہ مدہ بوئے بسند ست

(مجھے آپ کے زلف کی خوشبو کافی ہے اس سے زیادہ کی ہوس مجھے نہیں ہے)

یہ شعر شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر لکھا ہے۔ اللہ اکبر کیا موقع پر لکھتے ہیں۔ انہوں نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بال ایک صحابی لے ترا شے۔ پھر آپ کے حکم سے وہ سب لوگوں کو تقسیم کیے گئے۔ اس حدیث کے نقل کرنے کے بعد شیخ لکھتے ہیں کہ بڑے خوش قسمت تھے وہ لوگ لیکن ہم بھی بدقسمت نہیں۔ خیر اگر بال ہم تک نہیں پہونچے تو ہم کو یہ بھی کم نہیں کہ اس واقعہ کی خبر تو پہونچ گئی۔ اور اس مقام پر اُنہوں نے یہ شعر لکھا ہے ؎

مرا از زلفِ تو موئے بسند ست
ہوس را رہ مدہ بوئے بسند ست (ترجمہ اوپر ہو چکا)

واقعی عاشق صادق کی یہی شان ہے کہ جس کو ہر چیز میں چاہے کسی درجہ کی ہو اپنے محبوب ہی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ کہتے ہیں نا ؎

ہر چہ بینم در جہاں غیر تو نیست
یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

(جو کچھ جہان میں دیکھتا ہوں یا تو ہے یا تیری خوشبو ہے ...)

ہر درجہ پر قانع ہیں اس واسطے کہ محبوب سے کچھ تو تعلق ہے ؎

ہر چہ بینم در جہاں غیر تو نیست یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

(اوپر ترجمہ ہو چکا)

تو غرض شیخ کہتے ہیں کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بال ہم تک نہیں پہونچے تو خیر یہی سہی خبر تو پہونچی۔ ؏ بلا بودے اگر ایں ہم نہ بودے + یعنی اگر محبوب کی

حکایتیں بھی ہم تک نہ پہونچتیں تو کیا ہوتا۔ پھر کونسی تسلی تھی عاشق کے لئے اس سے زیادہ اگر ہو جائے عنایت ہے ورنہ ہمارا حق تو اتنا بھی نہیں۔ یہ نہایت تواضع کی بات ہے۔ عاشق صادق کو عبدیت لازم ہے اور عبدیت کا خاصہ ہے کہ بلند پروازی نہیں رہتی۔ جو کچھ بھی عطا ہو جائے اپنی حیثیت سے زیادہ سمجھتا ہے وہ بزبانِ حال یا بزبان قال یہ کہتا ہے ؎

عطا حق محبت عنایتے ست زدوست
وگرنہ عاشق مسکین بہیچ خرسند ست

(ادائے حق محبت بھی حق تعالیٰ کی عطا اور توفیق سے ہے وگرنہ عاشق مسکین
کس بات سے خوش ہے یعنی اسی توفیق سے)

عاشق مسکین کو تھوڑا سا بھی مل جائے تو وہ اس میں بھی راضی ہے۔ اور یہ مشرب الحمدللہ ہم نے اپنی آنکھوں سے ایک زندہ بزرگ کا دیکھ لیا ورنہ کتابوں ہی میں پڑھے ہوتے تو یہ سمجھتے کہ لوگوں کی لطافتیں ہیں ذہانتیں ہیں توجیہیں ہیں اپنے بزرگ کے اقوال کی۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دیکھنے کے بعد اب کوئی شک نہیں رہا۔ حضرت کا بھی بالکل یہی مشرب تھا۔

ع وگرنہ عاشق مسکین بہیچ خرسند ست

میں کہتا ہوں جس کا نام عبدیت ہے۔ بڑی مشکل ہے۔ سب کمالات کا حصول آسان ہے عبدیت ہی کا حاصل کرنا مشکل ہے۔ حضرت میں بفضلہ عبدیت کامل عطا فرمائی گئی تھی۔ گویا عبدیت اس زمانہ میں حضرت ہی کا حصہ ہے۔ ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ حضرت کوئی ایسی ترکیب ارشاد فرمائیں کہ جس سے زیارت جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حاصل ہو جائے۔ فرمایا آہا آپ کا بڑا حوصلہ ہے کہ آپ کا ذہن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت تک پہنچتا ہے۔ آپ کی نظر بہت دور پہونچی واللہ ہم تو اپنے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گنبد شریف کی زیارت کے قابل بھی نہیں سمجھتے۔ اگر وہی نصیب ہو جائے تو بسا غنیمت ہے۔ اس سے آگے تو

ہمارا ذہن بھی نہیں جاتا آپ بڑے لوگ ہیں کہ آپ کو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی تمنا ہے۔ اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے عبدیت کا اور یہی ہے وہ حالت جس کو حضرت حافظ فرماتے ہیں ؎

بخدا کہ رشکم آید ز دو چشم روشن خود
کہ نظر دریغ باشد بہ چنیں لطیف روئے

(بخدا مجھے تو اپنی دونوں آنکھوں پر رشک آتا ہے اور دل رکتا ہے کہ ان نظروں سے محبوب کو دیکھوں)

قسم کھاتے ہیں کہ میرا جی اس سے بھی جھجکتا ہے اور رکتا ہے کہ محبوب کو ان نظروں سے دیکھوں۔ دیکھئے عاشق اس سے بھی جھجکتا ہے کہ محبوب کو آنکھ اٹھا کر دیکھے اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ تو بے عقلوں کا مذاق ہے۔ صحابہ سے زیادہ تو کوئی عقلمند نہ تھا۔ ایک صحابی سے کسی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک پوچھا تو آپ کہتے ہیں کہ ارے یہاں دیکھا تھا کس نے نظر بھر کر جو بیان کر دوں بیٹھ کر کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حلیہ تھا۔ ہمت ہی نظر بھر کر دیکھنے کی کبھی نہ ہوئی۔ ایک کافر رئیس کی شہادت جو حدیبیہ میں صحابہ کی حالت دیکھ کر اپنی قوم کے پاس گیا تھا انھوں نے پوچھا کہ کیا حالت ہے اصحاب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی۔ اس نے بہت سے واقعے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ادب و عظمت۔ بیان کر کے مختصراً یہ حالت بیان کر دی کہ لا یحدون النظر الیہ یعنی گھور کر نہیں دیکھ سکتے۔ اور گھورنا کسے کہتے ہیں نظر بھر کر دیکھنے کو۔ غرض کسی کی ہمت نہیں تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر بھر کر دیکھ لے۔ بس یہ حالت تھی صحابہ کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عموماً صحابہ نظر بھر کر نہیں دیکھتے تھے اور یہ تو ہمت کس کی ہوسکتی تھی کہ نظر سے نظر ملا کر دیکھے۔ تو عشاق کی شان یہ ہوا کرتی ہے کہ تھوڑے سے پر بھی راضی ہو جاتے ہیں۔ وہی شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ کا مذاق ؎

مرا از زلف تو موئے بسند است   ہوس را رہ مدہ بوئے بسند است

ترجمہ (مجھے تو آپ کے زلف کی خوشبو کافی ہے اس سے زیادہ کی ہوس ہونی چاہیئے) تو میں کہتا ہوں کہ رویت کی قابلیت ہی عطا ہو جائے۔ گو فی الحال رویت حاصل نہیں لیکن وعدہ تو ہے گو ادھار ہی سہی۔ وہ بھی کافی ہے۔ ایک عاشق کہتا ہے

شعر

اگرچہ دور افتادم بدیں امید خرسندم
کہ شاید دستِ من بارِ دگر جانانِ من گیرد

(اگرچہ دور پڑا ہوں لیکن اس امید پہ خوش ہوں کہ شاید ہمارا محبوب حقیقی از راہِ کرم ہمارا ہاتھ دوسری بار پکڑ کر اپنی بارگاہ کی طرف جذب فرمالے)

امید بھی صرف اتنی کہ شاید ایسا ہو جائے۔ اور واقعی خُرسندی امید پر بھی ہوتی ہے دلو کان توهمًا. یہاں تک کہ اشعب طماع کی حکایت ہے۔ یہ معمولی شخص نہیں ہیں بڑے معتبر علماء میں سے گذرے ہیں مگر بیچارے مجبور تھے طمع کے ہاتھوں ان کی طمع کی بہت سی حکایتیں مشہور ہیں۔ چنانچہ ایک بار انھیں بہت سے لڑکے چھیڑ چھاڑ رہے تھے۔ جو آدمی کسی بات میں مشہور ہو جاتا ہے قاعدہ ہے کہ اُسے لوگ چڑایا کرتے ہیں۔ انہوں نے لونڈوں سے کہا کہ میاں فلانی جگہ کھانا بٹ رہا ہے۔ یونہی جھوٹ موٹ کہہ دیا۔ اپنا پیچھا چھڑایا۔ لونڈے دوڑ کر اس طرف کو جھپٹے انہیں دوڑے ہوئے جاتا دیکھ کر آپ کیا دل میں کہتے ہیں کہ اجی شاید بٹ ہی رہا ہو۔ اور خود بھی پیچھے پیچھے دوڑنے لگے۔ حضرت کو طمع کے غلبہ میں یہ یاد نہ رہا کہ میں نے ہی تو ان کو بھگایا تھا۔ اور حضرت ہم ان پر تو ہنستے ہیں لیکن ہم سب مبتلا ہیں ایسے ہی عدم تدبر میں۔ ان کی طمع تو سب کو معلوم تھی ہمارا عدم تدبر کسی کو معلوم نہیں۔ ہمارے دھوکہ کا کسی کو پتہ نہیں۔ وہ کیا عدم تدبر ہے اور ہم کیونکر دھوکہ میں آجاتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ہم اول تو لوگوں کو اپنے جھوٹے حالات اور وضع سے اپنا معتقد بناتے ہیں۔ جب لوگ معتقد ہو جاتے ہیں تو اب ان کے اعتقاد سے خود ہی استدلال کرتے ہیں کہ ہم کچھ تو ضرور ہوں گے تو جب تو لوگ اتنے معتقد ہیں

ہمارے۔ اگر ہم کچھ نہ ہوتے تو کیا سارے کے سارے بیوقوف ہی ہیں۔ اگر ہم واقع میں کچھ نہ ہوتے تو اتنے سارے لوگ ہمارے کیوں معتقد ہوجاتے معلوم ہوتا ہے ہم ضرور کچھ ہوگئے ہیں۔ اور یہ خبر نہیں احمق الناس کو ہمیں نے تو دھوکہ دے کر لوگوں کو اپنا معتقد بنایا ہے اگر ہم کوئی ترکیب نہ کرتے اور پھر بھی لوگوں کا ہمارے ساتھ اعتقاد ہوتا اس میں تو احتمال بھی ہوسکتا تھا لیکن یہاں ہمیں نے تو ترکیبیں کر کر کے لوگوں کو غلطیوں میں اور تلبیس میں ڈالا ہمیں نے تو سارا کارخانہ اور منصوبہ گانٹھا کہ کسی طرح لوگوں کو اپنا معتقد بنانا چاہیئے اور جب لوگ معتقد ہوگئے تو اب ہم اس منصوبہ کو بھول گئے اور اب خود ہمارا بنا اعتقاد ان کا اعتقاد ہے۔ ہم ان کے اعتقاد پر بنا کرتے ہیں اپنے اعتقاد کی۔ تو گویا ہمارا اعتقاد ہماری ہی تلبیس پر مبنی ہے گویا ہم اپنی ہی تلبیس سے اپنے معتقد ہیں تو ہم اشعب طماع پر کیا ہنستے ہیں ہم خود ایسی ہی بیہودگیوں میں مبتلا ہیں۔ یہ تو محض تفریح اور تتمیم فائدہ کے لئے عرض کیا گیا باقی میرا اصل مقصود اس حکایت کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ طلب اور محبت وہ چیز ہے کہ امید موہوم پر بھی طالب مسرور رہتا ہے۔ اسی واسطے کہا گیا ہے ؎

اگرچہ دور افتادم بدیں امید خرسندم
کہ شاید دست من بار دگر جانان من گیرد (ترجمہ صـ۲۳۲ پر ہو چکا)

تو غرض یہ مذاق ہے عاشق کا کہ تھوڑا سا بھی اگر مل جاوے تب بھی اُسے کافی ہے کہتے ہیں نا۔ ع ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے۔ کہیں یہ سُنا تھا کہ ہمارا ذکر محبوب کی محفل میں ہو رہا تھا تو بس اسی پر خوش ہو گئے کہ خیر اگر ہم اس محفل میں نہیں تھے تو ہمارا ذکر تو تھا۔ بس اسی پر بیچارہ خوش ہے کہ میرا ذکر تو اس محفل میں ہے۔ مشہور ہے نا کہ ایک دیہاتی عورت اپنے شوہر پر عاشق تھی لیکن وہ اس کی طرف التفات ہی نہ کرتا تھا۔ ایک دفعہ شوہر گاجریں کھا رہا تھا پنیدی کاٹ کاٹ کر پھینکتا جاتا تھا کھاتے کھاتے آپ کو جوش

ہوا تو بیوی کے پینڈی کھینچکر ماری منہ پر زور سے۔ اور وہ اس کی آنکھ پر جا کر لگی۔ اب آنکھ بند بھی اور آنکھ میں درد بھی لیکن اسی حالت میں اُس نے ڈومنی یا نائن کو بلایا اور اپنے باپ کے گھر یہ کہلا کر بھیجا کہ کھائی تھی گاجر ماری تھی پینڈی اماں سے کہیو کہ کچھ کچھ سہاگ بہوڑنے لگا ہے۔ اب آ گئے ہیں بھلے دن۔ چھیڑ چھاڑ تو شروع ہو گئی ہے۔ میرے گاجر کی پینڈی تو ماری اگر نہ مارتے تو میں کیا کر لیتی۔ تو یہ کیا ہے۔ عشق ہے تو محبوب کے دربار میں اپنا بڑا درجہ ہرگز نہ چاہے گا اور عاشق کو تو شرم آتی ہے۔ درجے مانگتے ہوئے۔ کیونکہ وہ اپنی حقیقت خوب جانتا ہے کہ میں ہوں کیا۔ اس واسطے میں کہتا ہوں کہ یہ بھی ایک گونہ رویت ہی ہے کہ رویت کی قابلیت ہو جائے۔ اگر حقیقی رویت نہیں ہے تو حکمی تو ضرور ہے تو اس نومسلم نے اپنا قصہ شوق رویت اور اسی شوق میں اسلام لانے کا جو مجھ سے بیان کیا تو مجھے شبہ ہوا کہ جب اس کی طلب کسی جگہ پوری نہ ہوگی تو عجب نہیں کہ یہ اسلام کو چھوڑ کر عیسائی ہو جائے۔ کہیں کوئی پادری صاحب کہنے لگے کہ میں دکھلا دوں گا تمہیں خدا کا نور پھر وہ بھی کوئی دھوکہ دے۔ اور سائنس والوں کا دھوکہ شاید سمجھ میں بھی نہ آوے۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ بھائی تمہارا کیا اعتبار۔ مجھے قوی شبہ ہوا ہے کہ کہیں تم اسلام ترک نہ کر دو کیونکہ تمہارا مقصود تو یہ ہے کہ میں خدا کو دیکھ لوں۔ جب تمہیں خدا یہاں نہ دکھائی دے گا تو پھر اسلام کو بھی چھوڑ سکتے ہو۔ جیسے کہ ہندوؤں کے مذہب کو چھوڑ اسی تمنا میں مسلمان ہو گئے ہو۔ کہنے لگا جی نہیں۔ اب اسلام کو نہیں چھوڑوں گا چاہے کامیاب ہوں یا نہ ہوں۔ بالکل گنوار اور لٹھ تھا لیکن اس لے ایسے علوم و معارف بیان کئے کہ میں دنگ رہ گیا۔ چنانچہ جب میں نے کہا کہ ہمیں کیسے اطمینان ہو کہ تم اسلام نہ چھوڑو گے۔ اس نے کہا کہ اسلام میں میں نے ایک ایسی خاصیت پائی ہے کہ نہ کسی مذاہب میں تھی نہ ہو۔ میں نے پوچھا کہ وہ کونسی خاصیت ہے۔ کہا اس مذہب میں توحید ایسی کامل ہے کہ کسی مذہب میں نہیں مجھے بڑی حیرت

ہوئی کہ یہ ابھی کیا جانے کہ توحید کیا چیز ہے۔ میں نے پوچھا مثلاً۔ کہا دیکھئے یہ کیا توحید نہیں ہے کہ ایک شخص بھنگی ہے یا چمار ہے۔ وہ مسلمان ہوگیا تو آج تمام مسلمان اس کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں اور اس کو اپنے ساتھ بٹھلا کر کھلاتے ہیں ورنہ ساری قومیں ایسے شخص کو اپنے سے گھٹا ہوا اور ذلیل سمجھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ شادی بیاہ نہ کریں یہ تو اپنی اپنی مصلحت ہے باقی حقیر کوئی نہیں سمجھتا۔ یہ توحید ہی کا اثر ہے کیا اچھی بات کہی اور استدلال بھی کیسے کھلے ہوئے واقعہ سے کیا۔ اللہ کے بندے اب بھی ایسے موجود ہیں جو مساوات کرتے ہیں اگر طوعاً نہیں تو کرہاً ہی۔ ایک حکایت اپنی کرہاً کی اور ایک حکایت دوسرے کی طوعاً کی سناتا ہوں۔ مجھے تو یہ حکایت پیش آئی کہ میں ایک دفعہ کالپی گیا۔ وہاں ایک شخص تھا نہایت صاف ستھرا اجلے کپڑے پہنے ہوئے جامع مسجد میں نماز کو آیا اس کے گانوں والوں سے معلوم ہوا کہ یہ پہلے بھنگی تھا۔ اب مسلمان ہوگیا ہے لیکن وہاں کے چودھری ساتھ کھلانا پلانا تو درکنار اس کے ہاتھ کا برتن بھی نہیں لیتے تھے۔ وہاں جلسہ تھا اس میں وہ بھی موجود تھا اور وہاں کے رئیس بھی جمع تھے۔ بعض لوگوں نے مجھ سے خواہش کی کہ میں اس موقع پر ان لوگوں کو سمجھا دوں کہ ایسا پرہیز نہ کیا کریں۔ اس کی سخت دل شکنی ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ نرے سمجھانے سے کچھ کام نہ نکلے گا سمجھانے سے تو اس وقت ہاں ہاں کہدیں گے پھر بعد کو کون پروا کرتا ہے۔ میں نے کہا ایک بدھنے میں پانی منگاؤ۔ جب پانی آگیا تو میں نے اس نومسلم سے کہا کہ پیو لوٹنی سے منہ لگا کر۔ اس نے پیا۔ پھر بدھنا اس کے ہاتھ سے لیکر میں نے بھی لوٹنی ہی سے منہ لگا کر اس کے بچے ہوئے پانی میں سے پیا۔ پھر میں نے سب سے کہا کہ پیو۔ حضرت سوا مان لینے کے کسی سے کوئی عذر نہ بن پڑا۔ سب نے جیسے تیسے پیا۔ پھر میں نے کہا کہ دیکھو بھائی اب اس سے پرہیز نہ کرنا۔ کہنے لگے اجی بس اب منہ ہی کیا رہا پرہیز کرنے کا تم نے ترکیب ہی ایسی کی کہ ہمارا سارا دھرم ہی لے لیا۔ اب اطمینان رکھو۔ اب ہم اسے اپنے

ساتھ کھلائیں پلائیں گے۔ اس سے پرہیز ہی کیا رہ گیا جب اس کا جھوٹا پانی ہی تم نے پلوا دیا۔ خیر سب کو بڑی خوشی ہوئی لیکن پیتے وقت جھجکتے سب تھے لیکن چونکہ میں خود پی چکا تھا اس لئے کسی کی ہمت نہ پڑی کہ انکار کر دے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میں بھی۔ یاد ہے مجھے۔ پی تو گیا لیکن اندر سے جی رُکتا تھا۔ اللہ معاف کرے اور کچھ اسی کے ساتھ نہیں بلکہ کسی کا جھوٹا پانی یا جھوٹا کھانا ہو مجھ سے نہیں کھایا پیا جاتا۔ سخت رکاوٹ ہوتی ہے۔ اگر کبر اس کا سبب ہے تو اللہ معاف کرے اور اگر ضعف طبیعت ہے تو معذوری ہے یا کوئی معتقد یہ کہہ لے کہ لطافت و نظافت ہے نفس کی شرارت تو دیکھئے خود ہی ایک خوبصورت عنوان بھی بتلا دیا۔ کسی بزرگ کے سامنے کا بچا ہوا بھی مجھ سے نہیں کھایا پیا جاتا۔ میں کیا کروں طبیعت متلاتی ہے۔ اسی لئے میں خود جو کھاتا ہوں تو بالالتزام اس طرح کھاتا ہوں کہ دیکھنے والے کبھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ کسی کے سامنے کا کھایا ہوا ہے بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بس اتنا ہی نکالا گیا ہے۔ اس قدر صاف کر کر کے اور ترتیب کیساتھ کھاتا ہوں کہ کسی کو دیکھ کر نفرت نہیں ہو سکتی۔ میں اور بھی لوگوں کو کھاتے ہوئے دیکھتا ہوں کہ چاروں طرف آلودہ کر دیتے ہیں۔ جس کو دیکھ کر گھن آنے لگتی ہے۔ اور پانی میں یہ وہم ہوتا ہے کہ یہاں منہ لگا ہوگا یہاں تھوک لگا ہوگا۔ بس مجھ سے تو کسی کا نہ جھوٹا پانی پیا جائے نہ جھوٹا کھانا کھایا جائے۔ ہاں کسی کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لینے سے نفرت نہیں ہوتی اب میں اپنی اس طبیعت کو کیسے بدل دوں میں نے تو کبھی بزرگوں کا بھی جھوٹا کھانا نہیں کھایا نہ کبھی جھوٹا پانی پیا الا نادراً مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ نے اُن حضرات کی برکت سے محروم نہیں رکھا۔ ان کے یہاں سچی چیزیں ہی اتنی تھیں کہ ان کی برکت ہی کافی ہوگئی جھوٹی چیزوں کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ بس سچی ہی چیزیں حصولِ برکت کے لئے کافی تھیں۔ خیر یہ تو نکتۂ شاعرانہ ہے۔ شاعروں کی خاطر سے بیان کر دیا ہے ورنہ دراصل بزرگوں کے یہاں کوئی چیز ایسی نہیں جس کو جھوٹا کہہ سکیں اور جس کو جھوٹا کہتے ہیں وہ بھی سچی ہی چیز ہے۔

اس میں بھی سچ مچ برکت ہے۔ تو غرض یہ حکایت تو کرہاً کی تھی جو مجھ کو پیش آئی اور اس پر بھی حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ گو طبعاً کراہت ہوئی مگر الحمدللہ عقلاً اس کو نہایت خوشی کے ساتھ گوارا کیا۔ یہ بھی حق تعالیٰ ہی کی توفیق تھی۔ اب دوسری حکایت طوعاً کی عرض کرتا ہوں۔

مولوی جمال الدین صاحب بھوپال میں مدار المہام تھے گویا وزیر ریاست تھے۔ وزارت اس وقت تو ضابطہ ہی کی رہ گئی ہے۔ اُس زمانہ میں تو واقعی سلطنت تھی کیونکہ پہلے اتنے ضابطے نہ تھے۔ اور پھر خود ایک بڑی رئیسہ نے اُن سے نکاح بھی کرلیا تھا۔ غرض ان کا بہت بڑا مرتبہ تھا۔ مگر تھے بڑے حق پرست یہاں تک کہ وہ رئیسہ بوجہ انتظاماتِ ریاست کے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ ایک دفعہ مسجد میں نماز پڑھنے گئے مولوی جمال الدین عالم تو تھے ہی نماز پڑھانے کے لئے لوگوں نے آگے کھڑا کردیا۔ اتفاق سے ایک ولائتی مولوی صاحب بھی موجود تھے انھوں نے ہاتھ پکڑ کر پیچھے ہٹا دیا کہ تم نماز نہیں پڑھا سکتے۔ تم اس قابل نہیں۔ اور کوئی پڑھائے۔ مگر مجال کس کی تھی کہ وزیر صاحب کے سامنے اور کوئی پڑھانے کیلئے بڑھے بالخصوص ایسے موقع پر جب کوئی نہ بڑھا تو وہ آپ خود جاکر مصلے پر کھڑے ہوگئے کہ ہم پڑھائیں گے اور یہ کہا کہ تمھاری بیوی پردہ نہیں کرتی۔ اور تم اس کو گوارا کرتے ہو۔ لہٰذا تم دیّوث ہو اور دیّوث کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے یہ فقہ کا مسئلہ ہے۔ یہ کہا اور اللہ اکبر۔ وزیر صاحب جماعت میں شریک رہے۔ نماز پڑھ کر بھی کچھ نہیں بولے بلکہ وہیں سے سیدھے پہونچے رئیسہ کے پاس۔ وہ اس وقت اجلاس میں تھیں۔ آپ نے بے دھڑک سب کے سامنے علی الاعلان اس کو مخاطب کرکے کہا کہ تمہارے پردہ نہ کرنے کی وجہ سے میں بدنام ہوا۔ لوگ مجھے دیوث کہتے ہیں اور میرے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تم نے مجھے بھی ذلیل کیا۔ یا تو وعدہ کرو کہ میں پردہ میں بیٹھوں گی نہیں تو تین طلاق۔ حق پرستی اور ہمت تو دیکھئے برسرِ اجلاس یہ کہدیا۔ گویا سارا ملک ہاتھ سے دے دینا گوارا کرلیا

مگر اول تو حکومت پھر بڑھیا۔ تو مولوی جمال الدین ایسے حق پرست تھے۔ ایک بار ان کے یہاں کوئی تقریب تھی یا جلسہ تھا۔ جس میں کھانا کھلایا جا رہا تھا۔ باوجود اتنے اقتدار کے ان میں تواضع اس درجہ تھی کہ کھانا خود رکھ رہے تھے۔ اسی دوران میں ایک بھنگی آیا اس نے کہا میاں سلام میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں مجھے مسلمان کر لو۔ مدار المہام صاحب نے سب کام چھوڑ چھاڑ اسے بٹھلا لیا اور مسلمان کر لیا پھر خدمت گار سے کہا کہ اسے حمام میں لیجا کر غسل کراؤ اور ہمارا جوڑا پہنا کر یہاں لاؤ۔ حیرت سب کو مگر اسی وقت جوڑا پہنا کر حاضر کر دیا گیا۔ حکم دیا کہ اسے بٹھلاؤ دسترخوان پر بڑے بڑے لوگ تھے۔ بڑے بڑے خان اور بیگ سب ہی پہنچے تھے۔ بس لوگوں کی ناکیں چڑھ گئیں۔ منشی جی نے کہا۔ وہ تھے تو مولوی مگر منشی مشہور تھے۔ کہا آپ صاحبان منقبض نہ ہوں یہ شخص آپ کے ساتھ نہیں کھائے گا اس کے ساتھ میں کھاؤں گا کیونکہ یہ اسی وقت مسلمان ہوا ہے اس وقت اسکی ایسی حالت ہے جیسے ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔ اس وقت اس کے ذمہ ایک بھی گناہ نہیں بالکل صاف اور پاک۔ یہ اس وقت ایسا پاک اور صاف ہے کہ یہاں ایک شخص بھی اتنا پاک صاف نہیں۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر میں کھاؤں گا۔ ہر ایک کو کہاں یہ دولت نصیب ہو سکتی ہے۔ یہ دولت تو میں نے اپنے لئے مخصوص کر رکھی ہے۔ تمھاری قسمت کہاں کہ ایسے شخص کے ساتھ کھانے کا شرف حاصل کر سکو میں تم کو اطمینان دلاتا ہوں کہ میں اسے تمہارے ساتھ کھانے کے لئے نہیں بٹھلاؤں گا میں خود اس کے ساتھ بیٹھ کر کھاؤں گا۔ تم مت گھبراؤ۔ تم الگ کھاؤ۔ میں اپنے برتن میں اس کو شریک کرتا ہوں یہ کہہ کر کھانا منگوایا اور کہا آؤ بھائی ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھاؤ۔ اب وہ جھجکے کہ میں مدار المہام صاحب کے ساتھ بیٹھ کر کیسے کھا لوں۔ مگر انھوں نے زبردستی بٹھلا لیا کہ بھائی تم اب بھنگی کہاں رہے تم تو اب ہمارے بھائی ہو گئے۔ غرض ایک برتن میں دونوں نے کھانا کھایا۔ واللہ حکایت تو یہ بڑی مزیدار ہے مگر ذرا عمل کر کے

دیکھئے کیسی بدمزہ ہے۔ مگر صرف اولاً بدمزہ ہے اور عمل کے بعد تو واللہ وہ حلاوت ہے کہ بیان میں نہیں آسکتی۔ مگر صاحب اولاً تو پورا جہاد اور بڑا سخت مجاہدہ ہے یہ انھیں کا حوصلہ تھا ورنہ ایسے شخص کے ساتھ تو بہت ہی برا برتاؤ کرتے ہیں یہ حالت تکبر کی ہے کہ اسے خطاب بھی کرتے ہیں تو ان الفاظ سے ابے او بھنگی کے ایک عبدالکریم تھا جو ہمارے یہاں مسلمان ہوگیا تھا اس کو لوگ بھنگی کہہ کہہ کے پکارتے تھے۔ بعد مسلمان ہوجانے کے بھی لوگ ایسوں کو بھنگی کا اور چمار کا کہنا نہیں چھوڑتے۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ مگر خیر یہ بھی غنیمت ہے کہ بڑھا دیا۔ بھنگی اور چمار نہ کہدیا۔ بھنگی کا اور چمار کا ہی کہا کیونکہ آخر اس کا باپ تو بھنگی ہی تھا۔ مگر یہ زیادہ خوشی کی بات اس لئے نہیں کہ محاورہ میں یہ اضافت مضاف مضاف الیہ میں تغایر کے لئے نہیں آتی بلکہ تحسین کلام کے لئے بطور زائد کے لائی جاتی ہے جیسے را ہے تو اضافت کے لئے موضوع مگر اکثر تحسین کلام کے لئے زائد بولا جاتا ہے۔ اور یہ کیونکر معلوم ہوا۔ یوں معلوم ہوا کہ یہیں تھانہ بھون میں ایک سید تھے مگر تھے بیچارے غریب انھوں نے اپنے یہاں ایک بہلی کرلی تھی غریب آدمی بیچارے کرایہ پر بسر اوقات کرتے تھے۔ شریف آدمی ذات کے سید مگر اللہ بچاوے مفلسی بھی عجیب چیز ہے سب کچھ کرالیتی ہے وہ کہنے لگے کہ میں ایک گاؤں میں اپنی بہلی کرایہ پر لے گیا۔ وہاں رات کو ٹھہرنا پڑا۔ اول تو سب سے زیادہ ذلیل جگہ مجھے ٹھہرایا۔ مجھے اس قدر پیچ و تاب کہ بس کھاجاؤں کچوں کو مگر کہا کچھ نہیں کیونکہ یہ ظاہر کرتے ہوئے بھی شرم آئی کہ میں سید ہوں۔ بس اندر ہی اندر اونٹ کر رہ گیا۔ اتنے میں مکان والے کے لڑکے نے آواز دی کہ او بہلبان کے۔ بھُس لے لے۔ کہنے لگے کہ میں جلا ہوا تو بیٹھا ہی تھا یہ سن کر بس آگ ہی تو لگ گئی۔ میں نے کہا کہ ابے گدھے یہ تو نے کیا کہا کہ بہلبان کے۔ ارے اگر ہم بہلی چلانے لگے ہیں تو کیا ہمارے باوا بھی بہلبان ہوگئے۔ بھُس لے لے بھُس لے لے۔ جا ہم بھُس نہیں لیتے۔ تیری بھی ایسی تیسی

اور تیرے بھس کی بھی ایسی تیسی۔ کہنے لگے میں نے اسی وقت قسم خدا کی کھالی کہ گھر پہونچتے ہی چھوڑ دوں گا اس کمبخت پیشہ کو۔ چنانچہ آتے ہی بیلی اور بیل بیچ ڈالے۔ تو میر صاحب کا ذہن خواہ مخواہ اس طرف گیا کہ یہاں اضافہ مقصود ہے واقع میں اس لڑکے سے پوچھو اس کا مطلب یہ نہ تھا اہل البیت ادری بما فیہ کے لفظ تو برائے بیت ہی تھا جیسے ایک میاں جی سکندر نامہ پڑھا رہے تھے جب یہ شعر آیا ع بزرگا بزرگی دہا بیکسم۔ تو اس کا مطلب اس طرح بیان کیا بزرگی یہی بزرگا بزرگی یہی بزرگی۔ دہا کے معنی لغت میں دیکھ کر بتائیں گے بیکسم برائے بیت ہے۔ آگے چل بھائی تو غرض کا جو ہے یہ برائے بیت ہے۔ لوگ اتنا حقیر سمجھتے ہیں کہ ان کا مقصود اس پکارنے سے کہ او بھنگی کے یہی ہے کہ او بھنگی یعنی تو ایسی ذلیل قوم سے ہے۔ اور صاحب اب بھی ایسے متکبر لوگ موجود ہیں۔ اپنے ایک عزیز ہی کا نہایت افسوس ناک واقعہ ہے۔ وہ ایک دوسرے قصبہ کے رہنے والے ہیں۔ ہمارا یہ قصبہ بڑا متکبر مشہور ہے مگر جہاں تک میں دیکھتا ہوں یہاں تکبر اتنا نہیں البتہ تیزی ہے۔ اور قصبات میں بہت تکبر ہے چنانچہ یہاں سے ایک قصبہ میں جہاں وہ عزیز رہتے ہیں ہمارا ایک طالب علم کسی اپنے کام کو گیا۔ وہ نو مسلم ہے وہ چمار کا لڑکا تھا مسلمان ہو گیا ہے۔ وہاں جا کر اس عزیز کو معلوم ہوا کہ یہ پہلے چمار تھا۔ پوچھا کیا پڑھتے ہو کہا قرآن مجید یہ سن کر انھوں نے اسے بہت گالیاں دیں اور کہا خبردار ابے چمار کے جو تو نے قرآن پڑھا۔ تو اور قرآن کا پڑھنا ابے تو کہیں تو پٹے گا تو نہیں۔ تو یہ انہوں نے جناب نصیحت کی۔ بھلا کتنی دلیری اور گستاخی کی بات ہے۔ میں نے کہا خدا تعالیٰ کافر کو چاہیں تو مومن کر دیں اور مومن کو چاہیں تو نعوذ باللہ کافر کر دیں اس کی قدرت سے ڈرنا چاہیے۔ اس کی وہ قدرت ہے

؎ کعبہ میں پیدا کرے زندیق کو
لائے بتخانہ سے وہ صدیق کو

یہ گلزار ابراہیم کا شعر ہے۔ یہاں صدیق سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں

جیساکہ قرآن مجید میں انہ کان صدیقاً نبیا وہ بت خانہ سے کعبہ میں آتے ۔ بت خانہ کیا۔ آزر کی آغوش یا کسی بت خانہ میں پیدا ہوئے ہوں یا پرورش پائی ہو مجھے تاریخ کی تحقیق نہیں۔ مگر آزر کا آغوش بت خانہ تو تھا ہی ۔ بلکہ اس کے سامنے بت خانہ کی بھی کیا حقیقت تھی سیکڑوں بت خانے اُس آغوش اور اُس بازو ہی سے تو وجود میں آگئے۔ بت خانہ تو کیا چیز ہے وہ تو بت گر تھا۔ مگر خدا تعالےٰ کی وہ قدرت ہے کہ اس بت خانہ میں صدیق کو پیدا کر دیا اور ع "کعبہ میں پیدا کرے زندیق کو"۔ کعبہ سے مراد مکہ مکرمہ ہے بشمرا وغیرہ سارے شہر کو کعبہ کہہ دیتے ہیں کیونکہ کعبہ ہی کی وجہ سے تو وہ شہر ہوا ہے اور زندیق سے مراد ابوجہل ہے۔ یعنی مکہ مکرمہ میں ابوجہل جیسے کافر کو پیدا کر دیا اسی کو فرماتے ہیں۔ حضرت حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ ؎

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم

ز خاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی ست

(حضرت حسن بصریؒ کو بصرہ سے اور حضرت بلال رضؓ کو حبش سے اور حضرت صہیب رومی کو روم سے جذب فرمایا گیا اور خاک مکہ مکرمہ سے ابوجہل پیدا ہو یہ کس قدر عجیب قدرت ہے اور عجیب تصرف ہے)

کیا ملیا میٹ کیا ہے تکبر کو۔ فرماتے ہیں کہ حبش میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو پیدا کر دیا ۔ یہاں گمان بھی نہ تھا کہ ایسا بڑا شخص پیدا ہو گا۔ کسی کو خبر تھی کہ یہاں بلال پیدا ہوں گے جو محبوب اور مقبول ہوں گے ۔ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ ایسے کے جو خدا کے محبوب ہیں ۔ اور ان کا اتنا بڑا درجہ ہو گا کہ ان کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم یوں فرما دیں گے کہ اے بلال تم کونسا عمل کرتے ہو کہ جب میں شب معراج میں سیر کرتا ہوا جنت میں پہنچا تو میں نے اپنے آگے آگے تمہاری جوتیوں کی کھسکھساہٹ سنی ۔ اس سے یہ نہیں لازم آتا کہ نعوذ باللہ حضرت بلال رضؓ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بڑھ گئے

نہیں بلکہ آگے آگے جو جا رہے تھے تو خادم کی حیثیت سے جا رہے تھے ۔ صورۃً آگے تھے معنیً آگے نہ تھے ۔ جیسے ارجاع الضمیر قبل الذکر ہوتا ہے کہ وہاں گو مرجع موخر ہے ذکراً لیکن رتبۃً مقدم ہے تو بھائی نحو میں تو تائید بھی اسکی موجود ہے ۔ اور دنیا میں بھی تو بہت سے امراء ایسے ہوتے ہیں جن کے آگے آگے خادم چلتے ہیں ۔ اسی طرح حضرت بلال جنت میں گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے آگے چل رہے تھے مگر تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم ہی ۔ لیکن یہ رتبہ کیا کچھ کم ہے کہ خادم کی وہ قسم بنے جو مخدوم کے آگے آگے چلتی ہے ۔ تو بھلا یہ کسی کو خبر تھی کہ حبشہ میں دو کالے کلوٹے لوگوں کے درمیان ایک اس درجہ کا شخص پیدا ہو جائے گا ۔ اور کس کو خبر تھی کہ حسن بصری بصرہ میں اور صہیب رومی جیسے بزرگ دار النصاریٰ میں پیدا ہوں گے ۔ بھلا کوئی سمجھ سکتا تھا کہ ۔

ع حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم + اور ع ۔ ز خاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی ست ۔ حسن تو بصرہ میں پیدا ہوں اور بلال حبش میں اور صہیب روم میں و نیز مکہ کی خاک میں کون پیدا ہو ابوجہل ۔ ہاں تو حضرت خدا سے ڈرنا چاہیئے ۔ اپنے ایمان پر کبھی مغرور نہ ہونا چاہیئے اور کسی کو حقیر نہ سمجھنا چاہیئے ۔

ع ۔ غافل مرو کہ مرکب مردانِ مرد را ۔ ہائے خوب ہی تعلیم ہے ؎

غافل مرو کہ مرکبِ مردانِ مرد را
در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند

(غفلت سے مت چل کہ حق تعالیٰ کے راستے کے شیران طریق بڑے بڑے مجاہدا سے سلوک کو طے کیا ہے) ۔ اور ؎

نومید ہم مباش کہ رندانِ بادہ نوش
ناگہ بیک خروش بہ منزل رسیدہ اند

(اس راہ میں نا امید مت ہونا کہ بہت سے رندان بادہ خوار یعنی گنہگار ایک آہ اور ایک نالہ سے منزل کو بطریق جذب طے کر لیتے ہیں)

واقعی رندان بادہ نوش ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند۔ یہ ہوا بھی ہے۔ منشی محمد جان مارہرہ کے جو کانپور میں رہتے تھے خود مجھ سے ایک حکایت بیان کرتے تھے کہ مارہرہ میں ایک آزاد مشرب شخص تھا۔ کوئی عیب دنیا کا نہ تھا جو اس میں موجود نہ ہو۔ لوگ اس کی شرارتوں پر جب اُسے نصیحتیں کرتے کہ بھائی خدا سے ڈرو تو وہ یہی کہہ دیتا کہ میاں تمہیں کیا۔ ہم جانیں اور ہمارے اللہ میاں جانیں گویا ناز تھا اس کو حق تعالیٰ کی رحمت پر۔ بس حضرت لوگ تو سمجھاتے سمجھاتے مایوس ہو گئے کہ اب اس کی اصلاح نہ ہوگی لیکن ایک دن دفعۃً اس کے منہ سے یہ نکلا کہ خدا جانے میرا کیا ہوگا۔ بس یہ کہتے ہی اس پر ایک حالت طاری ہوگئی۔ خدا جانے میرا کیا حال ہوگا۔ یہ تو بولا پھر بولنا بھی چھٹا کھانا پینا بھی چھٹا عیش آرام بھی چھٹا۔ بس نماز کے وقت تو نماز پڑھ لیتا۔ پھر سوا رونے کے اسے اور کوئی کام نہ تھا۔ اس کے رونے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کلیجہ باہر نکل پڑے گا۔ ہرچند لوگ تسلی دیتے تھے مگر کسی طرح صبر ہی نہ آتا تھا۔ یہاں تک کہ اسی حالت میں تیسرے دن انتقال کیا۔ کوئی شخص کر سکتا ہے اس شخص کے شہید ہونے میں۔ تو اب دیکھئے یہ ٹھیک ہے یا نہیں ؎

ہیچ کافر را بخواری منگرید　　کہ مسلمان بودنش باشد امید

(کسی کافر کو ذلت کی نظر سے مت دیکھنا کیونکہ ابھی ممکن ہے کہ وہ کسی وقت میں اسلام قبول کرکے حسن خاتمہ سے مشرف ہو جائے)

کسی کافر کو بھی ذلیل نہ سمجھنا چاہیئے کہ شاید مسلمان ہو جائے نہ کہ مسلمان ہونے کے بعد بھی ذلیل سمجھا جائے یہ تو نعوذ باللہ خدا کا مقابلہ ہے۔ خدا جانے آئندہ کیا ہونے والا ہے اور ہماری قسمت میں کیا لکھا ہے۔ تو ان منشی جمال الدین کی حکایت میں کہ بیان کی تھی اس نومسلم کے اس قول پر کہ اسلام میں توحید بہت کامل ہے تو اس نے مجھ سے یہ کہا کہ چونکہ مسلمانوں کی خاصیت توحید ہے اس لئے اب میں ان سے جدا نہ ہوں گا اب میں اسلام کو نہ چھوڑوں گا۔ خیر اس سے مجھے تسلی ہوئی اس پر یہ حکایت یاد آگئی تھی کہ لوگ نور چمک کو سمجھتے ہیں حالانکہ نور کہتے ہیں اس کو

جو ظاہر لنفسہ ومظہر لغیرہ ہو یعنی جو خود بھی ظاہر ہو اور دوسرے کو بھی ظاہر کرے بس حقیقت یہ ہے نور کی۔ اب اللہ نور السموٰات کی تفسیر میں استعارہ کی تاویل کی حاجت ہی نہیں کیونکہ اللہ تعالےٰ سموٰات اور ارض کو ظاہر بھی کر رہا ہے اور ان کے واسطے سے خود بھی ظاہر ہے۔ بہر حال نور اس کو کہتے ہیں جو خود بھی ظاہر ہو اور دوسرے کو بھی ظاہر کرے۔ تو اب وہ شبہ نہیں رہا کہ ہم نے تو نماز پڑھی تھی کوئی نور نہیں پیدا ہوا، ہم تو روزہ رکھتے ہیں کوئی نورانیت قلب میں محسوس نہیں ہوتی۔ طاعت میں کوئی نور نظر نہیں آتا۔ اب یہ شبہ رفع ہو گیا کیونکہ نور چمک دمک کا نام نہیں ہے بلکہ نور وہ ہے جس کی میں نے ماہیت عرض کی کہ ظاہر لنفسہ ومظہر لغیرہ ہو خیر عوام کیا سمجھیں اس کو لیکن اس کی علامتیں اور آثار ہیں جن سے وہ نور کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔ اگر آگ نہیں دکھائی دیتی تو دھواں تو دکھائی دیتا ہے۔ دھوئیں سے تو پہچان سکتے ہیں کہ آگ موجود ہے۔ آثار کیا ہیں اُس نور کے۔

ترمذی کی حدیث ہے اس آیت کی تفسیر میں فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام کہ جب شرح صدر ہوتا ہے تو نور قلب میں داخل ہوتا ہے۔ کسی نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وما علامتہ نور کے داخل ہونے کی کیا علامت ہے۔ فرمایا التجافی عن دار الغرور والانابۃ الی دار الخلود۔ دنیا سے تعلق کم ہو جانا اور متوجہ ہو جانا آخرت کی طرف۔ یہ علامت ہے نور قلب کی۔ تو بھائی اس علامت ہی سے سمجھ لو کہ طاعت میں نور ہے یا نہیں۔ تو طاعت میں مشغول ہونے سے یہ علامتیں پاؤ گے اور معصیت کے بعد اس کے خلاف پاؤ گے۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ معصیت میں ظلمت ہے اور طاعت میں نور ہے۔ اس طرح نور و ظلمت ہونا طاعت کا اور معصیت کا تم پر منکشف ہو جائے گا۔ اور اگر منکشف نہ ہو تو اس کی وجہ یہ ہو گی کہ کبھی خالص طاعت کو اختیار کر کے دیکھا نہیں۔ امتحان ہی کے طور پر چند روز خالص طاعتیں گذار لو۔

پھر معصیت کے بعد جو کیفیت ہو اس کو یاد رکھو تو خود فرق معلوم ہو جاویگا وہی آیت صادق آویگی جو میں نے پڑھی تھی ھل تستوی الظلمات ظلمات اور نور کہیں مساوی ہو سکتے ہیں۔ تو بہر حال اب یہاں سے معلوم ہو گیا کہ رمضان المبارک کا وہ مہینہ ہے جو مجمع النور ہے اس واسطے کہ اس مہینہ میں قرآن مجید نازل ہوا جس کی شان یہ ہے کہ ہدیٰ ہے بینات ہے اور فرقان ہے اور اس میں سے ہر ایک صفت دلالت کرتی ہے قرآن مجید کے نور ہونے پر فرقان ہونا بھی اسی پر دلالت کرتا ہے کیونکہ فرق بین الحق والباطل انکشاف پر ہے اور انکشاف نور سے ہوتا ہے جیسا اوپر بیان ہوا ہے۔ اور ایک ہدیٰ کا مادہ ہے وہ بھی دلالت کر رہا ہے قرآن مجید کے نور ہونے پر کیونکہ رستہ اسی چیز سے نظر آتا ہے جس کی شان ہو ظاہر لنفسہ و مظہر لغیرہ اس کو تو ہر شخص جانتا ہے۔ اور بینات جس کے معنی ہیں دلائل واضحات اس کا موضح ہونا یہ بھی کاسف ہوتا ہے جو مرادف ہے نور کا تو قرآن مجید کی سب صفتیں ایسی ہیں جن سے اس کا نور ہونا ثابت ہوتا ہے تو حاصل اس آیت کا یہ ہوا کہ رمضان المبارک ایسا مہینہ ہے جس میں ایسی نورانی چیز آئی تو گویا پُر انوار ہے یہ مہینہ اور ذات الانوار ہے یہ مہینہ۔ اور جب ذات الانوار ہے تو اس کا رافع الظلمات ہونا لازم ہے۔ اب رافع ہونے کی دو صورتیں ہیں ایک تو رافع ہونا ہے تکوینی اور ایک رافع ہونا ہے تشریعی۔ سو رفع تکوین تو باختیار عبد نہیں اس لئے تکوینًا تو خود رافع بنایا کہ اس کو مجمع الفضائل بنایا اسباب ظلمت کو اس میں مفقود کیا چنانچہ شیاطین بھی اس میں قید ہو جاتے ہیں اور رفع تشریع باختیار عبد ہے اس لئے اس پر آگے تفریعًا فرمایا فمن شهد منكم الشهر یعنی جب ایسا مہینہ ہے تو اس کو ظلمات کے رفع کا آلہ تم بھی بناؤ اس طرح سے کہ اس میں خاص عبادت کرو یعنی روزہ رکھو اور اس کے انوار کو آلہ بناؤ رفع ظلمات کا جس کی صورت یہ ہے کہ طاعت اختیار کرو۔ حاصل یہ کہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک لال ٹین رکھی ہو بڑی مسجد میں اور یہ کہا جاوے کہ اس سے کام لو اور جہاں جہاں ظلمتیں ہوں وہاں لے کر جاؤ تاکہ وہ رفع ہوں یہ تھوڑا ہی ہے کہ رکھی رکھی ساری دنیا کی ظلمات کے رفع کے لئے وہ کافی ہو جاوے اسی طرح تم کو بھی یہ مہینہ کیا ملا ہے گویا ایک لالٹین عطا ہوئی ہے۔ مگر اس کو محل

ظلمت میں لے بھی تو جاؤ۔ اگر کہیں نہ لے جاؤ تو بیٹھے بیٹھے ظلمت کیسے رفع ہوجائیگی یوں چاہیے وہ نور ایسا ہی قوی ہو اس سے ظلمتیں بلا استعمال بھی رفع ہوسکتیں ہیں مگر حق تعالیٰ نے شعاعوں کے پہونچنے کی حد تک پردے قصداً ایسے رکھے ہیں جن سے نور بدون تصرف کے نہیں پہونچتا تاکہ مکلف کا مکلف ہونا بھی تو معلوم ہو ورنہ اگر اس مہینہ میں اعمال ظلمانیہ پر بھی قدرت نہ ہوتی اور طاعات بالاضطرار صادر ہوتیں بخلاف فرشتوں کے تو یہ بھی رفع تکوین میں داخل ہوجاتا اور اس صورت میں مکلف کا کیا کمال تھا اور اس کو کیا برکت حاصل ہوتی۔ اور یہی ظہور کمالات و عطاء برکات اس کی وجہ ہے کہ انسان کو مکلف طاعات کا بنایا کہ ان شاء فعل وان شاء لم یفعل کہ ان کا اختیار مشابہ اختیار کے ہے۔ وہ ترکِ طاعت پر قادر نہیں انسان کو ان پر خاص شرف دینا تھا۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ جب حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنا چاہا تو ملائکہ نے عرض کیا کہ وہ تو کھائیں گے بھی پئیں گے بھی فاجعل لہم الدنیا ولنا الآخرۃ ان کے حصہ میں دنیا کر دیجئے ہمارے حصہ میں آخرت۔ ارشاد ہوا کہ ہرگز نہیں بھلا جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے اور جس کو صرف کُن کہنے سے پیدا کیا ہے دونوں کو برابر کردوں یعنی تم کو کہ صرف کن کہکر پیدا کیا ہے اور انسان کو جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے کیسے برابر کردوں۔ اب رہا یہ کہ دونوں ہاتھوں سے پیدا کرنے کے کیا معنی ہیں، سو اس کا حقیقی علم تو حق تعالیٰ ہی کو ہے۔ باقی حاصل مطلب یہ ہے کہ انسان کو خاص توجہ اور عنایت اور اعتنا کے ساتھ پیدا کیا ہے یعنی خلاصہ ارشاد کا یہ ہے کہ ان کی نوع بلحاظ مجموعہ کے ملائکہ کی نوع سے بڑھی ہوئی ہے۔ یہ نہیں کہ ہر فرد ہر فرد سے افضل ہے۔ یہاں سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ انسان ملائکہ سے بھی افضل ہے ولو باعتبار بعض الافراد اور کیا یہ بات فضیلت ظاہر کرنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ فرشتوں کو تو انسان کی خدمت سپرد کی گئی لیکن اس کو ان کی کوئی خدمت سپرد نہیں کی گئی۔ یہ کیا تھوڑی بات ہے کہ سارے کام انسان کے ملائکہ کے سپرد ہیں

یہاں تک کہ خود ان کی خدمت بھی اور ان کی چیزوں کی خدمت بھی۔ ان کی جس گھاس کو بیل کھاتے ہیں اُس کی بھی۔ کیونکہ قوتِ نامیہ سے کام لینے والے وہ ملائکہ ہیں جو مدبرات ہیں ارض و سمٰوات کے یہاں تک کہ نطفہ میں بھی ملائکہ ہی تصرف کرتے ہیں۔ جس وقت نطفہ قرار پایا اسی وقت ایک فرشتہ فوراً متعین کر دیا گیا پہلے اس نے علقہ بنایا۔ پھر عرض کیا اب کیا کروں پھر مضغہ بنایا، پھر عرض کیا اب کیا کروں۔ غرض اسی طرح اخیر تک برابر فرشتہ تصرفات کرتا رہتا ہے۔ اطباء سمجھتے ہیں کہ قوتِ مولدہ کام کرتی ہے۔ چلو بیٹھو بھی قوت بیچاری کیا کام کر سکتی ہے جب تک کوئی قوت سے کام لینے والا نہ ہو۔ یہ صاحب حکماء کہلاتے ہیں۔ یہ حکماء ہیں۔ حمقاء ہیں کہ طبیعت کو عدیمۃ الشعور بھی مانتے ہیں اور ایسے افعالِ بدلعہ بھی اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ جب بہت لتاڑ پڑی کہ بھلا کوئی عدیمۃ الشعور ایسے افعال بھی کر سکتا ہے تو اخیر میں ذرا متاخرین کو ڈھیلا ہونا پڑا اور کہنا پڑا کہ ضعیفۃ الشعور ہے۔ مگر پھر بھی اعتراض باقی ہے یعنی ان کے قول کا حاصل تو یہ ہوا کہ طبیعت بے عقل تو نہیں کم عقل ہے۔ لیکن وہ اعتراض تو پھر بھی باقی ہے کہ کم عقل سے ایسے افعال بدلعہ کیسے صادر ہو سکتے ہیں، بلکہ اب اعتراض اور قوی ہو گیا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بے عقل کا تصرف تو ایک نحو واحد پر چلتا رہتا ہے جیسے مشین کہ ایک مرتبہ گھما دینے سے کام کرتی رہتی ہے۔ تو جو عدیم الشعور ہے وہ کام کو اتنا نہ بگاڑے گا لیکن جو کم شعور ہے وہ بہت بگاڑے گا۔ مشین سے کام اتنا نہیں بگڑتا جتنا اناڑی سے، سو واقعی ان حکماء نے یہ کیا حماقت کی بات کہی۔ بس سیدھی بات یہ ہے کہ مسلمان ہو جاؤ۔ اور اس کے قائل ہو جاؤ کہ اللہ میاں فرشتوں سے یہ سب کام لیتے ہیں۔ پھر کوئی اشکال ہی باقی نہیں رہتا۔ ان حکماء نے اس قدر ٹھوکریں کھائی ہیں کہ کہیں پناہ نہیں ملتی، ہر جگہ اعتراض بخلاف اہلِ حق کے جو قائل ہیں خدا کے قادرِ مطلق اور مختارِ مطلق ہونے کے ان پر کوئی اشکال ہی نہیں واقع ہوتا البتہ حکماء کی طرف سے ان پر اخیر سوال یہ ہے کہ جس پر ان کو بڑا

ناز ہے کہ اختیار تو قدیم ہے پھر خاص وقت میں احد المقدورین کو ترجیح دینا ترجیح بلامرجح ہے جواب یہ ہے کہ مرجح ارادہ ہے اس پر سوال کیا گیا ہے کہ کسی خاص وقت میں ارادہ کیوں مرجح ہوا جواب یہ ہے کہ ارادہ کی حقیقت ہی یہ ہے کہ ترجیح احد المقدورین من شاء جب یہ ترجیح اس کا ذاتی فعل ہے خواہ یوں کہیے کہ اس کا لازم ہے اور ذات اور ذاتی کے درمیان اسی طرح ملزوم ولازم کے درمیان تخلل جعل کا محال ہے اس لئے اس ترجیح کی علت کا سوال ہی لغو ہے۔ بس بند ہو گیا ناطقہ۔ ایک اسلام نے سارے اشکالات کو حل کر دیا اور وہ اصولاً فروعاً ہر طرح سے بے غبار رہ گیا بہرحال تسخیر ملائکہ سے انسان کا کتنا بڑا شرف ثابت ہوا، البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ شرف اسی وقت تک ہے جب تک حق تعالیٰ سے اس کو تعلق ہے۔ دیکھو ہمارے یہاں کوئی مہمان آتا ہے تو اپنے بیٹوں سے اس کی خدامت کراتے ہیں۔ حالانکہ بیٹا نسبت میں اس شخص سے زیادہ قریب ہوتا ہے مگر مہمان ہونے کی وجہ سے وہ بیٹے سے زیادہ معزز ہے لیکن اسی وقت تک معزز ہے جب تک وہ مہمان ہونے کے تعلق کو قائم رکھے ورنہ اگر اپنی کسی حرکت سے اس تعلق کو منقطع کر دیا تو پھر اسی بیٹے کے ہاتھوں جس کو خدمت کرنے کا حکم تھا جوتیاں بھی لگوائی جاتی ہیں چنانچہ کانپور میں ایک شخص نے چند صلحاء کی دعوت کی تھی۔ میزبان کے لڑکے نے سب کے ہاتھ دھلائے۔ ان میں سے ایک صاحب جو مدعیان صلاح میں سے تھے آزاد سے تھے۔ انھوں نے اس قدر نالائق حرکت کی اس لڑکے کے رخسارہ پر محبت نفسانیہ سے ہاتھ پھیرا صاحب مکان نے دیکھ لیا۔ فوراً خدمتگار کو حکم دیا کہ ان سب نالائقوں کو کان پکڑ کر باہر نکال دو۔ ایک نالائق کی وجہ سے بھی بے چارے نکالے گئے۔ لو صاحب یا تو مہمان تھے بیٹا خدمت کر رہا تھا۔ یا نوکروں۔ سے کان پکڑ کر نکالے گئے۔

تو انسان کو حق تعالٰے نے دنیا میں اپنا مہمان کر کے بھیجا اور فرشتوں کو اس کے کام میں لگا دیا (بقولِ ذوق ؎

دنیا میں ہے جو کچھ وہ سب انسان کیلئے ہے
آراستہ یہ گھر اسی مہمان کے لئے ہے

لیکن یہ خدمت اور مہمان داری اسی وقت تک ہے جب تک ہم مہمانی کے اہل ہیں اور اگر مہمانی کے خلاف ذرا کوئی حرکت کی تو کان پکڑ کر نکال دیئے جائیں گے اتنا فرق ہے کہ وہاں اسی وقت ذلیل کر کے نکال دیئے جاتے ہیں یہاں ایک میعاد مقرر ہے دسترخوان کے لئے اس میعاد تک گو ہم سے کیسی ہی نالائق حرکتیں سرزد ہوں ہم مہمان ہی قرار دیئے جاتے ہیں جیسے بعضے کریم النفس ہوتے ہیں کہ جب کسی نے دسترخوان پر کھانا شروع کر دیا تو کریم النفس میزبان اس کی نالائقیوں پر چشم پوشی کرتا ہے اور صبر کرتا ہے کہ اب میں کیسے اس کھاتے ہوئے کو اٹھا دوں۔ لیکن جب میعاد ختم ہوگئی اور گھر سے ہو گئے باہر پھر وہ جوتہ وہ جوتہ۔ انھیں کے ہاتھوں ذلیل کرائے جائیں گے جن سے کہ اب خدمت کرائی جارہی ہے یعنی ملائکہ سے۔ بہرحال یہ ثابت ہوا کہ انسان کا کمال زیادہ تر اسی پر مبنی ہے کہ اس سے اضطراراً کام نہیں لیا جاتا۔ وہ اپنے اختیار سے مجاہدہ کرتا ہے۔ اس لئے رمضان کو اس کے لئے اضطراراً رافع ظلمات اعمالیہ نہیں بنایا گیا بلکہ اس کو خود حکم ہوا ہے کہ ان ظلمات کا رافع اس کو تم خود بناؤ یعنی اپنے اختیار سے مجاہدہ کر کے رمضان کو پورا انوار بناؤ اس طرح سے اُن انوار کو محل ظلمات میں پہنچاؤ اپنے عمل کے ذریعے سے اس لئے تروج فرمایا فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ تو اس طرح سے یہ آیت دلالت کرتی ہے حقوق رمضان کے وجوب پر جیسے کہ میں نے تقریر بیان کی بعد مقدمات اور اس مہینے میں علاوہ صوم کے اور بھی چند عبادتیں مشروع ہیں۔ اُن میں سے ہر عبادت کی حقیقت میں غور کرنے سے میرا یہ دعویٰ ثابت ہو جائے گا کہ واقع میں یہ مہینہ محل انوار ہے۔ چنانچہ مجموعہ میں سے ایک عبادت ہے اس کے اندر روزہ کی جو آیت میں صریح مذکور ہے۔ ایک عبادت ہے اس کے اندر تراویح کی، جس کی طرف ذکر قرآن سے اشارہ ہے۔ ایک عبادت ہے اس کے اندر اعتکاف کی

جس کا ذکر بعد میں ہے ۔ ایک عبادت ہے اس کے اندر اختیار لیالی قدر کی جس کا ذکر دوسری آیتوں میں ہے ۔ ایک عبادت ہے اس کے اندر کثرتِ تلاوتِ قرآن مجید کی اس کی طرف بھی ذکرِ قرآن ہی میں اشارہ ہے یہ گویا اس وقت پانچ عبادتیں ذہن میں حاضر ہیں اب ہر ایک کی حقیقت میں اور ذات میں غور کرنے سے جو میں نے دعویٰ کیا ہے اس کی تائید ہوگی سب کو تھوڑا تھوڑا بیان کرتا ہوں چنانچہ ایک عبادت ہے تلاوت قرآن مجید کیونکہ حق جل علا شانہٗ کے ارشاد سے رمضان شریف کا محل نزول قرآن ہونا ثابت ہوتا ہے ۔ اس سے مناسبت تلاوتِ قرآن مجید کی رمضان شریف کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے ۔ باقی خاص رمضان المبارک میں تلاوت کی کثرت کی حدیث قولی یا فعلی میں میری نظر سے نہیں گذری لیکن میری نظر وسیع نہیں ممکن ہے کہ کوئی روایت ہو جو میری نظر سے نہ گذری ہو ۔ لیکن ایک سنت اس وقت میرے ذہن میں ہے اس سے استدلال کرنا کافی ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال رمضان المبارک کے مہینہ میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن مجید کا دور فرمایا کرتے تھے اور جس سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال فرمایا اس کے رمضان میں جبرئیل علیہ السلام نے دو بار دَور کرایا ۔ چنانچہ آپ نے اس سے قرب وفات پر استدلال فرمایا یعنی معلوم ہوتا ہے میرے لئے اگلا رمضان آنے والا نہیں ہے میں اس وقت تک زندہ نہیں رہوں گا ۔ اسی لئے دو دفعہ دور کرایا گیا تاکہ اگلے رمضان کا دور بھی اسی رمضان میں ہو جائے ۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ یہ دور جو ہر سال رمضان المبارک میں ہوا کرتا تھا غیر تراویح میں ہوتا تھا ۔ لہٰذا اس سنت سے اور دوسرے اس حدیث سے رمضان شریف میں اور دونوں سے زیادہ آپ اجتہاد فرماتے تھے اور تلاوت ہمیشہ مطلوب ہے تو رمضان میں زیادہ مطلوب ہوگی ان دونوں سے مدعا ثابت ہو سکتا ہے ۔ غرض اس سے معلوم ہوا کہ ایک عبادت رمضان المبارک کی مطلوب عبادات میں سے تلاوتِ قرآن مجید بھی ہے اور قرآن مجید کا نور ہونا ھدیً للنّاس و بینٰتٍ من الھدیٰ والفرقان میں بیان فرما ہی دیا ہے

یہی دلیل کانز ہے۔ اس عبادت کے نور ہونے کی ایک جز و رمضان المبارک کی عبادات کا روزہ ہے جس کو اس آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ فمن شهد منكم الشهر فليصمه۔ اب رہا روزہ کا نور ہونا سو غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ روزہ کس طرح سے نور ہے تو روزہ کی حقیقت دیکھنی چاہیئے کہ کیا ہے۔ حقیقت یہی ہے لذات کا ترک کر دینا، شہوات کا ترک کر دینا، تو لذات کے ترک سے اور شہوات کے ترک سے خود مشاہدہ ہوسکتا ہے کہ قلب کے درمیان ایک کیفیت نور کی اور انشراح کی پیدا ہو جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ معاصی میں دو درجے ہیں ایک تقاضا اور ایک اس تقاضے پر عمل اور بالفعل اور عمل کا ظلمت ہونا معلوم ہی ہے باقی تقاضا گو وہ بالفعل ظلمت نہیں مگر بالقوہ ظلمت ضرور ہے اور بالقوہ شرط ہے بالفعل کی اور شرط کا فوت مستلزم ہے فوت مشروط کو اور روزہ سے تقاضے میں کمی آتی ہے تو فعل میں بھی کمی آوے گی تو دونوں درجے ظلمت کے اس سے منفی ہوگئے پھر نور ہونے میں کیا شبہ رہا روزہ اس طرح نور ہوا۔ لیکن یاد رکھنے کی بات ہے کہ فوت کے مرتفع و منفی ہونے کے معنی اصطلاح میں ضعیف ہو جانے کے ہیں نہ کہ بالکل معدوم ہو جانا۔ اور یہ بہت کام کی بات ہے جس کے نہ جاننے کی وجہ سے بہت غلطیاں واقع ہو رہی ہیں۔ چنانچہ عموماً اس وقت کے صوفیہ ترک لذات کی نسبت اور ترک تعلقات کی نسبت یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے قطع کا حکم ہے حالانکہ یہ الفاظ اصطلاحی ہیں ان کو لغت پر محمول نہ کرنا چاہیئے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ لذات کو بالکل فنا کر دینا چاہیئے اور اخلاق ذمیمہ بالکل معدوم ہو جانے چاہئیں۔ تو اس غلطی میں پڑنے سے یہ ضرر ہوتا ہے کہ بعد مجاہدہ کے جب دیکھتے ہیں کہ نفس میں ان چیزوں کا پھر تقاضا ہونے لگا ہے تو مایوس ہو جاتے ہیں کہ ہمارا سارا مجاہدہ ہی برباد گیا۔ اور مایوس ہونے سے یہ ضرور ہوتا ہے کہ پہلے جو تھوڑی بہت مجاہدہ کی توفیق تھی اس کو بھی ترک کر بیٹھتے ہیں۔ جب اس کو ترک کر دیتے ہیں تو اس کی وجہ سے جو مواد خبیثہ میں اضمحلال ہوگیا تھا وہ جاتا رہتا ہے اور پھر اس

مواد خبیثہ میں جوش و خروش پیدا ہو کر معاصی کا صدور ہونے لگتا ہے دیکھئے کتنا ضرر ہوا ذرا سی اصطلاح کے نہ جاننے سے تو قوت کے مرتفع ہونے کے معنی قوت میں اضمحلال ہو جانے کے ہیں۔ جب یہ سمجھ میں آگیا تو اب مکرر سمجھئے کہ روزہ میں خاصیت ہے اضمحلال داعیۂ شہوت کی جس کا نام تھا قوت جب قوت کا درجہ ضعیف ہو گیا تو فعلیت کا درجہ بدرجۂ اولیٰ ضعیف ہو جائے گا اور معاصی سے احتراز آسان ہو گا اور طاعت کی توفیق ہو گی۔ جب معاصی سے احتراز ہو گا جو سبب ظلمت ہیں اور طاعت کی توفیق ہو گی تو ظاہر بات ہے نور پیدا ہو ہی گا۔ اس اعتبار سے روزہ بھی نور ہوا۔ ایک عبادت تھی تراویح اس کا نور ہونا بھی ظاہر ہے۔ اول تو خود حدیث میں ہے الصلوٰۃ نور دوسرے نور ہونا اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے نور کی خاصیت یہ ہے کہ وہ ظلمت کو رفع کرتا ہے اسی طرح نماز مرتفع کرتی منکرات اور شہوات کو جیسا کہ ارشاد ہے ان الصلوٰۃ تنھٰی عن الفحشاء و المنکر اور منکرات و شہوات کا ظلمت ہونا ظاہر ہے غرض تراویح کا نور ہونا اس طرح سے معلوم ہوا ایک عبادت اعتکاف ہے اس کی حقیقت ہے خلوت اور خلوت میں جو نور پیدا ہوتا ہے ظاہر بات ہے کوئی شک و شبہ نہیں۔ ایک عبادت احیار لیالی قدر رمضان ہے یہ احیار تو سب راتوں میں عبادت ہے لیکن خود لیالی قدر کی عبادت کی فضیلت قرآن مجید میں مذکور ہے لیلۃ القدر خیر من الف شھر تنزل الملائکۃ و الروح فیھا باذن ربھم ملائکہ اہل نور ہیں اور ظاہر ہے کہ نور والوں کی صحبت سے نور پیدا ہوتا ہے اہلِ صلاح کی صحبت سے صلاح کا مادہ پیدا ہوتا ہے اہل فسق کی صحبت سے فسق کا مادہ پیدا ہوتا ہے اہل ظلمت کی صحبت میں ظلمت ہوتی ہے اہلِ نور کی صحبت میں نور ہوتا ہے۔ یہ خاصیت خاص ہے شب قدر کے ساتھ خلاصہ یہ کہ رمضان کیا ہوا مجمع الانوار ہوا۔ یوں تو سب طاعات انوار ہیں مگر یہ خاصیت رمضان المبارک ہی میں ہے کہ تمام انوار اس میں جمع ہو گئے ہیں۔ پھر اس میں جو عبادت بھی ہے اپنی کامل ہیئت کے ساتھ ہے۔ بخلاف دوسری عبادات جامعہ کے جن میں یہ بات نہیں۔

مثلاً اہل لطائف نے نماز کو جامع جمیع عبادات کہا ہے۔ اس طرح کہ نماز کے اندر نماز تو ہے ہی۔ تلاوت قرآن مجید بھی ہے کھانا پینا بھی نماز کے اندر ممنوع ہے وہ گویا روزہ کے معنی ہوئے۔ نمازی متوجہ ہوتا ہے خانۂ کعبہ کی طرف۔ وہ گویا حج کے معنی ہوئے کسی سے بولتا چالتا نہیں اور مسجد کے اندر ہی رہتا ہے تو گویا نماز میں معنی اعتکاف کے بھی ہوئے۔ کچھ نہ کچھ خرچ بھی کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً کپڑا ہی بنایا یا جانماز ہی خریدی تو گویا معنی زکوٰۃ اور انفاق کے بھی نماز کے اندر پائے گئے تو اس طرح سے بعض عبادات غیر رمضان میں بھی جامع الانوار ہیں مگر اتنا فرق ہے کہ نماز کے اندر تو اور عبادات تو صرف معنی ہی پائے جاتے ہیں اور رمضان المبارک میں ہر عبادت اپنے کامل ہیئت پر موجود ہے۔ چنانچہ نماز کے اندر جو روزہ کی صفت پائی جاتی ہے وہ صرف ایک ساعت کے اعتبار سے ہے اور ایک ساعت کا روزہ اس کی صورت اصلی کے اعتبار سے کوئی چیز نہیں۔ اسی طرح اعتکاف بخلاف رمضان المبارک کے کہ اس میں جتنی چیزیں ہیں سب مستقل طور پر موجود ہیں۔ صوم ہے وہ مستقل قرآن مجید کی تلاوت ہے وہ مستقل اعتکاف ہے وہ مستقل لیالی قدر کی بیداری ہے وہ مستقل یہ سب مستقل ہیں۔ یہ خاصیت کسی زمانہ میں یا کسی طاعت میں نہیں ہے۔ ایسی جامعیت ہے اس کے اندر۔ اس سے آپ خیال کر سکتے ہیں کہ رمضان شریف کیا چیز ہے۔ جب یہ ایسی چیز ہے تو جو اس کے حقوق ہیں ان کو ادا کرنا ضروری ہوا وہ حقوق کیا ہیں۔ ایک تو وہ حقوق ہیں جو مشترک ہیں تمام طاعات رمضان میں اور ایک حق ہے خاص خاص طاعات کے متعلق معاصی کا ترک کرنا۔ مثلاً روزہ کے متعلق اور معاصی ہیں، نماز کے متعلق اور معاصی ہیں۔ یہاں نماز سے مراد وہ نماز ہے جو خاص ہے جس کو تراویح کہتے ہیں۔ جو نماز عام ہے وہ مراد نہیں ہے۔ غرض ہر ایک کے متعلق جدا معاصی ہیں مثلاً روزہ کے متعلق جو معاصی ہیں وہ دو قسم کے ہیں ایک تو وہ قسم جس سے روزہ کی حقیقت میں فرق آجائے یعنی عدم امساک عن مفطرات الصوم یا جوان آدمی نے جس کو اندیشہ جماع کے ارتکاب کا ہو لمس اور تقبیل سے احتراز نہ کیا یہ بھی اُس ہی کی

ساتھ حکماً ملحق ہے۔ اور ایک وہ قسم جن سے روزہ کی حقیقت میں تو فرق نہیں آتا لیکن کمال میں مخل ہیں جیسے بری نگاہ سے کسی کو دیکھنا کسی کی غیبت کرنا یا کوئی ناجائز کام ہاتھ سے کرنا یا پاؤں سے ناجائز موقع کی طرف چلنا شطرنج گنجفہ کھیلنا گانا بجانا یا سننا یا ناچ دیکھنا وغیرہ وغیرہ اور سب سے بڑھ کر اقبح اور اشنع یہ ہے کہ روزہ ہی نہ رکھے۔ چنانچہ پارسال رمضان گرمی میں آیا تھا۔ اب ہر سال دس دس دن مقدم ہوتا چلا جائیگا یعنی اس سے پہلا رمضان پورے جون میں تھا مگر بہتیرے لوگوں نے جرئیں ہی ماریں بیٹھکر۔ اب کا رمضان جون کے مہینہ سے دن پہلے شروع ہوجائیگا۔ یعنی ۲۰ مئی سے۔ اگلے سال انشاء اللہ تعالیٰ اور دس دن پہلے شروع ہوگا۔ پھر انشاء اللہ تعالیٰ یکم مئی سے ہوگا۔ پھر اپریل میں پڑے گا۔ غرض اب ہر سال سردی ہی کی طرف ہٹتا چلا جائے گا پھر سردی کے زمانہ میں ہونے لگے گا۔ اور ہر چند یہ زمانہ گرمی کا ہے جس میں اب کے سال رمضان المبارک آرہے ہیں۔ مگر اب تک تو بفضلہ تعالیٰ گرمی پڑی نہیں بہت ڈر رہے تھے کہ خدا خیر کرے اب کے رمضان میں بڑی گرمی ہوگی مگر خبر بھی ہے خدا تعالےٰ نے اپنی رحمت سے گرمی کو سردی سے بدل دیا۔ اولئك يبدل الله سيئا تهم حسنات کا نمونہ ہوگیا اور یہ عجیب بات ہے کہ یہ مہینے سب گرمی کے ہیں۔ اپریل مئی جون۔ اپنے مہینوں کے نام اس لئے نہیں لئے کہ وہ مختلف موسموں میں واقع ہوتے ہیں۔ اس لئے غیروں کے مہینوں کے نام لئے ہیں کہ حساب آسانی سے سمجھ میں آجائے تو یہ اپریل اور مئی اور جون سخت گرمی کے مہینے ہیں مگر چند سال سے میں دیکھتا ہوں کہ گرمی بھی بہت دنوں میں شروع ہوتی ہے یعنی ضابطہ سے جو زمانہ گرمی شروع ہوجانے کا ہے اس وقت بھی سردی ہوتی ہے۔ غرض گرمی کا زمانہ شروع ہوجانے کے بعد بھی بہت دنوں تک سردی ہی رہتی ہے۔ اب بھی راتوں کو دیکھئے ٹھنڈ ہوتی ہے۔ دن کو بھی اور صبح شام بھی ایسی گرمی پریشانی کی نہیں ہوتی۔ اب جب مئی سے کھسک کر اپریل کے اخیر عشرہ میں رمضان شروع ہوں گے تو اور سردی ہوگی۔ پھر ۱۱ اپریل کو اور سردی میں ہوں گے۔ پھر یکم

اپریل کو اور سردی میں ہوں گے پھر مارچ میں آجائیں گے تو اور سردی ہو گی غرض اب اپنے دل سے ڈر نکال دو۔ کیونکہ سردی ہی کی طرف جا رہے ہیں اور رجب تک گرمی میں ہیں گرمی سے بھی نہ ڈرنا چاہیے کیونکہ وہ گرمی بھی اب رفتہ رفتہ سردی ہوتی جاتی ہے جیسا کہ مشاہدہ کر لیا۔ اور میرا خیال ہے کہ عجب نہیں کچھ زمانہ کے بعد گرمی ہی بالکل جاتی رہے مجھے خیال اس لئے ہوا کہ میں نے اپنے استاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس کے متعلق ایک پیشین گوئی سنی ہے۔ وہ پیشین گوئی یا تو کشف ہے یا فراست ہے کیونکہ مولانا کا دماغ بہت صحیح تھا۔ بزرگوں کے جدا جدا حالات ہیں مولانا کو کشف سے بہت مناسبت تھی۔ گو کشف ہونا کوئی ایسے زیادہ کمال کی بات نہیں۔ لیکن صاحب فراست بھی غضب کے تھے۔ ایسے عالی دماغ اور صحیح المزاج تھے کہ میں نے معتبر ذریعہ سے سنا ہے کہ پہلے یہ کیفیت تھی۔ بعد کو یہ کیفیت کم ہو گئی تھی کیونکہ ایک بار گھوڑے پر سے گر گئے تھے جس سے دماغ پر صدمہ پہنچا تھا کہ کوئی ایک دفعہ بھی چادرہ اوڑھ کر دیدیتا تھا تو اُسے سونگھ کر بتا دیتے تھے کہ یہ مرد نے اوڑھا ہے یا عورت نے۔ اس قدر صحیح دماغ تھا ان کے صاحبزادے مولوی حکیم معین الدین صاحب موجود ہیں انھوں نے عجیب و غریب حکایتیں مولانا کی صحت دماغ کی سنائی تھیں۔ اب اس پیشین گوئی کو یا تو کشف کہئے یا فراست سمجھئے میں کم سن تھا یعنی اٹھارہ انیس برس کی عمر تھی۔ اس وقت حضرت نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ بھائی چند روز میں ہندوستان میں بھی کشمیر ہو جائے گا۔ حالانکہ اس زمانہ میں بڑی سخت گرمی پڑتی تھی مگر ممکن ہے کہ مولانا کو خفیف فرق محسوس ہو چلا ہو صاحب چند سال تک تو کچھ فرق معلوم نہ ہوا البتہ مولانا کی وہ بات یاد رہی پھر تو میں بھی تھوڑا بہت فرق محسوس کرنے لگا۔ اور اب تو بہت ہی فرق ہو گیا ہے۔ جو سخت گرمی کا زمانہ ہونا چاہیے اس میں بھی سردی ہوتی ہے۔ اس واسطے میں کہتا ہوں کہ ڈرو مت جب گرمی میں سردی ہے تو سردی میں تو سردا ہو گا۔ یعنی بہت قوی سردی ہو گی۔ سردا جو میں نے اس وقت کہا اس پر یاد آ گیا ایک قصہ لطیف۔ یہاں تھانہ بھون میں

کسی کے سامنے کسی نے نقل کیا کہ پورب میں دہی کو مذکر بولتے ہیں مطلب یہ تھا کہ یہاں تو بولتے ہیں مثلاً دہی میٹھی ہے لکھنؤ میں بولتے ہیں دہی میٹھا ہے۔ تو آپ سنکر بولے کہ پورب میں کیا دہی کو دہا کہتے ہیں۔ ایک اس سے بڑھ کر ہوئی۔ میرے ایک عزیز ایک بڑے عاقل صاحب سے یہ حکایت بیان کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اس طرح تمہید اٹھائی کہ بعضے ایسے بیوقوف ہوتے ہیں کہ پوری بات تو سنتے نہیں بے سوچے سمجھے خواہ مخواہ بیچ میں ٹانگ اڑا کر ناحق دوسروں کے سامنے ذلیل اور شرمندہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے وطن کا واقعہ ہے۔ ایک صاحب نے ایسی ہی حماقت کی تھی۔ اور وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص ایک صاحب کے سامنے یہ بیان کر رہے تھے کہ پورب میں دہی کو مذکر بولتے ہیں۔ یہاں تک پہنچنے پائے تھے کہ وہ مخاطب صاحب بڑے بوجھ بجھکڑ بن کر بولے کہ کیا دہا بولتے ہیں اب وہ عزیز چپ کر آگے کیا کہوں۔ انھوں نے تو اب کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہ رکھی۔ انھوں نے کہا کہ آپ بیچ میں چپ کیوں ہو گئے پورا واقعہ تو سنائیے۔ پھر کیا ہوا۔ عزیز نے کہا اب اس حکایت کا مزہ ہی نہ رہا میں اب آپ سے کیا کہوں کہ کیا ہوا۔ یہی ہوا جو اس وقت ہوا کہ انھوں نے بھی یہی کہا کہ کیا دَہا بولتے ہیں پھر تو وہ صاحب اس قدر شرمندہ ہوئے جس کی حد نہیں کہ ناحق میں نے بیچ میں بول کر اپنی حماقت ظاہر کی۔ اس لئے میں نے یہ حکایت بیان کی کہ وہ دہی کا مذکر دَہا سمجھا۔ اسی طرح میں نے سردی کا مذکر سردا بولا۔ تو سردا پر یہ حکایت یاد آگئی تھی۔ غرض ڈرو مت کہ ابکے رمضان گرمی میں آرہے ہیں۔ اطمینان رکھو ان شاء اللہ بہت آسان رہیں گے اور ابھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ نصف شعبان کو جو روزہ ابکے رکھا تھا وہ بھی کچھ معلوم نہیں ہوا۔ آپ ان شاء اللہ تعالیٰ دیکھ لیجئے گا کہ بہت ہی آسانی کے ساتھ روزے گذریں گے (چنانچہ بفضلہ برکت قول حضرت اب تک ۹ روزے نہایت سہولت کے ساتھ ہو چکے ہیں کیونکہ خلاف موسم بجائے گرمی کے اچھی خاصی سردی پڑ رہی ہے بالخصوص بوجہ بارش ہو جانے کے اتنی سردی بڑھ گئی ہے کہ تراویح میں اور نماز فجر میں چادر کی حاجت ہوتی ہے اور دن بھر ابر رہتا ہے۔ امید ہے کہ ختم رمضان تک ان شاء اللہ یہی کیفیت رہیگی ۱۲ از کاتب

[illegible]

اور یوں کوئی عہدی کہے کہ چاہے سردی ہو یا گرمی ہمیں تو روزہ میں تکلیف ہی ہوتی ہے تو اس کا کوئی علاج ہی نہیں کیونکہ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ روزہ ہی فرض نہ ہوتا۔ اور میں شکایت کرتا ہوں کہ جو یوں کہتے ہیں کہ گرمی کیوجہ سے روزہ نہیں رکھا جاتا تو اگر گرمی سبب ہوتا روزہ نہ رکھنے کا تو جس وقت غلبہ ہوتا گرمی کا اسوقت کھاتے پیتے۔ میرا معمول ہے کہ میں بعد نمازِ فجر منزل پڑھتا ہوا جنگل کو نکل جاتا ہوں میں نے پارسال رمضان میں دیکھا کہ صبح کا وقت ہے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور ایک صاحب بیٹھے تربوز اڑا رہے ہیں۔ بھلا فرمائیے یہ کونسا وقت تھا تربوز کھانے کا کیا اس وقت گرمی ستا رہی تھی، کیا اس وقت پیاس کا غلبہ تھا۔ کچھ نہیں شرارت ہے بدمعاشی ہے غرض یہ روزہ نہ رکھنا تو پورا اتلافِ حق ہے۔ خلاصہ یہ کہ روزے کے تو یہ حقوق ہیں۔ دوسری عبادت ہے تراویح۔ اس کی ایسی گت بناتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ اتنی بڑی تو نعمت اور سمجھتے ہیں کہ اب تو کمبختی آئی۔ ۲۰ رکعتیں پڑھنی پڑینگی۔ کوئی حد ہے اور جو کوئی حافظ ہوئے ذرا مُجَوِّد پھر تو گویا قیامت کا سامنا ہے۔ اول تو ایسے حافظ کو کوئی تجویز ہی نہیں کرتا اور اگر کبھی لیا تو جلدی پڑھنے کی فرمائش کر کر کے ایسا تنگ کرتے ہیں کہ آئندہ کیلئے وہ توبہ کر لیتا ہے کہ انہیں تو اب کبھی سناؤنگا نہیں، یعنی یوں چاہتے ہیں کہ صرف اٹھک بیٹھک ہو اور ۲۰ پوری ہو جائیں، کانپور میں ایک بیچارے حافظ تھے جو ذرا رکوع سجدہ اطمینان کیساتھ ادا کرتے تھے اور قومہ میں بھی کچھ دیر لگاتے تھے، حافظ عبد اللہ مرحوم جامع مسجد نے خود سنا کہ لوگ بعد تراویح کے اس مسجد سے نکلتے ہوئے یوں کہہ رہے ہیں ارے میاں تراویح کیا ہیں قید خانہ ہے بس جا کر پھنس جاتے ہیں، رکوع میں گئے تو رکوع ہی میں ہیں، سجدے میں چلے گئے تو اب سر ہی نہیں اٹھتا التحیات پڑھنے بیٹھے تو اب کسی طرح سلام ہی نہیں پھیرتے، جان مصیبت میں آجاتی ہے غرض یوں چاہتے ہیں مقتدی کہ امام بس التحیات پڑھکر ہی سلام پھیر دیا کرے اور اسکو بہت پسند کرتے ہیں جو حافظ ریل ہو، اور ریل بھی کونسی مال گاڑی نہیں پسنجر نہیں ڈاک نہیں اسپیشل ہو اور اب اللہ بھلا کرے

ایجاد کرنیوالوں کا ریل سے بھی بڑھکر ہوائی جہاز چل گئے ہیں اب تو لوگ یہ چاہیں گے کہ حافظ جہاز ہوں، لیکن لوگ ابھی ہوائی جہازوں پر سوار نہیں ہوئے ورنہ ان شاء اللہ تعالیٰ اسکی تمنا بھی کرنے لگیں گے، ایک حافظ تھے نابینا۔ مر گئے ہیں بیچارے۔ ان کے تیز پڑھنے کا حال کچھ نہ پوچھو بس گن گن گن گن گن گن غفورا بن بن بن بن بن شکورا شکورا غفورا کے سوا کچھ خبر نہیں کہ کیا الفاظ منہ سے نکل رہے ہیں۔ اور یہ پتہ تو کیا چل سکتا تھا کہ کونسا رکوع پڑھ رہے ہیں یا کونسا پارہ ہے بس اندھا دھند آندھی کی طرح اڑے چلے جاتے تھے مگر مقتدی ان سے ایسے خوش تھے کہ سبحان اللہ کیا ہلکی پھلکی تراویح پڑھاتے ہیں اور میں تمہیں اس سے بھی زیادہ ہلکی پھلکی ترکیب بتا دوں، وہ یہ کہ بالکل نہ پڑھو، تو میں نے ترکیب ایسی بتا دی ہے کہ اس سے زیادہ ہلکی پھلکی تراویح ممکن ہی نہیں، کیونکہ ہلکی پھلکی ہونیکے بھی مراتب ہیں، جیسے جلدی کے مراتب ہیں، جلدی کی حکایت سُنئے۔ ایک نائی کو اس کے کسی ججمان نے کوئی ضروری خط دیا کہ فلاں شخص کو جا کر دے آدے خط اس سے کہیں کھو گیا، تھا بڑا چالاک، شریر نے کیا حرکت کی کہ سادہ کاغذ لیکر اور اسے ایک سادہ ہی لفافہ میں بند کر کے بس مکتوب الیہ کے پاس پہونچ گئے، اور اسے دے کر کہا کہ میاں نے یہ لفافہ آپ کے نام بھیجا ہے۔ اس نے کہا اور اس پر کچھ پتہ تو لکھا ہی نہیں ہے، نائی نے کہا حضور جلدی بہت تھی۔ پتہ لکھنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ خیر کھولکر دیکھا تو اندر بھی ایک سادہ کاغذ رکھا ہوا ملا جس پر کوئی تحریر نہ تھی۔ الٹ کر دیکھا کہ شاید دوسری طرف لکھا ہو مگر ادھر بھی کورا نظر آیا، اب تو بڑے چکرائے، پوچھا میاں کچھ کہو تو آخر یہ معمّا کیا ہے کہ نہ باہر کچھ لکھا ہے نہ اندر۔ یہ خط ہی کیا ہوا اس نے کہا حضور میں نے عرض تو کیا بہت جلدی تھی، کچھ لکھ ہی نہ سکے پوچھا کچھ زبانی کہہ دیا ہے، کہا حضور کہاں، بہت جلدی تھی، زبانی کہنے کی بھی فرصت نہیں ہوئی، تو یہ سوا مسخرہ پن کے کیا ہوا۔ یہ کوئی جلدی تھی۔ خیر یہ تو تمثیلی حکایت ہے جلدی کی ایک حکایت دیکھی ہوئی بھی ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے یہاں ایک ملازم تھا عبد اللہ۔ بڑا ہی بیوقوف تھا (پھر مزاحاً فرمایا ۱۲ کاتب)

اور لوگ بھی اس نام کے اس وقت موجود ہیں، ان میں سے کوئی مراد نہیں کہیں کسی کو شبہ ہو، وہ تو بیچارے مر بھی گئے۔ یہاں جتنے اس نام کے ہیں تو وہ ما شاء اللہ زندہ ہیں (جلسۂ وعظ میں ایک نوجوان صاحب اسی نام کے موجود تھے جو حضرتؒ کے پرجوش خدام میں سے ہیں، انہیں کیطرف حضرت کا اشارہ تھا، انہوں نے اپنی عقلمندی کا اس طرح ثبوت دیا کہ بھرے مجمع میں آپ پکار کر فرماتے ہیں کہ نہیں میں بھی ایسا ہی ہوں پھر بعد کو بہت پچتائے کہ واقعی مجھ سے حماقت ہوئی کیونکہ بہرصورت یہ حرکت آداب مجلس کے خلاف تھی ۱۲ کاتب) دنیا میں بعضے بڑے ہی کم عقل آدمی ہوتے ہیں، ایک دن آپ گھر کی طرف سے دوڑے ہوئے آئے اور کہا کہ اجی مولانا کے گھر میں سے یوں کہا ہے کوئی کام تھا جلدی کا، وہ گھر میں سے کہلا کر بھیجا تھا کہ جلدی جا کر کہہ آ۔ آپ دوڑے ہوئے پہنچے اور کہا مولانا یوں کہا ہے، مولانا نے جب پوچھا کیا کہا ہے۔ تو آپ کیا فرماتے ہیں کہ اجی میں تو بھول گیا یعنی دوڑنے کیطرف توجہ زیادہ تھی۔ اہتمام یہ تھا کہ جلدی جا کر خبر دوں۔ اس اہتمام میں دوسری طرف توجہ رہی نہیں اور اس خبر کو ہی بھول گئے۔ جو پہنچانی تھی ہمارے یہاں بھی ایک طالبعلم تھے عید و شاہ مر گئے بیچارے۔ میں نے بلا کر ایکدن ان سے کہا کہ تم حافظ لطیف احمد کو جانتے ہو اس نے کہا جی ہاں جانتا ہوں، میں نے کہا وہاں جاؤ، آگے میں کہتا ہی کہ وہاں جا کر یہ کرو لیکن کون انتظار کرتا ہے، بس یہ سنتے ہی کہ وہاں جاؤ آپ چلدیئے۔ میں نے واپس بلا کر پوچھا کہ تم چل کہاں دیئے کہا حافظ لطیف کے یہاں میں نے پوچھا وہاں جا کر کیا کرو گے۔ کہا بس چلا جاؤنگا جو حکم ہوا تھا وہ کر دوں گا۔ وہ عجیب چیز تھے صاحب۔ تو جیسے ایک مرتبہ جلدی کا یہ بھی ہے اسیطرح ایک درجہ ہلکے پھلکے رہنے کا بھی یہ ہے کہ تراویح پڑھی ہی نہیں بالکل۔ چنانچہ بعضے ایسا بھی کرتے ہیں، ارے بندے خدا کے جب نام کیا تراویح کا اور ایک گھنٹہ کی مشقت اٹھائی تو پاؤ گھنٹہ کی مشقت اور سہی۔ اور زیادہ وقت تو اٹھنے بیٹھنے میں لگتا ہے۔ اچھی طرح ادا کر کے پڑھنے میں اور گھسیٹ کر پڑھنے میں

آزما کر اور گھڑی لیکر دیکھ لو۔ دس پندرہ منٹ سے زیادہ تفاوت نہیں نکلے گا۔ پھر افسوس ہے صرف دس پندرہ منٹ کیلئے قرآن کو بگاڑ کر پڑھا جائے اور تراویح کو خراب کیا جائے، پھر تراویح سے فارغ ہوکر کوئی کام بھی تو نہیں محض باتیں کرنے کے سوا۔ افسوس کی بات ہے کہ تراویح کو تو یوں خراب کرو اور کھانیکو نہ خراب کرو بلکہ رمضان میں تو اور مہینوں سے زیادہ لذیذ کھانیکا اہتمام کرتے ہو کہ بھنا ہوا گوشت بھی ہو چٹنی کیلئے امچور بھی ہو دھی بڑے بھی ہوں، پھلکیاں بھی ہوں، گھونگھنیاں بھی ہوں شربت بھی ہو وغیرہ وغیرہ پھر شرم نہیں آتی کہ غذائے جسمانی تو اور دنوں سے اچھی ہو اور غذائے روحانی کو خراب کر کے کھاؤ۔ سبحان اللہ کیا اچھا فیصلہ ہے۔ اور نماز کی تحسین میں یہ بھی داخل ہے کہ اذان وقت سے پہلے نہ ہو۔ بعض مسجدوں میں رمضان میں یہ بھی ہوتا ہے کہ عشاء کی اذان وقت سے پہلے دیدیتے ہیں بس ملاجی نے کھانا کھایا اور اللہ اکبر پکار دیا، بلکہ بعض مسجدوں میں تو وقت سے پہلے نماز بھی شروع کر دیتے ہیں۔ زیادہ اہتمام اس کا ہوتا ہے کہ تراویح سے جلدی فارغ ہوکر لیٹ جائیں۔ اور لیٹنے کو یوں جی چاہتا ہے کہ پانی پیتے ہیں بیحد۔ یہ سخت غلطی ہے یعنی طباً بھی مضر ہے۔ ذرا پیاس کو روک کر پانی پیئیں تو تراویح بھی بشاشت سے ہوں، اور قرآن بھی اچھی طرح سن سکیں۔ ہمت والوں نے تو یہاں تک کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ۶۱ قرآن شریف ہر رمضان میں ختم کرتے تھے ایک ختم تو روزانہ دن میں کرتے۔ اور ایک رات کو ایک وہ جو ہمیشہ تراویح میں پڑھنے کا معمول تھا، غرض اس ایک مہینہ میں ۶۱ قرآن شریف پڑھتے تھے۔ تو دیکھو ایک اللہ کے بندے وہ بھی تو تھے۔ غرض تراویح کو جو کہ مخصوص عبادت رمضان المبارک کی ہے اور اس کے وہ حقوق ہیں جو میں نے عرض کیئے کہ ٹھیک وقت پر بھی ہوں رکوع سجود بھی اچھی طرح ہو تشہد بھی اچھی طرح ہو جلدی مت کرو تلاوت جو اسمیں کیجاتی ہے وہ بھی اچھی طرح ہو۔ اور ایک عبادت رمضان المبارک کی تلاوت قرآن ہے اس کے حقوق میں سے یہ ہے کہ تصحیح کے ساتھ پڑھا جائے۔ لیکن اس کی حالت یہ ہے کہ اول تو اس کا

اہتمام ہی نہیں ہے تصحیح کا طریقہ ہی نہیں سیکھتے اور اگر طریقہ بھی سیکھ لیا تو اس پر عمل نہیں کرتے۔ اور اگر عمل کرتے ہیں تو یارانِ طریقت پریشان کرتے ہیں. کوئی کہتا ہے کہ بھائی اچھی قرأت سیکھی قرآن پڑھتے ہو یا جھینکتے ہو. کوئی کہتا ہے کہ قرآن پڑھتے ہو یا گاتے ہو. کوئی کہتا ہے کہ الفاظ کو توڑ مروڑ کر کیوں ادا کرتے ہو بس فر فر پڑھتے چلے جاؤ، نہیں معلوم یہ فر فر کیا صیغہ ہے کیا فرّ ہے جو ماضی ہے اور جس کا مقصد فرار ہے بمعنی بھاگنے کے۔ محاورات میں تطابق بہت ہوتا ہے اُردو میں فر فر اس کو کہتے ہیں جہاں بھاگتا ہوا پڑھا جاتے. ایک ہمارے دوست ہیں حکیم صاحب انہوں نے تراویح میں قرآن سنانا چاہا مگر پڑھتے تھے صحیح چنانچہ والاالضالین کو جو صحیح مخرج سے ادا کیا مقتدی بگڑ گئے کہ ہم ان کے پیچھے تراویح نہ پڑھیں گے چنانچہ ان بیچاروں کو وہاں سے جدا ہونا پڑا۔ اب یہ مصیبت ہے کہ کوئی تصحیح کے ساتھ پڑھے تو لوگ پڑھنے نہیں دیتے، ایک مخلوق پریشان کرنے لگتی ہے تو بعض بعضوں نے تو یہ سستا نسخہ یاد کر رکھا ہے کہ والاالضالین کو والاالظالین پڑھتے ہیں. سمجھتے ہیں کہ یہ ظا اور ض باہم متشابہ ہیں گویا دونوں متحد الصفات ہیں پھر دونوں میں مغائرت کیسی اسی طرح دوسروں نے یہ سستا نسخہ یاد کر لیا ہے کہ ولاالضالین کو والدّالین پڑھتے ہیں. اور دا اور ض کے فرق کیلئے ذراض کو موٹا سا پڑھدیا۔ اور جہاں دال ہے وہاں باریک سا پڑھدیا۔ اس موٹے باریک پر مجھے وہی حکایت یاد آتی ہے کہ لکھنؤ میں تھے ایک مولوی صاحب معقولی جو امامت بھی کرتے تھے۔ وہاں ایک مولوی مہدی تھے۔ وہ بیان کرتے تھے کہ اُن معقولی مولوی صاحب کی یہ عادت تھی کہ قریب قریب ہر جہری نماز کے اندر پہلی رکعت میں تو تبت اور دوسری رکعت میں قل ہو اللہ پڑھتے تھے۔ اور وہ تھے تو مولوی مگر قرآن پڑھتے تھے بہت غلط۔ صاحب بعضے تو بہت ہی غلط پڑھتے ہیں یعنی اکثر اہل علم کو بھی تصحیح کیجانب التفات نہیں، بریلی میں ایک صاحب من الجنۃ والناس کے بجائے من الجنات والنس پڑھتے تھے۔ آپ نے یہاں کا الف وہاں جا لگایا، یعنی والناس میں جو الف ہے اس کو گرا کر من الجنۃ میں پڑھا دیا

ایسا ناس کیا، بس ان سے یہی کہنا چاہیئے کہ ام بہ جنہ۔ عالموں نے بھی تو ایسا ہی ناس کیا ہے ان کا معمول ہے کہ اگر کسی کا ناس کرنا ہو تو سورۂ ناس اس طرح پڑھنے کو بتلاتے ہیں، قل اعوذ برب الناس ناس ناس ملک الناس ناس ناس غرض ناس کے لفظ کو ہر جگہ تین دفعہ پڑھنے کو کہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے قرآن شریف اردو میں ہے کہ یہاں ناس کے وہی معنے ہیں جو اردو میں ناس کے ہوتے ہیں، جیسے کہتے ہیں کہ فلانے کا ناس جائے یعنی ستیاناس ہو۔ لاحول والاقوۃ، تو بعض لوگ قرآن شریف کی اس طرح گت بناتے ہیں جیسے کسی بڑھیا نے باز کی گت بنائی تھی، تو اسی طرح لکھنؤ کے وہ معقولی صاحب بھی ابی لہب کے بجائے ابی لحب پڑھتے تھے، مولوی مہدی کہنے لگے کہ سنتے سنتے میرے کان پک گئے جب دیکھو تبت یدا ابی لحب و تب کہنے لگے کہ میں نے ایک روز جاکر خلوت میں کہا کہ مولانا آپکی اتنی بڑی تو شان ہے اور شہرت ہے اور آپ کلام مجید غلط پڑھتے ہیں یہ آپ کی شان کے خلاف ہے کہا کیا غلط پڑھتا ہوں، انہوں نے کہا آپ ابی لحب پڑھتے ہیں اور یہ غلط ہے انہوں نے کہا اور کیا پڑھوں کہا یوں پڑھا کیجئے۔ ابی لہب ادب کیوجہ سے ذرا پست آواز سے بتایا، یہ سنکر مولوی صاحب کیا فرماتے ہیں اچھا آہستہ سے پڑھا کروں گا پکار کر نہ پڑھا کرونگا۔ سبحان اللہ کیا خوب سمجھے یہ مولوی ہیں آجکل کے، انہوں نے تو خود ادا کر کے ابی لہب کے صحیح تلفظ بتانا چاہتا تھا اور آہستہ سے اس لئے بتایا کہ بے ادبی نہ ہو۔ آپ یہ تو سمجھے نہیں کہ بجائے حا حطی کے ہا ہوز پڑھنے کو کہہ رہے ہیں اور سمجھے تو یہ سمجھے کہ شاید میں بہت بلند آواز سے پڑھا کرتا ہوں آہستہ پڑھنے کی ہدایت کر رہے ہیں انہوں نے کہا واہ حضرت خوب سمجھے۔ جب انہوں نے کھولکر کہا کہ بھائی ابی لہب میں حا حطی نہیں ہے ہائے ہوز پڑھا کرو تب کہیں ان کے سمجھ میں آیا۔ یہ مولوی آدمی ہیں، صاحب جو اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے آج کل مولوی ہونا کیا مشکل ہے ایک آدھ کتاب صرف نحو کی پڑھ لی کچھ قرآن حدیث کا ترجمہ دیکھ لیا۔ بس مولوی بن گئے۔ چنانچہ ہمیں ایک ایسے ہی مولوی صاحب ایک سفر میں ملے، کنڈا ایک مقام ہے ضلع اعظم گڈھ میں وہاں میرے ایک دوست ہیں،

تحصیلدار ہیں ان کا بُلایا ہوا وہاں گیا تھا ایک صاحب مولوی صاحب کہلاتے تھے ملنے آئے جو سب کچھ گذار تھے یعنی تہجد گذار اور شاید مال گذار بھی ہوں ، یعنی امیر بھی ہوں عمر بھی بہت تھی مگر عمر بھر کسی نے ان کو خرابی قرآن مجید کے ترجمہ دیکھنے کی نہ بتائی تھی حالانکہ بعضوں کیلئے ترجمہ دیکھنا حرام ہے اب لوگ ہمیں متعصب کہتے ہیں متشدد کہتے ہیں مگر ہم کیسے اجازت دیدیں ، کیا ان تجربوں پر خاک ڈالدیں ۔ اور ایک تجربہ نہیں بہت تجربے ہیں ۔ ایک تجربہ مجھے اس وقت یاد آگیا ، ہاں تو اُن صاحب نے پہلے یہ آیت پڑھی **یاایھاالذین اٰمنوا لاتقولوا راعنا** اور اس کا ترجمہ پڑھا کہ اے ایمان والو راعنا مت کہو پھر آپ کیا کہتے ہیں کہ تلاوت کرتے وقت کیا راعنا کا لفظ چھوڑ دینا چاہیئے ۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ مت کہو راعنا تو اس آیت کا یہ مطلب آپ نے سمجھے مجھے اس قدر حیرت ہوئی ، کہ جس کی انتہا نہیں کیوں کہ اس سے پہلے ایسا عجیب مطلب میں نے کبھی نہیں سُنا تھا ۔ میں نے کہا کہ جاؤ ہم نہیں بتاتے کہ کیا مطلب ہے بس مطلب یہ ہے کہ خبردار جو تم نے کبھی ترجمہ دیکھ کر قرآن مجید پڑھا ، بس سادی تلاوت کرتے رہو اور تم راعنا بھی پڑھتے رہو ۔ باقی جو مطلب ہے اس آیت کا اُسے تم جیسے کوڑھ مغز ونکے آگے کیا بیان کیا جائے ۔ اندھوں کے آگے روؤے اپنی آنکھیں کھووے ، بس خبردار جو کبھی ترجمہ دیکھا تو حضرت وہ جاہل سمجھا تھا کہ ابی لہب جو چپکے سے کہا ہے تو یہ مطلب ہے کہ آہستہ پڑھا کرو ۔ انہوں نے کہا مولوی صاحب ڈوب جاؤ ۔ کیا خوب مطلب سمجھے ، تو حضرت یہ حالت ہورہی ہے فہم کی اور بے توجہی کی ۔ جیسے چھوٹی د کو موٹا کرکے پڑھدیا تو بڑی ح ہوگئی ایسے بعض حروف کو سمجھتے ہیں کہ اگر باریک کرکے پڑھدیا تو دال ہوگئی ۔ اور اگر موٹا کرکے پڑھدیا تو ضاد ہوگیا بس اس پر قناعت کر رکھی ہے غرض اوّل تو تصیح مخارج کی طلب ہی نہیں اور اگر طلب بھی ہوئی کسیکو تو یہ نہیں مشق کریں بلکہ علماء سے تحقیق کرنے بیٹھ جائیں کہ والاالضالین کو والاالظالین پڑھنا چاہیئے یا والاالدٓالین ، امدالفتادیٰ میں کوئی فتویٰ اس قدر مکرر نہ ہوگا جسقدر کہ یہ مسئلہ ہر شخص یہی ضالین والین کا سوال کرتا ہے

حالانکہ ض کثرت سے کلام مجید میں موجود ہے مثلاً والضحیٰ میں ہے بحث جب ہوگی تو والا الضالین ہی میں غرض اس قسم کی فضول تحقیق تو ہر شخص کرتا ہے مگر یہ توفیق کسی کو نہیں ہوتی کہ مشق کرے کیونکہ یہ فن تو مشق ہی سے آتا ہے نری تحقیق علمی سے کہیں کچھ حاصل ہوتا ہے ایک قاری صاحب سے کسی نے پوچھا کہ ض کی صفت کیا ہے کہا میاں اگر میں نے صفت بیان بھی کردی تو اس سے کیا ہوتا ہے ض کی ہیئت اور کیفیت جو ہے وہ نرے بیان سے کسطرح ظاہر ہو جائے گی۔ جبتک اس کو ادا کر کے بھی نہ بتایا جائے۔ پھر یہ شعر پڑھا نہایت برجستہ ؎

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید لیک حیرانم کہ نازش را چساں خواہد کشید

(اگر مصور نے اس محبوب کی تصویر بنا بھی لی مگر اس بات سے حیران ہوں کہ اس کے ناز و ادا کی کس طرح تصویر بنائے گا۔)

سبحان اللہ وہ جو ایک آن ہے اور ادا ہے وہ صفات مخارج کے بیان کر دینے سے کیسے معلوم ہوگی۔ وہ جو ایک لوچ ہے وہ کیسے معلوم ہوگا وہ تو سماع کے متعلق ہے اب کسی نے توجہ کر کے خیر مشق بھی کر لی تو وہ اب نشانۂ ملامت ہے سب کا۔ مولانا فتح محمد صاحب ادرئی تشریف لے گئے تھے فرماتے تھے کہ میں نے جو اول بار فجر کی نماز پڑھائی تو بس قیامت اُڑے ہی رہ گئی، میں نے سورۂ قیامت پڑھی۔ یہ خبر نہ تھی کہ قیامت نازل ہو جائے گی، سلام پھیرتے ہی ایک صاحب نے اعتراض جڑا کہ وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربہا ناظرۃ میں آپ نے دونوں جگہ ظ پڑھی ہے مولانا نے ہر چند فرمایا کہ نہیں بھائی میں نے ایک ظ پڑھی ہے ایک جگہ ض۔ مگر وہ نہیں مانا مولانا حیران کہ اب اُسے سمجھائیں کیسے۔ سمجھے تو وہ جو فن تجوید جانتا ہو مگر مولانا نے ایک عجیب طریقے سے اُسے سمجھایا۔ فرمایا کہ اچھا اب یہ بتاؤ کہ میں نے دونوں جگہ ایک سا پڑھا تھا یا کچھ فرق تھا کہا تھا تو فرق۔ خیر وہ ہٹ دھرم نہیں تھا ورنہ اس کا بھی انکار کر دیتا، فرمایا بس اتنا ہی فرق ہے ظ اور ض میں۔ اور صاحب پڑھے لکھے لوگ بھی تو کثرت سے اس غلطی میں مبتلا ہیں اور اس قدر اسپر جمود ہے کہ

اگر کوئی اتباع کرنا چاہے تو اس کے پیچھے پڑجاتے ہیں پھر جب اہل علم جو مصلح ہیں انکی یہ حالت ہے کہ تو عوام کو کیا کہا جائے اسی لئے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اے عزیز صحت کی کیا امید رکھ سکتے ہو جب تمہارے طبیب ہی بیمار ہیں سچ ہی ہے واللہ باستثناء بعض کے خود اطباء ہی بیمار ہیں۔ یہ میں نہیں کہتا کہ مولوی زنا کرتے ہیں یا شراب پیتے ہیں لاحول ولاقوۃ مگر ایک علت ہے وہ میں بھی اپنے اندر پاتا ہوں اس سے میں خود بھی بری نہیں، وہ علت کیا ہے غرض پرستی۔ اور غرض پرستی وہ چیز ہے کہ ؎

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد　　صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد
چوں دہد قاضی بدل رشوت قرار　　کے شناسد ظالم از مظلوم زار

(جب غرض آئی ہنر پوشیدہ ہوا۔ اور سینکڑوں پردہ دل کی طرف سے آنکھوں پر آجاتا ہے)

(جب قاضی خود فیصلہ کے وقت رشوت سے دل کو خوش کر رہا ہو تو ظالم اور مظلوم کی پہچان کس طرح سے ممکن ہوسکتی ہے۔)

یہ غرض وہ چیز ہے کہ جب حاکم دل میں یہ ٹھان لے کہ فلانے سے ایک ہزار روپیہ لوں گا۔ پھر روداد مقدمہ کی اس کی آنکھوں میں الٹی ہی نظر آئے گی ع کے شناسد ظالم از مظلوم زار۔ پھر وہ یہ نہیں دیکھے گا کہ کون تو ظالم ہے اور کون مظلوم، اس غرض نے ہم کو تباہ کر رکھا ہے وہ غرض مال ہے جاہ ہے شہرت اعتقاد ہے بس اس نے ناس کر دیا ہے الا ماشاء اللہ منہم۔ بس یہ ڈرتے ہیں کہ اگر حق کا اتباع کریں گے تو آمدنی کم ہوجائے گی معتقد کم ہوجائیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ اس حالت میں وہ ہمارے کیا معتقد ہیں خود اپنے معتقد ہوئے۔ جانچ تو یہی ہے کہ ہم اتباع حق کا کریں پھر دیکھیں کہ کون ہمارے معتقد رہتے ہیں کون نہیں، وہ تو علماء سے یہ پوچھتے ہیں کہ چہ می فرمایند علماء دین دریں مسئلہ اور یہ الٹے ان سے پوچھتے ہیں کہ چہ می فرمایند جہلاء دنیا کہ خدا باید خواند یا دُو ادا اندریں

مسئلہ اندرین فتویٰ جب دیکھا کہ والاالضالین کے صحیح پڑھنے سے جہلاء ناراض ہوتے ہیں اور بداعتقاد ہوئے جاتے ہیں، بس غلط ہی پڑھنا شروع کر دیا۔ دیکھیے علماء دین نے اپنے فتویٰ سے رجوع کر لیا۔ میں کہتا ہوں کہ فتویٰ بھی نہ ہو غیرت اور شرافت کے بھی تو خلاف ہے کہ عوام سے ڈر کر حق کے اتباع کو چھوڑا جائے۔ حق کے مقابلہ میں عوام کو جوتی پر مارنا چاہیے۔ یہ خوب سمجھ لیجیے گا کہ حق کا اتباع اسی کو نصیب ہو سکتا ہے جسکی یہ شان ہو لایخافون فی اللّٰہ لومۃ لائم۔ اجی خدا سے کام ہے مخلوق کو جھاڑ و مارے۔ بس آزاد ہو کر رہے۔ بزرگوں کو یہاں تک آزادی حاصل تھی اور یہی ہونی چاہیے ؎

خلق میگوید کہ خسرو بت پرستی میکند   آرے آرے میکنم با خلق وعالم کار نیست

(مخلوق کہتی ہے کہ خسرو بت پرستی کرتا ہے یعنی پیر پرستی کرتا ہے ہاں ہاں میں ضرور کرتا ہوں مجھے مخلوق کی اس ملامت سے کچھ کام نہیں کیوں کہ میں توحید کامل کا اعتقاد رکھتا ہوں اور پیر سے صرف اللہ تعالےٰ کیلیے محبت رکھتا ہوں)

مخلوق اگر کہے کہ تم بت پرستی کرتے ہو تو جو آزاد نہیں ہیں وہ تو اس قول کی تردید کریں گے کہ نہیں صاحب میں بت پرستی نہیں کرتا، میرے ایسے عقیدے نہیں ہیں، اب بیٹھ کر للو پتو کرو جاہلوں کی، اور جو آزاد ہیں وہ کسی کے کہنے کی کچھ پرواہ نہیں کریں گے بلکہ صاف کہہ دیں گے کہ ؏ آرے آرے میکنم با خلق وعالم کار نیست۔ ہاں ہم بُت پرستی کرتے ہیں۔ جاؤ کر لو ہمارا کیا کرتے ہو کسی کے باپ کے غلام ہیں نوکر ہیں جو ڈریں۔ کسی نے کوئی تنخواہ مقرر کر رکھی ہے کہ خواہ مخواہ دبیں۔ جاؤ ہم بُت پرست ہی سہی۔ سب کے سب چھوڑ دو ہمیں، اور حضرت میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ حق میں وہ اثر ہے کہ اگر کوئی شخص حق کو قبول کر کے استغنا برتے اور یہ کہدے ؎

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو   دار و گیر و حاجب و دربان دریں درگاہ نیست

(جس کا دل چاہے آوے، جس کا دل چاہے نہ آوے ہمارے پاس کوئی دربان تو

مقر نہیں ہے ۔)

تو بڑے بڑے سرکش اس کے دروازے پر ناک رگڑیں گے۔ مگر دل کے اندر دغدغہ نہ ہو کہ سب چھوڑ دیں گے تو ہائے کیا ہو گا۔ لاحول ولا قوۃ مخلوق سے ڈر کر حق کو چھوڑ دینا نہایت ہی اوچھی بات ہے اور خصوص آمدنی کیلئے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ع حیف باشد دلِ دانا کہ مشوش باشد۔ دانشمند کا قلب روٹیوں کیلئے مشوش ہو افسوس کی بات ہے اس کا تو یہ مشرب ہونا چاہیئے ؎

موحد چہ بر پائے ریزی سرش چہ فولادِ ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد زکس ہمین ست بنیادِ توحید و بس

(جو توحید والا ہے اگر اس کے پاؤں پر سونے کا ڈھیر لگا دیا جائے یا اس کے سر پر تلوار رکھ دو ان کو نہ تو کسی سے امید ہوتی ہے نہ کسی سے خوف ہوتا ہے اور یہی توحید کی بنیاد ہے)

اور حضرت یہ تو ایک خاص مسئلہ کے متعلق گفتگو تھی ایسے ہی تمام احکام و اعمال ہیں، ماہرین کو چاہیئے کہ مستقل رہیں جہلاء کی مرض کا حق کے خلاف کبھی اتباع نہ کریں۔ اگر سب ایسا کرنے لگیں تو جہلاء کا کبھی حوصلہ نہ بڑھے اور جہلا کو بھی چاہیئے کہ اُن سے اپنے مرض کے اتباع کے منتظر نہ رہیں تو اے عوام اس مولوی کو چھوڑو جو تم سے ڈر کر تمہارا ہم خیال ہو گیا ہے وہ تو معلوم ہوتا ہے ٹٹو نلے بھاڑے کا۔ اور میرے کہنے کی بھی حاجت نہیں وہ تمہاری نظر سے خود ہی گر جائے گا۔ یہ تو ان عوام کا ذکر تھا جو علماء سے تعلق رکھتے ہیں مگر اُن سے اپنے مذاق کے اتباع کا انتظار کرتے ہیں، اور علماء اُن سے ڈر کر انکی مرضی کا اتباع کرتے ہیں، بعضے عوام وہ ہیں کہ علماء سے تعلق ہی نہیں رکھتے یہ لوگ کتابیں اور ترجمے دیکھ کر اپنے کو علماء سے مستغنی سمجھنے لگے ہیں، سو حضرت خوب سمجھ لو میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایسی ایسی باریک باتیں ہر فن میں موجود ہیں کہ بدون ماہر کے بتائے ان تک کسی کی نظر پہنچ ہی نہیں سکتی۔ اس واسطے ہر امر میں شیخ اور ماہر کے اتباع کی حاجت ہے کیونکہ ایک چیز بظاہر خیر

محض نظر آتی ہے لیکن ماہر اس سے منع کر دیتا ہے کیوں۔ اسلیئے کہ وہ مفضی ہے۔ الی الشر۔ اور اس شر تک غیر ماہر کی نظر فی الحال پہنچنے سے قاصر ہے پرسوں ہی کا واقعہ ہے۔ ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ ایک استفتا میرے پاس آیا، وہ مثال ایک مسئلہ کی تحقیق کے ضمن میں مجھے پیش آئی۔ وہ مسئلہ خیر سب کو معلوم ہی ہے لیکن مجھے اس کی مثال عرض کرنا ہے کہ ہر فن میں بہت سی باریک باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں ماہر ہی سمجھتا ہے غیر ماہر نہیں سمجھ سکتا۔ چنانچہ جزئیات میں عرض کروں گا وہ اس سے پہلے شاید کسی کے ذہن میں کبھی نہ آئی ہوگی۔ ایک شخص نے استفتا کیا کہ میرے گھر میں کچھ ایسا سلسلہ ہے کہ جب رمضان المبارک کا مہینہ قریب آتا ہے تو بچہ پیدا ہوجاتا ہے اور روزہ دو وہ چلہ چھٹی میں قضا ہوجاتے ہیں پھر سال بھر تک ضعیف رہتی ہے پھر دہی بچہ غرض قضا روزوں کے رکھنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اب کیا کرے جب قضا روزے نہیں رکھ سکتی تو کیا فدیہ دیدے میرے ذہن میں یہ آیا کہ مسئلہ تو یہ ہے کہ جب تک امید ہے عودِ قوت اور عود صحت کی روزہ ہی رکھے فدیہ نہ دے خیر یہ مسئلہ تو ہے ہی مگر میرے جی میں یوں آیا کہ یوں لکھدوں کہ بالفعل چاہے فدیہ بھی دیدے لیکن اگر کبھی صحت اور قوت عود کر آئے تو فدیہ کو کافی نہ سمجھے بلکہ ان روزوں کی قضا بھی کرے۔ یہ آیا ذہن میں، میں نے اپنی نزدیک اسمیں یہ احتیاط سمجھی کہ اگر صحت اور قوت نے عود نہ کیا تو یہ فدیہ ہی دینا کافی ہوجائے گا۔ اور سال کے سال دیتے رہنے میں سہولت رہے گی۔ ورنہ بہت سا جمع ہوگیا تو شاید پھر نہ دے سکے۔ اسمیں دونوں رعایتیں ہوجاویں گی کہ نفع تو بہت اور نقصان کچھ نہیں۔ نفع تو یہ کہ اگر صحت اور قوت نے عود نہ کیا تو تھوڑا تھوڑا کرکے دینے میں فدیہ آسانی کیساتھ ادا ہوجائے گا۔ ورنہ جمع ہوکر کثیر رقم ہوجائے گی۔ جسکا ادا کرنا بھی دشوار ہوگا اور اگر صحت اور قوت نے عود کیا تو روزے رکھ لیئے جاتیں گے اور وہ فدیہ جو دیا جاچکا ہے تطوع ہو جائے گا وہ گویا نفل خیرات ہوجائے گی۔ جسکا ثواب الگ ملیگا۔ بس قریب تھا کہ یہی لکھدوں لیکن اللہ تعالے نے سنبھالا۔ دستگیری فرمائی۔ معًا شرح صدر ہوا کہ حالت عوام کی یہ ہے کہ فدیہ کو بدل سمجھتے

ہیں روزہ کا۔ اگر فدیہ دیدیا تو پھر بے فکر ہو جائیں گے۔ اور قلب میں تقاضائے قضائے صوم کا پیدا نہ ہوگا کہیں گے کہ فدیہ تو دے ہی چکے ہیں لہذا مجھے یہ لکھنا پڑا کہ جائز نہیں فدیہ دینا جبتک صحت وقوت سے نا امیدی نہ ہو جائے تو دیکھئے یہاں فدیہ ظاہر اہل علم کے نزدیک بھی خیر ہے، لیکن کتنے بڑے شر عظیم کو مستلزم تھا۔ تو میں نے یہ واقعہ مثال کے طور پر پیش کیا، بہرحال عوام کی خواہ کوئی قسم ہو سب کے ذمہ حق یہ ہے کہ اپنے کو علماء کے تابع بنا دیں نہ ان سے موافقت کی توقع رکھیں نہ انسے مستغنی ہوں اور نہ کسی حال میں انسے مزاحمت کریں پس انکا ادب یہ ہے کہ وہ مزاحمت نہ کریں اور تمہارا ادب یہ ہے کہ اگر وہ مزاحمت کریں تو تم متاثر نہ ہو تم تو نائب ہو جناب رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے، کیا تھوڑی دیر کیلئے وجدان کی طرف نظر کر کے دیکھو اگر جناب رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بھی عوام مزاحمت کرتے تو کیا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی ان کی خاطر سے موافقت کر لیتے پھر یا تو نائب ہونے کی حیثیت سے تم بھی وہی کرو جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کرتے ورنہ نیابت کا کام چھوڑ دو ؎

یا مکن با پیل بانان دوستی   یا بنا کن خانہ بر انداز پیل (دوبار)

(یا تو فیل بان یعنی ہاتھی والا سے دوستی مت کرو یا پھر اس کیلئے دروازہ بہت بڑا بناؤ تا کہ مع ہاتھی کے آجاوے)

یا مکش بر چہرہ نیل عاشقی   یا فرو شو جامۂ تقویٰ بہ نیل (دوبار)

(یا تو اپنے چہرہ پر عاشقوں کی ملامت نہ لگاؤ یا پھر جامۂ تقویٰ کو دریائے عشق میں تر کرو یعنی زاہد خشک کے بجائے عاشق حق بنو۔)

تو اس پر یہ سب گفتگو بڑھ گئی تھی کہ ماہرین سے مزاحمت کرتے ہیں، غیر ماہرین سوائے ماہرین تم انکی مزاحمت کی کچھ پرواہ نہ کرو، حق بات پر عمل کرو، اللہ پر توکل کر کے یہ سب کلام واو اور ضاد پر بڑھ گیا تھا، تو غرض تلاوت قرآن مجید میں تو یہ کوتاہیاں ہیں، اور بعض کوتاہیاں قرآن مجید کے متعلق اور قسم کی ہیں، چنانچہ بعضے لوگ قرآن مجید کو بے وضو چھوتے ہیں یہ حرام ہے۔ بعضے رحل قرآن یا کتاب پر رکھ دیتے ہیں۔ یہ اکثر میں

دیکھتا ہوں کہ طالبعلموں کو کہ اسکی کچھ پرواہ ہی نہیں کرتے فقہاء نے تو یہاں تک ملحوظ رکھا ہے کہ روٹیوں پر برتن رکھنے کی بھی ممانعت کی ہے کہتے ہیں کہ روٹی کے اوپر برتن رکھنا نہیں چاہیئے، کیونکہ یہ رزق کی بے ادبی ہے۔ جب روٹی کا یہ ادب ہے تو قرآن مجید کا تو بہت ہی بڑا ادب چاہیئے۔ اب رہ گیا اعتکاف۔ سو اسکی روح ہے خلوت، اور خلوت کی حقیقت یہ ہے کہ ترک تعلقات۔ خود نفس رمضان میں مقتضی موجود ہے ترک تعلقات کا لیکن ترک تعلقات کے معنے بھی سمجھ لیجیئے۔ ترک سے مراد تقلیل ہے یعنی جو تعلق غیر ضروری ہو یعنی جس کا ترک مضر نہ ہو اس تعلق کو ترک کردے چاہے وہ ضرر دنیا کا ہو چاہے آخرت کا، اور جو تعلق ضروری ہو اس کو ترک نہ کرے کیوں کہ جو تعلق ایسا ہے وہ مُضر نہیں۔ مثلاً اپنے کمانے کھانے کیلئے دنیا میں مشغول ہونا اور اپنی ہی دنیا کا تعلق نہیں بلکہ جو تعلق دوسرے کی دنیا کا بھی ہو جسکا نفقہ اس کے ذمہ واجب ہے وہ بھی تعلق مضر نہیں، میں نے بارہا کہا ہے اور اب پھر بانگِ دُہل کیساتھ ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص کنجڑا ہو اور وہ صبح سے شام تک پکارتا رہے لیلو کدو لیلو ترکاری یا کوئی پھیری والا دن بھر لیلو سوئی اور لیلو تاگا کہتا پھرے اس کے قلب کے اندر ذرہ برابر ظلمت پیدا نہ ہوگی۔ اتنے بڑے اور لمبے چوڑے کلام اور اتنی صداؤں اور نداؤں سے بھی اس کو مطلق ضرر نہ ہوگا۔ اور ایک شخص ہے جس کو بولنے کی ضرورت نہیں ہے بالکل فارغ بیٹھا ہے وہ کسی سے صرف اتنا پوچھ لے کہ تمہیں خبر ہے کہ زید کہاں ہے جبکہ زید سے اسکو کچھ تعلق نہ ہو یا بلا ضرورت یہ دریافت کرے کہ زید کب آئے گا میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو اس سے ظلمت پیدا ہوگی وہ اس سے نہیں ہوگی۔ اب اس سے زیادہ میں کیا دلیل پیش کرسکتا ہوں، کہ قسم کھا رہا ہوں۔ اگر یقین نہ ہو خود تمیز پیدا کر کے دیکھ لو واللہ آنکھوں سے نظر آجائے گا۔ کہ قلب کا ناس ہوگیا ظلمت نے احاطہ کر لیا نورانیت برباد ہوگئی، انشراح غارت ہوگیا۔ وہ جو ایک تعلق مع اللہ پیدا ہوگیا تھا اسکے درمیان ایک حجاب قائم ہوگیا اس واسطے کہ من حُسنِ اسلام المرء ترکہ ما لا یعنیہ

جب ترک مالا یعنیہ حسنِ اسلام ہے تو مالا یعنیہ ضرور مُخل حسنِ اسلام ہوگا، اس شخص کے ایک فضول جملہ نے اسلام کی رونق کو اسلام کی زینت کو اسلام کے نور کو برباد کردیا تو وجہ کیا کہ اس شخص کو ضرورت نہ تھی۔ اور اس کُنجڑے کو ضرورت تھی کہ لیلو کدو لیلو ترکاری، بس اب اس میں فرق یہ ہے کہ زاہدان خشک تو ضروریات کو ترک کرتے ہیں اور محققین صوفیہ غیر ضروریات کو۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ایک صاحب وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ اب ان سے کوئی ضروری بات پوچھنا چاہتا ہے تو ہوں ہوں کرتے ہیں چاروں طرف اشارے کرتے ہیں سر ہلاتے ہیں، ہاتھ چلاتے ہیں، آنکھوں سے گھورتے ہیں اب چاہے کوئی سُسرا سمجھے یا نہ سمجھے یا جو چاہے سمجھ لے مگر بولنے کے نہیں، کیونکہ جسنے عمل بتایا ہے اس نے درمیان میں بولنے سے منع کردیا ہے ارے اُلّو ضرورت کے موقع پر نماز تک میں بولنا جائز ہے گو نماز باطل ہوجائے گی بلکہ بعض صورتوں میں واجب ہے یہ تیرا وظیفہ کہاں کا نکلا ہے جو نماز سے بھی بڑھ گیا۔ حماقت اور جہالت اور کچھ بھی نہیں، حضرت یہاں سے ثابت ہوتی ہے ضرورت فقہ۔ حضرت جریج ایک عابد تھے امم سابقہ کے ان کا قصہ جناب رسولِ مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نقل فرمایا ہے کہ وہ کسی صومعہ میں رہ کر عبادت کیا کرتے تھے۔ ایک دن انکی ماں آئی اور صومعہ کے باہر سے پکارنے لگی ارے جریج ارے جریج۔ جریج ان بزرگ کا نام تھا، وہ اس وقت نفلیں پڑھ رہے تھے۔ بیچارے بڑے گھبرائے کہ اللہ کیا کروں کیا نہ کروں اُدھر تو ماں ہے اگر جواب نہیں دیتا تو ماں کی دلشکنی ہوتی ہے اور ماں کا دل توڑنا گناہ ہے اِدھر نماز ہے اگر بولتا ہوں تو نماز جاتی ہے اور نماز کا توڑنا بھی گناہ ہے بیچارے فقیہ نہ تھے ورنہ پریشان نہ ہوتے۔ خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے فقیہ نہ تھا ارشاد ہے۔ **وکان فقیھا لاجاب امہ** بالآخر انکی سمجھ میں یہ آیا کہ ماں کا حق اللہ کے برابر نہیں ہوسکتا ماں کا دل توڑنا اتنا بُرا نہیں جتنا خدا کی نماز کا توڑنا، لہذا وہ نہ بولے اور نماز میں مشغول رہے جب دیر تک کوئی جواب نہ ملا تو ماں غصہ میں یہ بددعا دیکر چلی گئی کہ اے اللہ جیسا کہ یہ میرے پکارنے سے نہیں بولا اور مجھے پریشان کیا کہ میں تو

اتنی دور سے اس کے دیکھنے کے اشتیاق میں آئی تھی اور اس نے میری بات بھی نہ پوچھی اسی طرح تو اسے پریشان کیجو۔ اور یہ بددعا دی کہ اے اللہ اسے موت نہ آوے جب تک یہ رنڈیوں کا منہ دیکھ لے۔ بھلی مانس نے کوسا بھی غضب کا، آخر تجربہ کار تھی۔ سمجھتی تھی کہ تقدس ہی کی وجہ سے اس نے میرے سے بے رخی کی ہے خدا کرے تقدس ہی اس کا ملیا میٹ ہو۔ جس پر اسے بڑا ناز ہے۔ بس حضرت چونکہ ماں کا حق تھا اس وقت واقع میں نماز میں بھی بولنا بس اسکی دُعا قبول ہوگئی۔ وہاں ایک عورت تھی۔ قریب کے گاؤں میں رہتی تھی۔ دیہاتن تھی۔ آوارہ ہوگئی تھی۔ اس کے ایک بچہ پیدا ہوا حرام کا۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ کس کا ہے۔ اُسنے سمجھا کہ اگر اور کسی کا نام لیتی ہوں تو جھگڑا بڑھتا ہے پوچھ گچھ۔ گواہ لاؤ۔ شہادت دو۔ یہ۔ وہ۔ سو بکھیڑے۔ ایسے کا نام کیوں نہ لے دوں جو کوئی جھگڑا ہی نہ پھیلے جو سب سے الگ تھلگ رہتا ہو اور جسکا کوئی حامی اور مددگار ہی نہ ہو۔ تاکہ جلدی سے معاملہ دب جاتے زیادہ فضیحتی نہ ہو۔ بس جناب اس گدھی نے کیا کیا بیچارے جریج کا نام لے دیا بس لوگ نام سُنتے ہی بھڑک اٹھے کہ افوہ اس کے یہ کرتوت لوگوں کی یہ عادت تو ہے ہی کہ بلا تحقیق روایات کو معتبر سمجھ لیتے ہیں، چنانچہ اب بھی دیکھ لیجئے بالخصوص اس معاملہ میں تو تحقیق جانتے ہی نہیں، بس جناب لوگ اس عورت کو لیکر اس بیچارے عابد کے اوپر جا چڑھے کہ توڑ ڈالو اس کا عبادت خانہ اسنے ہمیں اتنے دنوں دھوکہ ہی میں رکھا خلوت خانہ توڑ پھوڑ زبردستی اس کو نکالا اور کہنے لگے کیوں نالائق تیری یہ حرکتیں تجھے ہم سمجھتے تھے کہ بڑا عابد ہے بڑا زاہد ہے۔ تیرے یہ اعمال، وہ سمجھ گیا کہ ماں کی بددعا قبول ہوگئی۔ یہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔ مگر حضرت آخر مقبول بندہ تھا۔ بس فضل الٰہی کے ناز پر کیونکہ اس طریق میں اگر کوئی گرتا بھی ہے اپنے درجہ سے تب بھی بالکل نہیں گر جاتا۔ گو بادشاہ بادشاہی سے معزول ہو کر وزارت پر آجاتے مگر وہ ناز اور دماغ شاہی کا پھر بھی رہتا ہے لڑکے سے پوچھا بتلا رے تیرا باپ کون ہے اسنے کہا کہ فلانا چرواہا ہے جو جنگل میں فلاں جگہ رہتا ہے اب تو لوگ بڑے معتقد ہوئے اور بڑے گھبرائے۔ قدم چومنے لگے کہ بللہ حضور ہماری خطا معاف فرمادیں۔ لایئے ہم

ہم آپ کا عبادت خانہ سونیکا بنادیں چاندی کا بنادیں انہوں نے کہا بھائی میرا تو وہی گوندے کا جھونپڑا اچھا ہے مجھے سونے چاندی کا مکان نہیں چاہیئے۔ مجھے تو اپنے اسی جھونپڑے میں پڑا رہنے دو۔ اس کو فرما کر حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ لوکان فقیہا لاجاب امہ اگر وہ فقیہ ہوتا تو اپنی ماں کو جواب دیتا اور نماز کو توڑ دیتا۔ اب یہ کہ آیا یہ حکم عام ہے خواہ فرض نماز ہو یا نفل یا خاص ہے نفل ہی کے ساتھ اس کا فقہاء نے فیصلہ کیا ہے۔ جیسا اس واقعہ میں ایک غیر فقیہ سے یہ حرکت صادر ہوئی ایسے ہی اس حدیث کو سنکر اگر کوئی غیر فقیہ ہر جگہ بولنے لگے پٹر پٹر خواہ فرض نماز ہو یا نفل تو یہ کام فقہاء کا تھا کہ انہوں نے اس کو طے کر دیا کہ یہ حکم خاص ہے نوافل کے ساتھ اس شرط سے کہ ماں باپ کو خبر نہ ہو کہ یہ نماز پڑھ رہا ہے فرض نماز کے دوران اگر ماں بھی بولے تب بھی جواب نہ دے۔ رہا اضطراری احوال اس سے مستثنیٰ ہیں جیسے کوئی اندھا کوئیں میں گرتا ہو سبحان اللہ مجھے تو فقہاء کی قوتِ اجتہادیہ پر یہ شعر یاد آجاتے ہیں۔ واقعی حضرت دنیا کی سمجھ اور ہے دین کی اور ہے ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

(جس نے اپنا چہرہ روشن کیا حسن کا نکھار کیا ضروری نہیں کہ وہ دلبری بھی جانتا ہو اور جو شخص آئینہ رکھتا ہے ضروری نہیں کہ وہ سکندری یعنی آداب شاہی بھی جانتا ہو)

ہزار نکتۂ باریک تر زمو اینجاست نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

(ہزار نکتہ بال سے زیادہ باریک ہے اس راہ میں ہر سر کے منڈانے والے کیلئے ضروری نہیں کہ وہ قلندری بھی جانتا ہو)

حقیقت میں یہ تھوڑا ہی ہے کہ کتابیں پڑھ لیں اور فقیہ ہو گئے۔ کتابیں پڑھنے سے کیا ہوتا ہے فقیہ وہ شخص ہے جسمیں خداداد ملکہ اجتہاد کا ہو۔ جو شخص ایک مسئلہ بھی نہ جانتا ہو وہ فقیہ ہو سکتا ہے اور جو شخص ایک لاکھ مسئلے جانتا ہو وہ فقیہ نہیں ہو سکتا تفقہ اور چیز ہے اور ضبط جزئیات اور چیز ہے اور یہی وجہ ہے کہ علماء نے فیصلہ کر دیا ہے

اور علماء نے کیا فیصلہ کیا ہے خود حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ وعظ کہنے کا اہل ہر شخص نہیں ہے کیوں کہ ہر منصب کا وہی اہل ہو سکتا ہے جو اس منصب کے شرائط کا جامع ہو۔ یہ تھوڑا ہی ہے کہ ایک آدھ کتاب دیکھی۔ اور واعظ بن گئے (اور جا کر منبر سنبھال لیا۔ حضرت اس ممبری کا حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ منصب نبوت ہے جو انبیاء علیہم السلام کے سچے وارث ہیں وہی اس کے اہل ہیں ۱۲ کاتب) عبدالرحمٰن خانصاحب مرحوم مالک مطبع نظامی کے مطبع میں ایک۔ ایسے ہی صاحب کا خط آیا۔ لکھا تھا کہ میرے پاس شرح وقایہ اردو کی تو ہے اس سے فتویٰ لکھ لیتا ہوں یہ شرح وقایہ کی خرابی ہے۔ اور فلانی کتاب فلاں فن کی ہے جسکی وجہ سے لوگوں کو بہت فیض پہنچ رہا ہے مگر ہاں لوگ ایک فیض سے محروم ہیں، یعنی طب سے اب اس کو بھی جاری کرنا چاہتا ہوں، کئی فیض جاری تھے ایک یہ بھی جاری کرنا جاری کرنا چاہتے تھے۔ لکھا تھا کہ طب احسانی اردو کی بھیجدو تاکہ یہ فیض بھی جاری کر دوں۔ اب یہ تھوڑا ہی ہے کہ کتاب دیکھی اور وعظ کہنے لگے۔ کتاب دیکھی اور نسخہ لکھنے لگے اس واسطے حضور اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ **لا یقص الا امیر او مامور او مختال** یعنی وعظ تین شخص کہتے ہیں۔ ایک حاکم دوسرے وہ جو مامور ہو۔ یعنی جس کو حاکم اسلام نے اس کام کیلئے مقرر کیا ہو یا اہل حل و عقد نے جو حاکم کو بھی حاکم بناتے ہیں۔ یہ اہلِ علم کے سمجھنے کی بات ہے کہ اہل حل و عقد اصل ہیں اور حاکم ان کا نائب ہے یعنی جو اہل الرائے ہوں) مثلاً علماء و مشائخ کیونکہ یہی دین کے سمجھدار لوگ ہیں۔ وہ جس کو وعظ کہنے کی اجازت دیدیں یا اُن کا نائب جو امیر المومنین ہے۔ وہ کسی کو مامور کر دے۔ تو یا خود حاکم یا جسکو حاکم یا ایسے علماء (متفق ہو کر مامور کر دیں) وہی وعظ کہہ سکتا ہے۔ تیسرا اگر کہے تو وہ متکبر ہے۔ معلوم ہوتا ہے دنیا کا طالب ہے چاہتا ہے کہ کچھ روپیہ کوئی رقم ہاتھ آجائے۔ اُسے جائز نہیں وعظ کہنا۔ اسی طرح فتویٰ لکھنا ہر شخص کا کام نہیں چاہے کتابیں بھی ختم ہو چکی ہوں۔ ہاں اپنے بزرگوں کے سامنے کسی نے یہ کام کیا ہو اور ان بزرگوں نے پسند بھی کیا ہو اُسکو البتہ جائز

ہے یوں پھر بھی کوئی لغزش یا غلطی ہو جائے کبھی کبھار وہ اور بات ہے وہ بشریت ہے تو یہ شخص ہے اہل فتویٰ لکھنے کا جیسے مطب کرنیکا وہی اہل ہوتا ہے جس نے کسی ماہر اور تجربہ کار طبیب کے مطب میں نسخے لکھ کر مریضوں کا علاج کیا ہو اور اس کے علاج کو اس طبیب نے پسند کیا ہو۔ اس کے نسخے جواب دکھلائے جاتے ہیں۔ طبیبوں کو تو اگر کوئی معاند نہ ہوگا تو وہ کہے گا کہ باقاعدہ نسخہ ہے تو جناب محض کتابوں میں کیا رکھا ہے۔ نری کتابوں بینی کا تو یہ اثر ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ میں ایک مولوی صاحب عظیم آباد پٹنہ کے حج کو آئے تھے اُن کے پاس ایک کتاب تھی جسمیں حجاج کیلئے ہدایات تھیں۔ اُسے دیکھ دیکھ کر سارے کام کرتے تھے وہاں ایک شخص تھا جعفر آفندی۔ آگرہ کا رہنے والا تھا اُسے ہندوستانیوں سے بہت محبت تھی۔ جس ہندوستانی کو دیکھتا اس سے ملتا چنانچہ ان مولوی صاحب سے بھی ملا۔ علیک سلیک کی۔ مولوی صاحب نے اس کتاب میں کہیں یہ لکھا دیکھا تھا کہ ذرا مانگنے والوں سے بچے رہنا بہت لوگ جبہ قبہ پہنے ہوئے پھرتے ہیں مگر ہوتے ہیں سائل بڑے بڑے شان دار لوگ گداگری کا پیشہ کرتے ہیں مولوی صاحب کو بدگمانی ہوگئی کہ یہ بھی کوئی سائل معلوم ہوتا ہے ضرور کچھ مانگے گا آپ نے بہت بے رخی کے ساتھ پوچھا کچھ کہنا ہے یہ شخص جعفر بڑا مسخرہ تھا سمجھ گیا کہ انہوں نے مجھے سائل سمجھا۔ ہاتھ جوڑ کر عرض کیا حضور کچھ عنایت ہو جائے۔ بہت حاجتمند ہوں۔ بہت غریب ہوں حضور چار وقت کا فاقہ ہو چکا ہے۔ مولوی صاحب نے ڈانٹ کر کہا بیحیا بے شرم ایسا عمدہ لباس اور اتنا لمبا چوغہ پہنکر بھیک مانگتے شرم نہیں آتی۔ کہتا ہے چار وقت کے فاقہ سے ہوں، جھوٹا کہیں کا۔ دور ہو جا یہاں سے بیحیا کہیں کا۔ غرض خوب ہی ڈانٹا، مگر اس نے بُرا نہیں مانا۔ اور چلا گیا۔ بڑا ہی خوش مزاج تھا۔ مولوی صاحب بڑے خوش کہ کیسی اچھی کتاب ہے۔ اور کیسے کیسے موقعوں پر کام دیتی ہے بڑے مسرور کہ کیا موقع پر کتاب کام آئی۔ سبحان اللہ ایک دفعہ مولوی صاحب میرے پاس بیٹھے تھے۔ جعفر آفندی جو وہاں ہو کر گذرے تو میں انکی تعظیم کیلئے کھڑا ہو گیا۔ اب تو

مولوی صاحب بڑے پریشان کہ یہ تو کوئی بڑا شخص معلوم ہوتا ہے وہ آکر میرے پاس بیٹھ گئے کہنے لگے صاحب مجھے ان مولوی صاحب سے بڑی شکایت ہے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ مجھے چار وقت کا فاقہ ہے۔ اس وقت اُنکی جیب میں روپے بھی بول رہے تھے۔ اگر یہ مجھے دیدیتے تو ان کا کیا بگڑ جاتا۔ مجھے ان سے بڑی شکایت ہے۔ مولوی صاحب بیچارے ذلت کے مارے دبے جاویں۔ شرم کے مارے کٹے جاویں کہنے لگے للہ معاف فرما دیجئے میں نے سخت گستاخی کی میں نے پہچانا نہیں تھا۔ واللہ میں نے آپ کو سائل سمجھا تھا۔ وہ بولے کہ مولوی صاحب یہ تو بتائیے کہ آپ نے مجھے سائل کیسے سمجھ لیا۔ آخر کیا آپ نے علامت مجھ میں سائل ہونیکی دیکھی۔ کہا صاحب میں نے کتاب میں پڑھا تھا کہ بڑے بڑے شاندار لوگ مکہ مکرمہ میں بھیک مانگتے ہیں۔ وہ بولے مولوی صاحب کچھ عقل سے بھی تو کام لیا ہوتا۔ صاحب نری کتاب کے بھروسہ تو نہیں رہنا چاہیئے۔ کہا کتاب میں بھی میں نے دیکھا تھا اور سچ مچ بڑے بڑے عبا اور قبا والے یہاں پر بھیک مانگتے ہوئے خود بھی دیکھ لیئے تھے۔ انہوں نے پوچھا مولوی صاحب یہ تو بتاؤ تم نے جن کو بھیک مانگتے دیکھا وہ عمامہ والے تھے یا کسی ترکی ٹوپی والے کو بھی کہیں بھیک مانگتے ہوئے تم نے دیکھا۔ کہا ہاں صاحب واقعی سب عمامہ والے ہی تھے ترکی ٹوپی والا تو اُن بھیک مانگنے والوں میں کوئی نہیں تھا۔ جعفر نے کہا کہ میں تو ترکی ٹوپی پہنے تھا سو بتلائیے کتاب میں یہ کہاں تھا لکھا کہ صرف عمامہ والے ہی بھیک مانگتے ہیں ترکی ٹوپی والے نہیں مانگتے تو حضرت نری کتاب سے فن حاصل کرنیکا تو یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ بھائی کتاب تو امانت کیلئے ہوتی ہے۔ اہلِ مہارت کی صحبت کے بغیر بخدا اور بخدا اور بخدا جسکو فن کا حاصل ہونا کہتے ہیں ہرگز میسر نہیں ہو سکتا چاہے جتنی کتابیں پڑھ چکا ہو۔ اور اگر کچھ بھی نہ پڑھا ہو لیکن اہلِ مہارت کی صحبت اٹھائے ہوتے ہو تو فن کا حصول ممکن ہے بلکہ بکثرت واقع ہے آخر حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالے علیہم اجمعین میں کیا بات تھی کہ بعد کے بڑے بڑے عارف اور عالم اُنکی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے۔ کیا وہ سب کے سب

لکھے پڑھے تھے بہت کم ایسے تھے جو اصطلاحی عالم ہوں ورنہ زیادہ تر تو امی محض ہی تھے چنانچہ خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ نحن امیۃ لا نکتب ولا نحسب ہم لوگ تو ایک امی جماعت ہیں نہ ہم حساب جانیں نہ کتاب جانیں۔ دیکھئے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فخر کرتے ہیں اپنی امت کی اُمیت پر۔ تو گویا اس امت کی خاص فضیلت اُمی ہونا ہے۔ پھر باوجود اُمی ہونیکے صحابہ جو بے نظیر تھے کہ نہ ابوحنیفہ انکی برابر نہ اویس قرنی ان کی برابر نہ جنید انکی برابر نہ کوئی غوث انکی برابر نہ کوئی قطب انکی برابر تو وہ کیا چیز تھے اور وہ کیا دولت تھی جس نے انکو سب سے بڑھا دیا تھا بس یہ یہ دولت تھی ؏ جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد ؎

گلے خوشبوئے در حمام روزے ؎ رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری کہ از بوئے دلآویز تو مستم
بگفتا من گلِ ناچیز بودم ولیکن مدتے با گل نشستم
جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد وگرنہ ہم ہما خاکم کہ ہستم

(حمام خانہ کی خوشبودار مٹی ایک دن میرے محبوب کے ہاتھ سے مجھے ملی میں نے کہا کہ تو مشک ہے یا عنبر ہے کہ تیری خوشبو سے میں مست ہو رہا ہوں کہا کہ میں ایک ناچیز مٹی ہوں، لیکن کچھ مدت تک پھول کی صحبت میں رہی ہوں میرے ہمنشین پھول نے میرے اندر اپنا اثر ڈالدیا وگرنہ میں تو وہی خاک اب بھی ہوں جو پہلے تھی) بس یہ تھی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے پاس دولت۔ کسی کی طویل صحبت تھی کسی کی کم مگر کمال سے کوئی بھی نہیں رہا البتہ اکملیت کے مراتب میں تفاوت تھا۔ چاہے زبان حاصل کی ہو یا نہ کی ہو کمال تو ہر شخص نے حاصل کر لیا تھا۔ زبان اور چیز ہے۔ کمال اور چیز ہے۔ اب کتابیں تو بہت سی پڑھ لیتے ہیں لیکن اہلِ مہارت کی صحبت میں رہنے کا بالکل اہتمام نہیں جہاں تم نے کتابیں پڑھی تھیں اگر کسی مربی کی صحبت بھی اٹھائے ہوتے تو اپنے کو کبھی اہلِ مہارت میں سے نہ سمجھتے۔ بھائی تم تو پہلے مربا بنو پھر مربی بننا چندروز کیلئے اپنے آپ کو کسی مربی کی سپردگی میں دے دو

وہ تمہیں تاؤ دے دیکر مربا بنائے گا۔ جب خوب گھل جاؤ گے اور مربہ بنانے والے بھی تصدیق کر دیں گے کہ ہاں اب مربہ بن گئے تب مربہ بنو گے۔ تمہارا خود ہی یہ سمجھ لینا کہ ہم اب مربہ ہو گئے ہرگز کافی نہیں کیونکہ اے مربہ! تیرے پاس کوئی ایسی محک اور کوئی ایسا معیار نہیں جس سے تو یہ جانچ لے کہ میں مربہ ہو گیا۔ جب تیرے پاس کوئی محک اور معیار نہیں تو تو اپنی ذات کو بلا آلہ کے دیکھے گا تو تو اپنے نفس کو دیکھے گا اپنے نفس سے جو ناقص ہے اور مربی تیرے نفس کو دیکھے گا اپنے نفس سے اور وہ ہے کامل لہٰذا اس کی جانچ معتبر ہو گی اور تیری جانچ ہرگز معتبر نہ ہو گی۔ کیونکہ اس کے پاس تو آلہ شناخت ہے اور تیرے پاس کوئی آلہ شناخت نہیں جیسے کوئی سیب کا مربہ بنا کر رکھے تو خود سیب یہ جانچ نہیں کر سکتا کہ میں مربہ ہو گیا یا نہیں۔ اس کے کیا دانت ہیں۔ جو کچل کر بتا دے گا البتہ جو مربہ بنانیوالا ہے اسکے دانت ہیں وہ دانت تلے دبا کر فوراً بتا دے گا کہ ہاں ہو گیا۔ تو تم کو ابھی کسی نے دانت تلے یا پیر تلے دبایا نہیں۔ کہیں سڑ نہ گئے ہو کہیں کچے نہ پڑ گئے ہو۔ غرض اصل چیز تو حقیقت کمال ہے مگر زعم کمال دعوی کمال اس نے خراب کر رکھا ہے۔ فرخ آباد میں ایک واعظ صاحب مدعی کمال کے ملے مجھ سے بیعت کی درخواست کی میں نے کہا میرے یہاں بیعت کی چند شرطیں ہیں اُن میں سے ایک شرط تمہارے لئے یہ ہے کہ وعظ کہنا چھوڑ دو۔ کیوں کہ تم عالم نہیں ہو۔ کہنے لگے صاحب میں تو بہت ہی احتیاط کے ساتھ مضامین بیان کرتا ہوں مجھے اجازت دیدی جاوے۔ میں نے کہا اگر احتیاط سے بھی بیان کرتے ہو تب بھی تمہارے نفس کا علاج یہی ہے کہ تم وعظ کہنا چھوڑ دو پھر بھی بعد اصرار کہ مجھے تو اجازت دے ہی دو۔ میں نے کہا اچھا مجھے ابھی اس میں بھی شبہ ہے کہ تم احتیاط کیساتھ بیان کرتے ہو گے کہنے لگے میں تو آپ ہی کی کتابیں یا حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں دیکھا کرتا ہوں بس اُنہی کتابوں کے مضامین میرے بیان میں ہوتے ہیں۔ میں نے کہا ممکن ہے تم ارتباط میں کچھ گڑبڑ

کرتے ہو یا سلسلہ ممکن ہے غلط ملاتے ہو یا ایسے عنوان سے ان مضامین کو نقل کرتے ہو کہ سننے والوں کو غلط فہمی ہوتی ہو اس لئے اگر تمہارا ایسا ہی اصرار ہے وعظ کہنے کی اجازت دیدینے پر تو یہ کرو کہ مجھے پہلے اپنا ایک وعظ نمونہ کے طور سنادو تاکہ میں یہ اندازہ کرلوں کہ تم کہاں تک احتیاط برتتے ہو۔ حضرت انہیں اپنے اوپر یہاں تک عقیدہ اور دلیرا تنے کہ اسپر راضی ہو گئے اور جھٹ وعظ کہنے بیٹھ گئے کہ اچھا سن لین۔ اول ہی میں آپ نے قصہ نقل کیا کہ ایک دن چاروں صحابہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے یہاں جمع ہو گئے۔ حضرت علیؓ دعوت کے واسطے ہدیہ کے طور پر گھر میں سے شہد لائے اس شہد میں ایک بال پڑا ہوا تھا۔ چاروں صحابہ نے ایک دوسرے سے کہا کہ یہ جو بال ہے اس کی کوئی مثال سوچو کہ یہ کس چیز کی مثال ہے۔ چنانچہ کسی نے کچھ مثال دی کسی نے کچھ مثال پیش کی اب مجھے تو یاد نہیں کہ کس نے کیا مثال دی۔ غلط مضامین کیا یاد رہتے۔ کسی نے کہا مومن کی فلاں حالت کے مشابہ ہے کسی نے کہا فلاں حالت کے مشابہ ہے میں نے کہا جب وعظ ختم کرچکے کہ اچھا یہ تو بتاؤ کہ یہ قصہ جو تم نے نقل کیا وہ کونسی کتاب میں ہے۔ میری کتاب میں ہے یا مولانا محمد قاسم صاحب کی کتاب میں ہے۔ کہنے لگے یہ تو یاد نہیں رہا کہ کس کتاب میں ہے مگر ہاں دیکھا ہے کہیں۔ میں نے کہا یہ آپکی احتیاط ہے کہ ایسا مہمل قصہ جو کسی اہل حق کی کتاب میں نہیں ہے اس کو بیان کردیا۔ اب تو سمجھ گئے کہ تم کو وعظ کہنے کی اجازت نہیں دیجا سکتی۔ مگر حضرت انہوں نے نہیں مانا۔ برابر وعظ کہتے ہیں۔ یہ تو گوارا کرلیا کہ مجھ سے تعلق نہیں رکھا اور یہ گوارا نہ ہوسکا کہ وعظ کہنا چھوڑ دیں۔ اب کیا علاج ایسے جہل مرکب کا۔ میں قسم کھاکر کہتا ہوں کہ جہل وہ چیز ہے کہ اگر کسی کو اپنے جہل کی خبر ہوجائے تو میں اسکو علماء میں شمار کرتا ہوں یعنی اول درجہ علم کا اپنے جہل پر مطلع ہوجانا ہے جیسے صحت کا اول درجہ مرض کی اطلاع ہے موٹا مسئلہ عقل کا ہے کہ جسکو اپنے مرض کی اطلاع نہ ہوگی وہ علاج ہی نہیں کرے گا۔ خدا بچائے یہ خود بینی ایسی بری چیز ہے کہ حضرت

حافظ اس کو کفر سے تعبیر کر رہے ہیں اور واقعی یہ ہے ہی ایسی بڑی چیز فرماتے ہیں ؎

فکر خود ورائے خود در عالم رندی نیست   کفرست دریں مذہب خود بینی وخود رائی

(عشق ومحبت کے راستے میں اپنی فکر اپنی رائے نہیں چلتی یہاں تو بس محبوب کی چلتی ہے اس مذہب عشق میں خود بینی اور خود رائی کفر ہے یعنی نہایت ہی قبیح ہے)

تو دیکھا آپ نے یہ آفت نازل ہو رہی ہے۔ حق جلّ علا شانہٗ صاف فرماتے ہیں۔ **هل يستوي الذين يعلمون والذين لا يعلمون** کہیں عالم اور جاہل بھی برابر ہو سکتے ہیں۔ اب اس وقت عوام الناس نے ایک عجیب وغریب مستی اور شورش برپا کر رکھی ہے اور علماء کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ بھی شریک ہوں۔ خیر عوام الناس پر تو حیرت نہیں مگر حیرت ہے علماء پر جو اُن سے مغلوب ہو کر اُن کے تابع ہو گئے ہیں، میں کہتا ہوں کہ عوام الناس کے دبانے سے اور ان سے دبکر جو علماء تابع ہو گئے ہیں کیا وہ سمجھتے ہیں کہ انکی کچھ قدر ہے وہ بھی تو مانتے ہیں کہ یہ علماء دل سے ہمارے موافق نہیں ہیں ہم سے دبکر تابع ہو گئے ہیں۔ اگر یہی حال ہے تو پھر اور کسی بات میں تابع بنائیں گے پھر اور کسی میں خلاصہ یہ کہ اُن کے مرید ہو جاؤ کسقدر شرم کی بات ہے جو کاریگر یعنی مادیات اور حسیات تک کا کاریگر بھی جو اپنے کام میں ماہر ہو اُس سے کوئی خلافِ قاعدہ کام تو لے لو۔ ہمارے یہاں تعمیر کا کام جاری ہے ایک معمار نے ایک کام کو ایک طریقہ سے بنانا چاہا مگر ہم غلط سمجھے ہم نے دوسرا انداز تجویز کیا کہ نہیں اس طرح بناؤ۔ اس نے کہا صاحب یوں نہیں بن سکتا۔ ہم نے کہا تمہیں اس سے کیا بحث جس طرح ہم کہہ رہے ہیں اسی طرح بنا دو۔ ایک دوسرا معمار تھا اس نے بھی کہا ارے جس طرح مالک کہیں اسی طرح بنا دے سمجھے کیا۔ بس جناب ہم سے تو بیچارہ بول نہ سکا اس پر بہت تیز ہوا اور کھڑا ہو گیا کہ تو بڑا کاریگر ہے آ تو ہی بنا جو قیامت تک بھی نہ بن سکے، نہایت تیز لہجے میں اس نے کہا۔ حالانکہ یہ تھوڑا ہی تھا کہ بن ہی نہ سکتا۔ بن تو جاتا اس طرح بھی جس طرح ہم لوگ کہہ رہے تھے مگر بے کینڈے بنتا۔ اسے اس قصور سے بھی شرم آئی کہ جو

دیکھے گا یا گل کہے گا بنانیوالے کو۔ گو بڑا کہنے والے متعین نہ ہوں معلوم نہ ہوں پھر بھی اہل کمال کو غیرت آتی ہے کہ اس کے ہاتھ سے ایسا کام ہو جس کو دیکھ کر لوگ کہیں کہ یہ کسی اناڑی کا کام ہے غرض جب اس نے پوری تقریر کی تب ہمیں اپنی تجویز کی غلطی معلوم ہوئی کہ واقعی وہی ٹھیک کہتا تھا۔ ہم نے کہا بیوقوف تو نے پہلے ہی پوری بات کیوں نہ کہہ دی تھی۔ تو میں کہتا ہوں کہ معماروں کو اتنی غیرت ہو اور مولویوں کو اتنی غیرت بھی نہ ہو۔ بس وہ کیا۔ غرض نے ساری خرابی ڈال رکھی ہے ؎

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد   صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد

(جب غرض دل میں آتی ہنر پوشیدہ ہوا سیکڑوں پردے حق بینی سے مانع بن جاتے ہیں جو دل سے نکال کر آنکھوں پر چھا جاتے ہیں۔)

اس لئے میں کہتا ہوں۔ اعتکاف کے تعلق سے یہ تقریر شروع ہوئی تھی غرض خلوت اور ترک تعلقات کی حقیقت محققین ہی جانتے ہیں غیر محققین کو ان کا اتباع چاہئے۔ اسی طرح ہر فن میں جو محققین ہیں وہ عوام کو اپنا تابع بنائیں۔ خود اُن کے ہرگز نہ بنیں۔ اگر اس عزم میں پختگی ہوگی تو عوام خود ان کے سامنے گردن جھکادیں گے۔ اور ان کا اتباع کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اور اگر نہ کریں گے تو تمہیں کیا

لست علیھم بمصیطر ایک عبادت احیاء لیالی قدر ہے اس احیاء کا موجب نورانیت ہونا مشہور و معلوم ہے خلاصہ یہ کہ رمضان المبارک کے حقوق کو جو کہ مجمع الانوار ہے پورا ادا کرو۔ اور خلاصہ ان حقوق کا کیا ٹھہرا کہ جو احکام واجبہ ہیں انکی پوری پابندی کرو اور جو امور منکر اور مکروہ ہیں خواہ وہ کبائر ہوں یا صغائر ہوں بالکل چھوڑ دو۔ خواہ فضائل میں کمی رہے مضائقہ نہیں۔ غرض رمضان المبارک کی اصل عبادت تو روزہ و تراویح اور ان کی تنزیہ ہے اور کثرتِ تلاوت و اعتکاف و شب بیداری اس کے متعلقات ان سب کی اصل یعنی اصل الاصول وہ احکام واجبہ کی پابندی اور امورِ منکرو مکروہ سے اجتناب ہے اس سے آگے اپنی اپنی

ہمت ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے مہمان کے سامنے جو چیزیں رکھی جاتی ہیں۔ ان میں اصل چیز تو گوشت روٹی ہے باقی مربہ اچار چٹنی یہ زینت ہیں دسترخوان کی اور معین بھی ہیں ہضم غذا میں اور لطف افزا ہیں اور کھانوں کی۔ اگر کوئی شخص اپنے مہمان کے سامنے یہ زائد چیزیں تو رکھدے مثلاً چٹنی بھی کئی قسم کی اور اچار بھی طرح طرح کے رکھدے۔ مربے بھی مگر ان کے سوا اور کچھ نہیں نہ خشکہ ہے نہ روٹی ہے نہ گوشت ہے جو اصلی غذا ہے اب وہ مہمان کیا کہے گا۔ یہی کہے گا کہ کیا کھاؤں۔ مربہ کھاؤں۔ اچار کھاؤں، کھانیکی چیز تو ایک بھی نہیں۔ یہ تو سب لگانیکی چیزیں ہیں۔ اگر اسی طرح تم نے اپنا رمضان اس حالت میں حق تعالےٰ کے سامنے پیش کیا کہ اس میں اصل چیز تو ہے نہیں مگر زوائد تو وہ کیا قبول ہوگا۔ اور اگر تمہارے پاس اصل چیز تو ہے مگر زوائد نہیں ہیں۔ یعنی اگر دن بھر بری نگاہ سے غیبت سے اور جتنے گناہ ہیں سب سے بچے رہو اپنی آمدنی حلال رکھو۔ پھر چاہے رات کو اچھی طرح پڑھکر سو رہو تہجد بھی نہ پڑھو وظیفے بھی نہ پڑھو مگر یہ کہ گناہ کے پاس نہ پھٹکو تو تمہارا رمضان بخدا اس شخص سے اچھا ہے کہ تہجد بھی ہے چاشت بھی ہے۔ وظیفے بھی ہیں تلاوت بھی ہے سب کچھ ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ غیبتیں بھی کر رہا ہے۔ برائی بھی کر رہا ہے عورتوں کو بھی تک رہا ہے لہو ولعب میں بھی مبتلا ہے لڑنا جھگڑنا بھی ہے بغض و حسد بھی ہے اس سے تمہارا رمضان ہزار درجہ اچھا ہے اگر ہمت نہ ہو بہت سے سیپارے ختم نہ کرو سو تو خوب پڑ پڑ کر بس فرض سنت نمازیں تو اٹھ کر پڑھ لیا کرو۔ باقی آرام سے مہینہ بھر گذارو مگر خدا کے واسطے گناہ کوئی نہ کرو تو یہ اچھا ہے۔ اور اگر ہمت ہو تو گناہ کو بھی چھوڑ دو اور طاعات کو بھی کرو۔ یہ تو پھر سبحان اللہ نورٌ علی نور ہے اور یہ مہینہ قابل تو اسی کے ہے کہ اس میں ایسا ہی کیا جائے یعنی واجبات و فضائل سب کو جمع کیا جاوے حدیث میں ہے کان رسول اللہ صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم

جودمن الریح المرسلة یعنی رمضان شریف آتے ہی اس قدر طاعت میں مشغول ہوتے تھے۔ جیسے ہوا چھوٹ نکلتی ہے کہ اڑی چلی جاتی ہے۔ ملاست کے ساتھ غرض رمضان کا جو مہینہ ہے اصل میں ترکِ دنیا کے واسطے ہے گیارہ مہینے خوب عیش و آرام میں گذارے ہیں۔ ایک مہینہ تو بندۂ خدا تھوڑی بہت مشقت اٹھالو جیسے مولانا فرماتے ہیں ؎

خواب را بگذار امشب اے پدر — یک شبے در کوئے بیخواباں گذر

(ایک رات خواب کو اے پدر ترک کر دے اور کسی اللہ کے عاشق کے پاس اپنی رات گذار لے پھر دیکھ کہ ان بے خوابوں کی گلی میں کیا لطف ہے جو رشکِ ہفت اقلیم ہے)

گیارہ مہینے تو سب کچھ کام کئے ایک مہینہ خدا کے کام میں رہ لو گے تو کونسا ایسا بڑا حرج ہو جائے گا۔ پھر وہ بھی اس طرح کہ اس میں صحت کی بھی رعایت رکھی گئی ہے غرض یہ مہینہ تو خاص ہو جائے عبادت کیلئے اور اخیر درجہ یہ کہ اگر عبادت نہ ہوسکے تو گناہ کو تو چھوڑ دو۔ اتنا تو کرو۔ یہ مقصود تھا میرا جس کو میں بیان کر چکا۔ اور مضامین بھی ذہن میں ہیں۔ مگر وقت بہت ہو چکا ہے اگر موقع ہوا تو میں یا اور احباب ان شاء اللہ تعالیٰ رمضان المبارک کے جمعوں میں عرض کرتے رہیں گے اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو ہمت اور توفیق دیں اعمال صالحہ کی اور ناپسندیدہ اعمال اور منکرات سے بچنے کی۔ اور ایک بات اور عرض کرنے سے رہ گئی کہ رمضان کے دن آنے سے پہلے آپس میں مل جل لو اور دلوں سے رنجشوں کو دور کر لو۔ کیونکہ معاصی سے روزہ کا اثر اور نور جاتا تو نہیں رہتا مگر بہت مضمحل ہو جاتا ہے (اب دعا کیجئے۔ اسے یہاں تک کی تقریر ہاتھ اٹھائے ہوئے فرماتے رہے ۱۲ کاتب، غالباً بعد ختمِ دعا یا دوران دعا ہی میں فرمایا کہ چونکہ اس بیان میں انوارِ رمضان کا ذکر ہے۔ اس لئے اس کا نام ومضان فی رمضان مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ومضان جمع ہے ومیض کی جس کے معنے ہیں چمک دمک کذا فی القاموس + تم بحمد اللہ الذی

بنعمتہ تتم الصالحات ، الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ ببرکت دعا و توجہات حضرت اقدس اس وعظ کی تبیض ۲۵ ، شعبان المعظم ۱۳۳۸ھ یوم شنبہ بوقت چاشت شروع ہو کر آج پندرہ دن کی مدت میں ۱۱ ، رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ یوم یک شنبہ عین اذان ظہر کے وقت حق تعالٰے نے اس ناکارہ کے ہاتھوں پوری کرادی ، حق تعالٰے اس کو مقبول و نافع فرمائیں اور صاحب وعظ کو مدت مدید تک اسی طرح فیض گستر رکھیں ۔ آمین ؛ بحرمتہ سید المرسلین صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم و آلہ و اصحابہ وازواجہ اجمعین ط

حضرت حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے
مکمل و مجلد مواعظ
مواعظ اشرفیہ کے نو ۹ حصے
قیمت دو سو روپے علاوہ خرچہ ڈاک
دعوات عبدیت کامل کے نو حصے مجلد ڈسٹ کور مکمل سٹ
قیمت مجلد ۔ دوسو (۲۰۰) روپے علاوہ خرچہ ڈاک

سٹ الابقاء مجلد ڈسٹ کور

مجلد سٹ ۱۹۷۱ء -/۲۰ مجلد سٹ ۱۹۷۳ء -/۲۰ مجلد سٹ ۱۹۷۳ء -/۲۰
مجلد سٹ ۱۹۷۴ء -/۲۰ مجلد سٹ ۱۹۷۵ء -/۲۰ مجلد سٹ ۱۹۷۶ء -/۲۰
مجلد سٹ ۱۹۷۷ء -/۲۰ مجلد سٹ ۱۹۷۸ء -/۲۵ مجلد سٹ ۱۹۷۹ء -/۲۵ مجلد سٹ ۱۹۸۰ء -/۲۵

ملنے کا پتہ مکتبہ تھانوی بندر روڈ کراچی ۔

قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

(رواہ البخاری)

سلسلہ التبلیغ کا وعظ

مسمّٰی بہ

الرفع والوضع

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

(رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ)

ناشر:- محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی - دفتر الابقاء

مسافرخانہ بندر روڈ کراچی
ایم۔ اے جناح روڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمیٰ بہ

الرفع والوضع

این	کہاں ہوا	مسجد خانقاہ امدادیہ۔ تھانہ بھون
متی	کب ہوا	۹ رجب سنہ ۱۳۳۲ھ بعد نماز جمعہ
کم	کتنی دیر ہوا	۲ گھنٹہ ۴۰ منٹ
کیف	کیونکر ہوا	بیٹھ کر ....
لم	کیوں ہوا	اہل خانہ کی درخواست پر کیونکہ عرصہ سے تھانہ بھون میں بیان نہ ہوا تھا
ماذا	کیا مضمون تھا	ہم کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ہر فعل و حال سے سبق لینا چاہئے پھر یہ بتلایا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے واقعہ معراج سے امت کو کیا نفع ہوا۔
[illegible]	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	رجب کرنیوالوں کو خصوصاً اور سالکین کو عموماً
من ضبط	کس نے ضبط کیا	احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
السامعون	سامعین کی تخمینی مقدار	۱۰۰ تقریباً
الاشتات	متفرقات	حضرت مدظلہم اس وقت قریب ہی سفر لکھنؤ سے تشریف لائے تھے اثناء سفر میں زکام بخار کی شکایت ہوگئی تھی جو بیان کے وقت بھی کسی قدر موجود تھی مگر محض مخلصین کی درخواست پر بیان کا ارادہ فرمایا اور بحمد اللہ ایسا ہی بیان ہوا جیسا بحالت تندرستی ہوا کرتا ہے بلکہ اس وعظ میں بہت سے جدید و عجیب مضامین بیان ہوئے جن کی قدر دیکھنے سے معلوم ہوگی

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمداً عبدہ و رسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وبارک وسلم۔

اَمَّا بَعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم
یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ہ اے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہم نے بیشک آپکو اس شان کا رسول بنا کر بھیجا ہے کہ آپ گواہ ہوں گے اور آپ بشارت دینے والے ہیں۔ اور اللہ کی طرف۔ اس کے حکم سے بلانے والے ہیں اور آپ ایک روشن چراغ ہیں۔

یہ ایک آیت ہے جس میں حق تعالیٰ نے اپنے رسول کریم (علیہ افضل الصلوۃ والتسلیم) کی بہت سی صفات بیان فرمائی ہیں۔ جن میں سے اس وقت مقصود البیان الخیر کی صفت ہے اور اسی سے مجھکو وہ مضمون مستنبط کرنا ہے جس کے بیان کا اس وقت ارادہ ہے اور وہ صفت سِرَاجًا مُّنِیْرًا ہے روشن چراغ وجہ بیان کی یہ ہے کہ بعض حضرات نے خلوص کے ساتھ بیان کی درخواست کی تھی کیوں کہ عرصہ سے یہاں پر بیان نہ ہوا تھا۔ گو ابھی تک سفر کا تکان نہ اُترا تھا رات بھی سر میں درد تھا اور اب بھی موجود ہے اور بیان کے لئے جس انشراح کی ضرورت ہوتی ہے اس کے لئے یہ مانع کافی تھا مگر درخواست خلوص سے تھی اس لئے انکار کو جی نہ چاہا یہ خیال ہوا کہ اس درخواست کو پورا ہی کر دوں گو مختصر ہی بیان ہو۔ مگر تکان کی وجہ سے پختہ وعدہ بھی نہ کیا تھا یہ کہہ دیا تھا کہ وقت پر جیسی رائے ہو گی اطلاع کر دوں گا۔ پھر میں نے سوچا کہ اگر بیان کروں تو کیا بیان کروں، بڑی دیر تک کوئی مضمون ذہن میں نہ آیا اور یہ عادت نہیں کہ کَیْفَمَا اتَّفَقَ (جیسا اتفاق ہو) کوئی سا مضمون بیان کر دیا جائے بلکہ ہمیشہ یہ خیال رہتا ہے کہ ضرورت اور وقت کے مناسب مضمون بیان کیا جائے جب وقت کے وقت بھی کوئی مضمون خاص ذہن میں نہ آیا تو ایک مانع یہ موجود ہو گیا مگر دفعۃً نماز میں ایک مضمون کی طرف ذہن منتقل ہوا وہ یہ کہ مہینہ رجب کا ہے جس میں باتفاق مؤرخین واہل سیر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ایک خاص کمال ظاہر ہوا ہے یعنی معراج پھر اس طرف ذہن منتقل ہوا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تمام کمالات متعدی

ہیں لازمی نہیں ہیں (یعنی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کمالات سے صرف آپ ہی کو نفع نہیں ہوا بلکہ آپؐ کے ہر کمال سے دوسروں کو نفع بھی ہوا ہے اسلئے واقعۂ معراج میں بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا جو کمال ظاہر ہوا ہے وہ بھی متعدی ہونا چاہیئے لازمی نہ ہونا چاہیئے۔

اس کے بعد عنوان بیان متعین ہو گیا کہ آج یہ مضمون بیان کیا جائے کہ واقعۂ معراج سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کمال تو ظاہر ہوا ہی اُمت کو بھی اس سے نفع پہونچا ہے اور آپکا یہ کمال بھی دوسرے کمالات کیطرح متعدی ہے لازمی نہیں، اسی طرح پر یہ مضمون ہماری ضرورت کا ہو گیا گو ہمارے واسطے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کیواسطے کمالات کا مطلقاً بیان بھی سبب سعادت ہے خواہ اُن کے تعدیہ پر نظر ہو یا نہ ہو مگر اَلْاَهَمُّ فَالْاَهَمُّ (اول اہم پھر اس کے بعد اہم ہو) کے قاعدہ سے چونکہ ابھی ہم اپنی اصلاح سے فارغ نہیں ہوئے ہم کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کمالات میں بھی یہ نظر رکھنا چاہیئے کہ ہم کو اس سے کیا نفع حاصل ہوا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کمالات کو محض اس نظر سے نہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ آپ کا خاص واقعہ ہے بلکہ سب سے سبق لینا چاہیئے اس کی شہادت قرآن سے ملتی ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (ہم نے کسی رسول کو بھی نہیں بھیجا مگر اسی واسطے کے خدا کے اذن سے اس کی اطاعت کیجائے) حالانکہ رسول کیلئے رسالت بہت بڑا کمال ہے مگر حق تعالیٰ نے لِيُطَاعَ (چاہیئے کہ اسکی اطاعت کیجائے) میں ہم کو متنبہ فرما دیا ہے کہ تم رسالت پر محض اس حیثیت سے نظر نہ کرو کہ وہ رسول کا ایک کمال ہے بلکہ تم اپنے فائدہ پر بھی نظر رکھو کہ رسالت ایسا کمال ہے جسکی اطاعت و موافقت سے مخلوق کے نزدیک مقبول و مقرب ہو جاتی ہے دوسرے مقام پر ارشاد ہے رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ (یعنی حضرت ابراہیم واسمعیل علیہما السلام نے عرض کیا کہ اے پروردگار ہماری اولاد میں ایسا رسول مبعوث فرمایئے

(پرنٹنگ محل) کراچی

باقی آئندہ- ان شاء اللہ تعالیٰ

جو ان پر آپ کی آیات کی تلاوت کرے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے) یہ آیت خاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شان میں ہے۔ کیونکہ یہ دعاء ایسے نبی کے حق میں ہے جو دونوں حضرات کی اولاد میں ہوں اور ایسا رسول جو ابراہیم علیہ السلام و اسمٰعیل علیہ السلام دونوں کی اولاد ہو بجز حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے کوئی نہیں پس ثابت ہوا کہ اس دعاء کا مصداق حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ہی ہیں اور اس میں حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے جن کمالات کا بیان ہے انکے متعدی ہونے کا بھی ساتھ ساتھ بیان ہے کہ وہ ایسے رسول ہوں جو محض کمالِ رسالت ہی سے متصف نہ ہوں بلکہ ان کا یہ کمال متعدی بھی ہو کہ مخلوق کو ان سے فیض پہنچے اس میں خاص حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے کمالات کے متعلق دو پیغمبروں کے صیغۂ دعاء میں اس پر تنبیہ کردی گئی کہ لوگوں کو حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے کمالات میں اپنے فائدہ پر بھی نظر رکھنی چاہیئے ایک مقام پر حق تعالےٰ نے حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی بعثت سے ہمارے اوپر امتنان فرمایا ہے تو وہاں بھی اس کے متعدی ہونیکا بیان فرمایا ہے لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ الآيه۔

(حقیقت میں اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جبکہ ان میں انہی میں سے ایسے رسول کو بھیجا کہ وہ ان کو اللہ تعالےٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان لوگوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں کتاب اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں)

غرض اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن میں میرے اس دعویٰ کی دلیل موجود ہے کہ ہم کو حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے ہر کمال سے سبق لینا چاہیئے اور ان پر اس جہت سے نظر کرنی چاہیئے کہ ہم کو اس کمال سے کیا فائدہ ہوا جنمیں سے حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا بڑا کمال معراج بھی ہے تو اس سے بھی ہم کو سبق لینا چاہیئے۔ اب اس اعتبار خاص سے اس مضمون کو رجب کے مہینے سے کوئی خاص خصوصیت

بھی نہیں رہی کیوں کہ میں واقعہ معراج بیان نہ کروں گا بلکہ یہ بتلاؤں گا کہ اُمت کو اس واقعہ سے کیا فیض پہنچا اور ظاہر ہے کہ اس ماہ سے واقعہ کو تو کچھ خصوصیت ہے بھی مگر جو فیض امت کو اس واقعہ سے پہنچا ہے وہ اس مہینے کے ساتھ خاص نہیں اس لئے یہ احتمال بھی نہ رہے گا کہ میں اس ماہ کی خصوصیت کیوجہ سے یہ مضمون بیان کر رہا ہوں جیسا اس مہینے میں بعض لوگ رجبی کرتے ہیں مگر وہ صرف قصہ معراج بیان کر دیتے ہیں یہ کوئی نہیں بیان کرتا کہ امت کو اس سے کیا نفع ہوا گو نفس واقعہ کا بیان بھی باعث برکت ہے بشرطیکہ منکرات سے خالی ہو جس میں تخصیص والتزام بھی داخل ہے (وَالْحَالُ خِلَافُہٗ) (حالانکہ حالت خلاف ہے) اب میں وہ مضمون بیان کرتا ہوں کہ اُمت کو واقعۂ معراج سے کیا نفع حاصل ہوا جسکے لئے میں نے یہ آیت تلاوت کی ہے جس میں میرے ذوق میں سِرَاجًا مُّنِیْرًا (روشن چراغ) سے اس مضمون کو مناسبت ہے گو اس پر استدلال موقوف نہیں اس پر دوسرے مستقل دلائل ہیں مگر مناسبت کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ اس آیت میں حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو روشن چراغ فرمایا گیا ہے اور یہ بطور تشبیہ کے ہے جیسے زَیْدٌ اَسَدٌ (زید شیر ہے) کہا جاتا ہے کہ بوجہ شجاعت کے اسی طرح حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو ایک خاص صفت میں چراغ سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ تشبیہ میں مشبہ بہ کا مشبہ سے اقوی واکمل ہونا لازم نہیں البتہ واضح واشہر ہونا ضروری ہے اس لئے حضور صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو چراغ سے تشبیہ دینے میں بھی یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ اس صفت میں چراغ آپ سے افضل ہے بلکہ اس کا مبنیٰ بھی وہی ہے کہ چراغ اس صفت میں بوجہ محسوس ہونیکے مشہور ہے۔ اور یہاں سے یہ اشکال بھی مرتفع ہو گیا جو بہت لوگوں کو صیغہ صلوٰۃ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ (اے اللہ درود بھیج محمد پر اور انکی آل پر جیسا کہ درود بھیجا تو نے ابراہیم اور ان کی آل پر)

میں پیش آیا کرتا ہے اس میں حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم پر صلوٰۃ کو ابراہیم علیہ السلام کے صلوٰۃ سے تشبیہ دی گئی ہے جس سے ابراہیم علیہ السلام کی صلوٰۃ کی افضلیت لازم آتی ہے اس اشکال کا منشاء یہ ہے کہ تشبیہ کیلئے مشبہ بہ کا افضل ہونا لازم سمجھا جاتا ہے مگر یہ بناءُ الفاسِدِ علی الفَاسِدِ (فاسد کی بنیاد فاسد پر) تشبیہ کیلئے افضلیت مشبہ بہ کا لزوم ہی غلط ہے بلکہ اس کے لیے محض مشبہ بہ کا اشہر و واضح ہونا لازم ہے افضل ہونا لازم نہیں۔ تتبع موارد استعمال سے اس کی تائید ہوتی ہے چنانچہ حق تعالےٰ نے ایک مقام پر خود اپنے نور کو نور مصباح سے تشبیہ دی ہے حالانکہ یہاں مشبہ بہ کی افضلیت کا وہم بھی نہیں ہو سکتا فرماتے ہیں اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّ لَا غَرْبِیَّۃٍ یَّکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ (اللہ تعالےٰ نور دینے والا ہے آسمانوں کا اور زمین کا اس کے نور کی حالت عجیبہ ایسی ہے جیسے اس میں ایک طاق ہے اس میں ایک چراغ ہے وہ چراغ ایک قندیل میں ہے وہ قندیل ایسا ہے جیسے ایک چمکدار ستارہ ہو وہ چراغ ایک مفید درخت سے روشن کیا جاتا ہے کہ وہ زیتون ہے جو نہ پورب رُخ ہے نہ پچھم رُخ ہے اس کا تیل اگر اس کو آگ بھی چھوئے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اٹھے گا نور علیٰ نور ہے)

گو یہاں نور مصباح کی بہت کچھ تقویت کی گئی ہے کہ چراغ شیشہ کے (گلاس کے) اندر ہے اور وہ ایسا چمکدار ہے جیسے روشن ستارہ اور اس چراغ میں تیل بھی زیتون کا ہے اتنا عمدہ کہ آگ لگنے سے پہلے ہی بھڑکنا چاہتا ہے لیکن گو وہ کتنا ہی قوی ہو حق تعالےٰ کے نور سے اس کو کیا نسبت اس سے ثابت ہو گیا کہ مشبہ بہ کیلئے مشبہ سے افضل ہونا ضروری نہیں گو اتفاق سے زَیْدٌ اَسَدٌ (زید شیر ہے) اسد زید سے زیادہ ہی بہادر ہو اور واقعی اس جانور کو خدا تعالےٰ نے قوت و شجاعت بہت

زیادہ دی ہے اور عجب نہیں ایسی ہی جزئیات سے لوگوں کو یہ غلطی واقع ہوگئی ہو کہ مشبہ بہ کو مشبہ سے افضل ہونا چاہیئے مگر حقیقت میں یہ لازم نہیں ورنہ نور مصباح کو نور خداوندی سے افضل کہنا پڑے گا حالانکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہوسکتا بلکہ تحقیق یہ ہے کہ مشبہ بہ کا صرف اشہر واوضح ہونا ضرور ہے افضلیت ضروری نہیں چونکہ حق تعالےٰ غائب از نظر ہیں کوئی شخص انکو آنکھوں سے دنیا میں اسکو نہیں دیکھ سکتا اس لئے خدا کا نور اشہر نہیں اور نور مصباح اشہر ہے اس وجہ سے اس کو نور مصباح سے تشبیہ دیدی گئی ہے اور خدا کے نور کی تو بڑی شان ہے لوگ کسی عالم کی تعریف میں کہا کرتے ہیں۔ کہ حضرت تو روشن چراغ ہیں اس میں بھی انکو یہ وہم نہیں ہوتا کہ چراغ نور میں ان سے افضل ہے مگر چونکہ چراغ کوئی بھی خالی از نور نہیں دیکھا گیا اس لئے اس کا نور اشہر ہے اور بشر بعض ظلماتی ہیں بعض نورانی اس لئے اس کا منور ہونا محتاج دلیل ہے تو اس کا منور ہونا اشہر نہیں اس تفصیل سے یہ مسئلہ طے ہوگیا کہ مشبہ بہ کیلئے مشبہ سے افضل ہونا لازم نہیں صرف اشہر واوضح ہونا ضروری ہے پس حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو سراج منیر فرمانے سے افضلیت سراج کا شبہ نہیں ہوسکتا الغرض اس آیت میں حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو تشبیہاً روشن چراغ فرمایا گیا ہے تو بنابر اصول تشبیہ جو خاص وصف چراغ میں ہے وہ آپ میں ہونا لازم ہے اور اسی سے یہ شبہ بھی دفع ہو جاوے گا کہ آفتاب یا ماہتاب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں نہ تشبیہ دی گئی حالانکہ آفتاب تمام منیرات میں روشن تر ہے اس کے سامنے نہ چاند کی کوئی حقیقت ہے نہ چراغ کی اور اگر یہ کہا جائے کہ آفتاب کی روشنی میں حرارت اور تیزی زیادہ ہے جس کی وجہ سے کوئی اس پر نگاہ نہیں جما سکتا اس لئے اس سے تشبیہ نہیں دی گئی تو پھر چاند سے تشبیہ دیدی جاتی چراغ سے تو وہ بدرجہا زیادہ ہے وجہ دفع یہ ہے کہ چراغ میں ایک خاص صفت ایسی ہے جو نہ آفتاب میں ہے نہ ماہتاب میں اس لئے حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو چراغ روشن فرمایا گیا بات یہ ہے کہ چراغ

میں تین صفتیں ہیں۔ ایک اس کا خود روشن ہونا دوسرے اپنے غیر کو روشنی دینا کہ چراغ کی وجہ سے دوسری چیزیں ظلمت سے نور میں آجاتی ہیں ان دو صفتوں میں تو چراغ اور آفتاب و ماہتاب سب شریک ہیں اور یہ دو وصف آفتاب و ماہتاب میں بیشک چراغ سے زیادہ ہیں۔ تیسری صفت چراغ میں یہ ہے اس سے دوسرا چراغ اسی کے مثل روشن ہو سکتا ہے چنانچہ ایک چراغ سے سیکڑوں چراغ روشن کر لئے جاتے ہیں۔ یہ صفت خاص چراغ ہی میں ایسی ہے کہ آفتاب و ماہتاب میں نہیں ہے کیونکہ آفتاب سے دوسرا آفتاب اور ماہتاب سے دوسرا ماہتاب روشن نہیں ہو سکتا خلاصہ یہ کہ آفتاب و ماہتاب دوسری چیزوں کو منوّر (باسم المفعول) تو کر دیتے ہیں مگر منوِّر (باسم الفاعل) نہیں کرتے اور چراغ دوسری اشیاء کو منوّر بھی کرتا ہے اور منوِّر بھی کر دیتا ہے اس لئے حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو آفتاب و ماہتاب سے تشبیہ نہیں دی گئی بلکہ چراغ روشن فرمایا گیا تو چراغ کی طرح آپ میں بھی علاوہ خود نورانی ہونے کے دو صفتیں ہوئیں ایک یہ کہ آپ دوسروں کو منور کرتے ہیں، دوسرے یہ کہ آپ بعضوں کو منور بنانے والے ہیں۔ پہلا کمال آپ کا امت میں ظاہر ہوا اور دوسرا کمال انبیاء علیہم السلام میں ظاہر ہوا۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام آپ سے فیض حاصل کر کے بمنزلہ مستقل چراغ کے ہوگئے۔ جیسے ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن کر لیا جاوے تو بجائے خود مستقل منوّر ہو جاتا ہے یہی شان انبیاء علیہم السلام کی ہے امت کی یہ حالت نہیں کیونکہ امتی کے اندر جو نور آپ کے واسطے سے آتا ہے وہ اس میں مستقل نہیں۔

پس آپ انبیاء علیہم السلام کے کمالات کے لئے بمنزلہ واسطہ فی الثبوت کے ہیں کہ ذی واسطہ بھی اس کمال کے ساتھ موصوف حقیقۃً ہو جاتا ہے اور واقعہ میں وہاں دو صفتیں ہوتی ہیں ایک واسطہ کی ایک ذی واسطہ کی اور امتیوں کے لئے بمنزلہ واسطہ فی العروض کے ہیں کہ ذی واسطہ حقیقۃً اس کمال کے ساتھ موصوف ہی نہیں ہوتا محض مجازاً متصف ہوتا ہے کیونکہ وہاں واقع میں ایک ہی صفت ہوتی ہے صرف

واسطہ میں اور ذی واسطہ میں کوئی صفت ہوتی ہی نہیں اسیطرح ائینوں میں واقع میں صفت تنویر کی ہے ہی نہیں وہ حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ہی کی صفت ہے کہ ائینوں کی طرف مجازاً منسوب کر دی جاتی ہے بخلاف انبیاء علیہم السلام کے کہ واقع میں بھی اُن میں تنویر کی صفت ہو جاتی ہے گو آپ کی ہی برکت سے تھی۔ رہا یہ کہ حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے جمیع کمالات میں انبیاء علیہم السّلام کو فیض پہو نچنے کی کیا دلیل تو ہم کو اس کے دلائل بتلانے کی گو کچھ حاجت نہیں کیونکہ یہ مسئلہ اہل تحقیق کا اجماعی ہے مگر تقریبِ فہم کے طور پر بتلانے کا کچھ حرج بھی نہیں سو ایک مقدمہ اول سمجھنا چاہیئے کہ آپ جمیع کمالات انبیاء علیہم السلام کے جامع ہیں اور اس کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ حدیث صحیح میں آتا ہے کہ ایک بار صحابہ رضی اللہ عنہم انبیاء کے فضائل میں گفتگو کر رہے تھے کسی نے کہا کہ حق تعالےٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو خلیل اللہ بنایا کسی نے کہا کہ اللہ تعالےٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کلیم اللہ بنایا کسی نے کہا کہ حق تعالےٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو روح اللہ وکلمۃ اللہ بنایا وعلیٰ ہذا۔ اور اس گفتگو سے صحابہ کا یہ مقصود نہ تھا کہ انبیاء کو آپ پر فضیلت دیں بلکہ غالبًا وہ یہ چاہ رہے تھے کہ جس طرح ہم کو ان انبیاء کے خاص اوصاف معلوم ہیں۔ اسی طرح یہ بھی معلوم کریں کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں خاص صفت کیا ہے جس کی وجہ سے آپ سب انبیاء سے افضل ہیں۔ صحابہ اسی گفتگو میں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اپنے حجرہ سے باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ میں نے تمہاری سب گفتگو سنی واقعی حضرت ابراہیم خلیل اللہ ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ وکلمۃ اللہ ہیں اَلَا اِنَّ صَاحِبَکُمْ حَبِیْبُ اللّٰہِ (یاد رکھو تمہارا ساتھی حبیب اللہ ہے)

اس واقعہ میں یہ تو ضرور ہے کہ حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اپنی یہ خاص صفت اپنی فضیلت ظاہر کرنے کیلئے بیان فرمائی ہے۔

چنانچہ سیاق کلام اس کو مقتضی ہے مگر اس پر اشد کال یہ ہے کہ لغت میں تتبع کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محبت وخلت میں خلت کا درجہ بڑھا ہوا ہے کیونکہ محبت

کا اطلاق تو تھوڑی سی محبت پر بھی ہو سکتا ہے مگر خلت کا اطلاق جبھی ہوتا ہے جبکہ محبت خُلَلِ قلب یعنی اندرون قلب میں پہنچ جائے جس کو تنبی نے اپنے ایک شعر میں بیان کیا ہے ؎

عَذْلُ الْعَوَاذِلِ حَوْلَ قَلْبِ التَّائِہٖ وَھُوٰیَ الْاَحِبَّۃِ مِنْہُ فِیْ سَوْدَائِہٖ

(ملامت گروں کی ملامت، قلب کے گرد اگرد رہے اور دوستوں کی محبت سودائے قلب یعنی قلب کے اندر ہے)

پس خلت اس درجہ کی محبت کا نام ہے جو سودائے قلب میں پیوستہ ہو جائے تو اب حضور صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ میں حبیب اللہ ہوں۔ ابراہیم علیہ السلام پر آپ کی فضیلت کو ثابت نہیں کرتا کیوں کہ وہ خلیل اللہ ہیں اور خلت کا درجہ محبت سے بڑھا ہوا ہے۔ اس اشکال کے جواب میں لوگوں نے مختلف تقریریں کی ہیں مگر سہل جواب یہ ہے کہ اس جگہ آپ نے محبت کا اطلاق معنے لغوی کے اعتبار سے نہیں فرمایا بلکہ محاورات کے اعتبار سے فرمایا ہے پس لغۃً گو خلت محبت سے بڑھی ہوتی ہے لیکن استعمال و اطلاق محاورات میں گو محبت تو خلت سے بڑھی ہوتی نہ ہو مگر حبیب کا صیغہ خلیل سے بڑھا ہوا ہے چنانچہ خلیل تو جس طرح معشوق کو کہتے ہیں اسی طرح اس کا اطلاق عاشق پر بھی آتا ہے بخلاف **حبیب** کے کہ اس کا اطلاق محض معشوق پر ہوتا ہے عاشق پر حبیب کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ اس کو محب کہتے ہیں۔ پس **خلیل اللہ و حبیب اللہ** میں یہ فرق ہوا کہ **خلیل اللہ** خدا کے عاشق کو بھی کہہ سکتے ہیں اور معشوق کو بھی اور **حبیب اللہ** صرف محبوب ہی کو کہیں گے (گو جو خدا کا محبوب ہوگا وہ محب بھی ضرور ہوگا مگر) مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ تعالے علیہ وسلم میں محبوبیت کی شان ابراہیم علیہ السلام سے بڑھی ہوتی ہے جب یہ ثابت ہو گیا کہ حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم میں شان محبوبیت سب سے زیادہ ہے تو اب عادات پر نظر کی جائے عادت یہ ہے کہ جب کوئی کسی کا محبوب ہوتا ہے تو محب کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ جو چیز بھی عمدہ ہو اور محبوب

کو دیجا سکتی ہے وہ اس کو ضرور دیا کرتا ہے۔ دی جا سکتی ہو گی قید میں نے اس لئے بڑھائی تاکہ کوئی صاحب اس دلیل سے حضور صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم کے لئے علم غیب وخواص الوہیت کو ثابت کرنے لگیں اگر کوئی ایسا کرے گا تو ہم کہدیں گے کہ گفتگو ان امور میں ہے جو محبوب کو دیئے جا سکتے ہیں اور خواص الوہیت کا اعطا بشر کو محال ہے (ورنہ یہ بھی ممکن ہوگا کہ حق تعالٰے کسیکو خدا بنادیں، حالانکہ اسکے امکان کا کوئی بھی قائل نہیں) اور یقیناً جتنے کمالات انبیاء علیہم السلام کو دیئے گئے ہیں وہ سب عمدہ ہیں اور قابل عطاء ہیں تو قاعدۂ عادیہ کی بنا پر جو کہ بمنزلہ لازم عقلی کے ہے حق تعالٰے نے وہ سب کمالات حضور صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم کو ضرور عطا فرمائے ہوں گے پس ثابت ہو گیا کہ جو کمالات جملہ انبیاء میں منفرداً منفرداً موجود ہیں وہ سب حضور صلے اللہ تعالٰے علیہ وسلم میں مجتمعاً موجود ہیں۔ اسی کو کسی نے کہا ہے ؎

حسن یوسف دمِ عیسیٰ ید بیضا داری آنچہ خوبانِ ہمہ دارند تو تنہا داری

(آپ حسن یوسف، دم عیسیٰ ید بیضاء رکھتے ہیں جو تمام اوصاف انبیاء رکھتے ہیں وہ سب اوصاف تنہا آپ میں موجود ہیں)

اور چونکہ یہ مقدمات اقناعیہ ہیں اس لئے اگر ان پر کچھ عقلی اشکال واقع ہوں تو مضر نہیں کیونکہ مقدمات اقناعیہ سے سامع کی تسلی کر دینا مقصود ہوتا ہے اسکات والزام مقصود نہیں ہوتا لہٰذا اس مقصود پر مقدماتِ عادیہ سے استدلال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، اور چونکہ اصل مقصود ان مقدمات پر موقوف نہیں لہٰذا ان کا اقناعی ہونا اصل مقصود کو بھی مضر نہیں۔ شاید اس شعر پر کسیکو یہ شبہ ہو کہ یوسف علیہ السلام کا حسن تو ایسا تھا کہ زنانِ مصر نے آپ کی صورت دیکھ کر بدحواسی میں ہاتھ کاٹ ڈالے تھے۔ حضور صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم میں یہ بات کہاں تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حسن کی انواع ہیں حسن کی ایک نوع یہ ہے کہ دیکھنے والے کو دفعۃً متحیر کر دے اور پھر رفتہ رفتہ اس کی سہار ہوتی جائے یوسف علیہ السلام کا حسن

ایسا ہی تھا چنانچہ زلیخا کو آپ کے حسن کی سہار ہو گئی تھی انہوں نے ایک دن بھی ہاتھ نہیں کاٹے ۔ اور ایک نوع حسن کی یہ ہے کہ دفعۃً تو متحیر نہ کرے مگر جوں جوں اس کو دیکھا جائے تحمل سے باہر ہوتا جائے جس قدر غور کیا جائے اسی قدر دل میں گھستا جائے اسیکو ایک شاعر بیان کرتا ہے ؎

یزیدك وجهه حسنا ۔۔۔ اذا ما زدته نظرا

حضور صلے اللہ تعالے علیہ وسلم کا حسن ایسا ہی تھا کہ اس میں دفعۃً متحیر کردینے کی شان ظاہر نہ تھی کیونکہ آپ میں خداداد عظمت و جلال کی ایک شان ایسی تھی کہ دیکھنے والے پر سب سے پہلے اس کا ایسا اثر پڑتا تھا جس کی وجہ سے دیکھتے ہی نیا آدمی مرعوب ہوجاتا تھا اس کو حسن صورت پر آنکھ بھر کر نگاہ ڈالنے کی مہلت ہی نہ ملتی تھی تاکہ تحیر کی نوبت آوے كَمَا فِي حَدِيْثِ عَلِيٍّ مَنْ رَاٰهُ بَدَاهَةً هَابَهُ اَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ فِي الشَّمَائِلِ جامع)

(جیسا حدیث شریف علی میں ہے جو شخص آپ کو اچانک دیکھتا آپ سے مرعوب ہوجاتا اس کو ترمذی نے شمائل میں نقل کیا ہے)

البتہ جتنا کوئی پاس رہتا اتنا ہی حضور صلے اللہ تعالے علیہ وسلم کا حسن اس پر منکشف ہوتا تھا اور دن بدن دل میں گھر کرتا چلا جاتا تھا (كَمَا فِي حَدِيْثِ عَلِيٍّ الْمَذْكُوْرِ وَمَنْ خَالَطَهُ بِشَاشَتَهٗ اَحَبَّهٗ ۱۲)

(جیساکہ حدیث علی مذکور میں ہے اور جو شخص آپ سے ملتا تو آپ سے محبت کرنے لگتا)

یوسف علیہ السلام کے حسن پر عورتوں کا عاشق ہوجانا منقول ہے مگر فی نفسہ یہ زیادہ بعید نہیں بلکہ فطری امر ہے جو عادت کے مطابق ہے گو کسی درجہ خاص میں خارق عادت بھی ہے اور حضور صلے اللہ تعالے علیہ وسلم بہ مرد عاشق تھے جن میں عہ بچے بھی تھے اور بوڑھے بھی تھے مردوں کا عاشق ہونا وہ بھی (بچوں اور) بوڑھوں

عہ جیساکہ حدیث میں دو نوجوان بچوں کا حضور صلے اللہ تعالے علیہ وسلم کی محبت میں ابوجہل پر حملہ آور ہونا مذکور ہے انہوں نے یہ سن لیا تھا کہ ابوجہل حضور صلی اللہ تعالے علیہ وسلم کا بہت دشمن ہے اس لئے دونوں اس کے

قتل کیلئے بیتاب تھے جب معرکہ بدر میں ابوجہل کی صورت نظر پڑی فوراً دونوں اس پر دوڑے اور ذرا سی دیر میں اس کو تہ تیغ کردیا ۲

کا یہ فی نفسہ یہی بہت عجیب ہے ایک عاشق صحابی فرماتے ہیں۔ رَاَیْتُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْلَۃً فِیْ حُلَّۃٍ حَمْرَاءَ وَالْقَمَرُ طَالِعٌ فَکُنْتُ اَرٰی اِلَی الْقَمَرِ مَرَّۃً وَاِلٰی وَجْہِہٖ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَرَّۃً فَوَاللّٰہِ کَانَ وَجْہُہٗ اَحْسَنَ مِنْہُ (او کما قال) یعنی ایک رات میں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو سُرخ (دھارے دار) جوڑے میں دیکھا اس وقت چاند نکلا ہوا تھا تو میں کبھی آپ کے چہرہ پر نظر کرتا کبھی چاند کو دیکھتا۔ بخدا آپ کا چہرۂ مبارک چاند سے زیادہ خوبصورت تھا اسی کو کسی شاعر نے عجیب لطیف عنوان سے تعبیر کیا ہے ؎

گہے بروئے تو گاہے بسوئے مہ نگرم کند مقابلہ چوں کس کتاب را تنہا

یعنی کتاب کے مقابلہ کیلئے تو دو آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے میں تنہا کیونکر مقابلہ کروں ایک مرتبہ حضرت طلحہ صحابی رضی اللہ عنہ نے لڑائی میں اپنے ہاتھوں کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا سپر بنایا تھا کفار کے جتنے تیر آتے وہ سب کو اپنے ہاتھ پر روکتے تھے تاکہ حضور صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تیر نہ لگنے پائے یہ عشق نہ تھا تو کیا تھا اس کے علاوہ صحابہ کی محبت کے واقعات کتابوں میں کثرت سے موجود ہیں۔ بہت صحابہ نے آپ کی محبت میں گھر چھوڑا باہر چھوڑا بیوی بچے چھوڑے اپنے عزیزوں کو جبکہ وہ حضور صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مخالف ہوتے بیدریغ قتل کیا حتیٰ کہ خود اپنی جانیں حضور صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر نثار کر دیں اور سر کٹوا دیئے اسی حسن کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ؎

لَوَاحِیْ زُلَیْخَا لَوْرَاَیْنَ جَبِیْنَہٗ لَاٰثَرْنَ بِالْقَطْعِ الْقُلُوْبَ عَلَی الْیَدَا

یعنی حضور صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا حسن دل میں گھستا تھا اگر آپ کو زنانِ مصر دیکھ لیتیں تو بجائے ہاتھوں کے دلوں کو چیر پھاڑ دیتیں پس اجمالاً حضور صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حسن کے متعلق میں اتنی گفتگو پر کفایت کرتا ہوں اور حقیقت میں اتنا بھی میرے مذاق کے خلاف ہے۔ باقی اس باب میں تفصیلی گفتگو کرنا تو میرے مذاق کے بالکل خلاف ہے کیونکہ اس میں ایہام تنقیص کا ہو جاتا ہے۔

دوسری دلیل اس مدعی کی کہ آپ کی جامعیت بجمیع کمالات الانبیاء علیہم السلام ہے وہ ہے جو **مولانا رومی** (قدس اللہ سرہ) نے خاتم النبیین سے مستنبط کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی خاتمیت جس طرح زمانی ہے اسی طرح آپؐ کو خاتمیت رتبی بھی حاصل ہے کہ کمالات انبیاء کے تمام مراتب آپ پر ختم ہو گئے ہیں یعنی آپ میں تمام کمالات سب سے اعلیٰ درجہ کے مجتمع ہیں مولانا نے اس مضمون کو بہت اشعار میں بیان فرمایا ہے وعظ الظہور میں وہ سب اشعار مفصل مذکور ہیں، اور اس سے مولانا کا یہ مقصود نہیں ہے کہ نعوذ باللہ آپ خاتم زمانی نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ خاتم زمانی ہونے کے ساتھ خاتم رتبی بھی ہیں یعنی تمام مراتب کمالات آپ پر ختم ہو گئے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس تفسیر پر آپؐ کی خاتمیت اور زیادہ اکمل ہو گی کہ ختم زمانی وختم رتبی دونوں آپ کے لئے ثابت ہوں گے اور یہی وہ مضمون ہے جو مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے ظاہر فرمایا تھا۔ تو لوگوں نے اس پر بہت شور مچایا مگر مولانا رومی کو کوئی کچھ نہیں کہتا کیونکہ لوگ ان کو درویش سمجھتے ہیں اور درویش بھی مجذوب اس لئے ان سے ڈرتے ہیں لوگ درویشوں کی نسبت یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو کچھ یہ زبان سے کہدیں گے وہی ہو جائے گا، بلکہ انکی مخالفت سے وبال آجانے کا خوف کرتے ہیں اس لئے ان پر زبان درازی نہیں کرتے خصوصًا مجذوبوں پر کیونکہ سالک تو پھر کچھ سوچ سمجھکر کہتا ہے اور مجذوب تو بیباک ہوتا ہے جو جی میں آتا ہے بیدھڑک کہہ ڈالتا ہے خواہ بددعا سے کوئی ھلاک ہی ہو جائے۔

چنانچہ مولانا رومی نے مثنوی میں ایک جگہ اپنے کشف سے اُن لوگوں کا حال بھی بیان فرمایا ہے جو مثنوی کے مضامین پر انکار کرتے تھے کہ اے حسام الدین تم دیکھ رہے ہو کہ یہ لوگ انکار کیوجہ سے جہنم میں کس طرح گر رہے ہیں اشعار میں تو صراحتًا یہ مذکور نہیں کہ مولانا کن لوگوں کی نسبت یہ ارشاد فرمارہے ہیں مگر شراح نے اسکی تفسیر میں یہی لکھا ہے کہ مولانا نے منکرین مثنوی

کے بارے میں یہ اشعار فرمائے ہیں۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ مثنوی عام تصانیف کی طرح نہیں لکھی گئی بلکہ بطور املاء کے لکھی گئی ہے کہ مولانا رومی پر کسی وقت خاص حالت ہوتی تھی اسی میں مولانا کی زبان پر اشعار جاری ہوتے تھے اور مولانا حسام الدین لکھتے جاتے تھے۔ اسی طرح پوری مثنوی لکھی گئی۔ تو اس حالت میں منکرین کا واقعہ بھی منکشف ہوگیا اس کو بھی بیان فرمادیا واللہ اعلم۔ تو ان اشعار کو مع شرح کے دیکھ کر مولانا پر اعتراض کرنے کی لوگوں کو اور بھی جرأت نہیں ہوتی۔ ڈرتے ہیں کہیں ہمارا بھی وہی حشر نہ ہو جو منکران مثنوی کا مولانا کے زمانہ میں ہوا تھا اس لیے ان اشعار پر کوئی اعتراض نہیں کرتا مگر اسی مضمون کو مولانا **محمد قاسم صاحب** نے جو بیان فرمایا تو لگے فتوے نکلنے بات یہ ہے کہ لوگ علماء کے زیادہ معتقد نہیں ہوتے نہ ان سے ڈرتے ہیں اور ہمارے حضرات کو لوگ علماء ہی سمجھتے ہیں صوفی اور شیخ نہیں سمجھتے حالانکہ مولانا محمد قاسم صاحب عالم متبحر ہونے کے ساتھ بہت بڑے شیخ کامل بھی تھے مگر اچھا ہے کہ لوگ

ع۵ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو تحذیر الناس میں مضمون خاتمیت لکھتے ہوئے مثنوی کے یہ اشعار نہیں ملے ورنہ سہولت کے ساتھ فرما دیتے کہ خاتمیت کے یہ معنیٰ بیان کرنے میں میں تنہا نہیں ہوں بلکہ مولانا رومی بھی اسی طرف گئے ہیں اب جی چاہتا ہے کہ اشارہ کے طور دو تین شعر مثنوی کے وعظ الظہور سے نقل کرکے اس جگہ بیان کردوں تاکہ ناظرین کو اس مضمون کا اجمالاً پتہ چل جاوے جسکی تفصیل کو حضرت مولانا نے وعظ مذکور پر حوالہ فرمایا ہے ؎ ختمہائے کانبیا بگذاشتند ؛ آن بدینِ احمدی برداشتند یعنی وہ مہریں (نقصان استعداد کی) جو انبیاء چھوڑ گئے تھے آپ کا دین ایسا کامل ہے کہ اسکی برکت نے وہ سب نقصان اٹھا دیئے ؎ قفلہائے ناکشادہ ماندہ بود ؛ از کف انا فتحنا برکشود۔ یعنی استعداد کے بہت سے قفل بے کھلے رہ گئے تھے انا فتحنا یعنی صاحب انا فتحنا کے دستِ مبارک سے کھل گئے۔ مراد حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔

باقی صفحہ ۳۰۱ پر

ان حضرات کو عالم ہی سمجھیں شیخ نہ سمجھیں کیونکہ عوام جس کو شیخ سمجھتے ہیں اس کو بہت لپٹنے لگتے ہیں اس کے پاس دنیوی قصے جھگڑے لیجاتے ہیں جس میں عارف کا وقت بہت ضائع ہوتا ہے کیمیا گو کا تو مذاق بھی ہوتا ہے کہ کوئی اس کو

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۰ ؎ بہرِ ایں خاتم شد است او کہ بجود ؛ مثل او نے بود و نے خواہند بود ۔ آپ اس سبب سے خاتم ہوئے ہیں کہ فیوض و علوم کے جود و عطا میں آپ کا مثل نہ ہوا نہ ہوگا۔ کمالات کے تمام مراتب آپ پر ختم ہو گئے اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ خاتم زمانی نہیں ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ خاتم مطلق ہیں زماناً بھی کمالاً بھی ؎ چونکہ در صنعت برد استا دوست ؛ نے تو گوئی ختم صنعت بر تو است ۔ تمثیل کے طور پر فرماتے ہیں کہ دیکھو جب کوئی استاد کسی صنعت میں سبقت لیجاتا ہے تو کیا تم اس کو یہ نہیں کہتے کہ یہ صنعت تجھ پر ختم ہے یعنی ضرور کہتے ہو اسی طرح خاتم النبیین میں ختم کمالات پر بھی اشارہ بعید نہیں کہ آپ پر کمالات نبوت ختم ہیں یعنی ان میں آپ کا کوئی مثل نہیں پس یہ معنے ہیں خاتمیت کے اور مطلب وہی ہے کہ ختم زمانہ کے ساتھ آپ اس طرح بھی خاتم ہیں ؎

در کشاد ختمہا تو خاتمی ؛ در جہانِ روح بخشا خاتمی

اول تو قوت فیضان کے اندر آپ کا خاتم ہونا بیان فرمایا تھا اس شعر میں نقصانِ استعداد کی مہریں کھولنے کے اعتبار سے آپ کا خاتم ہونا ظاہر فرماتے ہیں۔ کہ آپ ان مہروں کے کھولنے میں بھی خاتم ہیں اور روح عطا کرنے والے حضرات (یعنی انبیاء علیہم السلام) کے عالم میں آپ بمنزلہ خاتم کے ہیں ۱۲ من الجامع

* * *

کیمیاگر نہ سمجھے اگر لوگ اس کو کیمیا گر نہ سمجھیں گے تو اس کا کیا نقصان ہے اگر کچھ نقصان ہے تو انہی کا ہے کہ اس کے فیوض و برکات سے محروم رہ گئے عارف تو خود چاہا کرتا ہے کہ نا اہلوں کو میرے کمال کی اطلاع نہ ہوے

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی   بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(مدعی سے اسرار عشق و مستی کے نہ بیان رنج اور خود پرستی میں اس کو مرنے دو)

غرض جو تفسیر مولانا رومی نے بیان فرمائی ہے اس پر کسی نے کلام نہیں کیا اور جن لوگوں نے مولانا محمد قاسم صاحبؒ پر اعتراض کیا ہے اگر ان کو معلوم ہو جاتا کہ یہ مضمون مثنوی میں بھی ہے تو ہرگز کلام نہ کرتے اس لئے ہمیں اپنے مدعی کے اثبات میں مولانا رومی کے کلام سے استدلال کا حق ہے۔

جب حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے لئے خاتمیت زمانیہ کے ساتھ خاتمیت رتبیہ بھی ثابت ہے تو معلوم ہوا کہ تمام کمالات حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم پر ختم ہیں اور دوسرے انبیاء ان میں آپ سے مستفید ہیں جب ان دلیلوں سے یہ مقدمہ ثابت ہو گیا کہ آپ جمیع کمالات انبیاء علیہم السلام کے جامع ہیں اب میں اس دعوے کو ثابت کرتا ہوں کہ ان جمیع کمالات کا فیض حضرات انبیاء علیہم السلام کو حضور اقدس صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ہی سے پہونچا ہے اس پر دلیل یہ ہے کہ مصنف عبدالرزاق میں ایک حدیث ہے یَا جَابِرُ[عہ] اِنَّ اللّٰہَ تَعَالےٰ خَلَقَ قَبْلَ الْاَشْیَاءِ نُوْرَ نَبِیِّکَ مِنْ نُوْرِہٖ الحدیث الطویل اے جابر حق تعالےٰ نے سب سے پہلے تمہارے نبی کے نور کو اپنے نور سے پیدا کیا پھر جب اللہ تعالےٰ نے اور مخلوق کو پیدا کرنا چاہا تو اس نور کے چار حصے کئے اور ایک حصہ سے قلم

[عہ] قلت ذکرہ فی المواہب (ص ۹ ج ۱) بلفظ یا جابر ان اللہ تعالےٰ خلق قبل الاشیاء نور نبیک من نورہ الحدیث بطولہ ولم یذکر سندہ حتی ینظر فیہ ۱۲ جامع قلت لکن لایضر عدم ذکر السند لان الاستدلال لمحض التائید والمدعی ثابت باجماع اہل التحقیق ۱۲

پیدا کیا اور دوسرے سے لوح اور تیسرے سے عرش آگے طویل حدیث ہے اب یہ حدیث ان الفاظ سے مشہور ہوگئی ہے اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ (پہلے اللہ تعالیٰ نے میرا نور پیدا کیا) مضمون تو صحیح ہے مگر حدیث کے الفاظ یہ نہیں ہیں سو اول تو اس حدیث جابر میں تنصیص ہے کہ بقیہ سب مخلوقات کی تکوین میں جن میں حضرات انبیاء اور ان کے کمالات بھی آگئے آپ کو دخل ہے اور یہی حاصل ہے استفادہ کا آپ سے دوسرے یہاں بھی جس طرح مولانا اردی نے خاتمیت کی دو قسمیں کی ہیں اولیت انبیاء کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں ایک اولیت زمانیہ کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم زماناً سب سے مقدم ہیں ایک اولیت ذاتیہ کہ آپ ذاتاً سب سے مقدم ہیں کہ تمام مخلوقات اپنے وجود اور کمالات میں حضور صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محتاج ہیں جنمیں انبیاء بھی داخل ہیں مگر اولیت ذاتیہ کے وہ معنی مراد نہیں جو فلاسفہ کی اصطلاح ہے جس میں مقدم کی ذات مستلزم ہے متاخر کے وجود کو بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ میں اولیت زمانیہ کے ساتھ اولیتِ علیت بھی ہے کہ آپ دوسری مخلوق کے لئے علتِ ثبوتِ کمالات ہیں مگر نہ علت بمعنی مؤثر بالاضطرار بلکہ علت بمعنے توسط کے غرض یہ کہ ہم آپ کیلئے نہ باری تعالیٰ سے صدور میں ویسی اولیت ذاتیہ کے قائل ہیں جیسے فلاسفہ باری تعالیٰ کو عقل اوّل کے اعتبار سے مقدم بالذات کہتے ہیں کہ عقل کو مخلوق بالاختیار نہیں کہتے بلکہ مجعول بالاضطرار کہتے ہیں کہ وہ حق تعالیٰ سے بالاضطرار موجود ہوگئی پھر وہ اپنے ماتحت کے کیلئے اسی طرح علت موثرہ ہے بلکہ ہمارے نزدیک رسول اللہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اول مخلوق بالاختیار ہیں جس سے آپ کا حدوث لازم ہے اور پھر آپ دیگر مخلوق کے وجود و کمالات میں بھی اس طرح مؤثر نہیں ہیں محض باختیار حق واسطہ ہیں غرض اس حدیث سے آپ کے دو کمال ظاہر ہوئے ایک اولیّت زمانیہ دوسرے اولیّت بالعلیۃ آپ کا زماناً سب سے اوّل ہونا تو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ آپ میں استفادہ فیض وجود و کمالاتِ وجود کی قابلیت تمام مخلوق سے

زیادہ ہے اور اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ وہ قابلیت آپ کے اندر از خود بلا جعل حق تھی بلکہ وہ قابلیت بھی آپ کے اندر مشیت آلہی و عطاء خداوندی سے آئی ہے قابلیت بھی آپ کے لئے بالاضطرار ثابت نہیں بلکہ بالقصد والاختیار ثابت ہوتی ہے یہاں سے اس شعر کا اگر اس میں تاویل ہو جاوے غلط ہونا واضح ہو گیا ہے

نقصان زقابل ست وگرنہ علی الدوام　　فیض سعادتش ہمہ کس را برابر است

(نقصان قبول کرنے والے میں ہے ورنہ آپ کا فیض سعادت سب پر برابر ہے)

اس کا مدلول یہ ہے کہ مخلوق میں جو بعض کامل اور بعض ناقص ہیں اس اختلاف کا منشا قابل کی استعداد کا ناقص و کامل ہونا ہے ورنہ حق تعالے کا فیض سعادت سب کے لئے یکساں ہے گویا فیض آلہی کی مثال نور آفتاب جیسی ہے کہ وہ تو اپنی طرف سے نور افشانی سب پر یکساں کرتا ہے کسی پر کم زاید نہیں کرتا مگر قابل کے اختلاف سے آثار تنویر مختلف ہو جاتے ہیں کہ سیاہ توے میں تنویر کی قابلیت کم ہے اس لئے وہ زیادہ روشن نہ ہو سکا اور آئینہ میں قابلیت زیادہ ہے وہ زیادہ منور ہو گیا) یہ ہے مدلول اس شعر کا سو یہ بالکل غلط ہے کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ ہر شخص میں جو قابلیت مختلف ہے وہ حق تعالے کی طرف سے بالاضطرار ثابت ہے بالاختیار ثابت نہیں اور اسی وجہ سے باوجودیکہ سب کو فیض برابر پہونچاتے ہیں مگر کہیں زیادہ پہنچتا ہے کہیں کم اور یہ لازم بالکل باطل ہے کیونکہ وہ قابلیت فی نفسہ امر ممکن ہے تو بعض ممکنات کا قدیم و مستغنی عن الجاعل ہونا لازم آئے گا۔ جو بالکل غلط ہے۔ ممکن ہے کوئی ایسا نہیں جو جاعل سے مستغنی ہو یا حق تعالے سے بطریق ایجاب و اضطرار کے صادر ہوا ہو یہ مذہب فلاسفہ کا ہے جو مادہ کو اور اس کی استعداد کو قدیم صادر بالاضطرار کہتے ہیں اہل اسلام کا یہ مذہب نہیں ہے اور فلاسفہ کے قول کا غلط ہونا متکلمین نے خوب ثابت کر دیا ہے پس یہ کہنا غلط ہے کہ نقصان کا منشاء استعداد کا نقص ہے بلکہ اس کا منشاء یہ ہے کہ حق تعالے ہی نے کسی کی استعداد کامل

اور کسی کی ناقص بنائی ہے اور وہی خود سبکو یکساں فیض پہونچانا نہیں چاہتے۔ اگر وہ سب کو یکساں فیض پہنچانا چاہیں تو استعداد ناقص کی کیا مجال ہے کہ جو اس کو قبول نہ کرے اسی لئے صحیح مضمون اس شعر کا ہے ؎

دادِ او را قابلیت شرط نیست بلکہ شرطِ قابلیت دادِ اوست

(اسکی عطا کیلئے قابلیت شرط نہیں ہے بلکہ اس کی عطا و داد قابلیت کی شرط ہے)

یعنی حق تعالیٰ کی عطا قابلیت پر موقوف نہیں بلکہ قابلیت خود عطا پر موقوف ہے اگر حق تعالیٰ کسیکو کمالات عطا کرنا چاہیں تو اس میں قابلیت بھی پیدا کر دیتے ہیں یہ مضمون نصوص پر منطبق ہے آیات و احادیث اس کی تائید کرتی ہے۔

(وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى۔ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا وغیر ذلك)

(اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو تمام وہ لوگ جو زمین پر ہیں ایمان لے آتے)

اور پہلا شعر غلط ہے وہ شریعت[عہ] پر منطبق نہیں ہوتا مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہیدؒ نے اسی بنا پر عرفی کے اس شعر کی بھی تغلیط کی ہے اور سُنا ہے کہ تکفیر بھی کی ہے ؎

تقدیر بیک ناقہ نشانید دو محمل سلمائے حدوثِ تو و لیلائے قدم را

(تقدیر نے ایک ناقہ پر دو محمل رکھ دیئے ایک سلمائے حدوث کا دوسرا لیلائے قدم کا یعنی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں حدوث اور قدم کی دونوں صفتیں موجود ہیں۔)

اس شعر میں حضور صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے حدوث و قدم کی دونوں

[عہ] قلت ویمکن تاویلہ بحملہ علیٰ لغت النبی صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم فیصح ۱۲ جامع

صفتیں ثابت کی ہیں۔ یہ مذہب فلاسفہ کا ہے کہ حدوث ذاتی کے ساتھ قدم زمانی ممکن کے لئے بھی ثابت ہوسکتا ہے اہلِ اسلام کا یہ مذہب نہیں ہمارے نزدیک تعدد ذوات قدیمہ محال ہے کوئی ممکن قدیم نہیں ہوسکتا نہ بالذات نہ بالزماں ہاں اگر عرفی کے اسی شعر میں قدم سے معنی مصطلح مراد نہ ہوں بلکہ معنے لغوی یعنی کہیں گے مراد لیجائے تو اس صورت میں تکفیر کی ضرورت نہیں بلکہ اب اس کے وہی معنی ہوں گے جو اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ کے معنے ہیں غرض آپ کا اوّل مخلوق ہونا آپ کی کمال قابلیت کی دلیل ہے کہ اول فیض حق تعالٰے کا آپ کو پہنچا گو وہ قابلیت بھی بمشیت الٰہیہ ہے مگر حق تعالٰے کا آپ میں ایسی قابلیت کاملہ پیدا کرنا کیا تھوڑی بات ہے بہت بڑی بات ہے اور اولیت زمانیہ سے زیادہ کمال یہ ہے کہ آپ اس کی ساتھ تقدم بالعلیت سے بھی موصوف ہیں نہ بمعنی تاثیر بالذات کے بلکہ بمعنے توسط[ع] کے نیز نشر الطیب کے فصل ثانی کی پہلی اور دوسری روایت میں حاکم و بیہقی و طبرانی کی تخریج سے حدیث قدسی مذکور ہے کہ اے آدم اگر محمد نہ ہوتے تو میں تم کو بھی پیدا نہ کرتا اور رسالہ

[ع] قلت ویؤیدا اولیته صلی اللّٰه تعالٰی علیه وسلم بهذا المعنی حدیث جابر المذکور لما فیه من قوله فجعل ذلک النور یدور بالقدرة حیث شاء اللّٰه تعالٰی ولم یکن فی ذلک الوقت لوح ولا قلم ولا جنة ولا نار ولا ملک ولا سماء ولا ارض ولا شمس ولا قمر ولا جنی ولا انس فلما اراد اللّٰه ان یخلق الخلق قسم ذلک النور اربعة اجزاء (الی ان قال) ثم قسم الرابع اربعة اجزاء فخلق من الاول نور ابصار المومنین ومن الثانی نور قلوبهم وهی المعرفة باللّٰه ومن الثالث نور انسهم وهو التوحید الحدیث بطوله واللّٰه اعلم بصحته ۱۲ جامع۔

⁂

راحت القلوب میں حاکم کی روایت اور تصحیح سے اور شیخ سبکی اور بیہقی کی اس روایت کی تقریر و تثبیت سے نقل کیا ہے کہ اگر نہ پیدا کرتا میں محمد صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو نہ پیدا کرتا میں آدم کو نہ بہشت اور دوزخ کو الحدیث ان سب روایات کے آپ کا واسطہ فیوض و کمالات ہونا جمیع مخلوقات کیلئے ثابت ہوا امت کے لئے تو واسطہ فی العروض کے طور پر اور انبیاء کے لئے واسطہ فی الثبوت کے طور پر کیونکہ واسطہ فی العروض میں موصوف بالشئی حقیقت میں واسطہ ہوتا ہے ذی واسطہ مجازاً موصوف ہوتا ہے جیسے حرکت جالس فی السفینہ (کشتی میں بیٹھنے والے کی حرکت) کی بواسطہ سفینہ کے کہ حرکت کے ساتھ حقیقت میں صرف سفینہ موصوف ہے جالس دراصل ساکن ہے مگر بواسطہ حرکت سفینہ کے جالس کو بھی مجازاً متحرک کہہ دیتے ہیں اور واسطہ فی الثبوت کی ایک قسم میں کہ وہی مراد ہے اس مقام پر موصوف بالشئی ذی واسطہ و واسطہ دونوں حقیقۃً ہوتے ہیں جیسے ید و مفتاح (ہاتھ اور کنجی) دونوں متحرک ہوتے ہیں۔

پس فیوض اُمت کیلئے تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس قسم کے واسطہ ہیں جیسے سفینہ واسطہ ہے حرکت جالس کے لئے اور فیوض انبیاء میں آپ اس طرح واسطہ ہیں جیسے حرکت ید واسطہ ہے حرکت مفتاح کے لئے خوب سمجھ لو۔ یہی بات مولانا محمد قاسم صاحب نے بھی بیان فرمائی تھی جس پر لوگوں نے اعتراض کیا اور حیرت ہے کہ اپنی جماعت کے بعض اکابر کو بھی اشکال تھا اور وجہ اشکال یہ ہے کہ مولانا نے کمالات انبیاء میں بھی واسطہ فی العروض کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور اسی کو کہیں بالذات و بالعرض سے تعبیر فرماتے ہیں بعض اکابر نے مجھ سے بھی اپنا یہی اشکال بیان فرمایا کہ اس سے تو دوسرے انبیاء کا کمالات کے ساتھ حقیقۃً موصوف نہ ہونا لازم آتا ہے میں نے عرض کیا کہ یہ مولانا کی خاص اصطلاح ہے کہ وہ واسطہ فی الثبوت کی جگہ بھی واسطہ فی العروض کا استعمال فرماتے ہیں اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور دعا دی۔

بات یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی جدا اصطلاح قائم کر لینے کا حق ہے لَا مَشَاحَۃَ فِی الْاِصْطِلَاحِ (اصطلاح مقرر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں) مولانا کے ذمہ شیخ بوعلی سینا کی اصطلاحات کا اتباع لازم نہیں انکی یہ ذاتی اصطلاح ہے کہ واسطہ فی الثبوت کی ایک خاص قسم کو واسطہ فی العروض سے تعبیر فرماتے ہیں اور صوفیہ پر اکثر اعتراض اسی لئے ہوتا ہے کہ لوگ اُن کی خاص اصطلاحات سے ناواقف ہوتے ہیں مولانا فرماتے ہیں ؎

اصطلاحا تیست مر ابدال را

(ابدال کی خاص اصطلاحات ہوتی ہیں)

مولوی فضل حق صاحب خیر آبادی میں اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید میں تحریری مناظرہ ہوا کرتا تھا۔ زبانی مناظرہ کی کبھی نوبت نہیں آئی تو ایک دفعہ مولوی فضل حق صاحب نے اپنے طلبہ سے پوچھا کہ بھلا اگر مولوی اسمٰعیل صاحب سے میرا زبانی مناظرہ ہوتا تو میں کس فن میں مناظرہ کرتا طلبہ نے کہا معقول میں کیونکہ مولوی فضل حق صاحب معقول کے امام مشہور تھے اور واقعی اس فن میں ان کو کمال حاصل تھا اسلیئے طلبہ نے بھی یہی کہاکہ آپ معقول میں مناظرہ کرتے۔ فرمایا سبحان اللہ کیا میں پاگل تھا کہ معقول میں ان سے مناظرہ کرتا کبھی میں اپنے قول کی تائید میں کہتا کہ شیخ نے یوں کہا ہے وہ جواب دیتے کہ شیخ نے جھک مارا ہم اس کا قول نہیں مانتے طلبہ نے پوچھا کہ پھر کس فن میں آپ مناظرہ کرتے فرمایا میں ادب میں گفتگو کرتا کیونکہ یہ علم منقول محض ہے اس میں ذہانت سے کام نہیں چل سکتا اور مولانا اسمٰعیل صاحب کو اس فن میں ویسا توغل نہ تھا جیسا مولوی فضل حق کو تھا۔ واقعی عجیب فن چھانٹا جس میں وہی چل سکتا ہے جو حافظ اشعار ولغات ہو اس میں اپنی طرف سے ایک بات بھی نہیں چل سکتی ہر دعوے کیلئے نقل کی ضرورت ہے ہمارے استاد ملا محمود صاحب ادب سے بہت گھبراتے تھے اور سب فنون پڑھاتے تھے اور بہت اچھا پڑھاتے تھے مگر ادب کی کتاب جہاں کوئی لایا صاف فرما دیتے تھے کہ میں نہیں جانتا تو بات وہی تھی کہ اس فن

میں حفظ و نقل کی بہت ضرورت ہے مگر دیکھئے یہ بھی ان کی بے نفسی تھی کہ صاف کہدیتے تھے کہ مجھے یہ فن نہیں آتا میں نہیں جانتا بھلا آج تو کوئی اپنے طالب سے ایسا کہدے۔ نہیں کہہ سکتا مولانا بڑے بے نفس تھے پان بہت کھایا کرتے تھے سبق پڑھاتے میں بھی پان منہ میں رہتا تھا اسی لئے تقریر خود کم کرتے تھے بس طالبعلم نے تقریر کی اور آپ نے ہوں کر دیا۔ بعض دفعہ کوئی شریر طالب علم ایک بار صحیح تقریر کر کے دوبارہ غلط مطلب بیان کرتا تو آپ غلط پر ہوں کر دیا کرتے تھے چنانچہ ایک بار آپ مدرسہ سے گھر جا رہے تھے ایک کاشغری طالب علم کوئی بات پوچھنے کے لئے ساتھ ہو لیا اس نے تقریر کی آپ نے ہوں کر دیا۔ اسنے شرارت کر کے پھر دوبارہ غلط تقریر کی آپ نے اس پر بھی ہوں کر دیا۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر کہا ہوں ہوں کرتا ہے بتلاتا نہیں اس وقت آپ کو ہنسی آ گئی اور پان تھوک کر فرمایا کہ گدھے کے بلّے تو ہی تو خود تقریر کر رہا تھا تو نے مجھ سے کب کہا تھا کہ تم تقریر کرو اب تو نے کہا ہے تو میں تقریر کروں گا پھر آپ نے صحیح مطلب بیان فرما دیا، مولانا صاحب کسی پر غصے ہوتے تو گدھے کا بلّہ فرمایا کرتے تھے طلبہ کہتے۔ کہ حضرت گدھے کے بھی کہیں بلا ہوتا ہے بلّا تو کتے کا ہوتا ہے۔ بہت ہی بے نفس اور بھولے تھے مگر علوم میں بہت خوب استحضار تھا غرض دیکھئے مولوی فضل حق صاحب نے منطق کی حقیقت ظاہر کر دی کہ اگر میں مولوی اسمٰعیل صاحب سے منطق میں مناظرہ کرتا تو وہ ایک بات کہہ کر میرے تمام دلائل کو اڑا دیتے کہ شیخ نے جھک مارا۔ ارسطو نے غلط کہا اسیطرح مولانا محمد قاسم صاحبؒ اصطلاح فلاسفہ کے پابند نہ تھے انکی یہ الگ اصطلاح تھی کہ وہ واسطہ فی الثبوت کو واسطہ فی العروض فرماتے ہیں۔ پس حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کمالات انبیاء میں واسطہ فی الثبوت ہیں اس لئے جتنے کمالات انبیاء میں موجود ہیں وہ سب آپ میں مجتمع ہیں اور آپ ہی سے انبیاء کو حاصل ہوئے ہیں اس کی مزید تائید نشر الطیب کی چھٹی روایت منقولہ من المواہب سے ہوتی ہے کہ

امام محمد باقرؒ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالٰے نے عالم میثاق میں یہ اقرار لیا کہ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ (کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں) سب سے اول آپ ہی نے فرمایا! گویا اور حضرات نے اس جواب میں آپ سے تلقی کی اور رسالہ مذکورہ کی ساتویں روایت میں [illegible] مواہب سے حضرت عباس رضؓ کی اشعار ہیں کہ تقریر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ جنت میں سفینہ نوح علیہ السلام کی سلامتی اور نار نمرود میں حضرت ابراہیمؑ کی حفاظت کا آپؐ کی برکت سے ہونا مذکور ہے اسی کا خلاصہ صاحب قصیدہ بردہ نے اس شعر میں کہا ہے ؎

وَكُلُّ اٰيٍ اَتَى الرُّسُلُ الْكِرَامُ بِهَا فَاِنَّمَا اتَّصَلَتْ مِنْ نُوْرِهٖ بِهِمْ

(اور ہر معجزہ جس کو رسولان کرام لائے سوائے اس کے نہیں کہ وہ معجزہ صرف بدولت حضور پر نور صلے اللہ تعالٰے علیہ وسلم کے پہونچا ہے) ان سب دلائل سے آپ کی ذات مقدسہ میں جمیع کمالات انبیاء کا اجتماع اور دوسرے حضرات میں آپ کے واسطہ سے پہنچنا اچھی طرح ثابت ہوگیا، شاید اس پر کوئی یہ کہے کہ حضور صلے اللہ تعالٰے علیہ وسلم میں معجزہ عصا کہاں تھا اس کا جواب یہ ہے حضور صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم کے قرب ومجاورات سے ایک سوکھی لکڑی میں حیوۃ پیدا ہو گئی تھی۔ جس سے ٹیک لگا کر آپ خطبہ پڑھا کرتے تھے جب ممبر نبوی قیام ہوگیا اور آپ پہلی جگہ سے ہٹ کر ممبر پر تشریف فرما ہوئے تو اثنار خطبہ میں اس سوکھی لکڑی کے اندر سے بہت زور سے رونے کی آواز نکلنے لگی۔ حضور صلے اللہ تعالٰے علیہ وسلم ممبر پر سے اتر کر اس کے پاس تشریف لائے اور اس کی تسلی فرمائی تو وہ آواز آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ جیسے بچہ روتے ہوئے سبکتا ہے اور کمال یہ کہ اس واقعہ میں استن حنانہ میں بصورت جمادیت ہی حیاۃ وصوت پیدا ہو گئی صورت حیّ میں منقلب ہونے کے بعد آثار حیوۃ کا ظہور نہیں ہوا اور یہ معجزہ عصا سے زیادہ عجیب ہے کیونکہ عصائے موسوی میں آثار حیاۃ کا ظہور بعد انقلاب صورت شکل اژدہا ہوتا تھا اور یہ بھی گو بڑا خرقِ عادت ہے مگر

واقعہ اُستن حنانہ اس سے زیادہ عجیب ہے پس حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم میں معجزہ عصا کا وجود واقعۂ اُستن حنانہ سے ثابت ہو گیا۔ اور پھر میں وہی کہتا ہوں کہ اب باب میں تفصیلاً گفتگو نہ کرنا چاہیئے مگر اتنے پتے کے طور پر میں نے ایک مثال بیان کر دی ہے جس سے یہ تبلانا مقصود ہے کہ اگر غور کیا جائے گا تو حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم میں وہ سب کمالات مجتمعًا معلوم ہو جائیں گے۔ جو حضرات انبیاءؑ میں منفرداً منفرداً موجود تھے اور انکو حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ہی کے واسطہ سے وہ کمالات حاصل ہوئے ہیں اور گو یا کمالات انبیاء علیہم السلام میں بھی حقیقی ہیں مگر اتنا فرق ضرور ہے کہ آپ میں وہ کمالات اوروں سے قوی و اکمل ہیں اور اجمالاً اتنا کہنے کا ہمیں حق حاصل ہے کیونکہ حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا افضل الانبیاء ہونا مجمع علیہ ہے، باقی کمالات امت کے واسطے تو حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم واسطہ فی العروض ہیں اس لئے یہاں وہ مثال نہیں ہے جیسے ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن ہو کر مستقل ہو جاتا ہے بلکہ یہاں وہ مثال ہے جیسے گھر میں چراغ روشن ہونے سے در و دیوار منور ہو جاتے ہیں ظاہر ہے کہ در و دیوار میں روشنی کوئی مستقل نہیں ہے وہی ہے جو چراغ میں ہے۔

چنانچہ اگر وہاں سے چراغ کو اٹھا لیا جاوے تو در و دیوار سب تاریک رہ جائیں گے اسی طرح اُمتی کے اندر جو کمالات ہیں وہ محض آپ کے فیوض کا عکس ہے کوئی مستقل کمال نہیں اگر وہ اپنے . . کو صاحب کمال مستقل سمجھنے لگے تو کورا رہ جائے گا۔ جیسا کہ ایک کاتب وحی کا قصہ ہے جس کا نام عبداللہ بن بن سعد بن ابی سرح تھا۔ حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی برکت صحبت سے اس میں یہ بات پیدا ہو گئی کہ ایک مرتبہ آپ نے اُس کو قرآن شریف کی یہ آیت لکھنے کا امر فرمایا جو اسی وقت نازل ہوئی تھی۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَۃٍ مِّنْ طِیْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَۃً فِیْ قَرَارٍ مَّکِیْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَۃَ عَلَقَۃً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَۃَ مُضْغَۃً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَۃَ عظٰما فَکَسَوْنَا الْعِظٰمَ

لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ۔ (ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے بنایا پھر ہم نے اسکو نطفہ سے بنایا جو کہ ایک محفوظ مقام میں رہا پھر ہم نے اس نطفہ کو خون کا ایک لوتھڑا بنایا پھر ہم نے اس خون کے لوتھڑے کو بوٹی بنادیا پھر ہم نے اس بوٹی کو ہڈیاں بنادیا پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت چڑھادیا پھر ہم نے اسکو ایک دوسری مخلوق بنادیا)

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یہاں تک پڑھنے پائے تھے کہ اس کا اخیر جزو بیساختہ کاتب کی زبان پر جاری ہو گیا فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ. (سو کیسی نورانی شان ہے اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے) حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا لکھو یہی وحی میں بھی ہے تو یہ کیا تھا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فیوض قلب کا عکس تھا کہ اس شخص کے دل پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قلب کا عکس پڑ گیا اور فی الجملہ وحی سے مناسبت ہو گئی کہ اس کے دل میں بھی از خود آیت کا اخیر لفظ آگیا۔ مگر وہ شخص سمجھا کہ بس میں بھی پیغمبر ہو گیا مجھ پر بھی وحی آنے لگے کم ظرف اور کم حوصلہ تھا کہ اتنی بات پر آپے سے باہر ہو گیا اور مدعی نبوت بن کر مرتد ہو گیا اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اپنا تعلق قطع کر لیا یہ نہ سمجھا کہ یہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہی کا فیض تھا ورنہ مرتد ہونے کے بعد اسنے قرآن کی مثل کوئی جملہ کیوں نہ بنا لیا بس آپ سے تعلق قطع کرتے ہی کورا ہو گیا اسکے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَمَنْ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ (اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ لگایا کہے جب کلام اللہ تعالیٰ نے نازل کیا اسی طرح کا میں بھی لاتا ہوں)

یہ شخص ایک ہی جملہ کے توارد پر آپے سے باہر ہو گیا کیونکہ کم ظرف تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بارہا ایسا قصہ پیش آیا کہ وحی سے انکو

توافق ہو گیا بعض دفعہ تو وحی ان کی رائے کے موافق نازل ہوئی اور بعض دفعہ بلفظ توافق ہوا۔ کہ وحی انہی الفاظ میں نازل ہوئی جو حضرت عمرؓ کی زبان سے نکلے تھے مگر ان کو ایک دفعہ بھی یہ خیال نہ ہوا کہ میں کچھ ہوں اور مجھ پر بھی وحی آتی ہے بلکہ وہ اس کی حقیقت کو سمجھتے تھے کہ یہ محض حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت ہے جو ہمارے قلب میں تھوڑی سی نورانیت حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے طفیل سے پیدا ہو گئی ہے کہ بعض دفعہ وہی بات دل میں آجاتی ہے جس کے موافق وحی نازل ہونے والی ہے بلکہ حضرت عمرؓ کو اس پر ناز تو کیا ہوتا بعض دفعہ کسی واقعہ میں جب ان کی رائے میں اور حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی رائے میں اختلاف ہوتا اور وحی حضرت عمرؓ کی رائے کے موافق نازل ہوتی تو حضرت عمرؓ بجائے خوش ہونے کے شرمندہ ہوتے اور کئی کئی دن تک شرمندہ رہتے۔ چنانچہ عبد اللہ بن ابی رئیس المنافقین کے قصہ موت میں حضرت عمرؓ نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کی تھی کہ آپ اس منافق کے جنازہ کی نماز نہ پڑھیں کیونکہ حق تعالےٰ نے فرمادیا ہے کہ ان منافقوں کی بابت آپ کتنا ہی استغفار کریں ہم انکی مغفرت ہرگز نہ کریں گے (اور نماز جنازہ کی حقیقت دعاء و استغفار ہی ہے تو ان کے لئے دعا نہ کرنا چاہیئے) حق تعالےٰ فرماتے ہیں۔ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ۔ (آپ خود ان کے لئے استغفار کریں یا ان کیلئے استغفار نہ کریں اگر آپ ان کے لئے ستر بار بھی استغفار کریں تب بھی اللہ تعالےٰ انکو نہ بخشے گا۔)

حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عمر اللہ تعالےٰ نے مجھے اختیار دیا ہے کہ صراحۃً ان کے لئے استغفار کرنے سے منع نہیں فرمایا اور اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ میرے ستر سے زیادہ استغفار کرنے سے حق تعالےٰ بخش دیں گے تو میں ستر سے زیادہ استغفار کرلوں گا اس گفتگو کے بعد آپ

نے نماز پڑھا دی وہاں سے ہٹنے نہ بھی نہ پائے تھے کہ وحی نازل ہوئی وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ۔ (اور ان میں سے کوئی مرجائے تو اس پر کبھی نماز نہ پڑھیے اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوجیئے انھوں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ حالتِ کفر ہی مرے ہیں)

جس میں حضرت عمرؓ کی رائے کی پوری موافقت تھی۔ حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ اے عمرؓ حق تعالےٰ نے تمہاری رائے کو قبول فرمایا۔ حضرت عمرؓ بہت ہی شرمندہ ہوئے کہ یہ کیا ہوا۔ میں نے حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے کیوں اختلاف کیا تھا روایات میں حضرت عمرؓ کا قول آتا ہے فَعَجِبْتُ مِنْ جُرْأَتِيْ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رواہ البخاری، (میں رسول اللہ صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم پر اپنی جرأت کرنے پر متعجب ہوں)

بلکہ اگر غور کرکے دیکھا جائے تو عبداللہ بن ابی سرح کے واقعہ میں توافق بالوحی نہ تھا کیونکہ وہاں وحی نازل ہوچکی تھی صرف اتنی بات تھی کہ آپ کے دل میں جو الفاظ منزلہ موجود تھے ان میں سے ایک جملہ اس کے قلب میں بھی آگیا (اور یہ کچھ زیادہ عجیب بات نہیں بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کے دل میں جو بات ہوتی ہے پاس بیٹھنے والے کے دل پر اس کا عکس پڑجاتا ہے اور اس کی زبان سے وہی بات نکل جاتی ہے جو پہلے شخص کے دل میں تھی چنانچہ ایسے موقعہ میں کہا کرتے ہیں کہ میاں تم نے تو میرے دل کی بات ہی کہدی ۱۲ جامع) اور حضرت عمرؓ کے واقعہ میں وحی اب تک نازل بھی نہ ہوتی تھی واقعہ اختلاف کے بعد وحی نازل ہوئی جو انکی رائے کے مطابق تھی اور بعض دفعہ تو الفاظ بھی وہی ہوتے تھے جو حضرت عمرؓ کی زبان نکلے تھے مگر ان کو ایک دفعہ بھی اسپر ناز نہ ہوا بلکہ اس کو حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ہی کی صحبت

کی برکت سمجھے غرض اُمتی اپنے کو مستقل سمجھنے سے بالکل کورا رہ جائیگا سارے کمالات سلب ہو جائیں گے جیسا ابن ابی سرح کے واقعہ میں ہوا پس کمالات اُمت کے لئے آپ واسطہ فی العروض ہی ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے لئے واسطہ فی الثبوت مقصود تو اس سے حاصل ہو گیا مگر یہاں ایک اشکال طالبعلمانہ رہ گیا۔ ساتھ کے ساتھ میں اس کو بھی کو حل کئے دیتا ہوں۔ اشکال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے آیت اَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ کو تخییر پر محمول فرمایا حالانکہ سیاق کلام سے یہ جملہ تسویہ پر دلالت کرتا ہے کیونکہ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ چاہے آپ ان کے لئے استغفار کریں یا نہ استغفار کریں، اگر آپ ستر دفعہ بھی استغفار کریں گے تو اللہ تعالےٰ ان کی مغفرۃ کبھی نہ کریں گے۔ یعنی دونوں باتیں اُن کے حق میں مساوی ہیں۔ چنانچہ اہلِ محاورات اس کو خوب سمجھتے ہیں۔

نیز اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً (اگر ستر مرتبہ بھی استغفار کرو) میں عدد سبعین سے کثرت مراد ہیں۔ عدد خاص مراد نہیں اور مطلب یہ ہے کہ چاہے آپ کتنا ہی استغفار کریں انکی مغفرت نہ ہو گی۔ مگر حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا کہ میں ستر سے زیادہ استغفار کر لوں گا اسکی کیا وجہ ہے آپ تو افصح العرب ہیں آپ نے آیت کو تخییر پر اور عدد کو تحدید پر کیوں محمول فرمایا اس اشکال کا جواب شافی میں نے کہیں منقول تو دیکھا نہیں اور نہ کتابوں پر میری نظر زیادہ ہے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے میں نے جو جواب سُنا ہے۔ وہ بیان کرتا ہوں ممکن ہے کہ نقل سے بھی اس کی تائید ہو جائے اور اگر نقل سے ... تائید نہ ہو تو حضرت مولانا کو حق تعالےٰ نے فن تفسیر سے خاص ذوق عطا فرمایا تھا ان کے جواب کو ہم حجت سمجھتے ہیں مولانا نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ بیشک اسلوبِ کلام تو تسویہ ہی کیلئے ہے اور عدد سبعین سے بھی خصوصیت عدد مراد نہیں بلکہ کثرت مراد ہے مگر حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم پر اس وقت رحمت کا حال غالب تھا غلبہ رحمت سے آپ نے صورت کلام سے تمسک فرمایا تو اس جواب سے اشکال تو رفع ہو گیا مگر اس سے صوفیہ

کے ایک قول کو مقید کرنا پڑے گا وہ یہ کہ صوفیہ کا قول ہے کہ کاملین پر غلبۂ حال نہیں ہوتا تو اس میں یہ قید لگانی پڑے گی یعنی اکثر نہیں ہوتا کبھی کبھی ضرور ہو جاتا ہے اور یہ تقیید محض مولانا کے جواب کی وجہ سے نہیں بلکہ احادیث صحیحہ اس کی تائید کرتی ہیں۔ چنانچہ واقعۂ بدر میں جب مسلمانوں کا کفار سے مقابلہ ہونے والا تھا حدیث میں آتا ہے کہ اس وقت رسول اللہ صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم عریش مبارک میں نہایت الحاح کے ساتھ دعا فرما رہے تھے کہ اے اللہ اپنے وعدۂ نصر کو پورا فرمائیے اور مسلمانوں کو غلبہ عطا فرمائیے حتیٰ کہ جوش میں یہ بھی فرمایا اَللّٰهُمَّ اِنْ تُهْلِكْ هٰذِهِ الْعِصَابَةُ لَمْ تُعْبَدْ بَعْدَ الْيَوْمِ اے اللہ اگر یہ تھوڑی سی جماعت مسلمانوں کی ہلاک ہوگئی تو پھر زمین میں آپ کی عبادت نہ ہوگی۔ اللہ اکبر۔ خدا تعالےٰ سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر مسلمان اس واقعہ میں مغلوب ہوگئے تو پھر کوئی آپ کا نام نہ لیگا۔ صاحبو! آخر یہ کیا تھا علماء قشر تو تھک جائیں گے تاویلیں کرتے کرتے مگر ان سے کچھ جواب نہ آئے گا، ہاں صوفیہ اس کا جواب نہایت سہولت سے دیدیں گے کہ اس وقت آپ پر غلبۂ حال تھا مقام ناز کی کیفیت غالب تھی لیجئے سارا اشکال مرتفع ہوگیا مگر یہ جواب اس کو مقتضی ہے کہ صوفیہ کے اس قول مشہور کو مقید کیا جائے۔ اب ایک اشکال اور رہ گیا وہ یہ کہ ہم نے تسلیم کیا کہ آیت کی صورت تخییر کو محتمل تھی مگر اس سے محض جواز معلوم ہوا وجوب تو نہیں معلوم ہوا تخییر سے جس طرح منافقین کی نماز پڑھنے کا جواز نکلتا ہے ترک صلوٰۃ کا جواز بھی تو نکلتا ہے پھر حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے صلوٰۃ کو ترک صلوٰۃ پر کیوں ترجیح دی آپ نے نماز پڑھی کیوں اس کے لئے کوئی مرجح بتلانا چاہیئے ورنہ آپ کے فعل کا عبث ہونا لازم آئے گا اس کا جواب ایک تو مؤرخین نے دیا ہے کہ اس دن حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی اپنے سخت ترین دشمن پر یہ رحمت و شفقت دیکھ کر بہت لوگ مسلمان ہوگئے تھے تو گویا آپ

کے فعل میں یہ فائدہ اور یہ حکمت تھی اور دشمنوں کو یہ دکھلانا منظور تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو اپنے نفس کے لئے کسی سے بھی عداوت نہیں ہے بلکہ وہ دل سے اپنے دشمنوں کے لئے بھی رحمت و مغفرت کے خواہاں ہیں (جبتک حق تعالےٰ ممانعت نفرما دیں) اگر نفس کے لئے کسی سے آپ کو دشمنی ہوتی تو عبد اللہ بن ابی کے کفن میں اپنا قمیص مبارک ہرگز نہ دیتے نہ اس کی نماز پڑھتے نہ دفن میں شریک ہوتے کیونکہ شرعاً آپ کے ذمہ ان میں سے ایک کام بھی واجب نہ تھا مگر آپ نے شفقت و رحمت سے سب کچھ کیا اور اس کی دشمنی پر کچھ بھی التفات نہیں فرمایا اور ایک جواب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے دیا ہے کہ حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن ابی کے واقعہ میں اس مسئلہ کو حل فرمادیا ہے کہ تبرکات کے بھروسہ پر کوئی نہ رہے بدون ایمان کے سب بیکار ہیں۔ چنانچہ دیکھ لو کہ ابن ابی کے پاس کتنے تبرکات جمع ہو گئے حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اپنا قمیص مبارک اس کے کفن میں دیا بھلا یہ بات کس کو نصیب ہوتی ہے آج کل کوئی بہت کرے گا۔ غلاف کعبہ کا ٹکڑا رکھدے گا مگر غلاف کعبہ کو حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے قمیص سے کیا نسبت حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا جسد اطہر عرش و کعبہ سب سے افضل ہے اور اگر غلاف کعبہ کو قمیص نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے برابر مان بھی لیا جاتے تو یہ دولت کس کو نصیب ہو سکتی ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا لعاب مبارک اس کے منہ میں پڑے عبد اللہ بن ابی کے مرنے کے بعد آپ نے اپنا لعاب بھی اس کے منہ میں ڈالدیا تھا وہ تو آپ کا جزو تھا جس کی برکت لباس سے بھی زیادہ ہے۔ پھر آپ نے اس کے جنازہ کی نماز پڑھی گویا اس کے لئے دعاء مغفرت فرمائی بھلا یہ شرف آج کس کو نصیب ہو سکتا ہے کہ حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم صحابہ کو لے کر اس کے جنازہ کی نماز پڑھیں۔ مگر باوجود ان تمام باتوں کے عبد اللہ بن ابی کو ان تبرکات

سے کچھ بھی نفع نہ ہوا کیونکہ وہ ایمان سے محروم تھا حق تعالےٰ نے صاف فرمادیا۔ اِنَّھُمْ کَفَرُوْا بِاللّٰہِ وَبِرَسُوْلِہٖ وَمَاتُوْا وَھُمْ فَاسِقُوْنَ (انہوں نے اللہ اور اس کے رسول صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے ساتھ کفر کیا ہے۔ اور وہ حالتِ کفر ہی میں مرے ہیں)

غرض حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قصہ پر یہ سارا بیان چل پڑا تھا اس کے قبل میں یہ کہہ رہا تھا کہ حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے جدا اور مستقل ہو کر رہنے سے امتی تمام کمالات سے کورا ہو جاتا ہے اور آپ کی تو بڑی شان ہے حضرات اولیاء اللہ سے بھی گستاخی کے ساتھ تعلق قطع کرنا سلبِ فیوض و برکات و سلبِ نسبت بلکہ بعض دفعہ سلبِ ایمان کا سبب ہو جاتا ہے کیونکہ وہ بھی اپنے مستفیدین کے لئے واسطہ فی الفیوض ہوتے ہیں اور واسطہ کے ساتھ گستاخی عادت الٰہی کے موافق گستاخ کو تمام فیوض سے کورا کر دیتی ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ اولیاء کے کمالات جیسا کہ اوپر مذکور ہوا بعینہٖ حضور اقدس صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ہی کے کمالات ہیں، چنانچہ علماء نے کہا بھی ہے کہ اولیاء کے کرامات حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے معجزات ہیں جو ان اولیاء میں ظاہر ہوتے ہیں۔ پس جس شخص نے اس ولی کو جزماً یا احتمالاً صاحب کمال مان لیا اس کے کمال کو نبی صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا کمال مان لیا۔ پس اس کمال کی بے ادبی کرنا حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے ساتھ بے ادبی کرنا ہے ہاں اگر کسی وجہ شرعی سے اس کو صاحب کمال ہی نہ مانے تو وہاں یہ علت جاری نہیں ہو گی۔

چنانچہ سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ اپنی جوانی میں ایک بزرگ کی زیارت کو جا رہے تھے ساتھ میں دو آدمی اور تھے آپس میں گفتگو ہوتی جس طرح راستہ طے کرنیوالے رفیقوں میں ہوا کرتی ہے کہ بھائی تم ان بزرگ کے پاس کس غرض سے جا رہے ہو ایک شخص نے تو کچھ دنیوی غرض بتلائی کہ میں اپنے لئے فراخیٔ رزق وغیرہ کی دعا کراؤں گا دوسرے

شخص نے جو کہ عالم تھا اور اس کا نام ابن السقا تھا کہا میں تو ان بزرگ کا امتحان کرنے جارہا تھا کہ دیکھو یہ خالی بزرگ ہی ہیں۔ یا کچھ علم سے بھی تعلق رہے ہیں ان سے ایسے پیچیدہ سوالات کروں گا جن کا جواب نہ بن پڑے۔ پھر حضرت شیخ عبدالقادر رحمۃ اللہ سے اُن دونوں نے پوچھا کہ صاحبزادے تم کس کام کیلئے جارہے ہو فرمایا کہ میں تو صرف اس لئے جارہا ہوں کہ یہ بزرگ اللہ کے مقبول بندے ہیں شاید ان کی زیارت سے ہمارے نفس کی اصلاح ہوجائے اور اللہ تعالےٰ کا ہمارے حال پر بھی فضل ہوجائے۔ غرض تینوں ان بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوتے اُنکو کشف سے ان تینوں کی نیت کا حال پہلے ہی معلوم ہوگیا تھا۔ ابھی یہ لوگ کچھ عرض کرنے بھی نہ پائے تھے کہ شیخ نے خود ہی سب کے سوالات کا جواب دیدیا۔ جو شخص دنیوی غرض کے لئے آیا تھا اس سے فرمایا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ سونے چاندی کے ڈھیر تیرے پیروں کے نیچے ہوں گے (گویا اس کا مقصود پورا ہوگیا) ابن السقا سے فرمایا کہ تیرا ایک سوال یہ ہے۔ اور اس کا یہ جواب اور دوسرا سوال یہ ہے اور اس کا یہ جواب سوالوں کے جواب تو یہ ہیں مگر مجھے تیرے چہرہ پر آثار کفر نظر آرہے ہیں اور میں وہ حالت دیکھ رہا ہوں جبکہ تو اسلام سے مرتد ہوجائے گا۔

چنانچہ یہ شخص ایک مرتبہ خلیفۂ وقت کی طرف سے ہرقل کے پاس کوئی پیام لے کر گیا تھا بہت بڑا عالم تھا خلیفہ نے سفارت کے لئے اس کو منتخب کر رکھا تھا مگر اس نے ان بزرگ کے ساتھ گستاخی کی نیت کی تھی اس کے وبال میں ہرقل کے پاس) جاکر اس کی کسی لڑکی پر فریفتہ ہوکر اس کے عشق میں نصرانی ہوگیا اور اسی حالت میں مرا نعوذ باللہ منہ اور حضرت شیخ عبدالقادر رحمۃ اللہ سے فرمایا کہ مجھکو یہ بات نظر آرہی ہے کہ تم ممبر بغداد پر بیٹھے ہوئے یہ کہہ رہے ہو قَدَمِی ھٰذِہٖ عَلٰی رِقَابِ کُلِّ اَوْلِیَاءِ اللّٰہِ (یہ میرا قدم تمام اولیاء اللہ کی گردن

پر ہے)

اور میں دیکھ رہا ہوں کہ اولیاء اللہ کی گردنیں اس وقت جھک رہی ہیں۔

کتنا صحیح کشف تھا کیونکہ یہ بات انہوں نے ایسے وقت میں فرمائی تھی کہ اس وقت حضرت شیخ عبد القادر رح بالکل بچے نوجوان تھے۔ اس کا کسی کو وہم بھی نہ ہوسکتا تھا کہ کسی وقت اس درجہ کو پہونچیں گے مگر کشف بالکل صحیح تھا چنانچہ ایسا ہی ہوا جس کا واقعہ مشہور ہے کہ حضرت سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی قدس اللہ سرہ ممبر بغداد پر بیٹھے ہوئے ایک دن وعظ فرما رہے تھے اثناء وعظ میں جوش آیا اور فرمایا قَدَمِیْ هٰذِهٖ عَلٰی رِقَابِ کُلِّ اَوْلِیَاءِ اللّٰہ (یہ میرا قدم تمام اولیاء اللہ کی گردن پر ہے)

اس وقت جتنے اولیاء زمین پر تھے سب نے اس آواز کو سنا اور گردنیں جھکا دیں بلکہ بعض نے گردن جھکا کر یہ بھی کہا۔ بَلْ عَلٰی رَاسِیْ وَ عَیْنِیْ (بلکہ ہمارے سر اور ہماری آنکھوں پر)

یہ ویسا ہی قصہ ہوا جیسا کہ حضرت خلیل اللہ کی آواز کو حق تعالیٰ نے تمام عالم میں پہونچا دیا تھا حتیٰ کہ ارواح نے اپنے باپ ماں کے پشت اور رحم میں سے جواب دیا لبیک لبیک اسی طرح حضرت شیخ عبد القادر رح کی وہ آواز خلیل الٰہی آواز تھی جس کو تمام عالم کے اولیاء وقت نے سنا خدا تعالیٰ نے سب کو آواز پہونچا دی۔

پس جب اولیاء سے قطع تعلق کا یہ اثر ہے تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے قطع تعلق کرنیوالا کیونکر کمالات سے کورا نہ رہ جائے گا مگر اتنا فرق ہے کہ اولیاء سے تو قطع تعلق مطلقاً سلب کمالات کا سبب نہیں جب گستاخی کے ساتھ قطع تعلق کرے اس وقت وبال پڑتا ہے۔ اور حضور صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے قطع تعلق کرنا مطلقاً سلب فیوض و کمالات کا سبب ہے اگرچہ گستاخی بھی نہ کرے یہاں سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہوگئی جو محض توحید کو نجات کے لئے کافی سمجھتے ہیں

باقی آئندہ ان شاء اللہ تعالیٰ

تصدیق رسالت کو ضروری نہیں سمجھتے۔ افسوس مسلمانوں میں بھی بعض لوگ ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف توحید کی تعلیم کے لئے آرہے تھے تو جو شخص توحید کا اقرار کرلے وہ نجات پائے گا گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار نہ کرے یاد رکھو یہ قول بالکل باطل۔ ہے نجات بدون تصدیق رسالت ہرگز نہیں ہو سکتی جس طرح توحید رکن ایمان ہے اسی طرح تصدیق رسالت بھی رکن ایمان۔ ہے۔ ان لوگوں نے اس آیت سے دھوکہ دینا چاہا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصَارٰی وَالصَّابِئِیْنَ مَنْ آمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ الآیۃ (ترجمہ) جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی اور نصرانی ہیں اور جو صابی ہیں (ان میں سے) جو کوئی بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لے آئے اور اچھے کام کرے (قانون شریعت کے موافق) ایسوں کے لئے اُن کے پروردگار کے پاس حق الخدمت بھی ہے اور (وہاں) اُن پر کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں اور نہ وہ مغموم ہوں گے) اس آیت میں تصدیق رسالت کا ذکر (ظاہراً) نہیں ہے بلکہ سب فرقوں کی نجات کا مدار صرف ایمان باللہ و ایمان بالآخرۃ کو قرار دیا گیا ہے اس سے بعض لوگوں نے اس غلطی میں ڈالنا چاہا کہ نجات کے لئے تصدیق رسالت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ضرورت نہیں۔ جواب اس کا یہ ہے کہ ایمان باللہ بغیر تصدیق رسالت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متحقق ہی نہیں ہو سکتا پس یہ کہنا غلط ہے کہ یہاں تصدیق رسالت کا ذکر نہیں۔ تفصیل اس جواب کی وہ ہے جو میں نے ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب سے کہلا کر بھیجی تھی وہ بندۂ خدا بھی اسی غلطی میں مبتلا تھے ویسے بڑے نیک پابند صوم و صلوٰۃ تھے مگر شیطان نے ان کے دل میں یہ وسوسہ ڈال رکھا تھا کہ نجات کے لئے صرف ایمان باللہ کافی ہے تصدیق رسالت کی ضرورت نہیں۔ واقعی بدون علم دین کے کامل اصلاح نہیں ہوتی، عقائد بھی درست نہیں ہوتے افسوس آجکل لوگوں نے انگریزی پڑھنے کو بھی علم سمجھ لیا ہے۔ بس وہ ایسا ہی علم ہے جس سے روپیہ پیسہ معلوم ہو جاتا ہے خدا اس سے معلوم نہیں ہو سکتا۔ میں نے ان ڈپٹی کلکٹر صاحب سے کہلا کر بھیجا کہ ایمان باللہ کے صرف یہی معنی نہیں کہ اللہ تعالےٰ کو موجود مان لے کیونکہ وجود کا انکار تو مشرکین بھی نہیں کرتے

ضروری اطلاع :- خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

بلکہ ایمان باللہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالےٰ کو صفات کمال سے متصف اور صفات نقص سے منزہ سمجھے۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ صفات کمال میں سے ایک صفت صدق بھی ہے جس کی ساتھ خدا تعالیٰ کو موصوف ماننا توحید کے لئے ضروری ہے اور صفات نقص میں سے ایک صفت کذب بھی ہے جس سے خدا تعالیٰ کو منزہ سمجھنا لازم ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا دوسرا مقدمہ یہ کہ حق تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالےٰ کے رسول ہیں (اور قرآن کا کلام الٰہی ہونا دلائل عقلیہ سے ثابت ہے) تو اس خبر کو بھی سچا سمجھنا واجب ہے پس جو آپ کو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں مانتا وہ خدا تعالیٰ کو کاذب کہتا ہے جب کاذب کہا تو پھر اللہ پر کہاں ایمان لایا۔ پس ثابت ہوگیا کہ خدا تعالیٰ پر ایمان لانا بدون تصدیق رسالت کے ممکن نہیں۔ میں نے یہ بھی کہلا بھیجا کہ جواب کے لئے دس سال کی مہلت ہے۔

اس دلیل کا ان کے پاس کچھ جواب نہ تھا پھر خدا نے کیا ان کی اصلاح ہوگئی بعد میں مجھ سے ملے بھی تھے اس وقت ان کا شبہ رفع ہو چکا تھا بے چاروں کا خاتمہ اچھا ہوا۔ پس خوب سمجھ لو کہ بغیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کے نجات ہرگز نہیں ہو سکتی ایک فلسفی کی بابت ایک شخص نے خواب دیکھا تھا میں اس فلسفی کا نام بتلانا نہیں چاہتا خواہ مخواہ ایک مسلمان سے خواب کی بنا پر کفر کی بدگمانی ہو جائے گی مگر اس شخص کے خیالات تھے فلسفیانہ گو ظاہر میں مسلمان کہلاتا تھا۔ خواب یہ تھا کہ ایک شخص کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی تو اس نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فلاں شخص کا کیا حال ہوا آپ نے فرمایا کہ وہ بدون میرے توسط کے جنت میں جانا چاہتا تھا اور جنت کے قریب بھی پہنچ گیا تھا مگر میں لے ہاتھ پکڑ کر جہنم میں پھینک دیا کہ دور ہو کمبخت جنت میں بغیر میرے تعلق کے کوئی نہیں جا سکتا۔

غرض آپ امت کے لئے واسطہ فی العروض ہیں تمام کمالات و فیوض میں بدون آپ کے واسطے کے کوئی شخص بھی کمالات بلکہ ایمان سے بھی موصوف نہیں ہو سکتا۔ اسی کو حضرت شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

میندار سعدی کہ راہ صفا
توان رفت جز بر پئے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

(سعدی یہ گمان نہ کرو کہ صاف راستہ سوائے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے چل سکو گے جس شخص نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف راستہ اختیار کیا ہرگز منزل مقصود کو نہ پہونچے گا۔)

یہ تو ان کے واسطے ہیں جو بدون حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کے اس راستہ کو قطع کرنا چاہیں اور تعلق والوں کے واسطے ان شاء اللہ یہ ہوگا ؎

نماند بعصیاں کسے در گرو
کہ دارد چنیں سید پیش رو

(دوزخ میں گناہوں کی وجہ سے کوئی شخص نہ رہے گا جو آپ جیسا سردار پیشوا رکھتا ہو)

اور یہ ہوگا ؎

طُوْبیٰ لَنَا مَعْشَرَ الْاِسْلَامِ اَنَّ لَنَا
مِنَ الْعِنَایَةِ رُکْنًا غَیْرَ مُنْهَدِمٖ

(اے گروہ اسلام ہمارے لئے خوشخبری ہو عنایت الٰہی ہمارے لئے ایسا ستون ہے جو منہدم نہ ہوگا) ہمارے پاس خدا کے فضل سے ایک مضبوط رکن ہے ان شاء اللہ ہم بے کھٹکے پار ہو جائیں گے اور جن کے پاس یہ واسطہ نہیں ہے ان کی محرومی پر افسوس ہے۔

پس یہ مسئلہ خوب محقق ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم امت کے لئے واسطہ فی العروض ہیں اور امتی کے اندر اسی وقت تک کچھ فیوض و برکات ہیں جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق توسط ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔ باقی انبیاء علیہم السلام کے لئے آپ واسطہ فی الثبوت ہیں کہ وہ آپ سے فیوض حاصل کر کے استقلال کی ایسی شان اپنے اندر رکھتے ہیں جیسے ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن ہو کر مستقل ہو جاتا ہے اور بظاہر اس کا مقتضا یہ سمجھ میں آتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو آپ سے تعلق رکھنے کی ضرورت نہ ہو وہ آپ سے تعلق قطع کر کے بھی منوَّر و منوِّر رہ سکتے ہیں۔ مگر ایک دوسری دلیل سے ان کے لئے بھی آپ سے تعلق رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ۔ یعنی حق تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام سے عہد لیا ہے کہ اگر ہم تم کو کتاب و حکمت دیں پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے جو تمہاری کتاب کا مصدق ہو

تو تم اس کی تصدیق و نصرت ضرور کرنا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ جو مفسر القرآن ہیں اور حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے دعا بھی فرمائی ہے اَللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ الْکِتَابَ (اے اللہ ان کو کتاب اللہ کا علم عطا فرمائیں) اس لئے ان کی تفسیر حجت ہے وہ فرماتے ہیں یہاں رسول سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ عہد جملہ انبیاء علیہم السلام سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لیا گیا ہے کہ جو نبی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پائے اُس کے ذمہ ضروری ہے کہ آپ کی تصدیق و نصرت کرے پھر یہ بات ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نے بھی آپ کا زمانہ نہیں پایا تو یہ عہد ان سے کیوں لیا گیا اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو ہر وقت اور ہر زمانہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع و تصدیق کے لئے تیار رہنا چاہیئے خواہ وہ آپ کا زمانہ پائیں یا نہ پائیں مگر اپنی طرف سے ہر وقت اس کے لئے آمادہ رہیں اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی وقت اپنے تعلق کو قطع نہیں کر سکتے۔

دوسرے اگر یہ عہد بھی نہ لیا جاتا جب بھی انبیاء علیہم السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق قطع نہیں کر سکتے تھے کیونکہ مسئلہ شرعیہ اصولیہ ہے مَنْ لَّمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ جس نے (اُن) لوگوں کا شکر نہیں کیا (جو واسطۂ نعمت ہیں) اُس نے خدا تعالیٰ کا بھی شکر نہیں کیا۔ اور پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء علیہم السلام کے لئے واسطہ فی الکمالات ہیں گو فی النبوت سہی تو اس قاعدہ کے موافق انبیاء علیہم السلام حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے کبھی تعلق قطع نہیں کر سکتے کیونکہ اس سے شکر الٰہی میں نقصان لازم آتا ہے جس سے وہ حضرات مبرا ہیں اور انبیاء علیہم السلام پر آپ کے تعلق کا وجوب بالقوہ تو اس حدیث سے ظاہر ہے لَوْ کَانَ مُوْسٰی حَیًّا لَمَا وَسِعَہٗ اِلَّا اتِّبَاعِیْ (اگر موسیٰؑ زندہ ہوتے تو ان کو بھی بجز میری اتباع گنجائش نہ ہوتی) اور بالقول اس سے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بعد نزول الی الارض کے وجوباً آپ کا اتباع فرماویں گے اور کسی کو اِتَّبِعْ مِلَّۃَ اِبْرَاھِیْمَ حَنِیْفًا (آپ ملت حنیف ابراہیمؑ کا اتباع کیجئے) سے اس کے خلاف کا شبہ نہ ہو کیونکہ ملت ابراہیم خود

آپ کی ملت کا بوجہ تناسب لقب ہے جس میں حکمت ترغیب ہے تمام اہل ملل کی اس ملت کے اختیار کرنے پر کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کی جلالت متفق علیہ تھی اس لئے اتباع ابراہیم نہیں فرمایا اسی طرح بعد ذکر انبیاء علیہم السلام کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خطاب کیا گیا ہے فبھداھم اقتدہ (پس آپ بھی ان کے طریق پر چلئے) یوں نہیں فرمایا فَبِهِمُ اقْتَدِهْ (آپ ان کی اقتداء کیجئے) پس ھُدٰھُمْ سے مراد ھُدَی اللہ ہے۔ اس کو ملابست کے سبب ھُدٰھُمْ فرمادیا یہ سب تمہید تھی مقصود کی اور خلاف امید تمہید میں زیادہ وقت گذر گیا اب میں مقصود کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ مقصود یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج سے کیا سبق ہم کو حاصل کرنا چاہیئے تو سمجھئے کہ معراج کی حقیقت کیا ہے۔ لوگ معراج اس کو سمجھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زمین سے آسمان پر تشریف لے گئے۔ تو خوب سمجھ لیجئے کہ یہ عروج آسمانی حقیقت معراج نہیں بلکہ صورت معراج ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ صورت آپ کے کمالات میں سے نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ حقیقت معراج اسی صورت پر موقوف نہیں بلکہ اس کا تحقق دوسری صورتوں سے بھی ہو سکتا تھا گو جو صورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے متحقق ہوئی ہے وہ سب سے افضل واکمل ہے اور آپ معراج کی حقیقت صورت دونوں کے جامع ہیں اور یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی معلوم ہو گئی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عروج صوری یعنی عروج آسمانی کا انکار کرتے ہیں اور اس معراج کو منامی یا کشفی بتلاتے ہیں سو یہ بالکل نصوص کے خلاف ہے بلکہ احادیث مشہورہ سے آپ کا آسمانوں پر تشریف لیجانا ثابت ہے اور بیت المقدس تک تشریف لیجانا تو نص قرآنی سے ثابت ہے جس کا انکار بلا تاویل کفر ہے اور بتاویل بدعت۔ ان منکرین معراج آسمانی کے پاس کچھ دلائل تو عقلی ہیں کچھ نقلی۔ عقلی دلائل تو یہ ہیں کہ اس سے افلاک میں خرق والتیام لازم آتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ فلاسفہ کے پاس خرق والتیام کے امتناع پر کوئی دلیل نہیں اور جب وہ دلائل پیش کریں گے اس وقت ان شاء اللہ ہم اُن سب کا لغو و باطل ہونا ظاہر کر دیں گے چنانچہ متکلمین اس سے فارغ ہو چکے ہیں۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کا قصہ احادیث میں آتا ہے کہ آپ اتنے جلدی سیر سماوات سے فارغ ہو کر

واپس آگئے کہ صبح بھی نہ ہونے پائی تھی یہ محالات سے ہے کہ مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک اور پھر وہاں سے ساتویں آسمان تک آپ سیر کر آئیں اور یہ سارا قصہ ایک رات کے تھوڑے سے حصہ میں ہو جائے ہم کہتے ہیں کہ اس میں استحالہ کی کیا بات ہے ہاں استبعاد ہو سکتا ہے سو وہ بھی بطور الزام کے اس طرح مدفوع ہے کہ تمہارے نزدیک زمانہ حرکت فلک الافلاک کا نام ہے۔ چنانچہ رات اور دن کا آنا طلوع و غروب کا ہونا یہ سب حرکت فلک سے مرتبط ہے اگر حرکت فلک موقوف ہو جائے تو جو وقت موجود ہو گا وہی رہیگا اگر رات موجود ہو گی رات ہی رہے گی، دن موجود ہو گا دن ہی رہے گا تو ممکن ہے کہ حق تعالیٰ نے اس رات حرکت فلک کو تھوڑی دیر کے لئے موقوف کر دیا ہو اور اس میں کچھ تعجب نہیں معزز مہمان کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے دنیا میں بھی یہ قاعدہ ہے کہ جب بادشاہ کی سواری نکلتی ہے تو سڑک پر دوسروں کا چلنا بند کر دیا جاتا ہے ہم جب حیدرآباد گئے تو ایک دن دیکھا کہ پولیس کے سپاہی لوگوں کو سڑک پر چلنے سے روک رہے ہیں اس وقت سڑک پر سناٹا چھایا ہوا تھا معلوم ہوا کہ نواب صاحب کی سواری نکلنے والی ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے اگر آسمان اور چاند سورج سب کی حرکت کو اُس رات کچھ دیر کے لئے بند کر دیا ہو کہ جو چیز جہاں ہے وہیں رہے۔

پس آفتاب جس جگہ تھا اسی جگہ رہا اور ستارے جہاں تھے وہیں رہے کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلنے نہ پایا اس میں کیا استبعاد ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج سے فارغ ہو گئے پھر فلک کو حرکت کی اجازت ہو گئی تو اب ظاہر ہے کہ حرکتِ فلک جس جگہ سے موقوف ہوئی تھی وہیں سے شروع ہو گی تو آپ کی سیر میں چاہے کتنا ہی وقت صرف ہوا ہو مگر دنیا والوں کے اعتبار سے سارا قصہ ایک ہی رات میں ہوا کیونکہ حرکتِ زمانہ اس وقت موقوف ہو چکی تھی اب اگر کوئی دوامِ حرکتِ فلک کا دعویٰ کرے تو وہ اس کے لزوم کو ثابت کرے ان شاء اللہ ایک دلیل بھی قائم نہ کر سکے گا۔ دوسرا عاشقانہ جواب اس اشکال کا مولانا نظامی نے دیا ہے ؎

تن او کہ صافی تر از جانِ ماست　　اگر آمد و شد بیک دم رواست

(آپ کا جسم ہماری روح سے صاف تر ہے ایک گھڑی میں آمد و رفت صحیح ہے)

یعنی یہ بات سب کو معلوم ہے کہ خیال انسانی ذرا سی دیر میں بہت دور پہنچ جاتا ہے، چنانچہ آپ اسی وقت عرش کا تصور کیجیے تو ایک منٹ سے بھی کم میں عرش پر خیال پہونچ جائے گا۔ خیال کی حرکت بہت سریع ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خیال روح کی ایک قوت ہے اور روح نہایت لطیف چیز ہے وہ مادیات کی طرح کثیف نہیں اس لئے اس کی سیر میں کوئی حاجت و مانع نہیں ہوتا تو مولانا نظامی فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بدن مبارک تو ہمارے خیال سے بھی پاکیزہ تر ہے جب خیال ذرا سی دیر میں کہیں سے کہیں پہونچ جاتا ہے تو آپ کا جسم اطہر زمین سے آسمان تک اور وہاں سے عرش تک ذرا سی دیر میں آئے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ ایک دلیل عقلی فلاسفہ جدید پیش کیا کرتے ہیں کہ ہوا کے طبقہ سے اوپر جو خلا ہے اس میں ہوا نہ ہونے کے سبب کوئی متنفس زندہ نہیں رہ سکتا تو آپ اس میں سے اگر گذرتے زندہ کیسے رہتے مگر انھوں نے یہ نہ دیکھا کہ بعد تسلیم اس التزام کے یہ اس وقت ہے جب متنفس کو اس میں کچھ مکث بھی ہو چنانچہ آگ کے اندر سے اگر جلدی جلدی ہاتھ کو نکالا جاوے تو آگ کا اثر نہیں ہوتا۔

پس آپ اگر نہایت سرعت کی ساتھ اس خلا میں سے گذر جائیں تو وہ عدم تنفس میں موثر نہ ہوگا اور دلیل نقلی ان منکرین کے پاس حضرت عائشہؓ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے وَاللّٰہِ مَا فُقِدَ جَسَدُ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی لَیْلَۃِ الْاِسْرَاءِ کہ بخدا شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مفقود یعنی غائب نہیں ہوا اس کا جواب بعض لوگوں نے تو یہ دیا ہے کہ حضرت عائشہؓ اس وقت حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے گھر میں کہاں تھیں (نیز اس وقت ان کی عمر بہت ہی کم تھی شاید چار پانچ سال کی ہوں اور اگر معراج ۵؁ نبوت میں ہوئی ہو جیسا کہ زہری کا قول ہے تو وہ اسی سال پیدا ہوئی ہوں گی ۱۲ جامع)

اس لئے اجلہ صحابہ کی روایت اس واقعہ میں ان کی روایت سے مقدم ہے۔

مگر اس کا حاصل بظاہر یہ ہوا کہ حضرت عائشہؓ نے بے تحقیق ایک بات فرمادی ہم حضرت صدیقہ پر یہ گمان نہیں کرسکتے نہ کسی صاحب ادب کو ایسی جرأت ہوسکتی ہے۔ یہ مانا کہ وہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں موجود نہ تھیں اور کم سن بھی تھیں مگر جو بات وہ فرمارہی ہیں وہ تو عقل وبلوغ کے زمانہ میں ان سے صادر ہوئی ہے اور ایسے وقت میں وہ بدون تحقیق کے کوئی بات نہیں فرماسکتیں یقیناً تحقیق کے بعد فرمارہی ہیں ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی دوسرے واقعہ کی نسبت فرماتی ہوں کیونکہ معراج میں تعدد ہے تو پھر کچھ بھی مضر نہیں۔

میرے ذہن میں اس کا جو جواب آیا ہے وہ بہت لطیف ہے وہ یہ کہ فقدان کے دو معنی ہیں، ایک تو چیز کا اپنی جگہ سے گم ہوجانا ہٹ جانا دوسرے تلاش کرنا چنانچہ دوسرے معنی میں فقدان کا استعمال نص میں بھی آیا ہے قَالُوْا[عہ] وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ یعنی برادران یوسف علیہ السلام نے متوجہ ہوکر ندا کرنے والوں سے کہا کہ تم لوگ کس چیز کو تلاش کرتے ہو یہاں فقدان کے معنی طلب ہی کے ساتھ زیادہ ظاہر ہیں۔

پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس ارشاد کا مطلب صاف ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتنی دیر تک گھر سے غائب نہیں رہے کہ آپ کی تلاش کی جاتی۔ یہ مطلب نہیں کہ آپ ساری رات میں اپنے گھر سے جدا ہی نہیں ہوئے وہیں رہے۔ تاکہ اس سے معراج منامی یا کشفی پر استدلال کیا جائے بلکہ مطلب[عہ] یہ ہے کہ آپ گھر سے جدا تو ہوئے مگر زیادہ دیر نہیں لگی جس میں گھر والوں کو پریشانی ہوئی ہو اور تلاش کی نوبت آئی ہو۔

[عہ] قلت نص البغوی فی تفسیرہ ماذا تفقدون ما الذی ضل عنکم والفقدان ضد الوجدان اہ وکذا نص فی الخازن بان الفقدان ضد الوجود اہ (ص ۲۴۶ ج ۳) وکذا نص فی القاموس فقدہ یفقدہ فقدا وفقدانا وفقودا عدمہ فہو فقید ومفقود اہ (ص ۲۰۱ ج ۱) ولم اجد الفقود بمعنی التفقد بعد ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔ ۱۲ جامع۔ احقر اشرف علی کے ذہن میں اس حاشیہ کو دیکھ کر ایک تاویل آئی تھی جس کو حاشیہ آئندہ میں ظاہر کردیا گیا ۱۲

[عہ] اور اگر فقدان کے وہی معنی لئے جائیں جو متبادر ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم شب

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

غرض اس میں شک نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج جسمانی ہوئی اور آپ اس جسم سے آسمانوں پر تشریف لے گئے اس کا انکار ہرگز نہیں ہوسکتا اور یقیناً یہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۷) معراج میں گم نہیں ہوا۔ تب بھی اس سے معراج کا روحانی یا منامی ہونا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر سے اس رات جدا ہی نہیں ہوئے کیونکہ فقدان فعل متعدی ہے نہ کہ لازم اُس کے معنی غیبت وانفصال کے نہیں بلکہ گم کرنے کے ہیں جس کے لئے ایک کا فاقد اور دوسرے کا مفقود ہونا ضروری ہے پس مطلب یہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس رات کسی نے گھر سے غائب اور گم نہیں پایا اور یہ درست ہے کیونکہ آپ سب گھر والوں کے ساتھ گھر میں سوئے تھے اور معراج ایسے وقت ہوئی جو کہ عادةً لوگوں کے گہری نیند سونے کا وقت تھا۔ پھر جاگنے کے وقت سے پہلے آپ واپس تشریف لے آئے بلکہ خود آکر گھر والوں کو نماز صبح کے لئے جگایا تو ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے رات کو جاگ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر میں نہ دیکھا ہو اور اتنی بات مفقود ہونے کے لئے ضروری ہے قلت ولعل هذا هو مراد الشیخ فعبره بالتفتیش والا فالفقدان غیر المفقد نعم هو یستدعی فاقدا کما لا یخفی ۱۲ جامع - احقر اشرف علی کے ذہن میں پہلا حاشیہ دیکھ کر ہی یہ تاویل آگئی تھی مگر دوسرے عنوان سے پھر یہ دوسرا حاشیہ دیکھا اب اس تاویل کی اُس دوسرے عنوان سے ذرا واضح تقریر کرتا ہوں وہ یہ کہ فقدان کے معنی تو گم ہی کرنے کے ہیں مگر اس کے دو درجے ہیں ایک مطلق گم کرنا اور ایک ایسا گم کرنا جس کے بعد اس کے تلاش میں لگ جاوے پس پہلا درجہ فقد مطلق ہوا دوسرا درجہ فقد مقید۔

پس اس حدیث میں دوسرا درجہ مراد ہے یعنی آپ کا جسد ایسا مفقود نہیں ہوا جس سے تلاش کی نوبت آئی ہو کیونکہ زمانہ فقد کا اتنا قلیل تھا کہ کسی کو اس فقد کی اطلاع بھی نہیں ہوئی پس متن میں میری عبارت میں ہٹ جانے کو پہلے درجہ پر اور تلاش کرنے کو دوسرے درجہ پر محمول کیا جاوے تو اب معنی لغوی کے خلاف نہیں ہوا، اور بنا بر قواعد تصوف یہ بھی ممکن ہے کہ جسم عنصری ملکوت میں پہونچا ہو اور جسم مثالی ناسوت میں رہا ہو اُس کے دیکھتے ہوئے نے اسکو

(بقیہ حاشیہ ص۳۳۰)

صورتِ عروج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت بڑا کمال ہے مگر معراج کو ایسی صورت میں منحصر نہ سمجھنا چاہیئے اور نہ محض عروج آسمانی کے ساتھ حقیقت معراج کو مخصوص

(بقیہ حاشیہ ص۳۲۹) جسم عنصری سمجھ کر ما فقد کا حکم کرایا ہو اور موٹی بات ہے کہ اگر معراج جسد عنصری سے نہ ہوتی تو اتنا انکار اس پر نہ ہوتا اور اگر غلط فہمی سے ہوتا تو آپ بھی جواب دیدیتے کہ میں جسد عنصری سے دعویٰ نہیں کرتا کہ اس پر اس قدر استبعاد کیا جاوے ۱۲ احقر ظفر احمد عرض کرتا ہے کہ بعد میں تفسیر تنویر المقیاس میں جو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب ہے۔ ماذا تفقدون اور نفقد کی تفسیر ماذا تطلبون اور نطلب کے ساتھ میری نظر سے گذری اور یہ تفسیر بالکل اُس معنی کے مطابق ہے جو حضرت حکیم الامۃ نے اس آیت کی تفسیر میں بیان فرمائے ہیں کیونکہ طلب کے معنی تلاش کرنے اور ڈھونڈنے ہی کے ہیں اور بظاہر ابن عباس کی یہ تفسیر باللازم ہے کیونکہ فقدان اکثر طلب کو مستلزم ہوتا ہے لہذا ملزوم کی تفسیر لازم سے فرما دی لیکن اس سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ گاہے فقدان سے طلب و تفتیش بھی مراد ہوا کرتی ہے پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول میں بھی اس معنی کا احتمال ہے جیسا کہ حضرت مولانا نے فرمایا ہے واذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال اور ہر چند کہ تفسیر تنویر المقیاس اکثر محدثین کے نزدیک معتبر نہیں کیونکہ اس کے راوی کلبی اور ان کے شاگرد محمد بن مروان سدی صغیر مجروح ہیں مگر سیوطی نے اتقان میں ابن عدی کا یہ قول نقل کیا ہے لکن قال ابن عدی فی الکامل للکلبی احادیث صالحۃ وخاصۃ عن ابی صالح وھو معروف بالتفسیر ولیس لاحد تفسیرا طول منه ولا اشبع اھ ص ۱۹۶ ج ۲) جس سے فی الجملہ اس کی تقویت ہوتی ہے دوسرے یہ مسئلہ کوئی احکام کی قبیل سے نہیں جس میں راوی کا مجروح ہونا مضر ہو بلکہ از قبیل نقل لغت ہے جس میں بہت وسعت ہے فافھم واللہ اعلم وانما اطلنا الکلام فی ھذا المقام لیظھر لك نعمۃ اللہ علی جماعتنا ولہ الحمد انھا لا تقبل اقوال اکابرھا فی تفسیر معانی القرآن الا بعد ظھور مطابقتھا لاقوال السلف وان اکابرھا لا یتکدرون لایراد الاصاغر علیھم اذا کان بالادب لا لاجل الطلب ولیظھر لك حسن ذوق حضرۃ حکیم الامۃ فی التفسیر بحیث لا یتخطی عن الصواب ولو قال شیئا بغیر مطالعۃ کتاب ۱۲-

کرنا چاہیئے بلکہ اس کی حقیقت اس عروج کے علاوہ دوسری چیز ہے اور وہ قرب الٰہی ہے جس کی ایک صورت یہ بھی تھی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آئی ہے اور یہ اکمل صورت ہے مگر اس صورت کے علاوہ ایک دوسری صورت سے بھی اس حقیقت کا تحقق ہو سکتا ہے کیونکہ قرب الٰہی جو حقیقت معراج ہے کسی خاص صورت میں منحصر نہیں پس سمجھنا چاہیئے کہ قرب الٰہی کبھی بصورت عروج ہوتا ہے اور کبھی بصورت نزول اور کبھی دونوں طرح مجتمع ہو جاتا ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج عروجی اور نزولی دونوں ہوئی ہیں اس لئے کہ قرب الٰہی جیسا کہ بوقت عروج آپ کو حاصل ہوا ہے نزول کے وقت بھی حاصل تھا بلکہ یہ یہ قرب پہلے سے زیادہ تھا جیسا عنقریب آتا ہے اور بعض انبیاء علیہم السلام کو صرف عروجی معراج ہوئی ہے جیسا ادریس علیہ السلام کے متعلق وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا (ہم نے ان کو ایک بلند مقام پر اٹھا لیا) کی تفسیر میں بعض علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ زندہ دنیا سے آسمان کی طرف اٹھائے گئے اسی کو ایک عارف نے کہا ہے ؎

بمیر اے دوست پیش از مرگ اگر می زندگی خواہی ؛ کہ ادریس از چنیں مردن بہشتی گشت پیش از ما

(اگر تو اے دوست زندگی چاہتا ہے تو مرنے سے فنا حاصل کر کہ ادریس علیہ السلام ایسے مرے فنا سے پہلے ہم سے پہلے جنتی ہو گئے)

پھر اُس کے بعد ان کو نزولی معراج نہیں ہوئی اور جیسا حضرت عیسٰی علیہ السلام کو اسی طرح معراج ہوئی ہے اور اس کے بعد ابھی تک نزول نہیں ہوا مگر آخر زمانہ میں نزول ہوگا اور یونس علیہ السلام کو نزول معراج ہوئی ہے اُس کو مولانا رومی نے سمجھا ہے واقعی بڑے محقق ہے بیان اس کا یہ ہے کہ مولانا نے مثنوی دفتر سوم میں ایک مقام پر حدیث لَا تُفَضِّلُوْنِیْ عَلٰی یُوْنُسَ بْنِ مَتّٰی مجھے یونس بن متی پر فضیلت مت دو) کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ؎

گفت پیغمبر کہ معراج مرا　　　نیست از معراج یونس اجتبا
آن من بالا و آن او بشیب　　　زانکہ قرب حق برونست از حیب
قرب نز پائیں ببالا جستن ست　　　قرب حق از جلس ہستی رستن ست

(پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا کہ میری معراج یونس علیہ السلام کی معراج سے برگزیدہ

نہیں ہے میری معراج عروجی تھی اور ان کی نزولی اس لئے کہ قرب حق حساب سے باہر ہے، قرب حق کی حقیقت ارتفاع مکانی نہیں ہے بلکہ قرب حق قید ہستی سے چھوٹنا ہے)

اس تفسیر میں اشارہ اس طرف ہے کہ حدیث عام ہے جس میں وہ سب امور داخل ہیں جنہیں تفصیل سے وہم تنقیص ہو سکتا ہے۔ پس مطلب حدیث کا یہ ہوا کہ جن باتوں میں تم کو میری فضیلت اور یونس علیہ السلام کے نقص کا شبہ ہو اس میں مجھکو یونس علیہ السلام پر فضیلت نہ دو جن میں قصہ معراج بھی داخل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو ساتوں آسمانوں پر تشریف لے گئے آپ کو اس طرح معراج ہوئی اور یونس علیہ السلام عرصہ تک مچھلی کے پیٹ میں رہے۔ ظاہر بینوں کو اُن کی یہ حالت ناقص معلوم ہوتی ہے مولانا فرماتے ہیں کہ ان کی یہ حالت ناقص نہ تھی بلکہ یہ یونس علیہ السلام کی معراج تھی جو بصورت نزول واقع ہوئی پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کو یونس علیہ السلام کی معراج پر فضیلت نہ دو (یعنی ایسی فضیلت جس سے وہم ان کے نقص کا ہو) اور یہ مت سمجھو کہ معراج صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ہوئی ہے یونس علیہ السلام کو نہیں ہوئی۔ ایسا نہیں ہے بلکہ اُن کو بھی ہوئی مچھلی کے پیٹ میں ان کا جانا یہ بھی معراج ہی تھی کیونکہ معراج کی حقیقت ہے قرب حق اور وہ دونوں جگہ موجود ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرب حق اور صورت سے ہوا عروجاً بھی نزولاً بھی اور یونس علیہ السلام کو قرب حق اور صورت سے حاصل ہوا کہ وہ دریا میں غرق ہوئے اور مچھلی کے پیٹ میں رہے جس کا قصہ مشہور ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کو عذاب الٰہی سے ڈرایا اور فرمایا کہ ایمان لے آؤ ورنہ اتنی مدت میں عذاب نازل ہوگا۔ جب وہ مدت قریب آئی تو آپ اس خیال سے کہ یہاں عذاب نازل ہوگا وہاں سے چل پڑے مگر حق تعالیٰ سے صریح اذن نہیں لیا اور یہاں یہ قصہ ہوا کہ جب وہ تاریخ آئی عذاب کی آمد شروع ہوئی یہ آثار دیکھ کر لوگ گھبرائے اور ایمان پر آمادہ ہوئے اور یونس علیہ السلام کو تلاش کیا کہ ان کے ہاتھ پر ایمان لادیں، یہ نہ ملے تو انھوں نے کہا کہ اگر یونس علیہ السلام نہیں ہیں تو کیا ہوا ان پر اور حق تعالیٰ پر ایمان لانا تو ممکن ہے چنانچہ ایمان لے آئے اور عذاب ٹل گیا یونس علیہ السلام لوگوں سے اُس بستی کا حال پوچھتے رہتے تھے جب کسی نے عذاب کی خبر نہ سنائی اور پورا واقعہ معلوم نہ ہوا تو آپ کو خیال ہوا کہ اب اگر واپس بستی میں جاؤں گا تو وہ لوگ جھٹلائیں گے کہ تمہارے قول کے موافق عذاب تو نہ آیا اس شرمندگی

کی وجہ سے واپس نہ ہوئے بڑھے چلے گئے راستہ میں دریا پڑا اور آپ کشتی میں سوار ہوئے چلتے چلتے وہ کشتی چکر کھانے لگی۔ ملاح نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ اس کشتی میں کوئی غلام اپنے آقا سے بھاگا ہوا سوار ہے، اُس وقت یونس علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں بھائی میں اپنے آقا سے بدون پوچھے بھاگ آیا ہوں مجھے دریا میں ڈال دو لوگوں نے اُن کی صورت سے نیکی اور بزرگی کے آثار دیکھ کر اس کلام میں شبہ کیا بالآخر قرعہ اندازی ہوئی جس میں یونس علیہ السلام ہی کا نام نکلا۔

چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ یونس علیہ السلام نے قرعہ اندازی کی تو وہی ہارے پس لوگوں نے ان کو دریا میں ڈالدیا وہاں ایک بہت بڑی مچھلی تھی اس نے بحکم حق آپ کو نگل لیا اور قعر دریا میں پہونچی چالیس دن اُس کے پیٹ میں رہے مگر ہضم نہیں ہوئے حق تعالیٰ نے حفاظت فرمائی مولانا نے اس کو معراج قرار دیکر فرماتے ہیں ؎

قرب نز پستی ببالا رفتن است قرب حق از حبس ہستی رستن است

یعنی حق تعالیٰ کے قرب کی حقیقت مکانی ارتفاع نہیں بلکہ یہ ہے کہ بندہ اپنی ہستی کی قید سے چھوٹ جائے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ زہر کھالے یہ تو بڑا سستا قرب ہے جو ایک پیسہ کے سنکھیے سے حاصل ہو سکتا ہے سو یہ قید ہستی سے چھوٹنا نہیں بلکہ اس میں تو قید ہستی کے موجود ہونے کی دلیل ہے کیونکہ خودکشی حرام ہے اور خلاف مرضیٔ حق پر پیش قدمی کرنا قید ہستی یعنی دعویٰ وزعم استقلال ہستی کی علامت ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعویٰ ہستی کو چھوڑ دے اپنے کمالات سے نظر اٹھ جائے اپنے ارادہ کو ارادۂ حق میں فنا کر دے پس یہ ہے قرب کی حقیقت جس کا حاصل یہ ہے کہ اپنے اوپر نظر نہ رہے حاصل یہ کہ تم خود ہی قرب حق سے اپنے حاجب ہو اس کو مرتفع کرو اسی کو عارف فرماتے ہیں ؎

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست تو خود حجابِ خودی حافظ از میاں برخیز

(عاشق اور معشوق کے درمیان کوئی حائل نہیں تیری خودی خود حجاب ہو رہی ہے حافظ خودی کو درمیان سے اٹھا)

اور اسی کو حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ فرماتے ہیں ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

(مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کے چہرۂ انور کو نہ دیکھنے دوں اور کانوں کو بھی اسکی بات سننے دوں)

بلکہ ہمہ تن مشاہدہ حق میں فنا ہو جائے کہ نہ اپنے کان کو اپنا کان سمجھے نہ اپنی آنکھ کو اپنی آنکھ سمجھے بس وہ حال ہو جائے بِیْ یَبْصُرُ وَبِیْ یَسْمَعُ (میری وجہ سے دیکھے میری وجہ سے سنے) حضرت بایزید بسطامی قدس اللہ سرہٗ نے حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا عرض کیا ۔ یَا رَبِّ دُلَّنِیْ اِلٰی اَقْرَبِ الطُّرُقِ اِلَیْكَ اے اللہ مجھے اپنے تک پہونچنے کا نزدیک تر راستہ بتلا دیجئے جواب میں ارشاد ہوا یَا اَبَا یَزِیْدَ دَعْ نَفْسَكَ وَتَعَالَ یعنی اے بایزید بس اپنے نفس کو چھوڑ دو اور چلے آؤ (یعنی اتباع نفس کو) سبحان اللہ کیا نزدیک راستہ بتلایا گیا ہے اور یہی مراد ہے صوفیہ کے اس قول میں کہ مرید کو چاہیئے کہ شیخ کے ہاتھ میں اپنے آپ کو ایسا سپرد کر دے کہ کَالْمَیِّتِ فِیْ یَدِ الْغَسَّالِ یعنی جیسے مردہ غسال کے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ وہ جس طرف چاہتا ہے اس کو پلٹ لیتا ہے وہ کچھ نہیں کہتا اسی طرح مرید کو ہونا چاہیئے کہ شیخ کے ارادہ میں اپنی رائے واختیار اور قصد کو فنا کر دے وہ اگر جگا دے تو جاگے سُلا دے تو سو رہے نفلوں کا حکم کرے تو نفلیں پڑھے منع کر دے تو چھوڑ دے بشرطیکہ وہ خلاف شرع کا امر نہ کرے اگر شیخ کامل ہے تو وہ ایسا کرنے ہی کیوں لگا اور اگر ناقص ہے تو ایسے شیخ ہی کو سلام کرنا چاہیئے جب مرید شیخ کے ہاتھ میں اپنے کو اس طرح سپرد کر دیتا ہے تو پھر اس کو خدا تعالیٰ کے ساتھ بھی یہی تسلیم نصیب ہو جائے گی اور ایک وہ وقت آئے گا کہ یہ آسانی کے ساتھ اپنی ارادہ واختیار کو ارادہ خداوندی میں فنا کر دے یہی ہے قرب حق اور یہی قرب حق حقیقت ہے معراج کی اور ظاہر ہے کہ قرب حق تمام انبیاء علیہم السلام کو حاصل تھا تو حقیقی معراج سب کو حاصل تھی گو بعض کو صوری نہ ہوئی ہو اور ادریس علیہ السلام کو تو ایک قول پر صوری بھی ہوئی ہے اور مولانا رومی کی تحقیق کے موافق یونس علیہ السلام کو نزولی معراج ہوئی ہے پس ان کو اس طرح قرب ہوا کہ اوپر سے نیچے بلائے گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح قرب ہوا کہ نیچے سے اوپر بلائے گئے اور یہ ضروری نہیں کہ معراج بصورت نزول ناقص ہوا کرے تاکہ اس بنا پر معراج یونسی کو معراج محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے مفضول کہا جاوے گو دوسرے دلائل سے آپ کی معراج سب معراجوں سے افضل ہے مگر محض نزول کو ناقص ماننا اس کی بنا نہیں ہے بلکہ صوفیہ کا

تو مقولہ یہ ہے کہ عروج سے نزول افضل ہے۔ •

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج میں ایک تو آپ کی حالت عروج تھی جبکہ آپ نیچے سے اوپر کو جا رہے تھے اور ایک حالتِ نزول بھی جبکہ آپ اوپر سے نیچے کو آ رہے تھے صوفیہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نزولی حالت آپ کی پہلی حالت سے اکمل تھی اور اس سے یہ مت سمجھنا کہ میں یونس علیہ السلام کے نزول کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عروج پر ترجیح دے رہا ہوں ہرگز نہیں بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کبھی نزول اور کبھی عروج ہوا ہے تو ان دونوں میں آپ کے عروج سے آپ کا نزول افضل تھا باقی آپ کا عروج دوسرے دلائل سے ایسا اکمل ہے کہ وہ دوسروں کے نزول سے بھی افضل ہے مگر اس سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ نزول فی نفسہ نقص نہیں۔

غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج عروجی تو کامل ہے اور آپ کی معراج نزولی اکمل ہے سو ان میں فرق کامل اکمل کا ہے ناقص کامل کا نہیں کیونکہ آپ کی جو حالت بھی ہے وہ کمال سے خالی نہیں گو بعض حالتیں بعض سے زیادہ کامل ہوں مگر ناقص کوئی نہیں۔ اور آپ کی معراج نزولی کا معراج عروجی سے افضل ہونا صرف صوفیہ کے قول ہی سے ثابت نہیں بلکہ اُس پر دلائل موجود ہیں۔ ایک دلیل تو یہ ہے کہ معراج کی غایت حق تعالیٰ نے رویتِ آیات بیان فرمائی ہے چنانچہ سورہ نجم میں تو فرمایا ہے لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی (البتہ دیکھے آپ نے اپنے رب کے عظیم عجائب قدرت) اور سورۃ الاسراء میں فرمایا ہے لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا (تاکہ دکھائیں ہم آپ کو اپنے عجائب قدرت) اور ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آیات دکھلانے سے دو فائدے ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ آپ کی معرفت زیادہ ہو دوسرے یہ کہ آپ خود دیکھ کر دوسروں کو بتلا دیں۔

خلاصہ یہ کہ معراج سے دو مقصود تھے ایک یہ کہ رویت آیات و ازدیادِ علوم سے آپ کی تکمیل ہو دوسرے یہ کہ ان علوم سے آپ دوسروں کی تکمیل کریں۔ پہلا فائدہ لازمی ہے اور دوسرا فائدہ متعدی ہے اور ظاہر ہے کہ جو وقت فائدہ متعدیہ کے ظہور کا ہوگا وہ فائدہ لازمیہ کے وقت سے افضل ہوگا کیونکہ بعثتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اصل مقصود افادۂ خلائق ہی ہے۔ نیز دوسروں کی تکمیل سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درجات میں بھی ترقی ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ فائدہ متعدیہ

کا ظہور بعد نزول کے ہوا تو نزول کا عروج کا سے افضل ہونا ثابت ہوگیا۔ دوسری دلیل یہ آیت ہے وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى اُس کا بیان یہ ہے کہ ایک مرتبہ کچھ دنوں نزول وحی میں توقف ہوگیا اور کفار نے طعن کیا تو اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر رنج وغم کا اثر ہوا اور آپ پر حالت قبض طاری ہوگئی تو بعد میں حق تعالیٰ نے آپ کی تسلی فرمائی اور سورۂ ضحیٰ نازل ہوئی جس میں اول اُن آیات کی قسم کھائی گئی ہے جن کو اُس حالت سے خاص مناسبت ہے فرماتے ہیں وَالضُّحٰى وَاللَّيْلِ اِذَا سَجٰى مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى قسم ہے دن کی اور رات کی جبکہ وہ قرار پکڑلے (نہ آپ کے رب نے آپ کو چھوڑا نہ وہ آپ سے ناراض ہے) اس جگہ رات اور دن کی قسم بہت ہی مناسب ہے کیونکہ دن مشابہ ہے حالت بسط کے اور رات مشابہ ہے حالت قبض کے وجہ تشبیہ ایک تو یہ ہے کہ حالت بسط میں انوار کا توارد ہوتا ہے اور دن بھی محل نور ہے اور حالت قبض میں وہ انوار نہیں رہتے تو وہ رات کے مشابہ ہے دوسرے یہ کہ جس طرح دن میں کاروبار زیادہ ہوتے ہیں اس طرح حالت بست میں سالک سے کام زیادہ ہوتا ہے اور حالتِ قبض میں کسی کام کو جی نہیں چاہتا نہ نماز میں دل لگتا ہے نہ ذکر میں نہ تلاوت میں تو قبض میں کام کم ہوجاتا ہے وہ رات کے مشابہ ہے کہ اس میں بھی کاروبار بند ہوجاتے ہیں. حق تعالیٰ نے اس جگہ رات اور دن کی قسم سے مقام کی یعنی جواب قسم مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى (آپ کے پروردگار نے آپ کو نہیں چھوڑا نہ وہ آپ سے ناراض ہوا البتہ آپ کی پچھلی حالت آپ کے لئے پہلی حالت سے بہتر ہے) کی حقیقت بتلادی جس کا حاصل یہ ہے کہ سالک پر ان دونوں حالتوں کا آنا ایسا ہے جیسے لیل ونہار کا تعاقب پس جس طرح دن کے بعد رات آجانا غیر مقبول ہونے کی علامت نہیں اسی طرح بسط کے بعد کہ تواتر وحی ہے قبض کا آنا کہ توقف وحی ہے غیر مقبول ہونے کی دلیل نہیں بلکہ جس طرح ہم نے عالم میں لیل ونہار کا اختلاف حکمت کے لئے رکھا ہے یوں ہی سالک پر بسط وقبض کا تعاقب حکمت کے لئے مقرر کیا ہے۔

پس قبض سے پریشان نہ ہونا چاہیئے نیز اس میں قبض کی ایک حکمت کی طرف بھی اشارہ ہوگیا کہ جس طرح دن میں اگرچہ کاروبار زیادہ ہوتا ہے مگر مخلوق کی راحت

وآرام کے واسطے رات کا آنا بھی ضروری ہے اگر رات نہ آوے تو کاروبار کا تعب زائل نہ ہوسکے گا راحت وآرام کے لئے دن موضوع نہیں اس کے واسطے رات ہی کا وقت مناسب ہے اسی طرح گو بسط میں سالک سے کام زیادہ ہوتا ہے مگر اس کام کے دوام کے لئے قبض کی بھی ضرورت ہے اگر ہمیشہ بسط ہی رہے تو ایک نہ ایک دن کام کرتے کرتے اکتا جائے گا۔ اس لئے ہم قبض کی حالت مسلط کر دیتے ہیں تاکہ یہ زیادہ کام نہ کرے تھوڑے ہی پر اکتفا کرے اور فی الجملہ آرام مل جائے پھر قبض رفع ہونے کے بعد جو بسط آئے گا تو اس کو پہلے سے زیادہ نشاط عمل میں ہوگا اسی طرح پر قبض وبسط کے تعاقب سے یہ ہمیشہ کام کرتا رہے گا اسی کو عارف فرماتے ہیں ؎

از دست ہجر یار شکایت نمی کنم گر نیست غیبتے ندہد لذتے حضور

(میں ہجر کی شکایت نہیں کرتا کیونکہ اگر ہجر نہ ہوتا تو قرب میں لذت نہ معلوم ہوتی)

اس معنی خیز قسم کے بعد جواب ارشاد فرماتے ہیں مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی آپ کے پروردگار نے نہ آپ کو چھوڑا اور نہ وہ آپ سے ناراض ہے آپ بے فکر رہیں۔ اس میں تسلی تو ہوگئی مگر یہاں ایک شبہ آپ کو ہوسکتا تھا وہ یہ کہ گو قبض وبسط لیل ونہار کی طرح تعاقب ہیں اور قبض سے مجھے کچھ تنزل نہیں ہوا مگر بظاہر بسط اس سے افضل ہے کیونکہ لو فق للطبع ہے اس میں کام بھی زیادہ ہوتا ہے توجہ بھی اس میں عالم بالا کی طرف زیادہ رہتی ہے تو بسط میں ترقی زیادہ ہوتی ہوگی گو قبض میں بھی خود قبض کے سبب سے تنزل نہ ہوتا ہو مگر ترقی بھی تو بسط کی برابر نہیں ہوتی ہوگی آگے اس شبہ کا جواب دیتے ہیں۔

وَلَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰی یعنی كُلُّ حَالَةٍ اٰخِرَتٌ لَكَ خَیْرٌ مِنَ الْحَالَةِ الْاُوْلٰی۔

یعنی آپ کی ہر پچھلی حالت ہر پہلی حالت سے افضل ہے اس لئے زمانہ قبض کی حالت آپ کی اس بسط کی حالت سے افضل تھی جو اس سے پہلے تھی اور جب وہ پہلی حالت سے افضل تھی تو اس میں بھی ترقی بشد

نہیں ہوئی بلکہ برابر آپ کو ترقی ہو رہی ہے اور یہ جواب ایسا ہے جیسا کہ واقعۂ تحویل قبلہ میں حق تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ (اللہ ایسے نہیں کہ تمہارے ایمان یعنی نمازوں کو ضائع کردیں) جب بیت المقدس سے پھر کعبہ کی طرف قبلہ تحویل کیا گیا تو بعض صحابہ کو شبہ ہوا کہ جتنے دنوں ہم نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی ہے شاید اُن میں ثواب کم ملا ہوگا کیونکہ تحویل سے معلوم ہوا کہ اصلی قبلہ تو کعبہ تھا اور وہ قبلہ عارضی تھا اور اصلی قبلہ میں اور عارضی میں فرق ضرور ہے تو جو نمازیں عارضی قبلہ کی طرف ہم نے پڑھی ہیں ان میں کم ثواب ہوا ہوگا۔ حق تعالےٰ نے اس شبہ کا جواب دیا کہ ہم ایسے نہیں ہیں کہ تمہاری طاعات سابقہ کا ثواب کم کردیں یا ضائع کردیں کیونکہ تم نے تو بہرحال ہمارے حکم کی اطاعت کی ہے تم کو تو عارضی و اصلی ہونا معلوم نہ تھا اس لئے ثواب بھی تم کو کم نہیں ملا بلکہ ان نمازوں میں بھی پورا ہی ثواب ملا ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے کہ قبض و بسط جب ہماری طرف سے ہے اور آپ کے فعل کو اس میں کچھ دخل نہیں تو آپ کو حالتِ قبض میں بھی ترقی ہوتی رہتی ہے ترقی میں کمی نہیں خصوصاً جبکہ ہم نے آپ کو قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا (آپ کہئے کہ اے میرے پروردگار مجھ کو علم زیادہ دیجئے) کی تعلیم دی ہے اور ہمارا یہ دعا تعلیم کرنا علامتِ اجابت ہے) تو آپ کو ہر وقت ترقی ہوتی رہتی ہے اور آپکی ہر پچھلی حالت ہر پہلی حالت سے افضل ہوتی ہے۔ پس جس بسط کے بعد قبض آیا ہے یہ قبض پہلے بسط سے افضل ہے اور اس قبض کے بعد جو بسط آئے گا وہ اس قبض سے افضل ہوگا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو بڑی شان ہے۔ حضرات صوفیہ نے ہر عارف کے متعلق یہی فرمایا ہے کہ عارف کی ہر حالت آئندہ حالت گذشتہ سے افضل ہوتی ہے کیونکہ وہ ہر دم ترقی کرتا رہتا ہے اسی کو فرماتے ہیں ؎

سیر زاہد در مہے یک سالہ راہ　　　سیر عارف ہر دمے تا تختِ شاہ

(زاہد ایک مہینہ میں ایک سال کی راہ طے کرتا ہے اور عارف ذرا سی دیر میں تخت شاہ تک پہونچ جاتا ہے)

بیزارم ازاں کہنہ خدائے کہ تو داری   ہر روز مرا تازہ خدائے دگرے ہست
(تمہارے پرانے خدا سے بیزار ہوں ہر دم مجھے دوسرے تازہ خدا کی ضرورت ہے)

یہ عنوان ظاہر میں بہت موحش ہے مگر مطلب معلوم کرنے کے بعد استبعاد نہ رہے گا بات یہ ہے کہ ہر شخص کا حق تعالیٰ کے متعلق کچھ نہ کچھ خیال ضرور ہوتا ہے گو حق تعالیٰ ہمارے خیالات سے وَرَاءُ الْوَرَاءِ ثُمَّ وَرَاءُ الْوَرَاءِ ہیں مگر یہ ضرور ہے کہ ہم کو جب تصور ہوتا ہے تو کسی خاص کیفیت کے ساتھ ہوتا ہے اب سمجھئے کہ غیر عارف کو تو چونکہ ترقی معرفت میں ہوتی نہیں اس لئے جو خیال اس نے حق تعالیٰ کے متعلق ایک دفعہ قائم کرلیا ہے ہمیشہ بس وہی خیال رہتا ہے کہ حق تعالیٰ ایسے ہوں گے اس طرح ہوں گے اسی کو شعر میں کہنہ خدا کہا ہے اور عارف کو چونکہ ہمیشہ ترقی ہوتی اور تجلی الٰہی قلب میں تازہ ہوتی رہتی ہے اور روزانہ معرفت بڑھتی جاتی ہے اس لئے جو خیال اس کو حق تعالیٰ کے متعلق آج تھا وہ کل نہ رہے گا اور جو کل ہوگا وہ اس کے بعد نہ رہے گا وہ ہمیشہ اپنے گذشتہ خیالات سے توبہ کرتا رہتا ہے کیونکہ ہر وقت حق تعالیٰ کی عظمت اس شان سے منکشف ہوتی ہے کہ پہلا خیال اس کے سامنے غلط معلوم ہوتا ہے۔ اسی کو ان حضرت نے تازہ خدا کہا ہے یعنی تازہ تجلی معرفت خدا۔ اب مطلب تو صاف ہوگیا مگر عنوان کے موحش ہونے میں شبہ نہیں۔ لیکن ان لوگوں کو اپنے غلبۂ حال میں اس کی پروا نہیں ہوتی کہ کسی کا ایمان رہے گا یا جائے گا یا ہمارے اوپر کفر کے فتوے لگیں گے۔ غرض جب عارف کو ہر دم ترقی ہوتی رہتی ہے تو اس کو قبض سے پریشان نہ ہونا چاہیئے بلکہ اس کو حالت نزول پر محمول کرنا چاہیئے اور یہ سمجھ لے کہ یہ نزول پہلے عروج سے افضل ہے اور اس کے بعد جو عروج ہوگا یعنی بسط وہ اس نزول سے افضل ہوگا۔

تو اب واقعہ معراج سے جو سبق ہم کو حاصل ہوا وہ دو باتیں ہیں ایک یہ کہ معراج کی حقیقت قرب الٰہی ہے اور وہ سب انبیاء کو حاصل ہے تو یہ نہ کہنا چاہیئے کہ معراج صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ہوئی ہے اور کسی نبی کو نہیں ہوئی بلکہ معراج

سب کو ہوئی ہے۔ ہاں اجمالاً اس کہنے کا مضائقہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج اوروں کی معراج سے افضل واکمل ہے وہ بھی اس طرح سے کہا جاوے جس میں دوسرے انبیاء کی معراج کی تنقیص نہ ہو بلکہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت واکملیت کا بیان ہو اور معراج ہی کی کچھ تخصیص نہیں مطلقاً تمام احوال ومقامات انبیاء میں تفصیلی فضیلت جب تک منصوص نہ ہو بیان نہ کرنا چاہیئے جیسا عام لوگوں کی عادت ہے اور غضب ہے کہ بعض مصنفین بھی جن پر معقول کا غلبہ ہے اس مرض میں مبتلا ہیں میرا تو ایسی باتوں سے رونگٹا کھڑا ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک مصنف نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طرح فضیلت بیان کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غار ثور میں صدیق اکبر کو جب وہ کفار کے آجانے سے پریشان ہوئے یوں تسلی دی تھی (لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا، غمگین مت ہو تحقیق اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے) جس میں اول لَا تَحْزَنْ (غمگین مت ہو) فرما کر غم کو ہلکا کر دیا پھر اپنی ساتھ معیت حق کو بیان فرمایا جس میں خدا تعالیٰ کے ذکر کو مقدم فرمایا اور معیت میں حضرت صدیق اکبر کو بھی شریک فرمایا کہ صیغۂ جمع مَعَنَا استعمال فرمایا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کو جب فرعون اور لشکر فرعون کے آجانے سے پریشانی ہوئی اور انھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے اس پریشانی کو ظاہر کیا تو آپ نے فرمایا کَلَّا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَہْدِیْنِ (ہرگز ایسا نہیں کیونکہ میرے ہمراہ میرا پروردگار ہے وہ مجھ کو ابھی سیدھا رستہ بتلا دے گا) جس میں سب سے پہلے لفظ کلّا استعمال فرمایا جو دھمکی کے واسطے موضوع ہے عربی میں لفظ کلّا ایسے ہی موقعہ میں استعمال ہوتا ہے جہاں اردو کا کلا بھی استعمال ہوتا ہے گویا کلّے پر طمانچہ مار دیا پھر اپنی ساتھ معیت حق کو جو بیان فرمایا تو اپنے ذکر کو خدا تعالیٰ کے ذکر سے مقدم فرمایا یعنی لفظ مَعِیَ کو رَبِّیْ سے پہلے ذکر کیا گویا یہ حضرت مصنف سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو بولنا سکھاتے ہیں کہ حضرت آپ کو خدا کا ذکر اپنے ذکر سے پہلے کرنا چاہیئے تھا۔ گویا ان کو آداب کلام بھی نعوذ باللہ معلوم نہ تھے۔ پھر یہ بھی وجہ فضیلت بیان کی کہ موسیٰ علیہ السلام نے معیَ بصیغہ مفرد فرمایا جس میں معیت الٰہیہ کو اپنی ساتھ خاص کیا قوم کو اپنی ساتھ اس دولت میں شریک نہ کیا مجھے ان مصنف صاحب پر تعجب ہوتا ہے کہ اُن کے قلم سے

یہ مضمون نکلا کیونکہ بس میں تو یہ کہوں گا کہ ؎

سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجا ست
(دوست خطا یہی ہے کہ تو سخن شناس نہیں ہے)

اول تو ان کو ان جزئیات میں کلام کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے فضائل کلیہ منصوصہ کیا کچھ کم ہیں جو جزئیات غیر منصوصہ سے آپ کا افضل ہونا ثابت کیا جائے اور اگر اُن کو ایسا ہی شوق تھا تو یہ غور کرنا چاہئے تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مخاطب کون ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مخاطب کون کیونکہ بلاغت کا مسئلہ ہے کہ ہر حال اور ہر موقع ومحل کے لئے ایک ہی طرز کلام نہیں ہوتا بلکہ ہر موقعہ کے لئے جُدا طرز ہوا کرتا ہے ؎

ہر سخن نکتہ و ہر نکتہ مقامے دارد
(ہر کلام میں باریکی ہے ہر باریکی کا ایک مقام ہے)

میں بطور احتمال کے کہتا ہوں اور مانع کے لئے بمقابلہ مستدل کے احتمال کافی ہے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مخاطب حضرت صدیق جیسے لوگ ہوتے تو وہ بھی وہی فرماتے جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور اگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے مخاطب وہ لوگ ہوتے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مخاطب تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہی فرماتے جو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہے تعویل اس کی یہ ہے کہ آپ کی ساتھ غار ثور میں حضرت صدیق اکبر تھے جن کی جاں نثاری کی یہ حالت تھی کہ جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم غار ثور پر پہونچے ہیں تو حضرت صدیق نے اپنے چادرہ یا لنگی کو پھاڑ کر غار کے تمام سوراخ بند کئے تاکہ کوئی موذی جانور نکل کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا نہ دے سارے سوراخ تو بند ہو گئے مگر ایک رہ گیا اس کے لئے کپڑا نہ رہا تھا اس پر حضرت صدیق نے اپنا پیر لگا لیا کہ اگر کچھ نکلے گا تو میرے ہی پیر میں کاٹ لے گا حضور صلے اللہ علیہ وسلم تک نہ پہونچ سکے گا اس حالت میں جو حضرت صدیق کو کفار کے آجانے سے پریشانی ہوئی ظاہر ہے کہ وہ

پریشانی اپنی جان کے خوف سے نہ تھی بلکہ محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال سے پریشانی ہوئی تھی کہ ایسا نہ ہو کہ دشمن آپ کو دیکھ پائیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہونچائیں جو شخص اتنا عاشق ہو جس نے سانپ کے بل میں اپنے پیر رکھدیئے جس میں سانپ نے کاٹ بھی لیا تھا اس کو بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے اپنی جان کا خیال ہو سکتا ہے ہرگز نہیں ان کو جو کچھ خطرہ تھا وہ محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اذیت کا تھا اور اس خطرہ کا منشا بھی محض یہ تھا ؎

عشق است وہزار بدگمانی

(عشق ہزار بدگمانیاں ہیں۔)

ورنہ حضرت صدیق دولت توکل سے پوری طرح مالامال تھے ایسے شخص کی تسلی کے لئے وہی کلام مناسب تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال فرمایا کہ اول ان کے غم کو ہلکا کرنے کے لئے لَا تَحْزَنْ فرمایا پھر معیت حق میں ان کو بھی شریک کیا اور چونکہ آپ کو حصر مقصود نہ تھا اس لئے موافق اصل وضع کے ذکر اللہ کو اپنے ذکر سے مقدم فرمایا اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو لوگ تھے وہ نہ حضرت صدیق کی برابر متوکل تھے نہ ایسے جان نثار تھے کہ ان کو اپنی جان کا خطرہ بالکل نہ تھا محض موسیٰ علیہ السلام کی اذیت کا خطرہ تھا بلکہ ظاہر یہ ہے کہ ان کو اپنی جان کا خطرہ تھا پھر خطرہ ہی نہیں بلکہ انھوں نے اُس کو جزم ویقین کے ساتھ ظاہر کیا قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰی اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ (موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے کہا بس ہم تو یقیناً پکڑے گئے) جس میں ان اور جملہ اسمیہ اور لام تاکید تین موکدات موجود ہیں یعنی بس ہم تو یقیناً پکڑے گئے حالانکہ بارہا دیکھ چکے تھے کہ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی فرعون کے مقابلہ میں کس طرح مدد فرمائی اور اس وقت بھی خدا کے حکم سے اور اس کے وعدۂ نصر کو سن کر چلے تھے ان تمام امور کے ہوتے ہوئے اتنی پریشانی کہ اپنے پکڑے جانے کا ایسا جزم ہو گیا صاف ان کو غیر متوکل اور غیر کامل الیقین ہونے کی دلیل ہے اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے دھمکا کر فرمایا کَلَّا گویا ایک چپت رگادیا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا تاکید سے ان لوگوں نے اپنے پکڑے جانے کو ظاہر کیا تھا اس کا جواب ایسی ہی تاکید سے ہو سکتا تھا جو لفظ کَلَّا میں ہے

پھر چونکہ یہ لوگ بوجہ کامل الیقین نہ ہونے کے معیت حق سے محروم تھے اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے حصر کے لئے مؤخر کو مقدم کیا اور مقدم کو مؤخر کیا کیونکہ قاعدہ ہے تَقْدِیْمُ مَا حَقّہٗ التَّاخِیْرُ یُفِیْدُ الْحَصْرَ (جس کو مقدم کرنے کا حق تھا اس کے مؤخر کرلے حصر کا فائدہ دیتاہے) اور اسی وجہ سے معی بصیغۂ مفرد فرمایا صیغۂ جمع استعمال نہیں فرمایا مطلب یہ تھاکہ میری ہی ساتھ میرا پروردگار ہے تم لوگ بوجہ ضعیف الیقین ہونے کے معیت حق سے محروم ہو اب بتلایئے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس مقصود کو ادا فرمانا چاہتے جو موسے علیہ السلام نے ادا فرمایا کیا اس وقت بھی آپ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (مت غمگین ہو اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں) ہی فرماتے۔ جو لوگ بلاغت سے کچھ ذوق رکھتے ہیں وہ کبھی اس کے قائل نہ ہوں گے بلکہ وہ اس کہنے پر مجبور ہوں گے کہ اس مقصود کے ادا کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہی طرز اختیار فرماتے جو موسیٰ علیہ السلام نے اختیار فرمایا لیجیئے تفصیلی جزئیات میں کلام ایسا ہوتاہے کہ اس کو ایک ادنیٰ طالب علم بھی احتمال نکال کر باطل کرسکتاہے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل میں ہمیشہ اجمالی گفتگو کرنا چاہیئے تفصیلی کلام کبھی نہ کرنا چاہیئے مثلاً معراج ہی کے بارہ میں اجمالاً یہ کہنے کا مضائقہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج دیگر انبیاء کی معراج سے اکمل وافضل ہے کیونکہ آپ سید الانبیاء ہیں آپ کو حق تعالیٰ سے جس درجہ قرب ہے وہ سب کے قرب سے بڑھا ہوا ہے اور معراج کی حقیقت قرب ہی ہے۔ اور تفصیل کرکے یوں مت کہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج یونس علیہ السلام کی معراج سے اس لئے افضل ہے کہ آپ نیچے سے اوپر بلائے گئے اور وہ اوپر سے نیچے بلائے گئے کیونکہ میں بتلا چکا ہوں کہ نزول بنفسہ وجہ نقص نہیں بلکہ نزول تو ہر صاحب عروج کا اس کے عروج سے افضل ہوتاہے گو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یونس علیہ السلام کا نزول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عروج سے افضل ہو مگر تاہم یہ تو معلوم ہوگیا کہ نزول فی نفسہ سبب نقص نہیں اور اگر نزول کو علی الاطلاق نقص کہا جائے تو نعوذ باللہ آپ حق تعالیٰ کے لئے بھی نقص کو ثابت کریں گے کیونکہ وہاں بھی نزول ثابت ہے۔

حدیث میں ہے یَنْزِلُ رَبُّنَا تَبَارَكَ وَتَعَالٰی كُلَّ لَيْلَةٍ اِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا

(اللہ تعالٰے سماء الدنیا کی طرف ہر رات نزول فرماتے ہیں)

پس نہ عروج علی الاطلاق افضل ہوا نہ نزول بلکہ جس کو جو عطا ہو جائے وہی افضل ہے ایک سبق تو یہ ہوا اور اس مقام پر چند شبہات ہیں اول اوپر سے نیچے آنے کو جو معراج نزولی کہا گیا ہے نہ صرف مکان کے اعتبار سے بلکہ حقیقت نزول کے اعتبار سے مگر اتفاق سے وہ حقیقت اس صورت کے ساتھ مقرون ہو گئی۔

دوم کسی نبی یا ولی کے کسی عروج کو جو اس کے کسی نزول سے افضل کہا گیا ہے اس سے اُس کلیہ میں شبہ نہ کیا جاوے کہ نزول افضل ہوتا ہے کیونکہ یہ عروج کا افضل ہونا باعتبار بعض خصوصیات مقصودہ کے ہوتا ہے۔

سوم۔ یونس علیہ السلام کا نیچے جانا نزول کہا گیا ہے اور نزول کی افضلیت باعتبار توجہ الی الخلق للافادہ کے قرار دی گئی ہے سو اس وقت یہ افادہ کہاں تھا۔ جواب یہ ہے کہ ایک وجہ نزول کے افضل ہونے کی غلبۂ انکسار و افتقار بھی ہے سو یہ حاصل تھی اور قبض کا انفع ہونا بسط سے اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے۔

دوسرا سبق اس واقعہ معراج سے سالکین کو یہ حاصل ہوا کہ وہ اپنے حالات کا فیصلہ خود کر لیا کرتے ہیں یہ اُن کی غلطی ہے مثلاً پہلے ذکر میں جی لگتا تھا خطرات نہ آتے تھے انوار کی کثرت تھی اس کو وہ افضل حالت سمجھتے ہیں، پھر خطرات آنے لگے انوار میں کمی ہو گئی تو اب سمجھتے ہیں کہ ہم مردود ہو گئے۔ خبر بھی ہے کہ وہ عروج کی حالت تھی اور یہ نزول کی حالت ہے۔ اور معراج کی حقیقت آپ کو معلوم ہو چکی ہے کہ معراج کبھی عروج سے ہوتی ہے کبھی نزول سے ہوتی ہے اور دونوں حالتیں مقبول ہیں۔ پھر تم نزول کو ادون کیوں سمجھتے ہو بس سالک کی تو یہ حالت ہونا چاہیئے ہ

ہ ای بترجہ علی الخلق فسمی توجیہہ الی الحوادث نزولا ومقتضاہ ان یصح اطلاق العروج علی توجہہ تعالٰی علی ذاتہ وصفاتہ ولعل ذلك هو الماخذ لتسمیۃ الصوفیۃ توجہ السالك الی اللہ تعالٰی وصفاتہ عروجا وتوجہہ الی الخلق نزولا واللہ اعلم ۱۲ جامع

تو بندگی چو گدایان بشرط مزد مکن — کہ خواجہ خود روشن بندہ پروری داند

(تو گداگروں کی طرح مزدوری کی شرط پر بندگی مت کر اس لئے آقا خود بندہ پروری کا طریقہ جانتا ہے) چاہے قبض ہو یا بسط ہر حال میں خدا سے راضی رہے اور اپنے لئے کوئی حالت تجویز نہ کرے اگر قبض کسی معصیت کی وجہ سے نہ ہو تو پھر اس کو نزول پر محمول کرنا چاہیئے جو کہ صوفیہ کے نزدیک عروج سے افضل ہے مگر اپنے لئے تجویز اس کو بھی نہ کرے بلکہ جب بسط عطا ہو تو اسی میں خوش رہے حق تعالیٰ نے قبض و بسط و نزول و عروج تمہاری مصلحت کے لئے عطا فرمایا ہے وہی مصلحت کو خوب جانتے ہیں ایک عارف فرماتے ہیں ؎

بگوش گل چہ سخن گفتۂ کہ خنداں است — بہ عندلیب چہ فرمودۂ کہ نالاں است

(گل سے کیا کہدیا ہے کہ خنداں ہے بلبل سے کیا فرمادیا ہے کہ نالاں ہے) گل سے صاحب بسط مراد ہے اور عندلیب سے صاحب قبض مطلب یہ ہے کہ سب اسی کے باغ کے پروردہ ہیں گل بھی اور عندلیب بھی کسی کو خندہ ان کو پسند ہے اس کو بسط عطا فرمادیا کسی کا نالہ وگریہ پسند ہے اس کو قبض عطا فرمادیا۔ تم کو تجویز کا کوئی حق نہیں ہر حال میں راضی رہنا چاہیئے اصل مقصود معیت ہے اور وہ ان سب احوال میں حاصل ہے صرف لون مختلف ہے اسی کو مولانا وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ (وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو) تفسیر میں فرماتے ہیں ؎

گر بعلم آئیم ما ایوان اوست — ور بجہل آئیم ما زنداں اوست
گر بخواب ائیم مستان وئیم — ور بہ بیداری بدستان وئیم

(اگر علم تک ہماری رسائی ہوجائے تو یہ ان ہی کا ایوان ہے کہ درجہ علم ان کے تصرف سے عطا ہوا اور اگر ہم جہل میں مبتلا رہیں تو یہ ان کا زندان ہے یعنی حق تعالیٰ کا تصرف ہے کہ مجلس جہل سے نہیں نکلے اگر سو رہیں تو ان ہی کے بے ہوش کئے ہوئے ہیں اور اگر جاگ اٹھیں تو انہیں کی گفتگو میں ہیں یعنی یہ قوت بیانیہ بھی ان ہی کی عطا کی ہوئی ہے)

اور جہل سے مراد جہل غیر مضر ہے اور بعض دفعہ سالک پر ایسی حالت پیش آتی ہے کہ نہ اس کا قبض ہونا معلوم ہوتا ہے نہ بسط ہونا اس میں سالک حیران ہوتا ہے کہ میں اپنی اس

حالت کو کیسا سمجھوں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ حالت کیسی ہے مولانا اس کے متعلق فرماتے ہیں۔

؎ در تردد ہر کہ او آشفتہ است   حق بگوش او معما گفتہ است

(جو شخص کسی تردد میں پریشان ہو رہا ہو گویا حق تعالیٰ نے اس کے کان میں کوئی معمہ کہہ دیا ہے)

یعنی پریشان نہ ہو محبوب نے تمہارے کان میں معما کہہ دیا ہے جس کا مطلب حل نہ ہونے سے پریشانی ہو رہی ہے کبھی وہ عاشق کے امتحان کے لئے ایسی بات فرما دیا کرتے ہیں جس سے وہ چکر میں پڑ جائے حیرت کی ایک قسم یہ بھی ہے۔ مولانا نے حیرت کے اقسام بیان فرمائے ہیں کہ ایک تو حیرت محمودہ ہے اور ایک حیرت مذمومہ۔ حیرت مذمومہ وہ ہے جس کا منشا جہل محض کہ اس کو محبوب کا رستہ ہی نہیں ملا بلکہ رستہ سے الٹا جا رہا ہے اس کی حیرت تو حیرت مذمومہ ہے اور ایک حیرت وہ ہے جس کا منشا کثرت علوم ہو کہ محبوب کا پتہ تو لگا لیا ہے رستہ پر چل رہا ہے مگر کسی تجلی کے تواتر سے حیران ہو گیا ہے اُسی کو فرماتے ہیں ؎

گہ چنیں بنماید و گہ ضد ایں   جز کہ حیرانی نباشد کار دیں

(کبھی یہ دکھلاتے ہیں۔ کبھی اس کی ضد سوائے حیرانی تجلیات میں کچھ نہیں ہے)

آگے بعض دوسری اقسام کی طرف اشارہ فرماتے ہیں ؎

نے چنیں حیراں کہ پشتش سوئے دوست   بل چنیں حیراں کہ رویش روئے دوست
آں یکے حیراں کہ رویش سوئے دوست   واں دگر حیراں کہ رویش روئے دوست

(نہ ایسے حیران کہ دوست کی طرف پیٹھ کئے ہوئے ہوں بلکہ ایسے حیران ہیں تو جان کی محبوب کی طرف ہے وہ ایک ایسا حیران ہے کہ منہ اس کا دوست کی طرف ہے وہ دوسرا ایسا حیران ہے اس کا مُنہ دوست کے چہرہ کی طرف ہے)

خلاصہ مجموعہ اشعار کا یہ کہ جس کے کان میں حق تعالےٰ معما فرماتے ہیں اس کو ایسی حیرت ہو جاتی ہے جیسے کوئی عاشق محبوب کا چہرہ دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے اور غیر سالک کو یا اُس سالک کو جو شریعت کے خلاف سلوک طے کر رہا ہے جو پریشانی پیش آتی ہے وہ حیرت مذمومہ ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ پشتش ہوئے دوست۔ کہ محبوب کی طرف پشت ہونے کی وجہ سے پریشان ہے۔ پس جو سالک

شریعت کے موافق چل رہا ہو اُس کو کسی حالت سے پریشان نہ ہونا چاہیئے عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

در طریقت ہرچہ پیش سالک آید خیر اوست   بر صراط مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

(جو کچھ طریق عشق میں سالک پیش آئے وہی اس کے لئے بہتر ہے صراطِ مستقیم اے دل کوئی گمراہ نہیں ہے)

صراط مستقیم سے شریعت مراد ہے اگر سالک کسی معصیت میں مبتلا نہ ہو تو پھر قبض ہو یا بسط ہر حال میں راضی رہے پریشان نہ ہو۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

چونکہ قبضے آیدت اے راہرو   آن صلاح تست آیس دل مشو
چونکہ قبض آمد تو در وے بسط بیں   تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں

(جب تجھ کو اے سالک حالت قبض پیش آئے وہ تیری اصلاح ہی کے لئے ہے۔ جب تجھ پر حالتِ قبض طاری ہو تو اس میں بسط کا ملاحظہ کر خوش و خرم رہو پیشانی پر جھری مت ڈال یعنی رنجیدہ نہ ہو)

ہاں احتیاطاً کثرت استغفار قبض کی حالت میں کر لینی چاہیئے۔ ممکن ہے کہ یہ قبض کسی ظاہری یا باطنی گناہ سے آیا ہو تو استغفار سے اس کا تدارک ہو جاویگا۔

ہرچہ بر تو آید از ظلمات و غم   آں ز بیباکی و گستاخی ست ہم
غم چو بینی زود استغفار کن   غم بامر خالق آمد کار کن

(جو کچھ تجھ کو ظلمات اور غم والم پیش آتے ہیں وہ تیری بے باکی اور گستاخی سے آتے ہیں جب کوئی غم پیش آئے تو فوراً استغفار کر غم حق تعالیٰ شانہ سے کار کن ہو کر آیا ہے)

مولانا تو محقق ہیں اس لئے ذرا دھیمی طرح تسلی فرماتے ہیں مگر جو آزاد ہیں وہ کان کھول کر دو ٹوک بات کہتے ہیں چنانچہ سرمد آزاد اُن لوگوں کو خطاب کر کے کہتے ہیں جو قبض و بسط کے تعاقب سے پریشان ہوتے اور اپنے لئے ہمیشہ بسط ہی رہنا تجویز کرتے ہیں ؎

سرمد گلہ اختصار می باید کرد — یک کار ازین دو کار می باید کرد
یا تن برضائے دوست می باید داد — یا قطع نظر زیار می باید کرد
(سرمد گلہ شکوہ کم کرو دو کاموں میں سے ایک کام کرو یا تو جان وتن
محبوب کی رضا میں دیدو یا دوست سے قطع تعلق کرلو)

یعنی یہ کیا روز روز کی شکائتیں لئے پھرتے ہو بس سُن لو کہ یہ محبوب تو ایسا ہی ہے جو کبھی تم کو خوش کرے گا اور کبھی رُلائے گا اب دو باتوں میں سے ایک بات کرو یا تو جان وتن اس پر نثار کردو اور جس حال میں وہ رکھے اس پر راضی رہو ورنہ پھر ایسے محبوب ہی کو چھوڑ دو کیونکہ وہ تمہاری مرضی کا تابع نہ ہوگا اپنی مرضی کا تابع بنانا چاہتا ہے اگر اُس کی محبت کا دعوٰی ہے تو بس چپکے چپکے پڑے رہو کان نہ ہلاؤ ورنہ جاؤ اُس کو چھوڑ کر کسی دوسرے محبوب کو تلاش کرلو۔ واقعی سُنار کی کھُٹ کھُٹ لوہار کی ایک پورا علاج ان لوگوں کا حضرت سرمد نے کیا ہے۔ مولانا کے سمجھانے سے تو سیدھے نہ ہوئے تھے اب سب درست ہوگئے بس طالب کا مذاق تو وہ ہونا چاہیئے جیسا حضرت سعدی نے ایک بزرگ کا قصہ بیان فرمایا ہے۔

کہ ایک رات وہ تہجد کے لئے اٹھے تو ندا آئی کہ تو کچھ بھی کرتا رہ یہاں کچھ قبول نہیں۔ اور ندا بھی اُس زور سے آئی کہ ان بزرگ کے ایک مرید نے بھی سُن لی خیر اُس رات تو نماز پڑھ کر لیٹ رہے اگلی رات ہوئی تو پھر وہ اپنا بوریہ بدھنا لے کر اٹھے مرید نے کہا کہ حضرت ایسی بھی کیا بے غیرتی ہے کہ وہاں تو کچھ قبول نہیں ہوتا اور آپ پھر پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ شیخ نے جواب دیا کہ برخوردار یہ تو سب کچھ ہے کہ میرا عمل وہاں قبول نہیں مگر تم مجھے یہ بتلادو کہ پھر اس در کو چھوڑ کر جاؤں کہاں کوئی اور در بھی تو نہیں جہاں چلا جاؤں۔ میں تو اسی در پر پڑا رہوں گا قبول یا ناقبول سے مجھے کیا بحث ؂

توانی ازاں دل بپرداختن — کہ دانی کہ بے او تواں ساختن
(اس سے دل اٹھا سکتا ہے کہ بغیر اس کے کسی دوسرے سے موافقت کرلیگا)

اس جواب پر جس میں عبدیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی رحمت کو جوش ہوا اور ندا آئی ؎

قبول است گرچہ ہنر نیستت کہ جز ما پناہے دگر نیستت

کہ جاؤ قبول کر لیا گو ہنر تو کچھ نہ تھا مگر یہ دیکھ کر رحم آگیا کہ ہمارے سوا تیری پناہ کسی جگہ نہیں بس عاشق کو تو ایسا ہونا چاہیئے کہ وہ سچ مچ بھی رد کردیں جب بھی لپٹا ہی رہے سعدی فرماتے ہیں ؎

اگر دعوتم رد کنی در قبول من و دست و دامانِ آلِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)

(اگر مری دعا، رد کردیا قبول کرو میں ہوں اور میرا ہاتھ اور آلِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دامن)

پھر کیا ایسے کو قبول نہ کریں گے جو رد پر بھی راضی ہو ضرور قبول کریں گے مگر وہ کبھی اپنے عشاق کا امتحان لیا کرتے ہیں کہ دیکھیں ان کا عشق کس درجہ کا ہے یہ ہمارے رد کرنے پر بھی لپٹے رہتے ہیں یا چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں تو کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ حق تعالیٰ امتحان بھی نہ کریں عاشق کو اس چاہنے کا کوئی حق نہیں۔

صاحبو! عشاق تو رد کرنے پر بھی نہیں گھبرائے آپ صرف قبض و بسط ہی سے گھبرا گئے تعجب ہے بس اگر طالب ہو تو کام میں لگے رہو اس کی پروا نہ کرو کہ ذکر میں دل لگتا ہے یا نہیں لگتا ہمارے حاجی صاحب سے جو کوئی کہتا کہ حضرت ذکر سے نفع نہیں ہوتا تو آپ جوش کے ساتھ فرماتے کہ کیا یہ نفع کچھ کم ہے کہ تم ذکر تو کرتے ہو پھر فرماتے ؎

یابم اورا یا نہ یابم جستجوئے می کنم حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم

(اس کو پاؤں یا نہ پاؤں اس کی جستجو کرتا ہوں ملے یا نہ ملے آرزو کرتا ہوں)

غرض سالک کو ہر حال میں راضی رہنا چاہیئے (اس موقع پر عصر کی اذان ہوگئی تو فرمایا کہ) بس اب میں اس بیان کا خلاصہ کرکے ختم ہی کرنے والا ہوں۔

خلاصہ سارے بیان کا یہ ہوا کہ واقعہ معراج سے ہماری دو غلطیوں کا ازالہ ہوا ایک تو یہ کہ ہم لوگ مقاماتِ انبیا میں کلام کرتے ہیں سو ہم کو ایسا نہ کرنا چاہیئے تم کبھی اپنے قیاس سے یہ نہ کہو کہ فلاں نبی کا یہ مقام تھا اور یہ مقام دوسرے نبی کو حاصل نہ تھا تم کو انبیاء کے مقامات کی کیا خبر جو تم یہ فیصلے کرنے چلے ہو اس کی وہی مثال ہے کہ لومڑی

شیروں کا فیصلہ کرے اور اسی کا ضمیمہ یہ بھی ہے کہ اولیاء کے مقامات میں بھی گفتگو نہ کرو کیونکہ انبیاء کی طرح اولیاء کے مقامات بھی مختلف ہوتے ہیں آجکل لوگ اس مرض میں بہت مبتلا ہیں ایک کہتا ہے کہ میرے پیر کا تہجد کبھی ناغہ نہیں ہوتا جاڑے ہوں یا گرمی سفر ہو یا حضر ہمیشہ اپنے معمولات کو بخوبی پورا کرتے رہتے ہیں دوسرے کے پیر میں یہ کمال نہیں اُس کے معمولات کبھی ناغہ بھی ہو جاتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ میرے حضرت کو خدا تعالیٰ کی طرف ایسی توجہ دائم رہتی ہے کہ اس میں کبھی فرق نہیں آتا ان کو معمولات ظاہری سے معمولات قلبیہ کا زیادہ اہتمام ہے غرض کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ کہتا ہے یہ سب خرافات ہے بس جس سے جس کو نفع ہو رہا ہو اس سے لگا لپٹا رہے تم کو تفضیل کے لئے کس نے کہا ہے سالکین کو مقامات اولیاء میں کبھی کلام نہ کرنا چاہیئے۔ دوسرا سبق یہ حاصل ہوا کہ سالک اپنے کسی غیر اختیاری حال کو برا نہ سمجھے بشرطیکہ شریعت پر مستقیم ہو شریعت پر استقامت کے ساتھ جو حال بھی پیش آئے اس پر راضی رہے اور سب کو عروج و نزول پر محمول کرتا رہے یعنی کوئی حال عروج ہے کوئی نزول ہے اور دونوں نعمت ہیں۔ بس اب میں ختم کرتا ہوں اور اس وعظ کا نام الرفع والوضع تجویز کرتا ہوں کیونکہ اس میں معراج کی حقیقت عروج و نزول ہی بھلائی گئی ہے اور وضع و رفع کے بھی یہی معنی ہیں۔ اس کے بعد دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائے اور عمل کی توفیق دیں آمین۔ والحمد للہ رب العالمین و صلی اللہ علی سیدنا و مولانا محمد خیر خلقہ وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔

نوٹ

ممبر سے اتر کر حضرت مولانا نے فرمایا کہ یہ وعظ جلدی صاف ہو جاوے تو اچھا ہے بحمد اللہ حسب ارشاد آج ۲۴ر رجب ۱۳۴۲ھ کو اس کی تسویہ تفصیلی تمام ہوئی۔ اے اللہ اس ناکارہ کو بھی ان برکات سے متمتع فرما جن کا ذکر اس بیان میں ہوا ہے۔ آمین بحرمۃ سید المرسلین و اولیاء امتہ اجمعین ۱۲ جامع

تمت

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلۂ التبلیغ کے ۱

وعظ مسمّٰی بہ

اَلْمُرَادُ

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: عبد المنان غفرلہ

مکتبۂ تھانوی ـــــ دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱
ایم۔ اے جناح روڈ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلمُرَادُ[لہ]

مُلقّب بــــہ

تمییز المرغوبة من المرھوبة

این	متیٰ	کم	کیف	لم	ماذا	من ضبط	المستمعون	اشتتات
کہاں	کب	کس قدر	کس طرح	کیوں	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی مقدار	متفرقات
جامع مسجد مراد آباد	۵ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۳۴ھ جمعہ	۲ گھنٹہ ۵ منٹ	کھڑے ہوکر	.	ارادہ کا بیان تھا	ظفر احمد تھانوی	۵۰۰۰ تقریباً	کچھ بیان نماز جمعہ کے قبل ہوا اور کچھ بعد میں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئاتِ اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم۔ امّا بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَہٗ

[لہ] یہ نام تو مناسبت نام شہر کے اور خصوصیت مضمون کے ہے کہ اس میں ذکر ہے دنیا کے مراد بنانے اور آخرت کے مراد بنانے کے آثار و احکام کا اور لقب مناسبت ایک لڑکی کے نام کے ہے جس کے نکاح کی تقریب میں اُس وقت مراد آباد جانا ہوا تھا گویا لقب اس عقد کی تاریخی یادگار بھی ہے ۱۲ منہ

(پرنٹنگ محل کراچی)

(ان شاء اللہ باقی آئندہ)

فِیْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِیْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ یَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝ وَمَنْ
اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰی لَهَا سَعْیَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْیُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ كُلًّا
نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝ اُنْظُرْ
كَیْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ ؕ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِیْلًا ۝

(جو شخص دنیا کے نفع) کی نیت رکھے گا ہم ایسے شخص کو دنیا میں جتنا چاہیں گے جس کے واسطے چاہیں گے فی الحال ہی دیدیں گے پھر ہم اس کے لئے جہنم تجویز کریں گے وہ اس میں بدحال راندہ درگاہ ہوکر داخل ہوگا اور جو شخص آخرت کے ثواب کی نیت رکھے گا اور اس کے لئے جیسی سعی کرنی چاہیئے سعی بھی کرے گا بشرطیکہ وہ شخص مومن بھی ہو سو ایسے لوگوں کی یہ سعی مقبول ہوگی آپ کے رب کی اس عطا دنیوی میں سے تو ہم ان کی بھی امداد کرتے رہتے ہیں اور آپ کے رب کی یہ عطاء دنیوی کسی پر بند نہیں۔ آپ دیکھ لیجئے ہم نے ایک کو دوسرے پر کس طرح فوقیت دی ہے اور البتہ آخرت درجوں کے اعتبار سے بھی بہت بڑی ہے۔

یہ تو سب صاحبوں کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ کچھ حصہ وعظ کا نماز سے پہلے ہوگا اور کچھ بعد میں وجہ اس کی یہ ہوئی کہ جامع مسجد میں نماز جمعہ دیر سے ہوتی ہے اگر بعد نماز بیان شروع کیا جاتا تو وقت میں گنجائش کم ہوتی کیونکہ مجھے آج ہی ۵ بجے کی ریل سے جانا بھی ہے بعض دوستوں کی یہ رائے بھی ہوئی کہ نماز کا وقت مقدم کر دیا جائے مگر میں نے اس کو مناسب نہ سمجھا کیونکہ اس صورت میں بعض لوگوں کی نماز فوت ہونے کا اندیشہ تھا چنانچہ اب تک بھی نمازی سب نہیں آئے اس لئے یہی مناسب معلوم ہوا کہ وعظ کا وقت متجزی کر دیا جائے کچھ بیان نماز سے پہلے ہو جائے اور بقیہ نماز کے بعد پورا کر دیا جائے۔ اس وقت جو آیتیں میں نے تلاوت کی ہیں سب کا بیان کرنا مدنظر بھی نہیں مقصود صرف اول کی دو آیتوں کی بابت کچھ عرض کرنا ہے ان دونوں آیتوں میں حق تعالیٰ شانہ نے دو ارادوں کا ذکر فرمایا ہے ایک ارادہ دنیا دوسرے ارادۂ آخرت اور ساتھ دونوں کے ثمرات بھی مذکور ہیں یہ مضمون اگرچہ بارہا کانوں میں پڑا ہوگا مگر اب تک اس کو سرسری طور سے سنا گیا اور یہی وجہ ہے اس کے مؤثر نہ ہونے کی کیونکہ اگر مؤثر ہوا ہوتا تو اس کے علامات وآثار موجود ہوتے اس

وقت اس مضمون کو اسی لئے اختیار کیا گیا ہے کہ جو اثر اس کا ہونا چاہیئے تھا وہ ابھی تک نہیں ہوا اور اس کے ضروری ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا اس لئے اس کو بیان کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی درخواست کی جاتی ہے کہ اس کو سرسری نہ سمجھا جاوے اور مثل سابق بیانات کے اس کو بے توجہی سے نہ سنا جائے کیونکہ اس طرح سننا نہ سننا برابر ہے کسی مضمون کا کانوں میں پہنچنا اس کا نام نہیں ہے کہ اس کو بے توجہی کے ساتھ سن لیا جائے کیونکہ قرآن شریف میں کفار کے بارہ میں جابجا ارشاد ہے کہ یہ قرآن کو سنتے نہیں بہرے ہیں حالانکہ آواز تو ان کے بھی کانوں میں پہونچتی تھی بلکہ سننا اس کا نام ہے کہ مضمون سن کر اس میں تدبر کیا جائے پھر عمل کیا جائے سورہ صٓ میں صاف صاف مذکور ہے کہ ہم نے قرآن تدبر و تذکر ہی کے واسطے نازل کیا ہے قَالَ تَعَالٰی کِتَابٌ اَنْزَلْنَاہُ اِلَیْکَ مُبَارَکٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِہٖ وَلِیَتَذَکَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (یہ کتاب بابرکت ہے جس کو ہم نے آپ پر اس واسطے نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں تاکہ اہل فہم نصیحت حاصل کریں) اور بھی جابجا قرآن شریف میں تدبر نہ کرنے کی شکایت ہے اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ (یہ لوگ قرآن پاک میں کیوں تدبر نہیں کرتے) ہم لوگوں میں بڑی کمی یہ ہے کہ قرآن شریف میں تدبر نہیں کرتے اس کا مطلب لوگ یہ سمجھے ہوں گے کہ ترجمہ قرآن دیکھنا چاہیئے مگر صرف اتنا کافی نہیں کیونکہ جو لوگ ترجمہ کے ساتھ قرآن پڑھتے ہیں ان میں بھی یہ کمی موجود ہے کہ وہ تدبر نہیں کرتے اور محض سرسری طور پر اس کو پڑھ جاتے ہیں اب آپ کہیں گے کہ پھر کیا مطلب ہے کیا سب مسلمانوں کو مولوی بن جانا چاہیئے نہیں صاحبو! میں آپ کو مولوی بننے کی صلاح نہیں دیتا بلکہ مقصود یہ ہے کہ قرآن میں سے جو ضروری حصہ عمل کے لئے علما نے مدون کر دیا ہے جس کا نام علم عقائد و علم اخلاق و علم فقہ ہے آپ لوگ اس میں توجہ نہیں کرتے قرآن میں تدبر کرنے کے یہی معنی نہیں کہ قرآن سامنے رکھ کر ہی اس میں غور کیا جائے بلکہ یہ بھی تدبیر فی القرآن میں داخل ہے کہ جن کتابوں میں مضامین قرآن مذکور ہیں ان میں غور و محنت سے کام لیا جائے اب آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ مسلمانوں میں ترجمہ نہ جاننا کوئی کمی نہیں کیونکہ ترجمہ قرآن ہر شخص نہیں جان سکتا اس لئے کہ ہر شخص کو مولوی بننا تو دشوار ہے اور جو طریقہ مشہور ترجمہ دیکھنے کا ہے کہ قرآن مترجم لے کر دیکھ لیا اس کو میں خیر خواہی سے کہتا ہوں کہ یہ طریقہ ناکافی ہے اس کو چھوڑ دیا جائے۔ ترجمہ اردو کا مطالعہ بھی میں سچ کہتا

ہوں کہ بجز عالم کے کسی کا کام نہیں بہت سے واقعات ایسے پیش آتے ہیں کہ ترجمہ دیکھنے والوں کو بہت سے مضامین کا سمجھنا دشوار ہو گیا۔ کیونکہ بہت سے مضامین کا سمجھنا مبادی پر موقوف ہوتا ہے اور مبادی قرآن صرف و نحو و بلاغت و ناسخ و منسوخ و اصول و فقہ وغیرہ ہیں جب تک کوئی شخص مبادی سے جاہل ہے وہ ان مضامین کو کس طرح سمجھ لے گا جو کہ اُن پر موقوف ہیں۔

پھر مصیبت یہ ہے کہ آجکل پوچھنے کی عادت بھی لوگوں میں کم ہے اگر کہیں شبہ پڑتا ہے تو اکثر تو اپنی رائے سے اس کا مطلب تراش لیتے ہیں جس سے اکثر عقیدے فاسد ہو جاتے ہیں مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ عوام کو مضامین قرآن سے فیضیاب ہونے کا کوئی طریقہ نہ رہا اس کا جواب ایک تو میں پہلے دے چکا ہوں کہ جو کتابیں سلیس مضامین میں لکھی گئی ہیں ان کا مطالعہ تدبر کے ساتھ کیا جائے نیز جو لوگ مضامین قرآن اور علوم حقہ اپنے وعظ میں بیان کرتے ہیں ایسے لوگوں کا وعظ غور کے ساتھ سنا جائے۔ علاوہ ازیں نفس ترجمہ قرآن سے منتفع ہونے کا بھی ایک طریقہ ہے وہ یہ کہ آج کل دو قسم کے آدمی ہیں ایک وہ جن کو تحصیل علوم کے لئے فراغت مل سکتی ہے ان کو تو چاہیئے کہ بنام خدا اول مبادی قرآن محنت سے حاصل کریں پھر ترجمہ قرآن دیکھیں۔

دوسرے وہ لوگ ہیں جن کو اس قدر فراغت نہیں میسر ہو سکتی ان کو چاہیئے کہ پہلے کسی معتبر عالم سے مشورہ کریں کہ مجھے ترجمہ قرآن کون سا لینا چاہیئے کون سا ترجمہ قرآن صحیح اور معتبر ہے اپنی رائے سے خود تعین نہ کریں لوگوں نے آج کل تراجم کے لئے خود ہی ایک معیار مقرر کر لیا ہے مگر اس معیار کا غلط ہونا میں ابھی ثابت کر دوں گا۔

مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ٹکسالی ترجمہ ہے کہ بالکل صحیح اور معتبر ہے مگر بوجہ زبان بدل جانے کے اور نیز بعض میں محاورات زبان کی رعایت نہ کرنے کے وہ پھیکے معلوم ہوتے ہیں خیر پھیکے ہوا کریں مگر جو مقبولیت ان کو حاصل ہے وہ دوسرے ترجموں کو حاصل نہیں یہ اُن حضرات کے خلوص کی برکت ہے۔ آج کل لوگوں نے عمدہ ترجمہ کا معیار یہ قرار دے رکھا ہے کہ رنگین عبارت ہو کیوں صاحبو! اگر دو حکیم ہوں جن میں سے ایک تو ماہر ہے مگر وہ نسخہ پھیکا لکھتا ہیں اور دوسرا حکیم بڑی رنگین عبارت میں لکھتا ہے مگر ماہر نہیں ہے انصاف سے بتلایئے

کہ کس کے نسخہ کی آپ قدر کریں گے ظاہر ہے کہ ماہر فن کے نسخہ کی ہر شخص قدر کریگا اور اس کے مقابلہ میں اس غیر ماہر کے رنگین نسخہ کو کوئی بھی نہ پوچھے گا اور یہی کہا جائے گا کہ ہم کو تو مقصود علاج کرنا اور دوا کا استعمال کرنا ہے اس رنگینی کو لے کر کیا پھونکیں۔

صاحبو! اگر ہم قرآن کو کتاب علاج روحانی سمجھتے تو تراجم کے اندر بھی اسی بات کو ملحوظ رکھتے کہ کونسا ترجمہ ماہر فن کا ہے کہ اس کو معتبر جان کر اس پر عمل کیا جائے اور کونسا غیر ماہر کا ہے کہ اس سے اجتناب کیا جائے اگرچہ وہ کیسا ہی رنگین کیوں نہ ہو کیونکہ مقصود تو عمل ہے اور اس میں رنگینی عبارت کو کوئی بھی دخل نہیں مگر ہم لوگ قرآن کو قصہ کہانی کی کتاب سمجھ کر دیکھتے ہیں جب ہی تو رنگین ترجموں کی قدر ہوتی ہے اگر ترجموں کے مطالعہ سے مقصود عمل ہوتا تو رنگینی پر نظر نہ ہوتی بلکہ مقصود پر نظر ہوتی۔ اگر رنگین عبارت دیکھنے کا شوق ہے تو اس کے لئے ترجمۂ قرآن کو کیوں انتخاب کیا جاتا ہے عمدہ زبان تو قصہ چار درویش کی ہے اس کا مطالعہ کر لیا کیجئے ترجمہ قرآن کو خواہ مخواہ کیوں تکلیف دی غرض صحیح معیار عمدہ ترجمۂ قرآن کا یہ نہیں جو آج کل عوام کا مذاق ہو گیا بلکہ صحیح معیار وہ ہے جو میں نے بیان کیا کہ معتبر ماہر فن کا ترجمہ لیا جاوے پھر اس کو کسی معتبر عالم سے سبقاً سبقاً پڑھ لیا جائے بدون اس کے ترجمہ دیکھنا کافی نہیں اسی طرح ترجمہ سمجھنے کے لئے محض ادب دانی بھی کافی نہیں آجکل لوگوں میں یہ بھی بڑی کوتاہی ہے کہ ان لوگوں کی بڑی قدر کرتے ہیں جو عربی میں تقریر و تحریر کر لیا کریں اور اس کو بڑا کمال سمجھتے ہیں مگر قرآن سمجھنے کے لئے محض ادب دانی کافی نہیں اور میں اس کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں اگر قانون کی کتاب ایک شاعر سے پڑھی جائے جس کی زبان بہت عمدہ ہے مگر قانون سے اس کو مس نہیں اور ایک دوسرا شخص ہے جو زبان دانی میں حصہ کم رکھتا ہے مگر قانون سے پورا واقف ہے اب اگر کتاب قانون کی کسی عبارت میں دونوں کا اختلاف ہو شاعر کچھ مطلب بیان کرے اور قانون داں وکیل کچھ اور کہے عقلاً زمانہ انصاف سے بتلائیں کہ اس صورت میں کس کا قول قابل ہوگا ظاہر ہے کہ قانون داں وکیل کے سامنے زبان داں شاعر کا قول ایک کوڑی کو بھی نہ پوچھا جائیگا زبان آجانے سے فن سہل نہیں ہو سکتا اس لئے ترجمہ پڑھنے کیلئے کسی قانون شریعت جاننے والے مولوی کو منتخب کیا جائے اور اس سے تمام ترجمہ پڑھ لیا جاوے اور یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ جب قرآن کا اردو میں ترجمہ ہو گیا ہے تو اب اس کے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے وہ تو خود ہماری زبان ہی ہے بات یہ ہے کہ ترجمہ سے صرف عربی ترکیب اور لغات حل ہو جائیں گے مگر قرآن کوئی مقامات حریری تو نہیں کہ صرف حل

ترکیب و لغات اس کے معنے سمجھنے کے لئے کافی ہو جائے قرآن میں تو بڑے بڑے علوم یعنی عقائد و تزکیہ اخلاق و فقہ مذکور ہیں جب تک ان کو نہ بیان کیا جائے اس کا مطلب حل نہیں ہو سکتا اور جو شخص ان علوم سے خود ہی واقف نہیں اور نہ کسی واقف سے پڑھتا ہے وہ اگر خالی ترجمہ دیکھے گا تو اندیشہ ہے کہ وہ مرجیہ و قدریہ کا ہم عقیدہ ہو جائیگا کیونکہ ہر فن و ہر کتاب کی خاص اصطلاحیں ہوتی ہیں جو محض ترجمہ سے بدون استاد کے بتلائے حل نہیں ہو سکتیں۔ یہ شخص قرآن کا مطلب ویسے ہی سمجھے گا جیسا کہ کسی شخص نے گلستاں کے اس شعر کا مطلب سمجھا تھا ؎

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست — در پریشاں حالیٔ در ماندگی

اس شخص نے بھی اس شعر کا محض ترجمہ دیکھا تھا کہ دوست وہ ہے کہ پریشان حالت و خستگی میں دوست کا ہاتھ پکڑے اس نے ترجمہ ہی پر عمل کیا کہ ایک روز کسی موقع پر اپنے ایک دوست کو پٹتے ہوئے دیکھا تو اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے دشمن نے اور جی کھول کر اسے پیٹا اس نے ہر چند ہاتھ چھڑائے مگر اس نے نہیں چھوڑے جب وہ خوب پٹ چکے اور مارنے والے نے بھی ہار کر چھوڑ دیا تو اس دوست کو اس پر بڑا غصہ آیا اور اُس نے اسے بہت بُرا بھلا کہا کہ ایسے وقت میں امداد تو نہ ہو سکی اور الٹا دوستی کا یہ حق ادا کیا کہ میرے ہاتھ بھی پکڑ لئے اب یہ حیران ہے کہ میں نے تو شیخ سعدی کے کہنے کے موافق دوستی کا حق ادا کیا تھا یہ خفا کیوں ہوتا ہے اور اُس سے کہا کہ بھائی میں نے تو دوستی کا حق ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کی میں نے تو وہی کیا جو گلستاں میں شیخ فرماتے ہیں دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست الخ (دوست وہی ہے جو دوست کا ہاتھ پکڑے) تو صاحبو! اس شخص نے ترجمہ میں کوئی غلطی نہیں کی تھی البتہ ایک کمی تھی کہ جائے استاد خالی ست (استاد کی جگہ خالی ہے) اس نے ترجمہ خود ہی دیکھا تھا کسی سے پڑھا نہیں تھا بس جب گلستاں سمجھنے کے لئے باوجودیکہ وہ کوئی بڑی علمی کتاب نہیں محض ترجمہ دیکھنا بعض عقلاء کو غلطی میں ڈال دیتا ہے تو قرآن کا ترجمہ دیکھنا کیونکر کافی ہو جائے گا اور اس میں غلطی کا کیوں احتمال نہ ہوگا۔ اب اگر یہ سوال کیا جائے کہ جب ترجمۂ قرآن بھی بدون پڑھے نہیں آسکتا تو ترجمہ کرنے ہی کی کیا ضرورت تھی اُس سے کیا نفع ہوا اس کا جواب یہ ہے کہ ترجمے سے نفع یہ ہوا کہ آپ کو عربی صرف و نحو لغت پڑھنے کی ضرورت نہیں رہی کیا یہ تھوڑا نفع ہے اگر ترجمہ نہ ہوتا تو پہلے صرف و نحو میں دماغ صرف کرنا پڑتا پھر کہیں برسوں کے بعد اس قابل ہوتے کہ ترجمہ قرآن سمجھ سکیں اب اتنی آسانی ہے کہ جیسا چاہو ترجمہ کسی مولوی سے شروع کر سکتے ہو یہ تھوڑا نفع ہے باقی ترجمہ کرنے والوں کا یہ ہرگز مقصود نہیں

کہ کسی سے اس کے پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ صاحبو! ذرا دنیا کے کاموں پر نظر کرو کہ ذرا ذرا سا کام بھی بدون استاد کے بتلائے نہیں آتا۔ نجاری یعنی بڑھئی کا کام ذرا کوئی بدون سیکھے کرنے لے یقیناً اپنے ہاتھ پیر کاٹ لے گا۔ حالانکہ بارہا بڑھئی کو کاٹتے چھیلتے دیکھا ہو گا وہاں کوئی نہیں کہتا کہ بس ہم نے طریقہ دیکھ لیا ہم بھی ایسے ہی کیا کریں گے۔ ان باتوں میں ساری دنیا کا اتفاق ہے کہ بھائی صرف دیکھ لینا کافی نہیں جب تک کہ باقاعدہ استاد سے نہ سیکھا جائے افسوس قرآن کو ایسا معمولی کلام سمجھا جاتا ہے کہ اس کا ترجمہ خود دیکھ لینا کافی ہو گیا۔ صاحبو! آپ کو اس سے تعجب ہو گا کہ میری عمر پچاس سال سے تجاوز ہو گئی اور لکھنے پڑھنے کا اس عرصہ میں بہت ہی کام رہا مگر آج تک قلم بنانا مجھے نہیں آیا کیونکہ کسی سے سیکھا نہیں یونہی الٹا سیدھا کاٹ چھیل کر کام چلا لیتا ہوں جب خسیس سے خسیس فن بدون استاد سے سیکھے نہیں آسکتا تو ترجمۂ قرآن کی بابت کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں بدون استاد کے سمجھ لیتا ہوں۔ اور جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں وہ اس کا امتحان اس طرح کر لیں کہ پہلے خود سارا ترجمۂ قرآن دیکھ جائیں اس کے بعد کسی عالم سے پڑھیں ان شاء اللہ تعالیٰ اس کے بعد خود ہی اپنے کو جاہل کہیں گے اور معلوم کر لیں گے کہ محض ذہین ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ تدبر قرآن کے لئے سب کو مولوی بننا ضروری نہیں بلکہ قرآن میں تدبر کی اور بھی سہل صورتیں ہیں جو بدون مولوی بنے حاصل ہو سکتی ہیں۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جب بدون ترجمہ پڑھے تدبر نہیں ہو سکتا تو قرآن کا تلاوت کرنا بھی فضول ہوا بات یہ ہے کہ فضول اور بیکار وہ ہے جس میں کوئی نفع نہ ہو اور قرآن میں منافع بہت سے ہیں ایک نفع تو بعد فہم کے اس پر عمل کرنے کا ہے دوسرا فائدہ ثواب ہے تو بدون معنی سمجھے پڑھنا فضول اس وقت ہو جب کہ اس کو ثواب بھی نہ ملے اس بات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرو آپ فرماتے ہیں کہ قرآن پڑھنے والے کو ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور میں یہ نہیں کہتا کہ آلم ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے اور لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے تو الم میں تین حرف ہوئے اس کی تیس نیکیاں ہوئیں اور بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ میں آلف اور لام اور میم میں سے ہر ایک کو ایک حرف نہیں کہتا بلکہ لفظ الف میں جو اول الف آیا ہے وہ ایک حرف ہے اور لفظ لام میں جو اول لام بولا گیا وہ ایک حرف ہے اور لفظ میم میں جو اول میم بولا گیا وہ ایک حرف ہے تو گویا آپ نے ہر حرف کے سرے کو بیان کیا ہے اور باقی کو قیاس

چھوڑ دیا اس حساب سے الٓمٓ میں نو حرف ہوئے اور اس میں نوّے نیکیاں ہوئیں تو یہ قرآن کا تھوڑا نفع ہے کہ بے سمجھے پڑھنے سے بھی ایک لفظ میں نوے نیکیاں مل گئیں اور ہمارا کچھ خرچ بھی نہیں ہوا اور یہ ثواب کوئی حرف مقطعات کے ساتھ خاص نہیں بلکہ یہ تو ایک تمثیل تھی قرآن کے ہر لفظ کا یہی ثواب ہے سورۂ فاتحہ ہم پڑھتے ہیں جہاں زبان سے الحمد نکلا تو اس میں پانچ حروف ہیں معاً پچاس نیکیاں لکھی گئیں مگر افسوس تو یہ ہے کہ ہم لوگ اس کو نفع نہیں سمجھتے مگر مر کر اس کی قدر معلوم ہوگی اس کی بعینہٖ ایسی مثال ہے کہ دو شخص مکہ مکرمہ جانے والے ہیں اور معلوم ہے کہ یہ تانبے کا پیسہ وہاں بالکل نہیں چلتا ایک نے تو تانبے کے پیسوں سے دوسرا سکہ چاندی کا جو کہ وہاں رائج ہے خرید لیا دوسرا شخص جو کہ مکہ مکرمہ کی حالت سے جاہل ہے اور اُس کو خبر نہیں کہ وہاں کس سکہ کی ضرورت ہوگی اس پر ہنستا ہے اور اس کو بے وقوف بناتا ہے اور کہتا ہے کہ جب یہ پیسہ یہاں کار آمد ہے تو وہاں بھی ضرور کام دیگا اس نے صرف پیسے ہی پیسے ساتھ باندھ لئے مگر ایک تیسرا شخص جو کہ مکہ مکرمہ ہو کر آیا ہے فیصلہ کرے گا کہ پہلا شخص بیوقوف نہیں بلکہ وہ عاقل ہے بلکہ دوسرا شخص بیوقوف ہے اُس کو اتنی بھی خبر نہیں کہ میں جہاں جا رہا ہوں وہاں کا کیا دستور ہے مگر ابھی تک اس ثالث کے فیصلہ کی کسی کو قدر نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ دونوں شخص مکہ مکرمہ پہنچے اب دونوں کی حالت میں کھلا ہوا فرق نظر آئے گا پہلا شخص جو کہ مکہ مکرمہ میں چلنے والا سکہ ساتھ لایا ہے وہ تو ہر دکان پر جاتا ہے اور بے تکلف ہر ضرورت کی چیز لے آتا ہے اور دوسرا جس کی تھیلی میں تانبے کے پیسے ہی پیسے ہیں ہر ضرورت کے وقت دوسروں کا منہ تکتا ہے اور اب اپنی حماقت پر روتا ہے کہ افسوس میں نے عقلاء کے مشورہ پر عمل نہ کیا اب یہ پیسے تو یہاں بالکل فضول ہیں میں کس طرح کھانا خریدوں کہاں سے پانی خریدوں کس طرح یہاں کے دن کٹیں گے۔ اسی طرح ان نیکیوں کی قدر ہم کو آخرت میں ہوگی کیونکہ وہیں کا سکہ ہے وہاں آپ کے یہ روپے پیسے کام نہ دیں گے اور وہاں سب کو جانا ہے اس میں کسی مسلمان کو شک نہیں ہو سکتا۔ جب بازار قیامت قائم ہوگا وہاں بھی دو قسم کے لوگ ہوں گے ایک وہ جو کہ وہاں کا سکہ یعنی نیکیاں پلے باندھ کر لائے ہیں وہ تو بے تکلف ہر قسم کی راحت حاصل کریں گے دوسرے وہ لوگ جو اپنی غفلت کی وجہ سے آخرت کو بھولے ہوئے تھے اور اس وجہ سے کچھ نیکیوں کا ذخیرہ ساتھ باندھ کر نہیں لائے اُن کا یہ حال ہوگا ؎

ے

کہ بازار چندانکہ آگندہ تر   تہیدست را دل پراگندہ تر

(بازار جس قدر رونق پر ہوتا ہے تہی دست کا دل بہت پریشان ہوتا ہے)

اس وقت آپ اُن لوگوں کی قدر کریں گے جن کو آج مولویوں کا بگاڑا ہوا کہا جاتا ہے اس دن وہ احمق جن کی حماقت پر آجکل کی نئی روشنی نے رجسٹری کردی ہے عاقل کہلائیں گے اس وقت حیرت ہوگی کہ یہ لوگ جن کو ہم لوگ ذلیل سمجھتے تھے بڑے باشوکت ہیں اور آج ہم ان کے آگے ذلیل ہیں صاحبو! وہاں بجز اعمال صالحہ کے اور کچھ کام نہ آویگا۔ اور یہ بھروسہ نہ کرنا کہ ہمارے ماں باپ بہت نیک تھے ان سے کچھ نیکیاں بٹوالیں گے وہاں کوئی کسی کے کام نہ آویگا۔ حدیث شریف میں ایک شخص کا واقعہ مذکور ہے کہ قیامت کے دن ایک شخص کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں گی اور وہاں کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر نیکیاں زیادہ ہوں تو جنتی ہے اور بدیاں زیادہ ہوں تو دوزخی ہے اور دونوں برابر ہوں تو چندے اعراف میں رکھا جائیگا اس قاعدہ کے موافق اس شخص سے ارشاد ہوگا کہ اگر ایک نیکی کہیں سے تم کو مل جائے تو جنت میں بھیجدیا جائیگا وہ شخص خوش ہوگا کہ میرے تو ماں باپ بیوی بچے دوست احباب بہت سے ہیں کسی سے ایک نیکی کا ملجانا کیا دشوار ہے چنانچہ وہ جائے گا اور جاکر باپ سے اپنی حالت عرض کریگا کہ مجھے ایک نیکی کی ضرورت ہے تم میرے باپ ہو میرے حال پر رحم کرو ایک نیکی دیدو وہ صاف جواب دیدیگا کہ یہاں ہم کو اپنی جان کی پڑی ہے تجھے ایک نیکی کیسے دیدوں ماں بھی اسی طرح جواب دیدے گی اولاد بھی ٹکا سا جواب دیدے گی دوست احباب بھی دور کی سنائیں گے آخر نہایت مایوس ہوکر لوٹیگا راستہ میں ایک شخص سخی ملیگا جس کے پاس فقط ایک ہی نیکی ہوگی وہ اس سے پوچھے گا کہ میاں پریشان کیوں ہورہے ہو کیا بات ہے وہ جواب دیگا کہ اگر میری پریشانی کا علاج ہوسکتا تو میں ظاہر بھی کرتا مگر اس کا علاج کسی سے نہیں ہوسکتا ہر اک کو اپنی جان کی پڑی ہے ظاہر کرنے سے کیا فائدہ ماں باپ اولاد اقارب دوست احباب سب جواب دے چکے تم ہی کیا کرلو گے وہ کہیگا کہ تم اپنا حال تو کہو شاید میں اس میں کچھ ساتھ دے سکوں غرض بعد کلام بسیار یہ اپنا حال کہیگا کہ مجھے ایک نیکی کی ضرورت تھی وہ شخص جواب دے گا کہ میرے پاس کل ایک نیکی ہے تو وہ میرے وہ کسی کام کی بھی نہیں کیونکہ گناہ بہت زیادہ ہیں تو جہنم میں جاؤں گا یہ نیکی ہوئی تو کیا نہ ہوئی تو کیا لے یہ نیکی تو ہی لیجا تیرے ہی کام آجائے گی یہ

شخص حیران ہوگا کہ یا اللہ یہ کون سخی ہے جو اس طرح بے خطر اپنی نیکی دے رہا ہے صاحبو! وہاں بھی یہ اہل دل ہی سخاوت کریں گے اور یہی مخلوق پر رحم کریں گے ماں باپ کچھ کام نہ آویں گے غرض یہ شخص خوش ہوکر وہ نیکی لیکر لوٹے گا اور دربار الٰہی میں پیش کردے گا وہ تو بموجب اُس قاعدہ کے بخشدیا جائے گا کیونکہ نیکیاں غالب ہوگئیں. اس کے بعد ان سخی صاحب کو بلایا جائیگا کہ تم نے یہ کیا کیا اپنی نیکی دوسرے کو دیدی کیا تم کو اپنی نجات کی فکر نہیں. وہ عرض کریگا کہ الٰہی میرے پاس صرف ایک ہی نیکی تھی میں جانتا تھا کہ قاعدہ کے موافق تو میں جہنمی ہوں اور یہ نیکی میرے کارآمد نہیں ہوسکتی البتہ اگر حق تعالیٰ اپنے فضل سے بخشدیں تو اور بات ہے مگر جب میری بخشش صرف فضل حق پر موقوف ہے اور میں اپنے عمل سے نہیں بخشا جا سکتا تو اس غریب کی بھی کیوں امید توڑی میں نے وہ نیکی اس مسلمان بھائی کو دیدی کہ اُس کی تو مغفرت ہوجائے گی میرا معاملہ رحمت حق کے سپرد ہے. وہ شخص اس سخاوت پر بخشدیا جائے گا.

صاحبو! وہ عجیب دربار ہے وہاں ذرا ذرا سی بات پر بخشش ہوجاتی ہے ایک اور شخص کا قصہ حدیث میں آیا ہے کہ اس کے پاس کوئی نیکی نہ تھی صرف ایک یہ نیکی تھی کہ اس نے ایک دن راستہ میں سے کانٹا ہٹا دیا تھا جو ظاہر ہے کہ بہت ہی ذرا سی بات ہے مگر حق تعالیٰ کے یہاں اس کی بھی قدر ہوئی اور اُس کو اسی بات پر بخشدیا گیا۔ صاحبو! نیک کام کو چاہے کتنا ہی ذرا سا ہو حقیر نہ سمجھو بعض دفعہ ذرا سی بات قبول ہوجاتی ہے اور بڑے بڑے عمل جن پہ ناز تھا رکھے رہجاتے ہیں۔

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ جب اُن کا انتقال ہوا تو کسی دوسرے بزرگ کو کشف ہوا یا خواب میں دیکھا کہ اُن سے سوال ہو رہا ہے کہ ہمارے واسطے کیا عمل لے کر آئے ہو انھوں نے جواب دیا کہ اور تو کچھ نہیں توحید لیکر آیا ہوں ارشاد ہوا جھوٹا ہے توحید بھی تیری درست نہیں اُذْکُرْ لَیْلَۃَ اللَّبَنِ دودھ والی رات کا قصہ یاد کرو دودھ والی رات کا قصہ یہ ہوا تھا کہ ایک روز دودھ پینے سے پیٹ میں درد ہوگیا تھا تو انھوں نے کسی سے یہ کہا کہ دودھ سے درد ہوگیا تو یہ باز پرس ہوئی کہ تم نے دودھ کو موثر قرار دیا حالانکہ موثر ہم ہیں یہ کیسی توحید ہے جب توحید بھی غلط ثابت ہوئی تو وہ بزرگ بہت پریشان ہوئے پھر ارشاد ہوا کہ تم اپنے قول کے مطابق دوزخ کے مستحق ہوچکے کیونکہ تمھارے اقرار میں تمھارے پاس صرف ایک نیکی تھی اور وہ بھی غلط ثابت ہوئی اب سنو ہم تم کو کس بات پر بخشتے ہیں ایک رات کو تم نے ایک بلی کے بچہ کو سردی میں کانپتا دیکھا تھا اور تم نے اس پر رحم کھا کر لحاف ڈالدیا تھا جس پر اس نے تمکو دعا دی وہ دعا اُس بلی کے بچے کی ہم نے

قبول کرلی اور تم کو اس کی دعا پر بخشا جاتا ہے یہ بھی ایک عمل تھا مگر کبھی حق تعالیٰ بدون عمل کے صرف ظاہری صورت پر بخش دیتے ہیں چنانچہ ایک بزرگ ہیں قاضی یحییٰ بن اکثم جو بخاریؒ کے شیخ ہیں ان کو کسی نے خواب میں دیکھا کہ ان سے سوال ہو رہا ہے اور عتاب آمیز سوال ہو رہا ہے اور وہ چپ خاموش کھڑے ہیں جب عتاب ہو چکا تو انھوں نے عرض کیا کہ میں تو حدیث میں پڑھا کرتا تھا کہ اِنَّ اللّٰہَ یَسْتَحِیْ مِنْ ذِی الشَّیْبَۃِ الْمُسْلِمْ کہ حق تعالیٰ شانہ بوڑھے مسلمان سے حیا فرماتے ہیں اور اس کو بخش دیتے ہیں مگر یہاں تو معاملہ برعکس معلوم ہوتا ہے اس پر ارشاد ہوا کہ جاؤ اگرچہ نیکی کچھ نہیں مگر تمھارے بڑھاپے پر رحم کرکے تم کو بخشا جاتا ہے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ کہا ہے بیشک ہم کو بوڑھے آدمی پر رحم آتا ہے اسی کو شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

دلم میدہد وقت وقت ایں امید کہ حق شرم دارد ز موئے سفید

(دل میرا ہر وقت امید دلاتا ہے کہ حق تعالےٰ شانہ سفید بالوں سے شرم رکھتے ہیں)

اس سے زیادہ حیرت انگیز دوسری حکایت ہے کہ یہاں تو قاضی یحییٰ بن اکثم واقعی بوڑھے تھے ایک مسخرہ جوان کی حکایت ہے کہ جب مرنے لگا تو اس کو اپنی حالت پر خوف تھا کیونکہ عمل صالح کچھ نہ کیا تھا اس نے یہ وصیت کی کہ جب مجھ کو غسل وکفن دے چکو تو میری داڑھی پر ذرا سا آٹا چھڑک دینا چنانچہ ورثہ نے وصیت پوری کی اس کو کسی نے خواب میں دیکھا کہ اس سے سوال ہوا کہ تو نے یہ وصیت کیوں کی تھی اس نے عرض کیا کہ یا اللہ میرے پاس عمل تو کچھ تھا نہیں اس لئے اپنی حالت پر اندیشہ تھا اور یہ حدیث میں نے سنی تھی اِنَّ اللّٰہَ یَسْتَحِیْ مِنْ ذِی الشَّیْبَۃِ الْمُسْلِمِ کہ خدا بوڑھے مسلمان سے شرماتا ہے قسمت سے میں بوڑھا بھی نہ تھا اور نہ بوڑھا بننا اپنے اختیار میں تھا۔ تو میں نے یہ وصیت کی کہ میرے بالوں میں آٹا لگا دینا کہ بوڑھوں کی سی صورت تو ہو جاوے بس اتنی بات پر وہ شخص بخش دیا گیا۔ سچ کہا ہے ؏ رحمت حق بہانہ می جوید۔ (اللہ تعالیٰ کی رحمت بہانے ڈھونڈتی ہے) یہ تو حکایتیں اہل کشف کی ہیں جو خود حجت شرعیہ نہیں مگر حدیث میں بھی تو ان کی اصل موجود ہے۔ چنانچہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص کو صرف راستہ میں سے کانٹا ہٹا دینے پر بخش دیا گیا جب ان کی اصل حدیث میں موجود ہے تو پھر ان کشفیات کو بھی تائید میں بیان کرنا صحیح ہو گیا کیونکہ کشف کا بھی حکم ہے کہ اگر حدیث و قرآن کے موافق ہو تو قبول ہے ورنہ رد ہے۔

(یہاں تک بیان نماز جمعہ سے پہلے ہوا اس کے بعد حضرت مولانا نے نماز جمعہ پڑھائی بعد نماز کے پھر منبر

پر رونق افروز ہوئے اور فرمایا ۱۲ جامع) الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم **اما بعد** میں اس بات کو بیان کر رہا تھا کہ نیکیوں کی قدر ہم کو وہاں جا کر ہوگی اس لئے کہ یہ آخرت ہی کا سکہ ہے وہیں اس کا کار آمد ہونا معلوم ہوگا یہاں تو نیکیوں پر کوئی رقم نہیں ملتی اس لئے لوگوں کو اس کی قدر نہیں ہوتی مگر مرنے کے بعد سب کو قدر معلوم ہو جائے گی اور میں احادیث سے اس بات کو ثابت کر دیا تھا کہ وہاں ذرا ذرا سی نیکی بھی کار آمد ہے جس کی آج ہم کو قدر نہیں ہوتی۔ اس سے ثابت ہوا کہ قرآن کا بے سمجھے ہوئے پڑھنا بھی بیکار نہیں کیونکہ اس کے ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں تو ایسی چیز بیکار کیونکر ہو سکتی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف تلاوت کر لینا کافی ہے فہم معنی کی ضرورت نہیں ورنہ شاید کوئی حافظ صاحب خوش ہو جاتے کہ بس ہم مولویوں سے بھی بڑھ گئے سو یہ خیال صحیح نہیں کیونکہ اگرچہ الفاظ قرآن پر اس قدر ثواب ملتا ہے مگر ظاہر ہے کہ مقصود صرف یہی ثواب الفاظ کا تو نہیں بڑا مقصود یہی ہے کہ معنے کو سمجھ کر اس کے موافق عمل کرنا اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ صرف ترجمہ بھی کافی نہیں جب تک کہ اس میں تدبر نہ ہو کیونکہ سمجھنا یہی ہے جس پر اصل مقصود یعنی عمل موقوف ہے اسی طرح ان آیتوں کا مضمون بھی اگرچہ کان میں پڑا ہوا ہے مگر جب تک کہ تدبر نہ ہو وہ سننا مفید نہیں ترجمہ قرآن تو کفار بھی سمجھ جاتے تھے اور ہم سے زیادہ سمجھتے تھے مگر ان کو کچھ نفع ہوا کچھ بھی نہیں کیونکہ اس میں تدبر نہیں کیا تھا جس پر عمل مرتب ہوتا سرسری طور پر سنا گیا تھا اس لئے اس مضمون کو اہتمام سے دوبارہ اس لئے بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں تدبر کیا جاوے اور اس کے موافق عمل کرنے کی کوشش کی جاوے۔ اب وہ مضمون سنئے ان آیتوں میں جن کو میں نے تلاوت کیا تھا ایک بہت بڑی چیز کا ذکر ہے اگرچہ وہ بظاہر چھوٹی معلوم ہو یعنی اس میں دنیا اور آخرت کے ساتھ راد کو متعلق کرنے کا ثمرہ بتلایا گیا ہے کہ دنیا کا ارادہ کیا جائے تو اس کا کیا ثمرہ ہے اور آخرت کا ارادہ کیا جائے تو اس کا کیا نفع ہے ہراک کو الگ الگ حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے غرض ان آیتوں میں ارادہ کا ذکر ہے اس امر کی تعیین کے بعد آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ واقعی یہ ایسی چیز ہے جس کو ہم بہت ہی معمولی اور سرسری سمجھتے ہیں مگر یہ سرسری چیز ایسی ہے جیسے گھڑی کی بال کمانی کہ دیکھنے میں تو ذرا سی چیز ہے مگر گھڑی

کے چلنے کا دارومدار اسی پر ہے اور وجہ اس بے قدری کی یہ ہے کہ ارادہ ایک موجود غیر حسی ہے اس لئے ہم کو اس کی قدر نہیں مگر واقع میں فکر وارادہ وہ چیز ہے جس کے ترک کر دینے سے ہمارے سب حال بگڑ گئے اور بہت سے اللہ والوں کے حالات ومقامات اس کی بدولت درست ہوگئے۔ صاحبو! ارادہ بہت بڑی چیز ہے اس کو حقیر نہ سمجھا جاوے دنیا کے بھی سارے کام اس کی بدولت چلتے ہیں یہ بہت بڑی قوت ہے جو انسان میں رکھی ہوئی ہے ایک مثال سے آپ اس کو واضح طور پر سمجھ سکتے ہیں فرض کیجئے کہ ایک شخص کو جاڑے کے موسم میں اس حالت میں کہ بارش بھی ہورہی ہے اور سردی بہت ہورہی ہے گھر کے اندر بیٹھے بیٹھے پیاس معلوم ہوئی اور پیاس بہت شدید معلوم ہوئی مگر بوجہ تند ہوا کے باہر آنے کی ہمت نہیں ہوتی اس درمیان میں اس کے پاس حاکم کا حکم پہونچا کہ اسی وقت فلاں جگہ جو کہ شہر سے بہت فاصلہ پر ہے ہم سے آکر ملو اب غور کیجئے کہ یا تو یہ شخص اس سردی کی حالت میں اندر سے صحن تک بھی نہیں آسکتا تھا اب وہ کون چیز ہے جو اس کو گھر کے اندر سے صحن تک اور صحن سے گھر کے باہر اور وہاں سے شہر کے باہر کئی میل تک بارش اور سردی میں لے جاتی ہے وہ صرف قوت ارادہ ہی ہے کہ پہلے ارادہ نہ ہوا تھا کیونکہ پیاس کوئی قوی محرک نہ تھی اور اب ارادہ ہوگیا کیونکہ حکم حاکم بوجہ کسی قسم کی رغبت کے یا رہبت کے قوی محرک ہے جس نے اس کی قوت ارادہ کو حرکت دیدی ہے اور یہ کمل لیکر تمام مصائب کو برداشت کرتا ہوا حاکم تک جا پہنچتا ہے۔ اب ارادہ کی قوت معلوم کر کے جانو کہ ارادہ فی نفسہ نہ کوئی بری شے ہے نہ اچھی یہ اپنے حسن وقبح میں موقوف ہے اپنے مضاف الیہ پر یعنی مراد پر اگر اچھے کام کا قصد کیا جائے تو وہ ارادہ عمدہ ہے اور برے کام کا قصد کیا جائے تو وہ ارادہ برا ہے اچھے ارادہ پر ثواب ملے گا اور برے ارادہ پر اگر پختہ ارادہ ہو جاویگا گناہ لکھا جائیگا اس سے بھی ارادہ کی عظمت معلوم ہوگئی کیونکہ کسی عمل پر جزا و سزا بدون ارادہ کے مرتب نہیں ہوتی اور ارادہ پر بدون عمل کے بھی گناہ وثواب لکھا جاتا ہے اگر بدون ارادہ کے کوئی گناہ بھول چوک سے ہوگیا تو وہ معاف ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا یعنی بندوں کو تعلیم فرماتے ہیں کہ اس طرح دعا کیا کرو یا اللہ اگر ہم سے بھول چوک ہو جاوے تو ہم سے مؤاخذہ نہ کیا جائے اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ اواخر سورۂ بقرہ کی دعا مقبول ہوگئیں یعنی بھول چوک پر مؤاخذہ نہ ہوگا ایک حدیث میں اس کو صاف لفظوں میں بیان کیا گیا ہے رُفِعَ عَنْ اُمَّتِیَ الْخَطَاُ وَالنِّسْیَانُ کہ میری امت سے

خطا ونسیان معاف کر دیا گیا۔ اور بعض اعمال میں تو سب لوگ جانتے ہیں کہ بدون ارادہ کے عمل معتبر نہیں ہوتا مثلاً نماز بدون نیت کے صحیح نہیں ہوتی نیت کا نام ہی تو ارادہ ہے۔ اگر بدون اس ارادہ کے کوئی تمام دن نمازیں پڑھتا رہے تو سب فضول ہیں اور اگر نیت کر کے دو رکعت بھی پڑھ لے وہ صحیح ہیں ارادہ ہی کی وجہ سے قتل خطا و عمد میں شریعت نے فرق کیا ہے اگر قصداً کسی کو قتل کیا گیا تو اس میں گناہ بھی بہت زیادہ ہے یہاں تک کہ بعض صحابہ کا خیال تھا کہ قتل عمد کیلئے توبہ بھی نہیں اگرچہ جمہور نے اس کو رد کیا ہے اور اس صورت میں قاتل پر قصاص بھی آیا ہے کہ مقتول کے عوض اس کو قتل کر دیا جائے اور اگر خطا بھول چوک سے قتل ہو گیا اور قتل کا ارادہ نہ تھا مثلاً تیر شکار پر چلایا تھا کسی آدمی کے لگ گیا اور وہ مر گیا تو اس صورت میں گناہ بھی نہیں ہوتا نہ قصاص آتا ہے صرف دیت آتی ہے نیز اگر کسی معصیت کا پختہ عزم ہو جائے تو گناہ فوراً لکھا جاتا ہے اور اگر بدون اردہ کے غلطی اور خطا سے واقعی بھی گناہ ہو گیا تو کچھ بھی گناہ نہیں ہوتا وہ معاف ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ ارادہ سبب غالب ہے اس عمل کے ہو جانیکا اور ایسے سبب کے لئے حکم مسبب کا ہوا کرتا ہے مثلاً سنکھیا سبب غالب ہے ہلاکت کا تو اگر کوئی شخص بے قاعدہ بلا مشورہ طبیب خودکشی کی نیت سے سنکھیا تولہ بھر کھا لے تو چاہے بعد میں دست و قے کرا کر اس کی جان بچ بھی جاوے تب بھی اس کو گناہ خودکشی کا ہو گیا کیونکہ اس نے تو کوئی کسر جان ہلاک کرنے میں نہ رکھی تھی یہ اتفاقی بات تھی کہ وہ اس کے بعد بھی بچ گیا۔ اسی طرح جب کسی شخص نے پختہ ارادہ کر لیا کسی گناہ کا تو گویا اس نے اس کے کرنے میں کوئی کسر نہیں رکھی کیونکہ عادۃ اللہ یوں ہی جاری ہے کہ پختہ ارادہ کے بعد عمل ہو ہی جایا کرتا ہے یوں کبھی اتفاقاً نہ ہوا تو یہ نادر ہے وَالنَّادِرُ كَالْمَعْدُوْمِ (نادر مثل معدوم کے ہے) اس لئے یہ شخص ارادہ پختہ کر لینے سے ایسے سبب کا مرتکب ہو گیا جو اکثر مَفْضِیْ اِلَی السَّبَبَ (سبب کی طرف پہنچانے والا) ہو جاتا ہے اس لئے گناہ کا مستحق ہو گیا۔ اسی طرح کسی شخص نے نیک کام کا قصد کیا تو وہ ثواب کا مستحق ہو گیا کیونکہ سبب کے بعد اکثر کام ہو جاتا ہے کبھی نہ ہونا اتفاقی بات ہے لہذا وہ مثل کرنے والے کے سمجھا جائے گا اور اس کو اس عمل کا ثواب مل جائیگا۔ اب معلوم ہوا کہ ارادہ کتنی بڑی چیز ہے جو کہ عمل کے وجود کے لئے سبب غالب ہے جس کے بعد اکثر کام ہو جاتا ہے یہاں تک کہ شریعت میں اُس کو عمل ہی کے مثل شمار کیا گیا ہے سو اس کی مسلمانوں میں آجکل بہت ہی کمی ہے کہتے ہیں کہ فلاں کام ہم نے بہت ہی کرنا چاہا مگر نہیں ہوا مگر میں بقسم کہتا ہوں

کہ ان لوگوں نے اس کا ارادہ ہی نہیں کیا صرف تمنا ہی تمنا کی ارادہ اس کا نام ہے کہ جس اختیاری کام کا خیال کرے بس اُسی کی دھن لگ جائے اور اپنی پوری کوشش اس میں صرف کردے ایسا کرکے پھر کوئی بتلائے کہ کام نہیں ہوا۔ اور اس کے بعد بھی کام نہ ہوا کرے تو دنیا کا کام کیونکر چلے اس لئے جو شخص یوں کہے کہ میں نے ارادہ کیا اور پھر بھی کام نہیں ہوا میں اس کو کبھی تسلیم نہ کروں گا بلکہ اس سے یہی کہا جائے گا کہ تم نے اس کام کی تمنا تو کی ارادہ نہیں کیا۔ ایک شخص میرے پاس آئے جو بوڑھے ہوگئے تھے مگر نظر بد کے مرض میں مبتلا تھے آجکل لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ جوانی میں گناہ نہیں چھوٹتے تو بڑھاپے میں جاکر چھوٹ جائیں گے مگر میں سچ کہتا ہوں کہ جو گناہ جوانی میں نہیں چھوٹا وہ بڑھاپے میں کبھی نہ چھوٹے گا ؎

درختے کہ اکنوں گرفت ست پائے   بہ تیروئے شخصے بر آید ز جائے
اگر ہمچناں روزگارے ہلی   بہ گردونش از بیخ بر نگسلی

(جس درخت نے ابھی جڑ پکڑی ہے ایک آدمی کی قوت سے جڑ سے اکھڑ سکتا ہے اور اگر کچھ زمانہ تک ایسے ہی چھوڑ دیا جائے تو گردوں سے بھی جڑ سے نہیں اکھڑ سکتا۔)

سوچو گناہ اب جوانی میں نہ چھوٹا حالانکہ ابھی اس کی جڑ کمزور ہے تو بڑھاپے میں کیا خاک چھوٹے گا جبکہ جڑیں مضبوط ہو جائیں گی اور چاروں طرف پھیل جائیں گی۔ نیز ایک بات تجربہ کی یہ ہے کہ ہمیشہ عفت جوان آدمی کی قوی ہوتی ہے کیونکہ جس طرح جوانی میں تقاضا زیادہ ہوتا ہے اس کے روکنے کی قوت بھی زیادہ ہوتی ہے اور بڑھاپے میں یاد رکھئے کہ تقاضا کم نہیں ہوتا اگرچہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا مگر تقاضے میں کمی نہیں آتی اور اس تقاضے کو روکنے والی قوت کم ہو جاتی ہے تو اور بھی کچھ نہ ہو نظر بد میں تو یہ شخص مبتلا رہے ہی گا خصوصاً جبکہ عورتیں اس کی نظر سے احتراز بھی نہیں کرتیں چنانچہ بوڑھے آدمی سے پردہ بھی کم کرتی ہیں بہت سے بہت وہ فعل نہ کر سکے گا مگر میں کہہ چکا ہوں کہ مدار معصیت ارادہ پر ہے جب ایک شخص نے معصیت کا پختہ ارادہ کر لیا اور پھر بوجہ ناکارہ ہونے کے اُسے پورا نہ کر سکا تو گناہ اس کے نامۂ اعمال میں لکھا گیا۔ غرض وہ بوڑھے شخص مجھ سے ملے کہ اس کی کوئی سہل تدبیر بتلاؤ کہ میں اس مرض سے نجات پاؤں میں نے کہا سہل کی قید سے تو یہ سلسلہ غیر متناہی چلے گا آج آپ مرض کے ازالہ کی سہل تدبیر پوچھتے ہیں کل کو اس تدبیر کو سہل کرنے کے لئے اگر وہ سہل نہ معلوم ہوئی دوسری

تدبیر پوچھیں گے اس میں کچھ دشواری پیش آئی تو پھر اس کی سہولت کے لئے اور تدبیر پوچھیں گے اس طرح تو مرض کا علاج نہیں ہوسکتا بس سہولت کی فکر نہ کیجیے بجز ہمت کے اس کا کوئی علاج نہیں ایک دفعہ پختہ عزم کرلیجیے کہ چاہے کتنی ہی تکلیف ہو ہرگز نگاہ اوپر کو نہ اٹھاؤں گا اور جو کبھی اٹھ جائے تو فوراً نیچی کرلیجیے اس ترکیب سے ان شاء اللہ مرض زائل ہوجائیگا اس کے بدون زوال ممکن نہیں۔ وہ کہنے لگے کہ میں چھوڑنے پر قادر ہی نہیں ہمت کیسے کرسکتا ہوں میں نے کہا کہ یہ آپ غلط کہتے ہیں آپ یقیناً چھوڑنے پر قادر ہیں اور دلیل سے میں نے ان کو سمجھا دیا کہ آپ قادر ہیں وہ دلیل یہ تھی کہ حق تعالیٰ شانہ کا ایک طرف تو یہ ارشاد ہے لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کہ حق تعالیٰ طاقت سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں دیتے۔ دوسری طرف ارشاد ہے وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ کہ مسلمانوں سے کہہ دیجیے کہ اپنی نگاہوں کو نیچے رکھیں اور شرمگاہوں کو محفوظ رکھیں ان دونوں آیتوں کے ملانے سے معلوم ہوا کہ نگاہ نیچی کرنے پر بندہ قادر ہے اس لئے کہ اس کے متعلق حق تعالیٰ کا حکم ہے اور اُن کا کوئی حکم طاقت سے زیادہ نہیں ہوتا میرے سامنے تو وہ اس دلیل میں تاویلیں نکالتے رہے مگر گھر جا کر جو انھوں نے اس میں غور کیا تو خط آیا کہ واقعی میں غلطی پر تھا انسان ہر گناہ سے بچنے پر قادر ہے البتہ پہلے پہل کلفت ضرور ہوتی ہے مگر صرف پہلی ہی بار ہوتی ہے اس کے بعد وہ کلفت کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ پھر عادت ہوجاتی ہے۔ صاحبو! انسان میں ارادہ وہ قوت ہے کہ اس کی ساتھ وہ تمام مخلوق پر غالب آسکتا ہے صاحبو! تمہارے ساتھ دو لشکر ہیں ایک ملائکہ کا اور ایک شیاطین کا اور ان دونوں میں مقابلہ رہتا ہے ایک چاہتا ہے کہ تم کو بدی سے بچائے دوسرا چاہتا ہے کہ تم کو گناہ میں پھنسائے اور ان دونوں لشکروں کی ہار جیت تمہارے ارادہ پر موقوف ہے جس کی طرف تمہارا ارادہ ہوجاوے وہی غالب ہوجاویگا اگر آپ نے گناہ کا ارادہ کرلیا تو لشکر ملائکہ پسپا ہوگیا اب وہ غالب نہیں ہوسکتا اور اگر گناہ سے بچنے کا ارادہ کرلیا تو لشکر شیطان مغلوب ہوگیا اب وہ کبھی غلبہ نہیں کرسکتا افسوس آپ میں اتنی بڑی قوت موجود ہے اور پھر آپ یوں کہتے ہیں کہ ہم گناہ چھوڑنے سے عاجز ہیں صاحبو! آپ عاجز ہرگز نہیں ہاں یوں کہئے کہ ابھی تک چھوڑنے کا ارادہ نہیں کیا اور ارادہ نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ گناہ کی عظمت اور اس کا خوف دل میں نہیں گناہ کو ایک معمولی چیز سمجھ رکھا ہے اور جس گناہ کی عظمت دل میں ہے اس میں کسی

طرح کی بھی کوئی تاویل منہ سے نہیں نکلتی کیونکہ دیکھئے گناہ دو قسم کے ہیں ایک وہ جو کہ صرف شریعت مقدسہ میں حرام ہیں دوسرے وہ جو کہ قانون اور شریعت دونوں کے اعتبار سے ناجائز ہیں بتلایئے اُن گناہوں میں آپ کیا برتاؤ کر رہے ہیں جو کہ قانون کی رو سے بھی ناجائز ہیں اور موجب سزا ہیں ظاہر ہے کہ سب اس سے اجتناب کریں گے ڈاکہ کوئی نہیں مارتا چوری شریف آدمی بالکل نہیں کرتے یہاں تک کہ راستوں میں پیشاب تک نہیں کرتے کیونکہ قانوناً جرم ہے۔ کیوں صاحب اگر کوئی ڈاکو کہنے لگے کہ میں اپنے عیال کو بدون ڈاکہ کے پال نہیں سکتا تھا اس لئے کہ آمدنی کم اور خرچ زیادہ ہے تو کیا حاکم اُس کا یہ عذر قبول کر لے گا اور کیا اس کو سزا نہ دے گا یا چور یہی عذر کہنے لگے تو کیا اسکو رہا کر دیا جائے گا ہرگز نہیں۔ حاکم صاف کہدیتا ہے کہ ہم یہ باتیں نہیں سننا چاہتے تم نے خلاف قانون کام کیا ہے تم کو پھانسی دی جائے گی۔ اے اللہ ایک جواب حاکم دنیا کے سامنے نہیں چل سکتا وہ خدا کے سامنے پیش کرتے ہوئے کچھ تو شرمانا چاہیئے۔ آج کل لوگ بہت بیباک ہو کر کہدیتے ہیں کہ صاحب کیا کریں مجبور ہیں بدون سود اور رشوت کے خرچ نہیں چلتا اور علماء کو تنگ کرتے ہیں کہ اس مجبوری پر لحاظ کریں ان کو بھی یہ حق ہے کہ ایک حاکم سلطنت کی طرح وہ بھی صاف جواب دے دیں کہ ہم نہیں جانتے خرچ چلے یا نہ چلے شریعت مقدسہ نے اس کو حرام کیا ہے چھوڑنا پڑے گا ورنہ گناہ گار ہو گے اور فاسق فاجر کے خطاب کے مستحق ہو گے۔ آجکل لوگ علماء کو مجبور کرتے ہیں کہ سود کے جواز کے فتوے دو اور یہ نہیں جانتے کہ اگر وہ جواز کے فتوے دیے بھی دیں گے تو وہ بھی آپ ہی کے شمار میں ہو جاویں گے بلکہ اُن کی آپ سے بھی زیادہ گردن نپے گی. بھلا کسی مولوی کے جائز کر لینے سے کوئی حرام کام حلال ہو سکتا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ عوام مسلمان جن کو ذرا شریعت کا پاس ہے اُن مولوی صاحب ہی کو چھوڑ دیں گے۔ صاحبو! اول تو علماء اس کے ذمہ دار نہیں کہ آپ کا خرچ چلتا ہے یا نہیں خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا جو حکم ہے اس کو ماننا پڑیگا۔ دوسرے یہ عذر بھی بالکل غلط ہے کہ ہم سے گذر نہیں ہو سکتا. گذر ہو سکتا ہے مگر فضولیات کو حذف کر دو فٹن نہ رکھو نوکر زیادہ نہ رکھو کپڑا سستا پہنو غرض جائز آمدنی کے موافق خرچ رکھو دیکھو گذر ہوتا ہے یا نہیں مگر یہ فضولیات تو چھوڑتے نہیں پھر کہتے ہیں کہ

گذر نہیں ہو سکتا یوں کہیے کہ سود اور رشوت کے بغیر عیش پرستی نہیں ہو سکتی اس کو ہم بھی تسلیم کریں گے مگر عیش پرستی کی فکر کی شریعت میں خود ممانعت ہے اس کی ذمہ دار شریعت کیونکر ہو سکتی ہے اور جس کو گذر کرنا ہو وہ حلال روزی میں یقیناً گذر کر سکتا ہے البتہ ظاہراً اس میں لوگوں کی نگاہوں میں قدرے سبکی ہو گی سو اول تو یہ بھی خیال غلط ہے، ایسے شخص کی قلوب میں بڑی وقعت ہوتی ہے حکام بھی ایسے شخص کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ہم نے فرض کیا کہ سبکی ہی ہوتی ہے مگر اس کو گوارا کرنا چاہیئے اور خیال کرنا چاہیئے کہ اگر ہم سود یا رشوت لیں گے تو آخرت میں سبکی ہو گی جب حشر کی سبکی کا خوف دل میں ہو گا اس سُبکی پر نظر نہ جائے گی اور اس کی پرواہ بھی نہ ہو گی واللہ ہم لوگ آخرت کو بھولے ہوئے ہیں ورنہ یہ عذر کبھی زبان پر نہ آتے اچھا صاحبو! یہ عذر آپ کا کہ بدون اس کے گذر نہیں ہو سکتا اگر مان بھی لیا جائے تو یہ بھی صرف انہیں گناہوں میں چل سکتا ہے جن کے چھوڑنے میں آمدنی کا نقصان ہوتا ہے جیسے سود یا رشوت مگر پھر سوال یہ ہے کہ جن گناہوں کے چھوڑنے میں آمدنی کا نقصان بھی نہیں ہوتا وہ کیوں کئے جاتے ہیں جیسے جھوٹ، غیبت، مسلمان آدمی کو خواہ مخواہ ستانا اور نظر بد کیا نگاہ بد سے بھی کچھ غلہ بڑھ جاتا ہے جس کے چھوڑنے سے وہ مقدار غلّہ کی کم ہو جائے گی آخر ان گناہوں کے کرنے میں آپ کو کونسی مجبوری ہے اور ان سے بچنے میں کونسا نقصان ہے ان کو چھوڑنے میں آپ کیا عذر کریں گے بلکہ احادیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ گناہوں سے روزی کم ہو جاتی ہے ابن ماجہ میں ہے اِنَّ الْعَبْدَ لَیُحْرَمُ الرِّزْقَ بِخَطِیْئَةٍ یَعْمَلُھَا (یقیناً بندہ گناہ سے جس کو وہ کرتا ہے رزق سے محروم ہو جاتا ہے) گناہ سے زندگی تلخ ہو جاتی ہے گناہ کرنے والے سے راحت کوسوں دور ہے۔ کھانے پینے کی فراغت کا نام عیش نہیں ہے اصلی عیش دل کی راحت اور چین ہے جو گنہگار کو نصیب بھی نہیں اور اہلِ طاعت کے دل میں بے چینی کا نام نہیں ہوتا جب دنیا ہی میں گناہوں سے یہ عذاب ہو رہا ہے پھر نہ معلوم گناہ کرنے میں کیا مصلحت ہے واللہ مسلمان کو تو گناہ کچھ بھی مزہ نہیں دیتا کافر تو بیفکر ہو کر گناہ کرتا ہے کیونکہ اسے آخرت کا یقین نہیں مگر مسلمان کو تو گناہ

کرتے وقت بھی مزہ نہیں آتا۔ بار بار دل میں خوف خدا سے خطرہ پیدا ہوتا ہے پھر یہ شخص غفور رحیم کے مضمون کو آڑ بنا کر اس خطرہ کو ٹالتا ہے غرض ایک کشمکس میں دل پڑ جاتا ہے پھر ایسی حالت میں گناہ کا کیا لطف کمبخت کو آئیگا وہی مثل ہے گناہ اور بے لذت۔ اور اس مقدمہ کے کہ اللہ غفور رحیم ہے آجکل بالکل غلط معنی لوگ سمجھے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ کے غفور رحیم ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گناہ سے جو ضرر ہوتا ہے وہ ضرر بھی نہ پایا جائے اگر غفور رحیم ہونے کے یہ معنی ہیں تو کوئی صاحب ہمت کر کے سنکھیا تو کھالیں اگر غفور رحیم ہونے کے یہی معنی ہیں کہ مضر شے کا ضرر زائل ہو جاتا ہے تو چاہیے کہ سنکھیا کھالیں تو وہ بھی ضرر نہ کرے حالانکہ وہ ضرر ضرور کرتا ہے معلوم ہوا کہ یہ معنی اس کے نہیں پس نہ معلوم کہ گناہوں کی بابت یہ کیسے سمجھ لیا گیا کہ اس اعتقاد کے بعد وہ ضرر بھی نہیں کریں گے صاحبو! گناہ کی ظلمت تو ضرور پیدا ہو گی اور اس ظلمت کے ساتھ دخول جنت مشکل پس یا تو خدا بعد میں سچی توبہ کی توفیق دے اور یہ توبہ ایسی جرأت کرنے والوں کو بہت کم نصیب ہوتی ہے ورنہ اُس ظلمت کے دور کرنے کے لئے عذاب جہنم موجود ہے اِلَّآ اَنْ يَّرْحَمَ بِفَضْلِهٖ (مگر یہ کہ اللہ اپنے فضل سے رحم کریں) جب اعتقاد غفور رحیم سے دنیا کا ضرر رفع نہیں ہوتا تو یہ بڑی سخت غلطی ہے کہ اس اعتقاد سے آخرت کا ضرر مرتب نہ ہونا سمجھ لیا جائے خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس آیت میں ارادہ کا بیان ہے اور متعلق کے اعتبار سے اس کی دو قسمیں ہیں محمودہ و مذمومہ ان دونوں کے احکام اس آیت میں مذکور ہیں اور اس وقت میں انہیں کو بیان کرنا چاہتا ہوں غور سے سنئے۔ حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا۔ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا یعنی جو کوئی عاجلہ کا یعنی دنیا کا ارادہ کرتا ہے اس کو ہم جلدی اسی جگہ جو چاہیں اور جس کے لئے چاہیں دیدیتے ہیں ذرا قیود پر غور کیجیے کہ دنیا کے طالب کو دنیا عطا فرمانے کا پختہ وعدہ نہیں فرماتے بلکہ اتنی قیدیں ہیں کہ مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ کہ جتنا ہم چاہیں اور جس کیلئے چاہیں عطا کر دیں گے معلوم ہوا کہ ہر طالب دنیا کا مراد کو پہنچنا لازم اور ضروری نہیں اور اگر دنیا کے دینے کا پختہ وعدہ بھی ہوتا جب بھی وہ تو لینے کے قابل نہ تھی اور میں اس کو دلیل سے بتلاتا ہوں دیکھئے اگر ایک شخص کسی کو دو مکان دکھلائے ایک خستہ و خراب دوسرا نہایت

عمدہ اور یہ کہدے کہ خراب تو اسی وقت تم کو مل سکتا ہے اور بعد ایک ماہ کے واپس لے لیا جائیگا اور دوسرا اس وقت نہیں مل سکتا بعد ایک ماہ کے ملیگا اور وہ واپس نہیں کیا جائیگا اور دونوں ساتھ مل نہیں سکتے تو بتلایئے اس صورت میں کیا کیا جائیگا ظاہر ہے کہ کوئی بیوقوف سے بیوقوف بھی اس ویران کو اختیار نکریگا اس فیصلہ میں سب کا اتفاق ہے کہ وہ عمدہ ہی گھر لینا چاہیئے گو بعد مدت ملے صاحبو! اس شخص کو تو آپ جج بنکر بھی فیصلہ سنائیں گے کہ ویران گھر کو ہرگز اختیار نہ کرے مگر جب یہی معاملہ آپ کے ساتھ ہوا تو اپنے اس فیصلہ کو بھول گئے صاحبو! حق تعالیٰ شانہ نے آپ کے سامنے دو گھر پیش کردیئے ہیں ایک دنیا جو کہ اسی وقت مل سکتی ہے مگر بعد چندے چھین لیجائیگی اور خراب وخستہ وفانی بھی ہے دوسرا گھر آخرت ہے جو عمدہ ہے اور باقی رہنے والا ہے یہاں آپنے آخرت کو کیوں اختیار نہیں کیا گذشتہ مثال میں تو ایک ماہ کی بھی مہلت تھی اور یہاں تو کچھ بھی میعاد نہیں شاید ہمیں نفس نفس واپسی بود۔ (شاید سانس واپسی سانس ہو) زندگی کا کیا اعتبار ہے ایک منٹ کا بھی بھروسہ نہیں طاعون کا حال معلوم ہے کہ کس طرح دفعۃً مخلوق کا صفایا کردیتا ہے کل کا مرنے والا آج کیا جانے کہ میں کب مروں گا وہ تو آج بہت کچھ امیدیں اپنے دل میں کرتا ہوگا مگر اسے موت کی کچھ بھی خبر نہیں کہ سر پر آچکی ہے تو یہاں دنیا کی میعاد تو ایک مہینہ کیا ایک ہفتہ ایک دن بھی نہیں ہے ہر سکنڈ میں خطرہ ہے کہ اسی وقت ختم ہوجائے تو کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ایسا گھر جس کی اتنی کم میعاد اور فنا ہونیوالا اور جس کی کوئی راحت بھی تکلیف سے خالی نہیں آپنے اختیار کیا اور آخرت کو جس کے ملنے کے لئے ایک سانس کی دیر ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے باقی رہنے والا اور اس میں راحت ہی راحت ہے تکلیف کا نام بھی نہیں آپنے چھوڑ دی حالانکہ اگر ایسی صورت کوئی دوسرا شخص آپ سے پوچھنے آئے تو آپ اس کو یہی رائے دینگے کہ خراب خستہ فانی چیز ہرگز لینے کے قابل نہیں میرا یہ مطلب نہیں کہ آپ دنیا کو بالکل چھوڑ دیجئے شکایت اور افسوس تو اس کا ہے کہ اس کو آخرت پر ترجیح دے رکھی ہے۔ غرض یہ اچھی طرح ثابت ہوگیا کہ دنیا کے ملنے کا اگر پختہ وعدہ بھی ہوتا تب بھی وہ لینے کے قابل نہ تھی چہ جائیکہ اس کے دینے کا پورا وعدہ بھی نہیں پھر حالت یہ ہے کہ دنیائے فانی کو اختیار کرلینے سے تو بعض اوقات آخرت کا حصہ بالکل نہیں ملتا جیسے کہ کفار کو اور آخرت اختیار کرنے سے یہ نہیں ہوتا کہ دنیا بالکل نہ ملے بلکہ آخرت اختیار کرنے والے کو دنیا بھی ملتی ہے اگرچہ اتنا فرق ہے کہ آخرت والیکو دنیا کم ملتی ہے اور دوسروں کو زیادہ اور یہ فرق بھی صرف ظاہر ہی میں ہے ورنہ غریب لوگ جتنا لطف دنیا کا اٹھاتے ہیں امیروں کو وہ نصیب بھی۔ غریب لوگ امیروں سے زیادہ

کھاتے ہیں اور سب ہضم کر لیتے ہیں صحت اچھی رہتی ہے خوش و خرم رہتے ہیں درد سر اور زکام و نزلہ کو جانتے بھی نہیں امیروں کو آئے دن مسہل لینے پڑتے ہیں۔ ایک غریب آدمی کی کسی رئیس سے دوستی تھی۔ غریب آدمی بہت موٹا تازہ تھا اور رئیس صاحب دُبلے پتلے بیمار سے رہتے تھے ایک دن ان رئیس صاحب نے اپنے غریب دوست سے کہا کہ یار یوں تو تم غریب ہو مگر دیکھنے میں مجھ سے زیادہ موٹے ہو ایسی تم کیا غذا کھاتے ہو اس نے کہا کہ میں تم سے زیادہ لذیذ کھانا کھاتا ہوں اور ہر مہینے نیا نکاح کرتا ہوں امیر نے اس کا مذاق اڑایا اُس نے کہا مذاق کی کیا بات ہے کل کو تمہاری دعوت ہے امیر نے قبول کر لیا اور بڑی حیرت ہوئی دوسرے دن جب کھانے کا وقت ہوا وہ امیر صاحب غریب دوست کے گھر پہونچے تو اس نے باتیں شروع کیں باتوں باتوں میں بہت دیر ہو گئی اُن رئیس صاحب نے کھانے کا تقاضا کیا اس نے ٹال دیا کہ ابھی تیار نہیں ہوا ذرا سی دیر ہے اور پھر باتوں میں لگا یا یہاں تک کہ رئیس صاحب کا مارے بھوک کے بُرا حال ہو گیا اور بار بار تقاضا کیا جب اس نے بُرا حال دیکھا تو یہ کہا کہ تازہ کھانا تو ابھی تیار نہیں ہوا باسی روٹی رکھی ہے اور ساگ ہے کہو تو لاؤں اس نے کہا جو کچھ ہو لے آؤ باتیں نہ کرو چنانچہ وہ باسی روٹی اور ساگ لے آیا اور ان رئیس صاحب نے اندھے باؤلوں کی طرح اُسے کھانا شروع کیا ہر لقمہ پر سبحان اللہ کہتے جاتے جب وہ پیٹ بھر کر کھا چکے تو نفیس کھانے بھی اُس نے پیش کئے مگر چونکہ وہ خوب سیر ہو کر کھا چکے تھے اب عذر کر دیا اس نے کہا کہ کھائیے یہ بہت لذیذ ہیں امیر بولا بس جی اس سے زیادہ لذیذ نہیں غریب دوست بولا کہ جناب وہ لذیذ کھانا یہی ہے بھوک میں باسی کھانا جو ہم کھاتے ہیں تو یہ تمہارے پلاؤں سے زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے کیونکہ تم تو ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتے ہی رہتے ہو بھوک سے نہیں کھاتے ہو میرا یہی مطلب تھا وہ رئیس مان گئے کہ واقعی تم لوگ ہم سے زیادہ اچھا کھانا کھاتے ہو پھر پوچھا کہ لذیذ کھانے کا مطلب تو معلوم ہو گیا اب یہ بتلاؤ کہ ہر مہینہ نکاح تم کیسے کرتے ہو اس نے کہا کہ میں اپنی بیوی کے پاس مہینہ میں ایک بار جاتا ہوں جبکہ طبیعت میں پوری رغبت ہوتی ہے اور شہوت جوش میں ہوتی ہے تم لوگوں کی طرح روزانہ یا دوسرے تیسرے نہیں جاتا پس مجھے ہر مہینے ایسا ہی لطف آتا ہے جیسا کہ نئے نکاح میں آتا ہے اور تم کو تو سوچ فکر سے شہوت کو برانگیختہ کرنا پڑتا ہے اس سے تمھیں کچھ لطف نہیں آتا۔ وہ رئیس صاحب مان گئے کہ واقعی تمہاری دونوں باتیں سچی تھیں اور تم لوگ ہم سے زیادہ لطف میں ہو تو غریبوں کو جتنا ملتا ہے حلاوت کے ساتھ وہ اُسے کھاتے ہیں ہاں خدا اس سے تو بچائے کہ کھانے ہی کو [illegible] اور [illegible] کی نوبت آئے مگر حسب ضرورت ملنے کے بعد غریب آدمی زیادہ حلاوت سے کھاتا ہے کام کاج

کر کے بھوکا تھکا ماندہ شوق و رغبت سے کھاتا ہے اور امیر لوگ تو کمیٹی اور مشورہ کے بعد کھانا کھاتے ہیں کہ پہلے خادم آیا کہ میاں کھانا تیار ہے جواب دیدیا بھوک نہیں پھر ایک دوسرا آیا کہ حضور فاقہ اچھا نہیں کچھ تو نوش جان فرمالیجئے یار دوستوں کے کہنے سننے کے بعد وہ کچھ زہر مار کرتے ہیں کیونکہ بے بھوک کھایا ہوا تو زہر ہی ہو کر لگے گا۔ صاحبو! اگر تم کو امیروں کی تکلیف کا حال معلوم ہو جائے تو تم امیری سے پناہ مانگو اور اگر امیروں کو تمہاری راحت کا حال معلوم ہو جائے تو وہ غریبی کی تمنا کرنے لگیں مگر پہلے وہ بات پیدا کر لو جس سے غریبی میں لطف آئے یعنی قناعت وکفایت علی الضروریات آپ کو تو کھو رکھا ہے تکلف نے اور وضع نے جس کی وجہ سے خوامخواہ قرض کی نوبت آتی ہے اور پریشانی رہتی ہے اگر تکلف اور پابندی وضع نہ ہو بلکہ جیسا جس وقت حال ہو اسی کے موافق چال چلن ہو تو کبھی پریشانی پاس نہ آئے۔ بے تکلفی کا ایک عجیب واقعہ میں سناتا ہوں۔ ہمارے قصبہ کے قریب ایک قصبہ ہے اس میں ایک حکیم صاحب رہتے ہیں جو ہمارے حضرات ہی کی اولاد میں ہیں ایک مرتبہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ان کے یہاں مہمان ہوئے تو انھوں نے بے تکلف چپکے سے آکر مولانا سے عرض کیا کہ یہاں آپ کے بہت معتقد ہیں اگر آپ فرمائیں تو کہیں دعوت کا ڈھنگ ڈالوں کیونکہ میرے یہاں تو آج فاقہ ہے دیکھئے ذرا بھی تو ان پر مولانا کی تشریف آوری کا اتنا بار نہ ہوا کہ کہیں سے ادھار لیکر دعوت کرنے کا خیال کرتے جب اپنے گھر میں فاقہ تھا تو مہمان سے صاف کہدیا اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ بھی کیا اچھے مہمان تھے فرمایا بھائی میں تو تیرا مہمان ہوں جب تیرے گھر فاقہ ہے تو میں بھی فاقہ ہی سے رہوں گا خبردار کسی سے دعوت کا تذکرہ نہ کیجو صبح سے شام ہو گئی اور سارا گھر فاقہ سے بفکر رہا یہاں تک کہ مغرب کے وقت ایک مریض آیا اور حکیم صاحب کو گیارہ روپے دے گیا اس وقت حکیم صاحب نے آکر مولانا سے عرض کیا کہ حضرت جی آپ کی دعوت کیلئے خدا نے گیارہ روپے بھیجدیئے۔ مولانا نے فرمایا کہ بھائی کھانے میں تکلف نہ کرنا۔ انہوں نے کہا حضرت یہ مجھ سے نہ ہوگا جب نہیں تھا تو میں نے آپ سے فاقہ تک کرالیا اور اب جبکہ خدا نے آپ کی برکت سے یہ روپے بھیجدیئے تو اب میں کھانا عمدہ پکواؤں گا۔ چنانچہ پلاؤ وغیرہ تیار کرایا اور خوب مزہ سے کھایا۔ ایک شخص نے ایک اور عجیب حکایت بیان کی کہ میں اپنے ایک دوست کے یہاں الہ آباد میں مہمان ہوا تو ایک روز اس کے بچے بڑی خوشیاں کر رہے تھے کہ ابا جی ہمارے یہاں شیخ جی آئے وہ شخص کہتے تھے کہ میں سمجھا کہ شاید کوئی بزرگ آئے ہوں گے دیر تک میں اسی کا منتظر رہا کہ ان بزرگ کی میں بھی زیارت کروں مگر جب دیر ہو گئی اور نہ کوئی بزرگ آئے اور نہ اُن کا سامان آتا نظر آیا اور کھانے کا

وقت بھی گذر گیا تو میں نے دریافت کیا کہ یہ بچے شیخ جی کسے کہہ رہے ہیں لوگوں نے کہا کہ آج اس گھر میں فاقہ ہے ان لوگوں نے فاقہ کا نام شیخ جی رکھا ہے جب فاقہ ہوتا ہے تو بچوں کو بہلا دیتے ہیں کہ آج شیخ جی آئے ہیں روٹی نہیں ملے گی بچے ایسی خوشی سے رہتے ہیں کہ ان کو فاقہ سے رنج ہی نہیں ہوتا۔ اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے صبر و استقلال کا کہ بڑے تو بڑے بچے تک بھی پریشان نہ ہوتے تھے غرض یہ بات واضح ہو گئی کہ آخرت کے لئے کوشش کرنے والوں کو دنیا میں بھی بقدر ضرورت آسائش ملتی ہے گو زیادہ نہ ملے مگر وہ اس تھوڑی ہی دنیا سے وہ لطف حاصل کرتے ہیں کہ طالبان دنیا کو باوجود کثرت مال کے وہ لطف حاصل نہیں ہوتا۔ مگر طلب دنیا کے ساتھ آخرت اس طرح نہیں مل سکتی تعجب اب بتلایئے کہ طالب دنیا ہونا عقلمندی ہے یا طالب آخرت ہونا حالانکہ آپ ابھی معلوم کر چکے ہیں کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا ایسی حقیر ہے کہ اگر آخرت سے محرومی کی صورت میں اس کے ملنے کا پورا بھروسہ بھی ہوتا جب بھی وہ لینے کے قابل نہ تھی چہ جائیکہ آخرت چھوڑ کر دنیا کے ملنے کا پورا بھروسہ بھی نہ ہو کیونکہ ارشاد فرماتے ہیں مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ یعنی جو کوئی دنیائے عاجلہ کا ارادہ (و طلب) کرے ہم اس کو دنیا ہی میں فی الحال جس قدر چاہتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں دیدیتے ہیں پھر اس کے لئے جہنم مقرر کر دیتے ہیں جس میں وہ برائی اور ذلت کے ساتھ داخل ہوگا اور جو لوگ کہ آخرت کا ارادہ کریں اور اسکے لئے سعی کریں جو اس کے لئے ہوا کرتی ہے درانحالیکہ وہ مومن بھی ہوں تو ان لوگوں کی کوشش کی قدر کیجائیگی اب ذرا دونوں مضمونوں میں غور کر لیا جائے کہ طلب دنیا و طلب آخرت دونوں کے ثمرات کو کس طرح بیان کیا گیا ہے طالب دنیا کی بابت تو ارشاد ہے عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ یعنی ہم طالبان دنیا میں سے جس کو چاہتے ہیں اور جس طرح چاہتے ہیں دیدیتے ہیں معلوم ہوا کہ نہ سب کا کامیاب ہونا ضروری اور نہ یہ ضروری کہ جو وہ چاہا کریں وہی مل جایا کرے بلکہ جو حق تعالیٰ چاہیں گے دیدیں گے۔ اور طالبان آخرت کے متعلق ارشاد ہے اُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا کہ جو آخرت کی طلب کوشش عملی اور ایمان کے ساتھ کرتے ہیں ان کی کوشش کی قدر کیجائیگی ایمان اور سعی کی قید۔ واقعی ہے احترازی نہیں اور یہ دراصل بیان ہے مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ کا کہ ارادۂ آخرت کہتے ہی ہیں ایمان اور

عمل صالح میں سعی کرنے کو کیونکہ اس کے بدون طلب آخرت متحقق ہی نہیں ہو سکتی ہے اور یہاں سے رد ہو گیا ان لوگوں کا جو کہ اپنے کو طالب آخرت سمجھتے ہیں مگر عمل صالح نہیں کرتے کہ دراصل یہ لوگ طالب آخرت ہی نہیں طلب کے لئے علامت بھی چاہیئے طلب آخرت کی علامت یہی ہے کہ ایمان اور عمل صالح اختیار کیا جائے اور میں نے یہ مضمون کہ سَعٰی لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ (اس کے لئے سعی کریں جو اس کے لئے ہوا کرتی ہے درانحالیکہ وہ مومن بھی ہوں) قید واقعی ہے اسی لئے بیان کیا تاکہ یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اس آیت میں جو ثمرۂ ارادۂ آخرت کے متعلق مذکور ہے وہ صرف ارادہ کا ثمرہ کہاں ہے بلکہ سعی اور ایمان اور ارادہ اس سب مجموعہ کا ثمرہ ہے اور دعویٰ تمہارا ارادۂ آخرت کے ثمرہ کا ہے تو اس تقریر سے یہ شبہ زائل ہو گیا کیونکہ میں نے بتلا دیا کہ یہ قید واقعی ہے اور ارادہ کا بیان اور اس کی شرح ہے رہا یہ سوال کہ پھر اس کے مقابل ارادۂ عاجلہ کی تفسیر کیوں نہ بیان کی گئی اس کا جواب یہ ہے کہ ارادۂ آخرت کی اس تفسیر سے مقصود یہ ہے تاکہ ارادۂ آخرت کا سہل ہونا معلوم ہو جائے کہ اس میں معمولی سعی اور ایمان کی ضرورت ہے تاکہ اس کے بعد آخرت کی طلب کے لئے رغبت دل میں پیدا ہو بخلاف ارادۂ دنیا کے کہ اس کی ترغیب مقصود نہیں اس لئے اس کی تفسیر بیان نہیں فرمائی علاوہ ازیں یہ کہ ارادۂ آخرت کی تفسیر کے متعلق تو لوگ غلطی میں مبتلا ہیں کوئی کسی طریقہ کو طلب آخرت سمجھتا ہے کوئی کسی طریقہ کو اس لئے اسکی تفسیر کی ضرورت تھی اور ارادۂ دنیا کو تو ہر شخص سمجھتا ہے اس کے بیان کی حاجت نہ تھی، پس ارادۂ دنیا و آخرت میں ایک تو فرق یہاں یہ بتلایا گیا کہ طلب دنیا سے یہ کچھ ضروری نہیں کہ وہ مطلوب حاصل ہی ہو جاوے اور نہ یہ ضروری ہے کہ ہر اک کو حاصل ہو جاوے اور طلب آخرت کی ہمیشہ قدر ہوتی ہے وہ ضائع نہیں سکتی۔ دوسرا ایک لطیف اشارہ ایک خاص فرق کی طرف اس آیت میں اور بھی ہے جو اسی وقت سمجھ میں آیا ہے اور ابھی تک اس آیۃ کی تفسیر میں نظر سے نہیں گذرا ممکن ہے کسی نے لکھا بھی ہو وہ یہ کہ اس جگہ دو جملے شرطیہ ہیں اور ہر ایک میں تعلق شرط کا جزا کے ساتھ مختلف عنوان سے بیان کیا گیا ہے ارادہ دنیا کی بابت تو ارشاد ہے مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ یہ صیغہ استمرار کا ہے۔ ترجمہ یہ ہوا کہ جو کوئی دنیا کو طلب کرتا رہے اور ہمیشہ طلب میں منہمک رہے تب کچھ ملتا ہے اور ارادہ آخرت کے متعلق مَنْ اَرَادَ بدون لفظ کان کے ارشاد فرمایا گیا ہے جس سے یہ معلوم ہوا کہ ثمرۂ اخروی حاصل ہونے کے لئے طلب میں مرنا کھپنا نہیں پڑتا بلکہ کچھ ارادہ کرنے سے بھی وہ ثمرہ حاصل ہو جاتا ہے اس کا یہ تو مطلب نہیں کہ طالب آخرت کا ارادہ اور طلب مستمر نہیں ہوتا کچھ دنوں کے بعد ارادہ

و طلب زائل ہو جاتا ہے نہیں حقیقت میں تو وہ بھی مستمر رہتا ہے مگر تھوڑی سی سعی و طلب کے بعد وہ حکم میں غیر مستمر کے ہو جاتا ہے کیونکہ محبت الٰہی پیدا ہو جانے کے بعد وہ ارادہ اتنا سہل ہو جاتا ہے کہ اس کے پیدا کرنے کے لئے اہتمام کرنا نہیں پڑتا وہ ارادہ خود بخود پیدا ہوتا رہتا ہے اگرچہ پیدا اختیار سے ہوتا ہے مگر بوجہ اعانت غیبی کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود بدون اختیار کے پیدا ہو رہا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ آخرت کی طلب محبوب سرکار ہے اس میں سعی کرنے والے کی اس طرف سے امداد ہوتی ہے جس سے وہ بالکل سہل ہو جاتی ہے حدیث شریف میں ہے مَنْ تَقَرَّبَ اِلَيَّ شِبْرًا جِئْتُ اِلَيْهِ ذِرَاعًا وَمَنْ تَقَرَّبَ اِلَيَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ اِلَيْهِ بَاعًا وَمَنْ اَتَانِيْ يَمْشِيْ اَتَيْتُهٗ هَرْوَلَةً اور دنیا مردود بارگاہ الٰہی ہے اس میں ہمیشہ دقّت و تعب ہی رہتا ہے اس کے لئے ہمیشہ اہتمام و اہتمام از خود کرنا پڑتا ہے اور یہ طلب ہمیشہ بتکلف از سر نو پیدا کرنی پڑتی ہے پس حقیقۃً تو دونوں ارادے مستمر ہوتے ہیں مگر بوجہ سہولت و اعانت غیبی کے ارادۂ آخرت گویا مستمر نہیں رہا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا خود بخود اس کے دل میں اُن اعمال کا تقاضا پیدا کر دیتا ہے اور ارادۂ دنیا حقیقۃً اور حکمًا دونوں کے اعتبار سے مستمر ہے اسی لئے اس کے ساتھ کان استمرار کے لئے بڑھایا گیا اور ارادۂ آخرت کے بیان میں کان نہیں بڑھایا گیا اور شرح اس سہولت و اعانت کی یہ ہے کہ طلب آخرت میں قدرے سعی کرنے سے جب نسبۃ مع اللہ پیدا ہو جاتی ہے تو اس سے ایک کیف اور حال ایسا پیدا ہو جاتا ہے جو ہر مشکل کو آسان کر دیتا ہے اسی کو عراقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

صنما رہ قلندر سزد ار بمن نمائی   کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(طریق زہد خشک بہت دور دراز کا راستہ ہے مجھے تو طریق عشق میں چلائے)

رہ قلندر سے یہی طریق عشق و نسبت مع اللہ مراد ہے اور رسم پارسائی سے وہ طریق عبادت جو بدون نسبت و محبت ہو مراد ہے جس میں اعمال کی یہ حالت ہوتی ہے جو بعد میں مذکور ہے ؎

بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند   تو برون در چہ کردی کہ درون خانہ آئی
بزمیں چو سجدہ کردم ز زمیں ندا بر آمد   کہ مرا خراب کردی تو بسجدۂ ریائی

(کعبہ کے طواف کو گیا تو حرم نے مجھ کو راستہ نہ دیا اور کہا تو نے حرم سے باہر کیا کیا ہے جو خانہ کعبہ میں داخل ہونا چاہتا ہے جب زمین پر میں نے سجدہ کیا تو زمین سے یہ ندا آئی کہ تو نے

ریا کا سجدہ کر کے مجھ کو بھی خراب کیا)

وہ کیف نسبت مع اللہ کا ایسا ہوتا ہے کہ اس کے بعد کام نہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ کام کرنا کچھ دشوار نہیں رہتا اور اس طریق میں کچھ باطنی مشقت بھی پیش آتی ہے مگر وہ اس سے بددل نہیں ہوتے بلکہ اس میں بھی اُن کو بڑا لطف آتا ہے اسی کی بابت ارشاد ہے

؎ از محبت تلخہا شیریں بود

اور ارشاد ہے ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من　　　دل فدائے یار دل رنجان من

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو طبیعت ناگوار ہی کیوں نہ ہو میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے میں اپنے یار پر جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں)

اور کہا گیا ہے ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو خنجر آزمائی کرے)

اور کہا ہے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو　　　دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر قربان ہو دل آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں آپ سے راضی ہوں)

اور اس نسبت مع اللہ سے اور سب کام تو آسان ہو ہی جاتے ہیں جو سب سے بڑی خوفناک چیز ہے جس سے سب لوگ ڈرتے ہیں یعنی موت وہ بھی ان کے لئے ایسی خوشگوار ہو جاتی ہے کہ اس کی یہ لوگ تمنائیں کرتے ہیں۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم　　　راحت جاں طلبم وزپئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے　　　تا در میکدہ شاداں و غزلخواں بروم

(جس دن دنیا سے کوچ کروں وہ دن بہت اچھا ہے راحت جان طلب کروں

اور محبوب حقیقی کے پاس جاؤں میں نے نذر کی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہو جائے
تو دیارہ محبوب کے در تک خوش وخرم اور غزلیں پڑھتا ہوا جاؤں)

شاید کوئی صاحب یہ کہیں کہ یہ سب باتیں موت کی تمنا کی پہلے ہی ہوں گی جب موت آئی ہو گی اس وقت حقیقت معلوم ہوئی ہو گی تو یہ خیال غلط ہے ابن فارض رحمۃ اللہ علیہ نے عین موت کے وقت دکھلا دیا کہ اہلِ نسبت مرتے وقت کیسے مطمئن ہوتے ہیں اُن کا واقعہ ہے کہ جب مرنے لگے تو آٹھوں جنتیں اُن کے سامنے پیش کر دی گئیں تو انہوں نے جنتوں سے منہ پھیر لیا اور یہ شعر اسی وقت پڑھا ؎

اِنْ كَانَ مَنْزِلَتِيْ فِي الْحُبِّ عِنْدَكُمْ   مَا قَدْ رَأَيْتُ فَقَدْ ضَيَّعْتُ اَيَّامِيْ

کہ اگر میری اس محبت کی یہی قدر تھی جو میں دیکھ رہا ہوں کہ جنتیں میرے سامنے کر دی گئیں تو میں نے اپنے دن ہی ضائع کئے یعنی میں نے تو محبت اس کے واسطے نہیں کی تھی میں تو کسی اور چیز کا طالب ہوں یہ کہتے ہی آٹھوں جنتیں چھپا دی گئیں اور ایک خاص تجلی حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے ہوئی اُسی کے ساتھ جان پرواز کر گئی اسی مضمون کو قلندر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم   گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم
مجھے آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کے چہرہ انور کو نہ دیکھنے دوں اور کانوں
کو بھی اس کی باتیں نہ سننے دوں)

؎ گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد   تا نہ بینم رخِ تو روح رمیدن ندہم
راگر ملک الموت میری جان لینے کو آئے تو میں جب تک آپ کی تجلی نہ دیکھ لوں
جان نہ دوں گا)

یعنی اگر ملک الموت میری جان قبض کرنے آئیں تو جبتک تجلی خاص نہ دیکھ لوں گا جان نہ نکلنے نہ دوں گا حق تعالیٰ رحم فرمائے ابن فارض پر انہوں نے اس حالت کو کر کے دکھلا دیا کہ بدون تجلی خاص کے چلنے پر راضی نہ ہوئے اسی لئے میں کہتا تھا کہ طالب آخرت کا ارادہ اگرچہ مستمر ضرور ہوتا ہے مگر بوجہ سہولت و اعانت عملی کے گویا وہ بالکل ارادہ ہی نہیں کرتا سب کام بدون اس کے ارادہ کے ہوتا رہتا ہے کیونکہ میرا مطلب یہ نہیں کہ ان سے کبھی گناہ نہیں ہوتا یا یہ معصوم ہیں نہیں بلکہ تقاضا معصیت کا ان کو بھی ہوتا ہے کیونکہ نفس ان کے ساتھ بھی لگا ہوا ہے مگر ان کے تقاضے کی اور دوسروں کے تقاضے کی ایسی مثال ہے

جیسے کہ ایک تو شائستہ گھوڑا شرارت کرے کہ اس کو ذرا سی چمکار میں بیدھا کر لیتے ہیں اور ایک غیر شائستہ گھوڑا شرارت کرے کہ وہ نہ مارنے سے سیدھا ہوتا ہے نہ چمکارنے سے وہ جب شرارت کرتا ہے سوار کو پٹک دیتا اور زین کو بھی پھینک دیتا ہے تو اب یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ گھوڑا شائستہ ہونے کے بعد بھی کبھی شرارت کرنے پر آتا ہے مگر وہ بہت جلد سیدھا ہو جاتا ہے۔ اہلِ نسبت کی ایسی ہی مثال ہے یہی لوگ ہیں جو پلصراط پر برق کی طرح جائیں گے کیونکہ پلصراط جیسا کہ اہلِ کشف نے لکھا ہے شریعت کی صورت مثالی ہے جو لوگ دنیا میں شریعت پر بسہولت چلتے تھے اور شریعت پر چلنا ان کو ایسا آسان اور خوشگوار ہو گیا تھا جیسا کہ دوسروں کو کھانا پینا سونا یہ لوگ پلصراط پر بھی بآسانی گذر جائیں گے بس مضمون مقصود ختم ہو گیا اب اس آیت میں چند نکات سمجھئے جو اس وقت ذہن میں ہیں ان کو بیان کر کے بس بیان کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ ایک نکتہ یہ ہے کہ طالبین دنیا کے بارے میں پہلے یہ فرمایا گیا ہے عجلنا لہ فیھا ما نشاء لمن نرید کہ طالبین دنیا میں سے ہم جس کو چاہیں گے جس قدر چاہیں گے عطا کر دیتے ہیں۔ اس کا مقتضا تھا کہ اس کے مقابلہ میں طالبین آخرت کے لئے یہ فرمایا جاتا اعطیناہ مایشاء کہ ہم طالب آخرت کو جو کچھ وہ چاہے گا وہی دیں گے کیونکہ جب دنیا والوں کے لئے یہ فرمایا گیا کہ ان کو جو ہم چاہیں گے وہ دیں گے تو بظاہر اس کے مقابل طالبین آخرت کے لئے فضیلت پوری اس طرح معلوم ہو گی کہ اُن کو اُن کی طلب کے موافق سب کچھ دیا جائے مگر بخلاف اس کے اس آیت میں مایشاء نہیں فرمایا گیا بلکہ بجائے اُس کے اُولٰئِكَ کان سعیھم مشکورا فرمایا گیا تو بات یہ ہے کہ اگر اس جگہ حق تعالےٰ اہل آخرت کے بارے میں یہ ارشاد فرماتے کہ ان کو جو کچھ وہ چاہیں گے وہی دیا جائیگا تو اس میں درحقیقت کچھ زیادتی نہ ہوتی بلکہ وعدہ گھٹ جاتا کیونکہ نعمائے آخرت کی شان یہ ہے مالاعین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علے قلب بشر یعنی نہ ان کو آنکھوں نے دیکھا نہ کان نے سُنا نہ کسی بشر کے قلب پر ان کا خیال گذرا تو بتلایئے کہ جب وہاں کی نعمتوں کا یہ حال ہے تو اگر یہ فرمایا جاتا کہ طالبین آخرت کو جو کچھ وہ چاہیں گے دیا جائے گا اس سے زیادتی ہوتی یا کمی بہت کمی ہو جاتی کیونکہ وہاں کی نعمتوں کا ہم کو وہم بھی نہیں ہو سکتا پھر ہماری خواہش کے موافق جو ہم کو ملتا وہ تو بہت ہی کم ہوتا۔ حق تعالیٰ شانہ کی کتنی بڑی رحمت ہے کہ ہمارے واسطے انھوں نے ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جن کا ہم کو خطرہ بھی نہیں ہو سکتا اور نہ وہاں کا ثواب ہماری خواہش پر

موقوف نہیں فرمایا بلکہ اپنی رحمت سے بہت زیادہ عطا فرمائیں گے۔ اسی کے بارے میں مولانا کا ارشاد ہے ؎

خود کہ باید ایں چنیں بازار را　　کہ بیک گل میخری گلزار را
نیم جاں بستاند و صد جاں دہد　　آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

(ایسا بازار کہاں مل سکتا ہے کہ ایک پھول کے بدلہ میں چمن ہی خرید لے ضعیف وحقیر و فانی جان لیتے ہیں۔ جان باقی دیتے ہیں۔ جو تمہارے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتا وہ عطا کرتے ہیں)

اب آپ نے سمجھا کہ ما یشاء نہ فرمانا ہی ہمارے لئے رحمت ہے اس وجہ سے حق تعالیٰ شانہ نے اجمالاً فرما دیا اولئک کان سعیہم مشکورا یعنی ان لوگوں کی کوشش کی اس دربار میں قدر ہوگی اسی سے سمجھ جاؤ کہ جن کی کوشش کی قدردانی ایسے عظیم الشان قدردان بادشاہ کے دربار میں ہو ان کو کیا کچھ ملے گا اس کا اندازہ اس سے کر لو کہ بادشاہانِ دنیا جب کسی کی قدردانی کرتے ہیں تو اس کے ساتھ کیسا معاملہ کرتے ہیں وہ یہ نہیں کیا کرتے کہ خدمت کی حیثیت پر انعام واکرام کریں بلکہ وہ اپنی حیثیت کے موافق انعام واکرام کیا کرتے ہیں جس کا اس کو وہم بھی نہیں ہوتا پھر جس کی قدردانی حق تعالیٰ شانہ اپنی عظمت کے موافق فرمائیں گے اندازہ کر لو اسے کیا کچھ ملے گا اس وقت اس کی تفصیل سمجھ میں نہیں آسکتی۔ دوسرا اشارہ وسعیٰ لہا سعیہا میں ہے کہ یہ کلام اس سعی کے سہل ہونے پر دال ہے جیسا کہ اردو محاورہ میں بھی بولا جاتا ہے کہ اس کام کے لئے جو تدبیر ہے وہ کرنی چاہیئے اُس تدبیر کو بیان نہ کرنا اور اجمالاً یہ کہدینا کہ جو تدبیر اس کی ہے وہ کرنی چاہیئے اس سے اُس تدبیر کا معلوم اور سہل ہونا معلوم ہو جاتا ہے اسی طرح یہ کلام یہاں پر وارد ہوا ہے کہ جو لوگ طالب آخرت ہیں اور اس کے لئے وہ سعی کرتے ہیں جو اس کی سعی ہے ان کی کوشش کی قدر ہوگی اس طرز کلام سے اس سعی کا معلوم ہونا اور سہل ہونا سمجھا جاتا ہے مطلب یہ کہ وہ سعی مختصر اور مشتہر ہے بیان کی ضرورت نہیں۔ تیسرا اشارہ مشکورا میں اس بات کی طرف ہے کہ جو کچھ آخرت میں ملیگا وہ محض قدردانی ہے عمل کو اس میں دخل نہیں اس سے ناز کرنے والوں کو تنبیہ مقصود ہے کہ اپنے عمل پر نازاں نہ ہونا چاہیئے جو کچھ وہاں ملے گا محض انعام ہوگا ورنہ تم عمل سے اُس کے مستحق نہیں ہو سکتے

وجہ یہ کہ طاعت ادائے حق خداوندی ہے اور اس کے حقوق غیر متناہی ہیں اور حقوق غیر متناہی کا ادا کرنا موقوف ہے عمل غیر متناہی پر اور ہم بوجہ حادث (یا پیدا ہونیوالا) و متناہی ہونے کے عمل غیر متناہی سے عاجز ہیں تو عقلاً انسان ادائے حق خداوندی سے عاجز ہے تو اب جو کچھ بھی اسے ملے وہ محض قدر دانی نہیں تو اور کیا ہے یہاں سے یہ شبہ بھی دور ہو گیا ہو گا جو بعض رحمدل لوگوں کے دلوں میں آیا کرتا ہے کہ کافر کے واسطے ہمیشہ کے لئے خلود فی النار کیوں مقرر ہوا۔ کفر تو اس نے کیا تھوڑی مدت تک یعنی دنیا کی زندگی میں اور سزا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم یہ تو بظاہر عدل کے خلاف معلوم ہوتا ہے تو بات یہ ہے کہ کافر نے حق تعالیٰ کے ساتھ جب شرک و کفر کیا تو اس نے حق تعالیٰ شانہ کے حقوق غیر متناہیہ کو ضائع کیا اور حقوق غیر متناہیہ پر سزا غیر متناہی موافق قاعدۂ عقل کے ہے غرض عمل صالح سے تو حقوق غیر متناہیہ ادا نہیں ہوتے اور کفر سے حقوق غیر متناہیہ ضائع ہو جاتے پس عمل متناہی کے بدلے جزا غیر متناہی جو مومنین کو عطا ہو گی یہ البتہ عقل سے آگے ہے عقل یوں کہتی ہے کہ جب عمل متناہی ہے تو جزا بھی متناہی ہونی چاہیئے۔ لوگ آج کل عقل عقل گاتے پھرتے ہیں مگر یہ عقل ان کی خیر خواہ نہیں دشمن ہے ؎

آزمودم عقل دور اندیش را
بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(عقل دور اندیش کو آزما لیا جب اس سے کام نہ چلا تو اپنے آپ کو دیوانہ بنا لیا)

یہ لوگ ہمیں بے عقل بتلاتے ہیں مگر ہمیں ایسی عقل کی ضرورت نہیں اس سے ہم بیعقل ہی اچھے مگر خیر بھی ہے یہ بے عقلی کس کے لئے ہے ؎

ما اگر قلاش دگر دیوانہ ایم
مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(ہم اگر قلاش اور دیوانہ ہیں کیا پرواہ کی بات ہے یہی دولت کیا کم ہے کہ ہم محبوب حقیقی ان کی محبت کے متوالے ہیں)

خدا کا دیوانہ ہزار عاقلوں سے بہتر ہے۔ ؏ "اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد"

پس مشکورا فرمانے سے بتلا دیا کہ عقل تو چاہتی ہے کہ تمہارا اجر کم ہوتا مگر یہ ہماری قدر دانی ہے ایک حدیث میں بھی یہ مضمون آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں اپنے عمل سے کوئی نہ جائے گا ہاں رحمتِ الٰہی ہو جائے تو اور بات ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا اور اس سوال کی ہمت بھی انہیں کو تھی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا انت کیا آپ بھی اپنے عمل سے جنت میں تشریف نہ لے جاویں گے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میرے اس سوال پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر خوف غالب ہو گیا اور آپ نے سر مبارک پر ہاتھ رکھ کر فرمایا ولا انا الا ان یتغمدنی اللہ برحمتہ کہ میں بھی عمل سے جنت میں نہ جاؤں گا مگر یہ کہ خدا کی رحمت میری دستگیری کرے۔ صاحبو! اب کس کی ہمت ہے جو اپنے عمل کو کچھ سمجھے ہماری تو وہ مثال ہے جو کسی بزرگ نے بیان فرمائی ہے ؎

چو آں کرمے کہ در سنگے نہانست
زمین و آسمان وے ہمانست

مولانا نے اس کی مثال میں ایک اور حکایت بیان فرمائی ہے ایک بدوی کی جس نے بجز اپنے گانوں کے گڑھوں کے کبھی پانی نہ دیکھا تھا اور قحط میں ان کے خشک ہو جانے سے دنیا سے پانی کو ناپید سمجھتا تھا کہ وہ کسی خلیفہ بغدادی کے پاس زمانۂ خشک سالی میں ایک گھڑا شیریں پانی کا لے گیا تھا بڑی دور دراز مسافت سے وہ گھڑا سر پر رکھے ہوئے جب پہونچا تو خلیفہ کے دربار میں اسکو پہنچا دیا گیا خلیفہ نے پوچھا اس نے کہا کہ اے امیر المؤمنین یہ جنت کا پانی ہے خلیفہ نے بہت قدر دانی سے وہ گھڑا لے لیا اور حکم کیا کہ سونے سے پُر کر کے اس گھڑے کو واپس کر دیا جائے اور حکم دیا کہ اس کو نہر دجلہ کی طرف کو واپس کیا جائے تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ یہ ہم نے محض اُس کی محبت کی قدر کی ہے ورنہ آبِ شیریں کی ہمارے یہاں کمی نہیں۔ اسی طرح قیامت میں جب ہم اپنے اعمال کی جزا دیکھیں گے کہ اس قدر بے شمار نعمت ہے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب محض قدر دانی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز حق تعالیٰ شانہ اپنے مومن بندے کا حساب چھپا لیں گے اور فرمائیں گے کہ ہم نے تم پر یہ یہ انعام فرمائے تھے تم نے پھر بھی نافرمانی کی فلاں گناہ کو یاد کرو تم نے فلاں دن یہ کام کیا تھا اُس دن یہ کام کیا تھا غرض گناہوں کی فہرست شمار

فرمائیں گے یہاں تک کہ مومن یہ سمجھے گا کہ بس میں ہلاک ہوا اور ہر طرف سے اپنے کو جہنم کے قریب دیکھے گا اس وقت حق تعالیٰ شانہ فرمائیں گے کہ جاؤ ہم نے دنیا میں بھی پردہ پوشی کی تھی یہاں بھی ہم پردہ پوشی کرتے ہیں پھر اس کے نامۂ اعمال میں سے گناہوں کو محو فرمادیں گے اور ان کی جگہ اعمال حسنہ درج فرمادیں گے۔ یہ ہے اولئٰک یبدل اللہ سیٸاتھم حسنات کا مضمون کچھ ٹھکانا ہے اس رحمت کا کہ مسلمانوں کو اپنی رحمت سے دوسروں کے سامنے ذلیل نہ فرمائیں گے بلکہ دوسروں کے سامنے اُس کی عزت بڑھائی جائیگی اور یوں ظاہر کیا جائیگا کہ گویا اُس نے گناہ کیا ہی نہیں۔ صاحبو! ایسے خدا کو چھوڑ کر کہاں جاتے ہو کیا اس کا حق تمہارے اوپر کچھ بھی نہیں جو یوں نافرمانی پر کمر بستہ ہوئے ہو۔ ایسے رحیم کریم خدا کے ساتھ تعلق اور لگاؤ پیدا کرو اور اُس کی محبت میں کوشش کرو۔ بس اب میں وہ ترکیب بتلاکر جس سے حق تعالیٰ شانہ کے ساتھ تعلق اور لگاؤ پیدا ہو بیان ختم کرنا چاہتا ہوں اُس کی ترکیب یہ ہے کہ سب سے پہلے علم دین بقدر ضرورت حاصل کرو کہ بدون اس کے خدا تعالیٰ کی خوشی و ناخوشی کا پتہ چلے گا اس کے بعد اللہ تعالےٰ سے پکا عہد کرو کہ آئندہ گناہ نہ کریں گے اور گذشتہ گناہوں سے سچی توبہ کرو اور سچی توبہ یہی ہے کہ آئندہ کے لئے پختہ عہد کرلیا جائے کہ اب گناہ نہ کریں گے توبہ کے وقت عہد پختہ کرنا چاہیئے اس کے بعد اگر غلطی سے عہد ٹوٹ جائے تو توبہ پھر ایسی پختگی کے ساتھ کی جائے اور اس پختہ عہد کے بعد اگر پھر گناہ ہوجائے تو صلوۃ التوبہ کے ساتھ توبہ کرنی چاہئے خالی زبانی توبہ پر اکتفا نہ کیا جاوے کہ یہ علاج ہے نفس کا جس کی اب زیادہ ضرورت ہوگئی ذرا چند روز اس کا التزام کرکے تو دیکھو کہ پھر گناہوں سے طبعی نفرت ہوتی ہے یا نہیں۔ بڑا مجرب نسخہ ہے اور نہایت سہل کہ جب گناہ ہوجائے تو وضو کرکے دو رکعت نفل پڑھ کے توبہ کی جائے ہر گناہ پر ایسا ہی کیا جائے آخر کار گناہ سے طبعی نفرت اور طاعت کی طبعی رغبت پیدا ہوجائے گی۔ اور اس کے ساتھ ہی کسی کامل کی صحبت کو تلاش کرو اہل اللہ سے ملتے رہو اُن سے اپنا حال کہو دین میں اُن سے مدد لو کہ صحبت کامل اکسیر اعظم ہے۔ یہ صحبت بجلی کی طرح اثر کرتی ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دنیا سے دل یکسو اور آخرت

کی طرف راغب ہو جاتا ہے اور سونے کے وقت دن بھر کے تمام کاموں کا حساب کیا کرو جتنے گناہ ہو گئے ہیں اُن پر نادم ہو کر استغفار کر کے سوؤ اور کچھ وقت تنہائی کا اللہ کی یاد کے واسطے نکالو یہ پانچ باتیں ہوئیں اِن پر عمل کر کے دیکھئے ان شاء اللہ حق تعالیٰ کے ساتھ دل کو پورا لگاؤ ہو جائیگا اور اتنی سہولت کے بعد بھی کوئی نہ کرے تو ایسے نا قدرے کو خدا تعالیٰ ہی ہدایت فرمائیں۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ شانہٗ ہمیں توفیق عطا فرمائیں۔ والحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ علی سیدنا محمد النبی الامی وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم۔

تمت بالخیر

اعلان ختم سال

اِس دسمبر ۱۹۸۱ء کے رسالہ الابقار پر آپ کا زرِ سالانہ ختم ہو گیا سالِ جدید ۱۹۸۲ء کے لئے الابقار اگر آپ کو جاری رکھنا ہے تو بیس ۲۰ روپے آج ہی روانہ فرما دیں۔

وی پی رجسٹری کا خرچہ دو ۲ روپے زائد خرچ ہوتا ہے آپ کو اگر دو ۲ روپیہ کا نقصان سے بچنا ہے تو آج ہی اولین فرصت میں بیس ۲۰ روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما دیں والسلام۔

افسوس ناک اعلان

ایک بہت ہی نیک اور نیک کام کی طرف دوڑ کر چلنے والے نے کراچی کے چند امام اور خطیب مسجد کے نام یہ رسالہ الابقار اپنی طرف سے زرِ سالانہ ۱۹۸۱ء کا ادا کر کے اِس ۱۹۸۱ء کے پورے سال بھر کے لئے جاری کرایا تھا۔ وہ تو جاری کرا کر اللہ تعالیٰ کے یہاں چلے گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب نیا سال ۱۹۸۲ء شروع ہونے والا ہے اگر آپ کو یہ رسالہ پسند ہے تو نئے سال ۱۹۸۲ء کیلئے بیس ۲۰ روپے ارسال فرما دیں۔ اگر ناپسند ہے تو ایک خط سے مطلع فرما دیں۔ وی پی کا انتظار کراچی کے امام صاحب اور خطیب مسجد نہ فرما دیں بلکہ زرِ سالانہ بیس روپیہ کا منی آرڈر بھیجدیں۔

منی آرڈر بھیجنے کا پتہ۔ محمد عبد المنّان غُفرلہٗ مکتبہ تھانوی مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱